بانی و مدیرِ اعلیٰ — محمود ریاض

مدیرہ — سادرہ خاتون

مدیر — آذر ریاض

نائب مدیرہ — رضیہ جمیل

مدیرہ خصوصی — امت الصبور

بلقیس بھٹی

نفسیات — عدنان

اشتہارات — خالدہ جیلانی

خط و کتابت کا پتہ

خواتین ڈائجسٹ

37- اردو بازار کراچی

MEMBER APNS CPNE

رکن آل پاکستان نیوز پیپرز سوسائٹی

رکن کونسل آف پاکستان نیوز پیپرز ایڈیٹرز

زرِ سالانہ بذریعہ رجسٹری

پاکستان (سالانہ) ------ 700 روپے

ایشیا، افریقہ، یورپ ---- 5000 روپے

امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا --- 6000 روپے

کہنی سُننی — مدیر — 14

کرن کرن روشنی — ادارہ — 15

ہمارے نام — نادرہ خاتون — 29

آپ سے کیا پردہ

غزل — انشا جی — 20

خاتون کی ڈائری

میری ڈائری سے — امت الصبور — 276

مجھ سے ملیے

یاسر شورو — شاہین رشید — 280

انٹرویو

اعجاز کا رنگ — امت الصبور — 25

سونیا حسین — شاہین رشید — 21

ناول

آب حیات — عمیرہ احمد — 36

بن مانگی دعا — عفت سحر طاہر — 196

مکمل ناول

تیرے جیسا ہی ہوں — سائرہ رضا — 68

عہدِ الست — تنزیلہ ریاض — 220

نمل — نمرہ احمد — 122

ناولٹ

محبت کا رنگ — سمیرا گل عثمان — 174

افسانے

رقصِ بہاراں — قرۃ العین رائے — 108

گلابی کاغذ — امت العزیز شہزاد — 116

مکافاتِ عمل — عائشہ خان — 169

محبت میٹھی سی — نادیہ جہانگیر — 62

نظمیں غزلیں

غزل — میثم علی آغا — 171

نظم — حرا قریشی — 171

رنگا رنگ پھول

زنگا رنگ سلسلہ، شگفتہ جاہ 272

خبریں و بریں، واصفہ سہیل 278

میری بیاض سے

آپ کی بیاض سے، خالدہ جیلانی 270

نفسیات

نفسیاتی ازدواجی الجھنیں، عدنان 288

پکوان

موسم کے پکوان، خالدہ جیلانی 286

آپ کا باورچی خانہ، مسز حمیرا ثقلین 284

بیوٹی بکس

بیوٹی بکس کے مشورے، امت الصبور 290

اگست 2015

جلد 43 شمارہ 4

قیمت 60 روپے

خط و کتابت کا پتہ: خواتین ڈائجسٹ، 37 - اردو بازار، کراچی۔

پبلشر آزر ریاض نے ابن حسن پرنٹنگ پریس سے چھپوا کر شائع کیا۔ مقام: بی 91، بلاک W، نارتھ ناظم آباد، کراچی

Phone: 32721777, 32726617, 021-32022494 Fax: 92-21-32766872

Email: info@khawateendigest.com Website www.khawateendigest.com

خواتین ڈائجسٹ کا اگست کا شمارہ لیے حاضر ہیں۔
قارئین کو جشن آزادی مبارک۔
14- اگست 1947ء برصغیر کے مسلمانوں کی تاریخ کا ایک سنہرا دن، جب دنیا کے نقشے پر پاکستان کا نام وجود میں آیا۔ ایک ایسا خطۂ زمین جو قدرت کی عطا کردہ تمام نعمتوں سے مالا مال تھا۔ سمندر، دریا، پہاڑ، زرخیز سونا اگلتی زمینیں۔ اناج سے لے کر معدنی ذخائر تک کون سی نعمت تھی جس سے قدرت نے اس سرزمین کو نہیں نوازا۔ دنیا کا بہترین چاول، ہر قسم کے پھل، سبزیاں، کوئلہ، لوہا، تانبہ اور سونے کے ذخائر، قدرتی گیس اور سب سے بڑھ کر آزادی کی نعمت۔ مسلمانوں کو ہندوؤں اور انگریزوں کے تسلط سے رہائی ملی۔
آزادی اور اپنا وطن کتنی بڑی نعمت ہے۔ اگر یہ جاننا ہے تو روہنگیا کے مسلمانوں کی دل دہلا دینے والی حالت دیکھ لیں جنہیں قدم رکھنے کے لیے بھی زمین میسر نہیں۔
کشمیر اور فلسطین کے مسلمانوں کی جدوجہد اور حالات سب کے علم میں ہیں۔ اسرائیلی بربریت پر رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ ہم جو پاکستان کی خرابیاں گنواتے نہیں تھکتے۔ آج دنیا بھر میں کہیں بھی چلے جائیں، ہمیں وہ درجہ نہیں مل سکتا جو پاکستان میں حاصل ہے۔ ہم وہاں ہمیشہ دوسرے درجے کے شہری رہیں گے۔
یہ ملک اللہ کی نعمت اور معجزہ ہے۔ مسلمانوں نے اپنے عزم، حوصلے اور اتحاد سے ناممکن کو ممکن کر دکھایا۔ یہ ہمارا گھر ہے اور اس کی حفاظت اور دیکھ بھال ہمارا فرض ہے۔ اللہ تعالیٰ اسے رہتی دنیا تک سلامت رکھے۔ آمین۔

محمود خاور کی برسی،

محبت کرنے والے ہمیشہ دلوں کے مکین رہتے ہیں۔ محمود خاور کو دنیا سے رخصت ہوئے کتنے سال بیت گئے۔ لیکن ان کی محبت اور یادیں آج بھی دل پر نقش ہیں۔
20- اگست کو ان کی برسی ہے۔ قارئین سے دعائے مغفرت کی درخواست ہے۔

اس شمارے میں،

- عہد الست - تنزیلہ ریاض کے ناول کی آخری قسط،
- تیرے جیسا ہی ہوں - سائرہ رضا کا مکمل ناول،
- نمل - نمرہ احمد کا مکمل ناول،
- عمیرہ احمد اور عفت سحر طاہر کے ناول،
- سمیرا گل عثمان کا ناولٹ - محبت کے رنگ،
- ٹی وی فنکارہ اور ماڈل سونیا حسین سے ملاقات،
- اداکار یاسر شورو سے باتیں،
- کرن کرن روشنی - احادیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کا سلسلہ،
- نفسیاتی ازدواجی الجھنیں اور دیگر مستقل سلسلے شامل ہیں۔

اگست کا شمارہ آپ کو کیسا لگا؟ آپ کی رائے جاننے کے منتظر ہیں۔

قرآن پاک زندگی گزارنے کے لیے ایک لائحہ عمل ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی قرآن پاک کی عملی تشریح ہے۔ قرآن اور حدیث دین اسلام کی بنیاد ہیں اور یہ دونوں ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم کی حیثیت رکھتے ہیں۔ قرآن مجید دین کا اصل ہے اور حدیث شریف اس کی تشریح ہے۔

پوری امت مسلمہ اس پر متفق ہے کہ حدیث کے بغیر اسلامی زندگی نامکمل اور ادھوری ہے' اس لیے ان دونوں کو دین میں حجت اور دلیل قرار دیا گیا۔ اسلام اور قرآن کو سمجھنے کے لیے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کا مطالعہ کرنا اور ان کو سمجھنا بہت ضروری ہے۔

کتب احادیث میں صحاح ستہ یعنی صحیح بخاری' صحیح مسلم' سنن ابوداؤد' سنن نسائی' جامع ترمذی اور موطا مالک کو جو مقام حاصل ہے' وہ کسی سے مخفی نہیں۔

ہم جو احادیث شائع کر رہے ہیں' وہ ہم نے ان ہی چھ مستند کتابوں سے لی ہیں۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کے علاوہ ہم اس سلسلے میں صحابہ کرام اور بزرگان دین کے سبق آموز واقعات بھی شائع کریں گے۔

کرن کرن روشنی

ادارہ

فخر کرنے اور ظلم و زیادتی کی ممانعت

اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔

"تم اپنی بابت پاکیزگی کا دعوامت کرو' تم میں سے جو پرہیز گار ہیں ان کو وہ خوب جانتا ہے۔" (النجم۔32)

نیز اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔

"بے شک ملامت کے لائق وہ لوگ ہیں جو لوگوں پر ظلم کرتے ہیں اور زمین میں ناحق سرکشی کرتے ہیں' یہی لوگ ہیں جن کے لیے دردناک عذاب ہے۔" (الشوریٰ۔42)

عاجزی

حضرت عیاض بن حمار رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"اللہ تعالیٰ نے میری طرف اس بات کی وحی فرمائی ہے کہ تم عاجزی اختیار کرو' یہاں تک کہ کوئی کسی پر ظلم نہ کرے اور نہ کوئی کسی دوسرے کے مقابلے میں فخر کرے۔" (مسلم)

فائدہ

اللہ نے کسی کو مال و دولت اور جاہ و منصب یا حسن و جمال یا علم و فضل عطا کیا ہو تو یہ اس پر اللہ کا احسان ہے' اس کو اللہ کے حکم کے مطابق تواضع اور عاجزی اختیار کر کے اللہ کا شکر ادا کرنا چاہیے اور اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ ان نعمتوں سے دوسرے لوگوں کو فائدہ پہنچانا چاہیے نہ کہ فخر و غرور کا اظہار کر کے اللہ کی ناشکری اور لوگوں پر ظلم و زیادتی کا ارتکاب کرے۔

خود کو برتر سمجھنا

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"جب کوئی آدمی یہ کہے کہ لوگ تباہ ہو گئے تو وہ ان میں سب سے زیادہ تباہ ہونے والا ہے۔" (مسلم)

فائدہ

اس میں اپنے آپ کو اچھا سمجھنے اور دوسروں کو حقیر

گردانے کی ممانعت ہے۔

بول چال بند رکھنا

اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔

"مومن تو بھائی بھائی ہیں چنانچہ اپنے دو (لڑے ہوئے) بھائیوں میں صلح کرادو۔" (الحجرات۔10)

نیز اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔

"گناہ اور زیادتی (کے کاموں) میں ایک دوسرے کی مدد نہ کرو۔" (المائدہ۔2)

فائدہ آیات

لڑائی اور ترک تعلق' اخوت کے خلاف ہے' اس لیے مسلمانوں کو باہم لڑے ہوئے مسلمانوں کے درمیان صلح کرانے کا حکم دیا گیا ہے تاکہ مومنانہ اخوت برقرار رہے۔ بغیر کسی سبب شرعی کے بول چال بند رکھنا بھی گناہ اور زیادتی ہے' اس لیے اس کی حوصلہ افزائی بھی گناہ پر تعاون ہے' جس سے مسلمانوں کو روک دیا گیا ہے۔ بلکہ ایسے موقعوں پر ضروری ہے کہ صلح کرادی جائے۔

تین دن سے زیادہ

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"تم ایک دوسرے سے تعلقات منقطع نہ کرو' نہ ایک دوسرے سے منہ موڑو (پیٹھ دکھاؤ) نہ ایک دوسرے سے بغض رکھو' نہ آپس میں حسد کرو اور اے اللہ کے بندو! بھائی بھائی بن جاؤ اور کسی مسلمان کے لیے یہ جائز نہیں ہے کہ وہ اپنے (مسلمان) بھائی سے تین دن سے زیادہ بول چال بند رکھے۔" (بخاری و مسلم)

بہتر کون

حضرت ابو ایوب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"کسی مسلمان کے لیے جائز نہیں ہے کہ وہ اپنے (مسلمان) بھائی سے تین راتوں سے زیادہ تعلق منقطع رکھے۔ دونوں کا آمنا سامنا ہو تو یہ اس سے اور وہ اس سے منہ پھیر لے۔ اور ان دونوں میں بہتر وہ ہے جو سلام کرنے میں پہل کرے۔" (بخاری و مسلم)

فوائد و مسائل :

1۔ اسلام چونکہ دین فطرت ہے' اس لیے اس میں فطری امور و معاملات کی مناسب حد تک رعایت رکھی گئی ہے۔ جب دو مسلمانوں میں کسی وجہ سے لڑائی جھگڑا ہو جائے تو دل میں میل کا پیدا ہو جانا فطری امر ہے' جس کی وجہ سے وہ دونوں ایک دوسرے سے بولنا اور تعلق قائم رکھنا پسند نہیں کرتے۔ شریعت نے اس فطری ناراضی کو تسلیم کیا اور تین دن تک بول چال بند رکھنے کی اجازت دے دی' لیکن زیادہ دنوں تک ترک تعلق' شدید بغض و عداوت کا باعث بنتا ہے' جس سے معاشرتی فساد میں اضافہ' رشتے داریوں میں مستقل رخنہ اور دوستانہ تعلقات میں شدید خلل پیدا ہوتا ہے' اس لیے عارضی تلخی و کشیدگی کو تین دن سے زیادہ برقرار رکھنے سے روک دیا گیا۔

2۔ سلام میں پہل کرنے کی فضیلت بیان کرکے دوبارہ تعلقات استوار کرنے کا ایک آسان طریقہ بھی تجویز فرمادیا' کیونکہ سلام سے محبت میں اضافہ اور بات چیت کا آغاز ہو جاتا ہے۔

مغفرت

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"ہر سوموار اور جمعرات کو (بارگاہ الٰہی میں) اعمال پیش کیے جاتے ہیں۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ ہر اس شخص کے گناہ معاف فرمادیتا ہے' جو اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہراتا ہو' سوائے اس شخص کے کہ اس کے اور اس کے بھائی کے درمیان دشمنی اور کینہ ہو تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: "ان دونوں کو چھوڑ دو' یہاں تک کہ یہ صلح کر لیں۔" (مسلم)

فائدہ: بغیر کسی سبب شرعی کے آپس میں دشمنی رکھنا مغفرت الٰہی سے محرومی کا باعث ہے۔ آعاذنا اللہ منہ۔

فساد

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا۔

"شیطان یقیناً" اس بات سے مایوس ہو گیا ہے کہ نمازی جزیرہ عرب میں اس کی عبادت کریں گے "مگر ان کے درمیان فساد ڈالنے میں (وہ کامیاب رہے گا۔") (مسلم)

فوائد و مسائل :

1 ۔ یہ حدیث دلائل نبوت میں سے ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ پیش گوئی سچ ثابت ہوئی کہ مسلمان آپس میں لڑیں گے، جھگڑیں گے اور باہم تعلقات منقطع کریں گے اور یہ کام شیطان کی شرارت، اس کے بھڑکانے اور وسوسہ اندازی کی وجہ سے ہوگا۔

2 ۔ نمازیوں سے مراد مسلمان ہیں۔

تعلق منقطع کرنے والا

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"کسی مسلمان کے لیے یہ جائز نہیں ہے کہ وہ تین دن سے زیادہ اپنے بھائی سے تعلق منقطع رکھے۔ چنانچہ جو شخص تین دن سے اوپر تعلق منقطع کیے رکھے گا اور اسی حالت میں اسے موت آگئی تو وہ جہنم میں جائے گا۔" (اسے ابوداؤد نے ایسی سند کے ساتھ روایت کیا ہے، جو بخاری کی شرط پر ہے۔)

فائدہ :

جہنم میں یہ دخول بطور سزا کے ہوگا، سزا بھگتنے کے بعد اسے جہنم سے نکال کر جنت میں داخل کر دیا جائے گا کیونکہ ہمیشہ جہنم میں رہنا صرف کافروں کے لیے ہے۔ تاہم اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ مسلمان جو چاہے کرلے، وہ بطور سزا بھی جہنم میں نہیں جائے گا۔ ایسا سمجھنا غلط ہے۔

ایک سال تک تعلق نہ رکھنا

حضرت ابو خراش حدرد بن ابی حدرد اسلمی اور بعض کے نزدیک سلمی، صحابی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انہوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا۔

"جو شخص اپنے (مسلمان) بھائی سے ایک سال تک تعلق منقطع رکھے گا تو اس کا یہ عمل، اس کا خون بہانے کے برابر ہے۔" (اسے ابوداؤد نے صحیح سند سے روایت کیا ہے۔)

فوائد و مسائل :

1 ۔ ترک تعلق بھی ایک طرح سے معنوی قتل ہے جس سے دوسرے مسلمان کو سخت ذہنی اذیت سے گزرنا پڑتا ہے، اس لیے اسے قتل کے مترادف قرار دیا۔

2 ۔ بول چال یا ترک تعلق صرف اللہ کی رضا کے لیے ہو، **مثلاً** "کوئی شخص بدعتی ہے یا کھلم کھلا فسق و فجور کا ارتکاب کرتا ہو، سمجھانے کے باوجود وہ اپنی بدعت یا فسق و فجور سے باز نہ آئے تو ایسے شخص سے صرف اللہ تعالیٰ کی رضا کے لیے بول چال بند کر دینا اور تعلق منقطع کر لینا جائز بلکہ مستحب ہے تاکہ اسے عبرت و نصیحت ہو اور اس طرح شاید وہ باز آجائے۔ لیکن محض دنیوی رنجشوں کی وجہ سے تین دن سے زیادہ تعلق منقطع کرنے کی اجازت نہیں ہے۔

گناہ

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"کسی مومن کے لیے یہ جائز نہیں ہے کہ وہ کسی مومن سے تین دن سے اوپر تعلق منقطع کیے رکھے۔ چنانچہ اگر اسی حالت میں تین دن گزر جائیں تو چاہیے کہ اس سے ملاقات کر کے اسے سلام کرے، اگر اس نے سلام کا جواب دے دیا تو دونوں ثواب میں شریک ہو گئے اور اگر اس نے (کشیدگی کو برقرار رکھتے ہوئے) سلام کا جواب نہ دیا تو وہ گناہ گار ہوا اور سلام کرنے والا ترک تعلق کے گناہ سے نکل گیا۔"

(اسے امام ابوداؤد نے حسن سند سے روایت کیا

ہے، نیز انہوں نے فرمایا۔ اگر ترک تعلق اللہ کے لیے ہو تو پھر اس میں کوئی گناہ نہیں۔)

دو آدمیوں کا سرگوشی کرنا

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: "سرگوشی کرنا تو شیطان کی طرف سے ہے۔" (المجادلہ۔10)

فائدہ آیات :

چند افراد ایک ساتھ ہوں یا ہم سفر ہوں، ایسے مقام اور موقع پر دوسروں کو چھوڑ کر، صرف دو شخصوں کا باہم رازدارانہ انداز میں گفتگو کرنا سرگوشی ہے، جس کی ممانعت ہے، کیونکہ اس سے دوسروں کی دل آزاری ہوتی ہے یا وہ بدگمانی میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔

تین آدمی

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"جب تین آدمی ہوں تو تیسرے کو چھوڑ کر دو آدمی آپس میں سرگوشی نہ کریں۔" (بخاری و مسلم)

چار آدمی

اسے ابوداؤد نے بھی روایت کیا ہے اور اس میں ابوصالح (راوی) نے یہ زیادہ بیان کیا کہ میں نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے پوچھا۔

"اگر چار آدمی ہوں تو؟"

انہوں نے جواب دیا: اس میں تیرے لیے کوئی حرج نہیں۔"

اسے امام مالک نے موطا میں عبداللہ بن دینار سے روایت کیا ہے۔ انہوں نے کہا۔

"میں اور حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ خالد بن عقبہ کے اس مکان کے پاس تھے جو بازار میں ہے۔ چنانچہ ایک آدمی آیا جو حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے سرگوشی کرنا چاہتا تھا اور حضرت ابن عمر کے ساتھ میرے سوا کوئی نہیں تھا۔ حضرت ابن عمر نے ایک دوسرے آدمی کو بلایا، یہاں تک کہ ہم چار آدمی ہو گئے تو انہوں نے مجھ سے اور اس تیسرے آدمی سے، جس کو انہوں نے بلایا تھا، فرمایا۔

"تھوڑا پیچھے ہٹ جاؤ، اس لیے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا ہے "ایک کو چھوڑ کر دو آدمی باہم سرگوشی نہ کریں۔"

فوائد و مسائل :

1۔ اس میں بعض آداب مجلس کا بیان ہے۔ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ نے ایک چوتھے آدمی کو اس لیے بلایا تاکہ آپ اس شخص کی بات سن لیں جو آپ سے علیحدگی میں گفتگو کرنا چاہتا تھا۔ چنانچہ آپ نے دو آدمیوں کو تھوڑا پیچھے کر دیا تاکہ سرگوشی کرنے والے کی کوئی بات وہ نہ سن سکیں۔

2۔ اس سے معلوم ہوا کہ ایک سے زیادہ آدمیوں کی موجودگی میں دو آدمی آپس میں سرگوشی کر سکتے ہیں، البتہ چار آدمی ہوں تو تین سرگوشی کریں اور چوتھے کو الگ رکھیں، یہ ممنوع ہے۔ علاوہ ازیں یہ ممانعت جائز باتوں میں ہے۔ ورنہ شر کی باتوں میں تو سرے سے سرگوشی کی اجازت ہی نہیں ہے، چاہے تیسرا آدمی نہ بھی ہو۔ قرآن کریم میں ہے۔

"اے ایمان والو! جب تم آپس میں سرگوشی کرو تو گناہ اور زیادتی کے کاموں اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی نافرمانی میں سرگوشی نہ کرو!" (المجادلہ: 58:9)

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"جب تم تین آدمی ہو تو تیسرے کو چھوڑ کر دو آدمی سرگوشی نہ کریں، یہاں تک کہ تم لوگوں میں مل جل جاؤ۔ اس لیے کہ ایسا کرنا اس (تیسرے آدمی) کو غمگین کر دے گا۔" (بخاری و مسلم)

فائدہ :

اس میں ممنوعہ سرگوشی کی وجہ بیان کی گئی ہے کہ اس سے ایک مومن کو تکلیف ہوتی ہے اور مومن کو ایذا پہنچانا سخت گناہ ہے۔ اس بنا پر یہ سرگوشی حرام کے درجے میں ممنوع ہے۔ البتہ جب تینوں افراد لوگوں میں مل جل جائیں تو پھر دو شخص آپس میں جس طرح چاہیں گفتگو کر سکتے ہیں۔

غلام، جانور اور بیوی کو سزا دینا

اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔

''اور ماں باپ، رشتے داروں، یتیموں، مسکینوں، رشتے دار، (یا قریب کے) پڑوسی دور کے پڑوسی، ہم نشین ساتھی اور مسافر کے ساتھ حسن سلوک کرو اور ان کے ساتھ بھی جو تمہارے غلام ہیں۔ بے شک اللہ تعالیٰ تکبر کرنے والے، فخر کرنے والے کو پسند نہیں کرتا۔'' (النساء۔36)

فائدہ آیات :

ان تمام قسم کے لوگوں کے ساتھ حسن سلوک کرنے کا حکم ہے جس کا مطلب ہے کہ کسی کے ساتھ بھی ایسا رویہ اختیار نہ کیا جائے جو حسن سلوک کے منافی ہو۔ اور بغیر کسی شرعی عذر کے کسی کو سزا دینا یا ادب سکھانے کے لیے مارنے کی ضرورت پیش آجائے تو ضرورت سے زیادہ مارنا بھی اسی لیے ممنوع ہے کہ یہ حسن سلوک کے منافی ہے۔

جانوروں سے سلوک

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''ایک عورت کو ایک بلی کی وجہ سے عذاب دیا گیا۔ اس نے اسے قید کر دیا تھا حتی کہ وہ مرگئی، چنانچہ وہ اس کی وجہ سے جہنم میں گئی۔ نہ اس نے اسے کھلایا پلایا، جب کہ اس نے اسے قید کر رکھا تھا اور نہ اسے اس نے چھوڑا کہ وہ خود زمین کے کیڑے مکوڑے کھا لیتی۔'' (بخاری و مسلم)

فوائد و مسائل :

1 ۔ حیوانات کے ساتھ بھی نرمی اور حسن سلوک ضروری ہے، سنگ دلی کا مظاہرہ حرام ہے۔

2 ۔ جانوروں کو قید کر کے پنجرے وغیرہ میں رکھنا جائز ہے، بشرطیکہ ان کی خوراک اور دیگر ضروریات کا خیال رکھا جائے۔

غلام کو مارنا

حضرت ابو مسعود بدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں اپنے غلام کو کوڑے سے مار رہا تھا کہ میں نے اپنے پیچھے سے ایک آواز سنی۔

''خبردار، اے ابو مسعود!''

مگر میں غصے کی حالت میں ہونے کی وجہ سے آواز کو نہ سمجھ سکا۔ چنانچہ جب وہ (آواز دینے والے میرے قریب ہوئے تو دیکھا کہ وہ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرمارہے تھے۔

''خبردار، اے ابو مسعود! اللہ تعالیٰ تجھ پر اس سے کہیں زیادہ قادر ہے جتنا تو اس غلام پر ہے۔''

میں نے کہا: اس کے بعد میں کبھی کسی غلام کو نہیں ماروں گا۔''

ایک اور روایت میں ہے کہ آپ کی ہیبت سے کوڑا میرے ہاتھ سے گر گیا۔

ایک اور روایت میں ہے: چنانچہ میں نے کہا۔

''اے اللہ کے رسول! یہ اللہ کی رضا کے لیے آزاد ہے۔''

تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

''اگر تو آزاد نہ کرتا تو آگ تجھے اپنی لپیٹ میں لے لیتی' یا (فرمایا:) تجھے جہنم کی آگ ضرور چھوتی۔'' (یہ تمام روایات مسلم نے بیان کی ہیں۔)

فوائد و مسائل :

1 ۔ اس میں بھی غلاموں (اور نوکروں چاکروں) پر بلاوجہ سختی کرنے یا جرم سے زیادہ شدید سزا دینے کی وعید کا ذکر ہے۔

2 ۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ نے جس جلالت و ہیبت سے سرفراز فرمایا تھا اس کا بھی کچھ بیان اس میں آگیا ہے۔

غزل

انشاء جی

کس کو پار اُتارا تم نے، کس کو پار اُتارو گے
ملاّحو، تم پردیسی کو بیچ بھنور میں مارو گے

منہ دیکھے کی میٹھی باتیں سنتے اتنی عمر ہوئی
آنکھ سے اوجھل ہوتے ہوتے جی سے ہمیں بسارو گے

آج تو ہم کو پاگل کہہ لو، پتھر پھینکو، طنز کرو
عشق کی بازی کھیل نہیں ہے، کھیلو گے تو ہارو گے

اہل وفا سے ترکِ تعلق کر لو پر اک بات کہیں؟
کل تم اِن کو یاد کرو گے، کل تم انہیں پکارو گے

اُن کا ہم سے پیار کا رشتہ، اے دل چھوڑو بھول چکو
وقت نے سب کچھ میٹ دیا ہے، اب کیا نقش ابھارو گے

انشا کو کسی سوچ میں ڈوبے، در پر بیٹھے دیر ہوئی
کب تک اس کے بخت کے بدلے، اپنے بال سنوارو گے

ٹی وی فنکارہ

سونیا حسین سے ملاقات

شاہین رشید

اردو ڈراموں میں کام کر کے شہرت پانے والی ہماری دو فن کارائیں ایسی ہیں جو اردو رسالوں کے لیے انٹرویو دینا پسند نہیں کرتیں۔ ان میں ایک سنیتا مارشل اور دوسری سونیا حسین ہیں۔ سنیتا مارشل سے تو ہم نے کوشش نہیں کی، لیکن سونیا حسین سے تھوڑی بات چیت ضرور ہوئی۔ سونیا حسین کے بولنے کا انداز بہت دل نشین ہے۔ بہت عزت اور پیار سے بات کرتی ہیں۔ آج کل آپ انہیں "ہم تیرے نکاح میں" اور "ماتا" میں دیکھ رہے ہیں۔

"کیسی ہیں سونیا حسین؟"

"جی اللہ کا شکر ہے۔"

"اردو میگزین سے کیا ناراضی ہے؟"

"کچھ بھی نہیں..... ہرگز نہیں۔"

"اچھا..... تو پھر انٹرویو کیوں نہیں دیتیں؟"

قہقہہ..... "ارے سمپل سی بات ہے ایکچولی شاہین جی! میں اردو رسالے پڑھتی ہی نہیں ہوں۔ بس اس لیے انٹرویو بھی نہیں دیتی۔ ناراضی والی کوئی بات نہیں۔"

"پڑھا کریں..... بہت اچھے رسالے ہوتے ہیں۔ آج کل ٹی وی پر جتنے ڈرامے بن رہے ہیں ان کی کہانیاں ان ہی رسالوں سے لی گئی ہیں اور زیادہ تر ڈراما نگار بھی ان ہی رسالوں کی لکھاری ہیں۔"

''اچھا...! چلیں پھر ان شاء اللہ دوں گی انٹرویو...
ویسے مجھے شہرت سے زیادہ اپنے کام سے پیار ہے۔ بس ناظرین مجھے پسند کرتے ہیں، میرے لیے اس سے بڑھ کر کچھ بھی نہیں۔''

''آج کل آپ کے دو سیریلز ''ہم تیرے نکاح میں'' اور ''ممتا'' بہت اچھے جا رہے ہیں۔ کیا رسپانس مل رہا ہے؟''

''بہت اچھا رسپانس مل رہا ہے۔ لوگ بہت پسند کر رہے ہیں۔ آپ بتائیں، آپ کو کیسے لگ رہے ہیں یہ سیریلز۔''

''ارے جناب! بہت اچھے سیریلز ہیں۔ پسند کیے جا رہے ہیں۔ دونوں میں آپ کے کردار قربانی دینے والی لڑکی کے ہیں۔ اصل زندگی میں بھی آپ ایسی ہی ہیں؟''

قہقہہ... ''سچ میں ایسی ہی ہوں۔ قربانی دینے والی، سب کا خیال رکھنے والی، سب سے محبت کرنے والی لڑکی ہوں۔''

''کچھ یاد ہے اب تک کتنے سیریلز اور سوپ میں کام کر چکی ہیں؟''

''ارے بہت ہیں۔ سچ میں سب یاد نہیں ہیں، لیکن جو بہت مشہور ہوئے ان میں جیسا کہ آپ نے بھی ابھی کہا۔ ''ہم تیرے نکاح میں ہیں'' اور ''ماممتا'' ''سرخ جوڑا'' ''خدا نہ کرے'' ''ہرجائی'' ''میں ہاری پیا'' ''ایسا چلے جیسا'' ''شکوہ'' اور کئی دیگر بھی ہیں۔ انہیں لوگوں نے بہت پسند کیا اور ہاں ''میرے ہم راہی'' اور ''مجھے صندل کردو'' بھی بہت پاپولر ہوئے۔''

''ڈراموں میں اداکاری کے علاوہ بھی کچھ کیا؟''

''بہت کچھ کیا، ڈبنگ کی، ہوسٹنگ کی، ماڈلنگ کی اور معروف برانڈ کے لیے ماڈلنگ کی، ہر کمرشل کو قبول نہیں کیا۔ ہمیشہ معیار کو برقرار رکھا اور خیال بھی، کیونکہ ہم اگر اس بات کا خیال نہیں رکھیں گے تو ناظرین غلط چیزوں کی طرف راغب ہو جائیں گے۔''

''اگر فلموں میں آفر ہو تو پھر بھی اس بات کا خیال رکھیں گی کہ معیار برقرار رہے؟''

''بالکل معیار کو برقرار رکھوں گی اور آپ آفر کی بات کر رہی ہیں، میں تو ایک فلم کر چکی ہوں جو تقریباً مکمل ہو چکی ہے۔ ڈائریکٹر جامی ہیں اور یہ ایک مکمل آرٹ مووی ہے اور چونکہ یہ آرٹ مووی ہے تو اس میں اوٹ پٹانگ ڈانس اور آئٹم سونگ ہرگز نہیں ہیں۔''

''اور اگر آئٹم سونگ کرنے پڑتے تو کر لیتیں؟''

''ارے نہیں...! میں یہ کام نہیں کر سکتی، نہ مجھے پسند ہے۔ میں ہمیشہ اچھی اور بامقصد فلموں میں کام کرنا چاہتی ہوں۔''

''کچھ چانس ہے اچھی فلمیں بننے کا؟''

''بننے کا؟ ارے بن رہی ہیں۔ ''نامعلوم افراد'' کو ہی دیکھ لیں، اس سے قبل بھی اچھی فلمیں بنی ہیں۔ اب پوری دنیا میں، ہماری فلمیں پسند کی جا رہی ہیں۔ ہم آہستہ آہستہ ترقی کی طرف گامزن ہیں اور اب لوگ فلموں میں کام کرنے کو ترجیح دیتے ہیں اور ایک دن آئے گا کہ ہم اپنی فلموں پر فخر کریں گے۔''

''اپنے ڈراموں سے مطمئن ہیں؟''

ہنستے ہوئے۔ ''آپ کیا پوچھنا چاہتی ہیں؟ کوئی بھی آرٹسٹ نہ کبھی اپنے کام سے مطمئن ہوتا ہے، نہ ہی ملک میں بننے والے ڈراموں سے اور نہ ہر تحریر معیاری ہوتی ہے، کچھ نہ کچھ کمی ضرور رہ جاتی ہے۔''

''ہنستی ہوئی بہت اچھی لگتی ہیں، پھر یہ رونے دھونے والے کردار کیوں؟''

ہنستے ہوئے... ''اگر میں روؤں گی نہیں تو ڈراموں کی ریٹنگ کیسے بڑھے گی۔ صرف میں ہی نہیں رو رہی ڈراموں میں ہر فن کارہ رو رہی ہے اور اس لیے رو رہی ہے کیوں کہ ایسے ڈرامے بن رہے ہیں کیا کریں کہ آج کل ایسے ہی اسکرپٹ لکھے جا رہے ہیں۔''

''پوچھا نہیں کہ ایسا کیوں ہو رہا ہے؟''

''جی پوچھا تھا... کہتے ہیں کہ ریٹنگ بڑھتی ہے اور

ایسا دنیا میں ہو بھی رہا ہے۔ اس لیے وہ ہی پیش کیا جارہا ہے، جو ہمارے معاشرے میں ہو رہا ہے۔"

"آپ کیا کہیں گی کیا ایسا ہو رہا ہے؟"

"میرا تو اتنا مشاہدہ نہیں ہے، لیکن جہاں تک میں نے دیکھا ہے، آج کی عورت یا لڑکی مظلوم نہیں ہے، بلکہ اسٹرونگ ہے اور چینلز والوں کو اپنا رویہ بدلنا چاہیے۔ لڑکی کو اسٹرونگ دکھائیں، تاکہ دیگر دیکھنے والی لڑکیاں بھی مضبوط اور اسٹرونگ ہوں۔"

"آپ کا کیا ارادہ ہے، اپنے آپ کو چینج کرنا ہے؟"

"ان شاء اللہ آپ جلد ہی مجھے بغیر رونے دھونے والے ایک بہت ہی اچھے کردار میں دیکھیں گی اور ہو سکتا ہے کہ ڈائریکٹرز کو میرا چینج پسند آئے۔"

"عورت تو ہر ڈرامے میں مظلوم ہے، مگر کہانیاں بھی ایک جیسی ہیں کیا خیال ہے آپ کا؟"

"جب ایک ہی انداز کی روتی دھوتی لڑکیاں دکھائی جائیں گی تو پھر کہانیاں بھی تو ایک جیسی ہی ہوں گی۔ مسئلہ یہ ہے کہ ہمارے پروڈیوسر اور ڈائریکٹرز کوئی نیا تجربہ ہی نہیں کرنا چاہتے۔ وہ ڈرتے ہیں کہ کہیں ناکامی کا منہ نہ دیکھنا پڑے اور میں سمجھتی ہوں کہ جس نے ہمت کر لی وہ ہی کامیاب رہے گا۔ کیونکہ اب ناظرین چینج چاہتے ہیں، وہ ایک جیسی کہانیوں سے تنگ آگئے ہیں۔"

"کبھی دل چاہتا ہے کہ میں خود آجاؤں اس فیلڈ میں اور کچھ کر کے دکھاؤں اور بتادوں کہ نئی کہانی کیا ہوتی ہے، کس طرح کام ہوتا ہے؟"

"نہیں.... ابھی میں اپنے آپ کو اس قابل نہیں سمجھتی۔ ابھی میرے پاس اتنے وسائل نہیں ہیں کہ بے جھجک ہو کے سارے کام کر لوں، لیکن جو نام اب مشہور ہو چکے ہیں انہیں اب نئے تجربات کرنے کی ضرورت ہے اور میرا خیال ہے کہ انہیں ناکامی کا منہ نہیں دیکھنا پڑے گا۔"

"کس قسم کے کردار کو نے کو بالکل دل نہیں چاہتا اور آنکھیں بند کر کے انکار کر دیتی ہیں؟"

"ہمارے ڈراموں میں وہی کچھ دکھایا جاتا ہے جو ہو رہا ہے، مگر صرف ایک موضوع کو لے کر نہ چلیں۔ ہمارے معاشرے میں اور بھی بہت کچھ ہو رہا ہے۔ رہی بات آنکھیں بند کر کے انکار کرنے کی تو ایسا تو میں نے کبھی نہیں کیا، لیکن جو کردار کرنا مجھے بالکل بھی پسند نہیں ہیں وہ ساس، بہو کے روایتی کردار ہیں۔ میرے پاس ایسے بہت سے اسکرپٹ آتے ہیں جو ساس، بہو کی روایتی کہانیوں پر مبنی ہوتے ہیں۔ میں کہتی ہوں کہ اب زمانہ اور ماحول بدل گیا ہے۔ اب نہ ساسیں پہلے جیسی رہی ہیں اور نہ ہی بہویں.... اب دونوں بہت اچھی زندگی گزارتی ہیں۔"

"مگر ہمارے گاؤں، دیہات میں تو ایسا ہے نا؟"

"تو پھر گاؤں، دیہات کا ماحول دکھائیں، شہر کے ماحول میں تو دو پڑھی لکھی خواتین کو نہ لڑوائیں اور نہ ہی ساس کے ظلم سہتے ہوئے یا بہو کی بدتمیزیاں دکھائیں۔ جو حقیقت ہے وہی دکھائیں۔

شاہین! ایسا کریں باقی باتیں بعد میں کر لیں، ابھی مجھے شوٹ پہ جانا ہے۔"

"اوکے.... اوکے.... بس دو تین سوال اور.... ایک تو یہ کہ اس فیلڈ میں آمد کیسے ہوئی؟ پاپڑ بیلنے پڑے یا سب کچھ بہت آرام سے مل گیا؟"

"اصل میں تو میرا تو دل ہی نہیں تھا اس فیلڈ میں آنے کا اور نہ ہی کوئی ارادہ، میرا مطلب ہے اداکاری کی فیلڈ میں.... ہاں کبھی کبھار نیوز اینکر بننے کا شوق سر پر سوار ہو جاتا تھا اور اپنے اس شوق کو پورا کرنے کے لیے میں نے چند ایک چینلز پہ جا کر آڈیشنز بھی دیے، لیکن کوئی خاطر خواہ نتیجہ نہیں نکلا۔ اسپورٹس کا بھی شوق ہے تو اسپورٹس چینل بھی گئی تو وہاں میری ملاقات علی سعید صاحب سے ہوئی، جو ایک سیریل بنا رہے تھے Do not be Jeasous اس میں انہوں نے مجھے کام کی آفر دی جو کہ میں نے قبول کر لی کہ چلو کچھ کر لوں، شاید پھر نیوز اینکر بننے کا چانس مل جائے۔ مگر جناب! شاید میری قسمت میں اداکارہ بننا لکھا تھا، چنانچہ

اس کے بعد مزید آفرز آگئیں تو سوچا پھر یہ ہی فیلڈ درست ہے۔"

"اداکارہ بننے کا ارادہ نہیں تھا' تو پھر کیا بننے کا ارادہ تھا؟"

"میں ڈاکٹر بننا چاہتی تھی مگر یہ خواہش بھی پوری نہیں ہوئی تو میں نے فزیالوجی میں بی ایس کی ڈگری لے لی۔"

"سونیا! آپ کافی کام کر چکی ہیں' کن ڈائریکٹرز کے ساتھ کام کرنے میں ایزی رہیں؟"

"کسی کا نام لیا تو دوسروں کے ساتھ زیادتی ہو جائے گی۔ سب ہی بہت اچھے ہیں اور میں زیادہ تر ان ہی کے ساتھ کام کرتی ہوں جو مجھے پسند ہیں' مگر پھر بھی جن کے ساتھ کام کرکے مجھے گھر جیسا ماحول ملتا ہے ان میں روبینہ اشرف صاحبہ' عاصم رضا' جاوید اور جامی صاحب ہیں۔"

"ہم عصر فن کاروں کے بارے میں کچھ کہیں گی؟"

"سچ بات تو یہ ہے کہ میری ہم عصر ہوں' مجھ سے پہلے والی ہوں یا میرے بعد آنے والیاں ہوں' ماشاء اللہ سب ہی اپنے ٹیلنٹ کے مطابق بہت اچھا کام کر رہی ہیں۔"

"تعلقات کیسے ہیں سب سے؟"

"بہت اچھے۔ میری سینئرز میرے لیے رول ماڈلز ہیں' جونیئرز اور ہم عصروں سے بہت اچھی دوستی ہے۔ مجھے ہر وہ انسان بہت پسند ہے' جو محنت سے آگے بڑھتا ہے اور کوئی مقام حاصل کرتا ہے۔"

"لوگ ملتے ہیں تو کام کی تعریف کرتے ہیں۔ آپ کے معصوم چہرے کی تعریف کرتے ہیں یا کچھ تنقید بھی ہوتی ہے؟"

ہنستے ہوئے... "کام کی تعریف ہوتی ہے۔ میرے معصوم چہرے کی بھی اور میرے لیے یہ وقت بہت اچھا ہوتا ہے جب کوئی میرے کام کی تعریف کرتا ہے اور میرے ڈراموں کے حوالے کے ساتھ' تنقید منہ پر تو کوئی نہیں کرتا' پیچھے کرتے ہوں تو پتا نہیں۔"

"سیاست سے لگاؤ ہے' فارغ اوقات میں کیا کرتی ہیں؟"

"بہت زیادہ... اور کچھ پتا نہیں کہ چند سال بعد آپ مجھے سیاست میں دیکھیں' مجھے بے نظیر بھٹو بہت پسند ہیں اور اگر سیاست میں آئی تو ان ہی کو فالو کروں گی' فارغ اوقات میں لائف کو انجوائے کرتی ہوں' مووویز دیکھتی ہوں۔ گھر والوں کے ساتھ وقت گزارتی ہوں۔"

"اور یہ آخری سوال کہ..."

"شکر ہے... پوچھیں..."

"آج کل آپ کا ڈراما "ہم تیرے نکاح میں ہیں" چل رہا ہے۔ آپ بھی تو کسی کے نکاح میں ہیں؟"

قہقہہ... "جی جی... میں واصف صاحب کے نکاح میں ہوں۔ جو کہ بہت اچھے انسان ہیں۔ لوگ پوچھتے ہیں کہ ان کی خوبیاں بتاؤں تو میں کہتی ہوں کہ کوئی ایک خوبی ہو تو بتاؤں... ماشاء اللہ ان میں خوبیاں ہی خوبیاں ہیں۔ واصف نے ہی مجھے پروپوز کیا تھا اور مجھے یاد ہے کہ ان ہی کے ساتھ میں نے پہلا پروجیکٹ بھی کیا تھا۔"

"نکاح دھوم دھام سے ہوا؟"

"نہیں جی... بہت سادگی سے اور ہم دونوں کی فیملیز ہی نے شرکت کی تھی؟"

"بہت شکریہ سونیا! اب اجازت دیں۔"

"اوکے... شاہین آپ کا بھی شکریہ۔"

"جی بالکل..."

☼

سرورق کی شخصیت

ماڈل	لائبہ مغل
میک اپ	روز بیوٹی پارلر
فوٹو گرافر	موسیٰ رضا

حرفِ سادہ کو دیا اعجاز کا رنگ

امت الصبور

میرے روز و شب تھے بندھے ہوئے موسموں کے مزاج سے
کبھی ایک لمحہ بھی سال تھا، کبھی سال پل میں گزر گیا

آپ کی محبتوں کے ساتھ ایک اور سال کا سفر تمام ہوا۔

43 برسوں پر محیط یہ سفر جتنا مشکل تھا، اتنا ہی آسان بھی تھا کہ اس سفر میں لگن اور شوق شامل تھا جس نے تھکنے نہیں دیا۔

گردش ماہ و سال کی نیرنگیوں میں کئی راستوں سے گزرے، کئی اتار چڑھاؤ دیکھے لیکن قافلۂ شوق رکنے نہیں پایا، وہ شوق، وہ جستجو، وہ تلاش آج بھی جاری ہے۔

اس طویل سفر میں ہماری مصنفین نے ہمارا بھرپور ساتھ دیا۔ ان کی سوچ اور فکر کے رنگ لفظوں میں ڈھلے تو ان میں زندگی کے سارے منظر سمٹ آئے۔ ان کی تحریروں میں عہد حاضر کی کرب ناک حقیقتوں کی آگہی کے ساتھ ساتھ شگفتگی، دل آویزی اور خوابوں کے دلکش رنگ بھی شامل تھے انہوں نے اپنی تحریروں کے ذریعے لاکھوں قارئین کے جذبات واحساسات کی ترجمانی کی، ان کے دلوں میں امید کے چراغ روشن کیے، یہی وجہ ہے کہ خواتین ڈائجسٹ کے ذریعے مصنفین کو اپنی پہچان کے ساتھ ساتھ قارئین کی بے پایاں محبت و تحسین بھی ملی۔

فطری بات ہے، ہم جن کو پسند کرتے ہیں، جن سے لگاؤ رکھتے ہیں، ان کے بارے میں زیادہ سے زیادہ جاننا چاہتے ہیں، ہماری قارئین بھی مصنفین کے بارے میں ان کی ذات کے حوالے سے جاننا چاہتی ہیں۔

سالگرہ نمبر کے موقع پر ہم نے مصنفین سے سروے ترتیب دیا ہے، سوالات یہ ہیں۔

1 لکھنے کی صلاحیت اور شوق وراثت میں منتقل ہوا؟ یا صرف آپ کو قدرت نے تخلیقی صلاحیت عطا کی۔ گھر میں آپ کے علاوہ کسی اور بہن بھائی کو بھی لکھنے کا شوق تھا؟

2 آپ کے گھر والے، خاندان والے آپ کی کہانیاں پڑھتے ہیں؟ ان کی آپ کی تحریوں کے بارے میں کیا رائے ہے۔

3 آپ کی کوئی ایسی کہانی جسے لکھ کر آپ کو اطمینان محسوس ہوا ہو۔ اب تک جو لکھا ہے، اپنی کون سی تحریر زیادہ پسند ہے؟

4 اپنے علاوہ کن مصنفین کی تحریریں شوق سے پڑھتی ہیں؟

5 اپنی پسند کا کوئی شعر یا اقتباس ہماری قارئین کے لیے لکھیں۔

آئیے دیکھتے ہیں، مصنفین نے ان کے کیا جوابات دیے ہیں۔

سیما بنت عاصم

سب سے پہلے تو سالگرہ کی ڈھیروں ڈھیر مبارک باد۔ رب تعالیٰ یہ آب و تاب ہمیشہ برقرار رکھے۔ (آمین) ساتھ ہی یہ خوش خبریاں کہ 16 فروری کو پروردگار نے مجھے چاند جیسے بھتیجے سیف اللہ سے نوازا اور 14 مارچ کو میری بھانجی فضا روید پیا دیس سدھاری۔ آپ سب سے ہم سب کے لیے دعاؤں کی درخواست ہے۔

1 ۔ وراثت..... توبہ کریں توبہ۔ مجھے تو لگتا ہے پشتوں میں کوئی قلم کا مزدور نہیں گزرا۔ رہے بہن بھائی' تو جن پیسوں کی بچے ٹافیاں کھاتے ہیں' میں کہانی خرید کر پڑھتی تھی اس وقت۔

کیا خبر تھی تیری محفل میں بھی گھسنا ہوگا۔ (ہنسیے مت' دانت اندر کریں اپنے۔)

2 ۔ گھر میں تو گھر کی مرغی دال برابر والا معاملہ ہے۔ والد صاحب نے اک بار میرا دل رکھنے کو میرا اک افسانہ "محبت اک سفر کا سلسلہ ہے" پڑھی تھی۔ خاندان والے سراہتے بھی ہیں اور فخر بھی کرتے ہیں کہ خاندان میں اک روایت شکن بھی موجود ہے۔

3 ۔ اے خدایا! یہ کیا پوچھ لیا آپ نے

اجی اپنے قلمی کارنامے ہمیں کہاں یاد رہتے ہیں۔ یہ تو دوسروں کا ہی دم خم ہے' جو گاہے بہ گاہے ہمیں شرمسار کیا کرتے ہیں جیسے۔

"زلزلہ پر پہلی کہانی آپ ہی نے لکھی تھی نا۔"

"اچھا!" فٹ سے جیسے دماغ کی کوئی بتی روشن ہو جاتی ہے۔

ویسے مجھے اپنی اک تحریر "حیات نو" لکھ کر اطمینان محسوس ہوا۔ یہ اک روحانی قوتیں رکھنے والی لڑکی کی کہانی تھی۔ جو اخبار جہاں میں شائع ہوئی۔

اب میرا افسانہ نکتوں کی شکل میں سر اٹھاتا ہے۔ نکتوں کی تکمیل کے بعد یہ الجھاؤ کہ کون سا نکتہ کہاں استعمال کرنا ہے۔ یہی الجھاؤ۔ نکتوں کے پیچ و خم تحریر کو مشکل بنا دیتے ہیں۔

افسانے پر "ہاتھ ڈالنے" سے بچتی چھپتی پھرتی ہوں۔ اور یقین کریں سب پوائنٹس ٹھکانے لگ جانے پر..... افسانے کی تکمیل سے زیادہ جان خلاصی پر اطمینان محسوس ہوتا ہے۔ میرا افسانہ پڑھ کر آپ سوچ بھی نہیں سکتیں کہ سیمانے اس پر کتنا سر کھپایا ہے۔

4 ۔ اپنے علاوہ سب مصنفین کی تحریریں شوق سے پڑھتی ہوں۔ صدف آصف اچھا لکھ رہی ہیں۔ ویل ڈن..... رفعت سراج' راحت جبیں' آسیہ رزاقی کی کوئی تحریر مس نہیں کرتی اور ہاں' اک نام جو بھولتا ہی نہیں' عظمت عزمی اور فرحانہ ناز ملک کا ذکر ضرور کروں گی کہ وہ میرے دل میں ہے۔

5 ۔ میں جب بچہ تھا۔
تو اکثر کھلونے ٹوٹ جاتے تھے۔
میرے رونے پر۔
ماں آکر جوڑ دیتی تھی۔
سنا ہے' ماں سے بھی بڑھ کر
تجھے الفت ہے بندوں سے
تو آکر جوڑ دے یا رب!
میں خود کو توڑ بیٹھا ہوں!

فرح بخاری

1 ۔ جی ہاں! بلاشبہ لکھنے کا شوق وراثت میں منتقل ہوا۔ والد محترم تو ہر فن مولا ہیں اور بے شمار تخلیقی صلاحیتوں کے مالک بھی' میرے اندر ان کے ہنر کا شاید چوتھائی حصہ بھی نہیں آیا۔ وہ رائٹر بھی ہیں۔ آرٹسٹ بھی' سیاح بھی ہیں' فوٹو گرافر بھی اور بے شمار سفرناموں کے خالق بھی' لیکن افسوس وہ اپنی زیادہ تر تخلیقات کو اپنی لائبریری تک محدود رکھتے ہیں' شاید وہ اس بات پر یقین رکھتے ہیں کہ ہنر شہرت کا محتاج نہیں ہوتا اور یہ ٹھیک بھی ہے' کیونکہ ان کا بے پناہ ٹیلنٹ اور ذہانت دنیا سے چھپی نہیں ہے۔

ویسے ارادہ تو میرا بھی کچھ ایسا ہی تھا۔ کہانیاں لکھ لکھ کر بک شیلف میں رکھتے جانا' لیکن میں نے اپنے شوہر کی حوصلہ افزائی کی بدولت انہیں شائع کرانے کی ہمت اپنے اندر پیدا کی اور کامیابی کے اس سفر میں اللہ تعالیٰ کے ساتھ ساتھ ان کی بھی دل سے شکر گزار ہوں۔

بہن' بھائیوں میں سے اور کسی نے لکھنے وغیرہ میں دلچسپی نہیں لی۔ البتہ ذہین وہ سب مجھ سے زیادہ ہیں۔ شاید پڑھائی کی طرف زیادہ رجحان نے انہیں اضافی سرگرمیوں کا وقت نہیں دیا۔

2 ۔ گھر والوں میں سب سے پہلے میری امی اور بھابھیاں میری کہانی پڑھتی ہیں' بلکہ امی تو اس وقت میری کہانی سے واقف ہوتی ہیں' جب ابھی وہ میرے ذہن میں ہوتی ہے۔ میں اپنا آئیڈیا سب سے پہلے ان ہی سے شیئر کرتی ہوں۔ بھابھیاں فوراً" ہی بڑی تابعداری سے تعریف کر دیتی ہیں۔ بہنیں البتہ نہیں بخشتیں۔ بڑی بہن شہربانو ویسے بھی بہترین نقاد اور تبصرہ نگار ہیں۔ ہر سین اور ہر کردار پر جامع اظہار خیال فرماتی ہیں اور چھوٹی بہن راحیل کو ہر کہانی کی "ہیپی اینڈنگ" سے شکوہ ہوتا ہے اللہ جانے کیوں۔

سب سے زیادہ مزا دوستوں کے تبصرے سے آتا ہے۔ کیونکہ یہ ایسی "مخلوق" ہے کہ جو منہ میں آئے کہہ دیتی ہے۔ مثلاً" میری دوست شہلا نے جب "تیرے دھیان کی تیز ہوا" پڑھا تو کہنے لگیں۔

"اب بس بھی کرو' بال بچے دار ہو گئی ہو' چھوڑو یہ رومانوی کہانیاں لکھنا۔"

میں نے مشورہ سر آنکھوں پر سجاتے ہوئے "شام خزاں طویل سہی' لکھ دیا تو اگلے دن ہی نہایت دکھی دل سے فون پر کہنے لگیں۔

"کیوں ایسے سنجیدہ موضوع پر قلم اٹھایا۔ میں تو بس رونے والی ہی ہو گئی تھی۔ تم بس ہلکی پھلکی رومانٹک کہانیاں ہی لکھا کرو۔"

اب بتائیں بندہ ہنسے یا روئے اور حد سے زیادہ صاف گو سمیرا علی جان کی طرف سے ڈھیروں تنقید کارڈ لگا رہتا ہے۔ ایسے دل کھول کر تعریف کرتی ہیں کہ سیروں خون بڑھ جاتا ہے۔

3 ۔ ویسے تو میرا تخلیقی سفر زیادہ طویل نہیں' لیکن الحمد للہ اب تک جو بھی لکھا' سکون ہی محسوس کیا۔ البتہ سب سے زیادہ جو کہانی پسند ہے۔ وہ "میں ندیا تم ساگر" ہے۔ کیونکہ ذاتی طور پر میں گاؤں کے ماحول اور دیہاتی زندگی کو بہت پسند کرتی ہوں۔ اس کہانی میں ایک سلجھے ہوئے استاد کے توسط سے گاؤں والوں کو توہم پرستی سے نکالتے دکھا کر کافی سکون محسوس کیا۔

باقی انصاف پسندی سے کہوں تو کوئی بھی تحریر لکھ لینے کے بعد سکون تب تک نہیں آتا جب تک قاری بہنیں تعریف کی مہر نہ ثبت کر دیں۔

4 ۔ پرانے لکھنے والوں میں پریم چند دیہاتی ماحول کی حقیقی عکاسی کی وجہ سے بہت پسند ہیں۔ غلام عباس اپنے درد بھرے جذباتی موضوعات کی بنا پر اور پطرس بخاری ہلکے پھلکے لطیف مزاح کی وجہ سے آج بھی دل موہ لیتے ہیں۔ جہاں تک بات ہے نئے لکھنے والوں کی تو آج مجھے موقع ملا ہے۔ اپنی پسندیدہ رائٹر اور شخصیت "رفعت سراج" صاحبہ کے بارے میں لکھنے کا۔ سچ تو یہ ہے کہ رائٹر بننے کی تحریک میرے اندر "دل دیا دہلیز" پڑھ کر پیدا ہوئی۔ رفعت جی کی دو خوبیوں کا خصوصی طور پر ذکر کرنا چاہوں گی۔

ایک تو ان کے کردار انتہائی جان دار اور پاور فل ہوتے ہیں۔ خصوصاً" جس طرح انہوں نے "باری" کا کردار تخلیق کیا۔ یہ صرف وہی کر سکتی تھیں۔

دوسرے ان کا لکھا ایک ایک لفظ نہایت سہولت

سے پڑھنے والے کے دل و دماغ میں اترتا جاتا ہے۔ بات کو بلاوجہ الجھا کر پیش کرنا اور بھاری بھر کم الفاظ میں لپیٹنا وہ پسند نہیں کرتیں۔ میں انہیں اپنا روحانی استاد تسلیم کرتی ہوں' کیونکہ انہیں پڑھ کر لکھنا سیکھنا' البتہ ان جیسا لکھنا میرے بس کی بات نہیں۔

5 ۔قیصر نجفی کی غزل کے کچھ اشعار جو مجھے بہت پسند ہیں۔

ہر شجر سے نہ رکھ امید ثمر
کچھ شجر بے ثمر بھی ہوتے ہیں
سپیوں کو نہ جان بے مایہ
سپیوں میں گہر بھی ہوتے ہیں

صائمہ اکرم چوہدری..... اسلام آباد

1 ۔لکھنے کا شوق تو نہیں ہاں' پڑھنے کا شوق مجھے وراثت میں ضرور ملا۔ میرے فادر کو اخبارات' آرٹیکل اور میگزین وغیرہ پڑھنے کا بہت شوق تھا۔ ان ہی کی دیکھا دیکھی یہ صلاحیت ہم چار میں سے تین بہن' بھائیوں میں منتقل ہوئی' لیکن قلم اٹھا کر اس میدان میں نکلنے کا سہرا صرف میرے سر ہے۔ اب دیکھتے ہیں وراثت میں آگے یہ شوق کس کو منتقل ہوتا ہے؟

2 ۔الحمدللہ..... بہت سے دوسرے لوگوں کی طرح ہمارے ساتھ بھی "گھر کی مرغی دال برابر" والا ہی حساب ہوتا ہے۔ بقول میری والدہ کے لکھنا کون سا مشکل کام ہے۔ بس قلم اٹھاؤ اور کاغذ نیلے پیلے کرنا شروع کردو۔ جبکہ میری بجیا کا کہنا ہے' ہمیں مزا نہیں آتا' کیونکہ جو باتیں تم ہمارے سامنے کررہی ہوتی' وہ ہی لکھ رہی ہوتی ہو' جبکہ کالج کولیگز کا کہنا ہے کہ تم اپنی تحریروں کے بالکل برعکس ہو' تمہاری تحریر بہت سنجیدہ اور تم حد درجہ غیر سنجیدہ ہو۔ (اب پتا نہیں یہ تعریف ہے یا تنقید؟) ہاں کالج میں میری لٹریچر کی اسٹوڈنٹس بہت کھل کر تعریف کرتی ہیں' میری بیسٹ فرینڈ فریحہ اور میری بہت پیاری کولیگ اور میری استاد فاطمہ باجی (فاطمہ زاہد) بے لاگ انداز میں تبصرہ کرتی ہیں۔ فریحہ اور فاطمہ باجی یہ دونوں شخصیات اگر کسی تحریر کو پاس کردیں تو مجھے لگتا ہے کہ ہاں واقعی اس میں کچھ دم ہوگا۔

3 ۔وقت کے ساتھ ساتھ جس طرح میری شخصیت اور میرے مزاج میں بہت سی تبدیلیاں آئی ہیں' اسی طرح تحریروں کا انداز بھی بدلتا جارہا ہے۔ میں نے مزاح اور سنجیدہ موضوعات دونوں پر لکھا' لیکن ابھی تک کوئی ایسی چیز نہیں لکھ پائی' جس سے اطمینان قلب محسوس ہو۔ ہاں "دیمک زدہ محبت" اور "ابن آدم" کو میں نے بہت دل سے لکھا تھا اور اسے کافی سراہا بھی گیا۔ اپنی آنے والی تحریروں میں "سیاہ حاشیہ" اور ایک ناول "کن فیکون" جو ادھورا لکھ کر رکھا ہوا ہے' وہ مجھے بہت پسند ہیں۔

4 ۔اپنے علاوہ سب ہی کو شوق سے پڑھتی ہوں' لیکن عمیرہ احمد' تنزیلہ ریاض' سائرہ رضا' آمنہ ریاض' نبیلہ ابر راجہ' فرحت اشتیاق' عالیہ بخاری' راحت جبیں' فائزہ افتخار اور عنیزہ سید کا اسٹائل اچھا لگتا ہے۔ اس کے علاوہ ہما کوکب بخاری' رفعت ناہید سجاد' رفعت سراج اور فارحہ ارشد کی تحریروں کو بہت مس کرتی ہوں۔ کاش یہ لوگ دوبارہ لکھنا شروع کردیں۔

5 ۔اپنی پسند کا کوئی شعر یا اقتباس اپنے قارئین کے لیے لکھیں۔

شاعری اور نثر میں پسند ناپسند وقت کے ساتھ ساتھ بدلتی رہتی ہے۔ آج کل نثر سے زیادہ شاعری اچھی لگ رہی ہے۔ اس لیے میر تقی میر' فیض احمد فیض' جون ایلیا اور اقبال کو خوب پڑھا جارہا ہے۔ ایک شعر فیس بک پر کہیں پڑھا اور بہت اچھا لگا' لیکن شاعر کا نام معلوم نہیں۔

میں اپنے حرف سے نکلا تو لفظ تک پہنچا
پھر ایک "کن" کا بڑی دیر انتظار کیا

نادیہ خاتون

خط بھجوانے کے لیے پتا
خواتین ڈائجسٹ، 37- اردو بازار، کراچی۔
Email: info@khawateendigest.com
khawateendigest@hotmail.com

نوشین اختر... کبیر والا

یہ میری انوکھی محبت بلکہ خاموش محبت کی داستان ہے جو مجھے آپ کے ادارے کے ہر فرد سے ہے اور اس کی وجہ شعاع اور خواتین ہیں۔ اللہ کا شکریہ ہوا کہ مجھے کبھی کسی نے پڑھنے سے نہیں روکا بلکہ پہلے امی پھر میں خود اور اب بھائی لا کر دیتے ہیں۔ آپ کی ساری رائٹرز میری اپنی ہیں۔ دوسری بہنوں کی طرح راحت جبیں، فاخرہ جبیں، فرحت اشتیاق، نگہت عبداللہ، میمونہ خورشید، غزالہ نگار اور کزنی، رفعت سراج، شازیہ چوہدری (مرحومہ) عمیرہ احمد، نمرہ احمد، تنزیلہ ریاض، عالیہ بخاری، سمیرا حمید، آسیہ رزاقی اور بہت ساری دوسری مصنفین ان میں سے کچھ کی راہیں جدا ہو گئیں اور کچھ ہم سے وابستہ ہیں۔ مجھے ہمیشہ ایسا لگتا تھا کہ اف یہ کس قدر خوب صورت موضوع کا انتخاب کر کے کیسے اسے لفظوں میں ڈھال لیتی ہیں، لیکن پھر ایک دھماکا ہوا جب سائرہ رضا کو پڑھا اوہ! میرے خدا! کہانی کے لیے خاص موضوع ہونا ضروری نہیں۔ عام اور معاشرے میں رائج لوگوں کے اپنے قائم کردہ نظریات کو کس قدر خوب صورتی سے صفحہ قرطاس کی زینت بناتی ہیں۔ آپ کے رسالے کے توسط سے ان کے لیے بہت سی نیک خواہشات اور دعائیں۔ آپ کا پورا ادارہ میرے لیے ایک خاندان، میرے اپنے خاندان کی طرح ہے۔ یہ آپ لوگوں کی ہی بدولت ہی تو ہے کہ معیز کے مرنے پر میں کتنا روئی اور معیز جو ثمینہ اکرم کا بیٹا تھا، تو میں نے کبھی ثمینہ اکرم کو دیکھا نہ معیز کو۔

زندگی میں بہت سارے نشیب و فراز آئے، کبھی لگا کہ زندگی پر جمود طاری ہو گیا اب بھلا دکھوں کے اس دائرے سے کیسے نکلیں گے پر ان پرچوں سے صبر، قناعت، حوصلہ سیکھا۔ انہوں نے پر خلوص دوست بن کر ڈھارس بندھائی۔ عدنان بھائی کے مشورے، جو کسی بہن کے لیے ہوتے تھے، لیکن ان کی روشنی سے اپنی زندگی کو جگمگایا اور بیوٹی ٹپس سے چہرے کو ——— آپ لوگوں کا بہنوں کو جواب دینے کا انداز کتنا پیارا ہے ورنہ اکثر دوسرے پرچوں میں انداز کچھ اور ہے۔ کسی بہن کی تنقید کو خندہ پیشانی سے سننا بلکہ پڑھنا، الجھن کو سلجھانا واہ! آپ لوگوں کا تو ہر انداز ہی دل موہ لینے والا ہے۔ اب کچھ میرے بارے میں پڑھیے۔

کبیر والا کے نزدیک ایک چھوٹے سے گاؤں چاہ چینے والا میں ہم رہتے ہیں۔ دو بھائیوں کی لاڈلی بہن اور دو بیٹیوں کی راج دلاری مما ہوں۔ جی ہاں مما لیکن خبردار مجھے کوئی آنٹی ٹائپ خاتون نہ سمجھا جائے، میں نے بڑا اس وقت تک نہیں ہونا جب تک میری بیٹی سعدیہ کالج نہیں چلی جاتی ابھی وہ فورتھ کلاس میں ہے۔ رسالہ آنے پر پہلے میں پھر امی پھر ثنا اور پھر میری دوسری کزنز ثمینہ اور نبیلہ وغیرہ پڑھتے ہیں اور آخر میں سعدیہ۔ وہ ابھی صرف باتوں سے خوشبو آئے اور لطیفے پڑھتی ہے رسالے کو باقاعدہ کور کر کے رکھتے ہیں میری الماری کی آخری درازیں رسالوں کے لیے وقف ہیں مجال نہیں جو کوئی ان کا ٹائٹل بھی پھاڑے فارغ وقت میں پرانے رسائل نکال کر پڑھنے میں جو مزہ ہے وہ دنیا میں کہیں بھی نہیں (آیوشہ میری پیاری کزن 9th کے پیپرز سے فراغت کے بعد خوب رسالے چاٹ رہی ہے)۔ کبیر والا ہمارے گاؤں سے صرف پانچ منٹ کے فاصلے پر

ہے بائیک پر۔ سب لوگوں کی طرح مجھے بھی اپنے شہر سے بہت پیار ہے گیریژن اسکول سسٹم کبیر والا میں ٹیچر ہوں، وہیں پر دونوں بچیاں بھی پڑھتی ہیں۔ HIC اسپیشل ایجوکیشن میں ایم ایڈ کر رکھا ہے۔ بس نوکری کا انتظار ہے۔

ج۔ نوشین اختر خواہ کتنے ہی طویل ہوں خط تو ہم سب کے ہی پورے پڑھتے ہیں، لیکن آپ کا خط پڑھ کر داد بھی دی۔ ہم اپنی قارئین کی ذہانت کے دل سے معترف ہیں، لیکن آپ کی خاص بات یہ ہے کہ آپ گاؤں میں رہتی ہیں اس کے باوجود آپ نے اعلا تعلیم حاصل کی اور باقاعدگی سے مطالعہ بھی جاری رکھا۔ خط کی طوالت کے پیش نظر ہمیں کچھ حصے حذف کرنے پڑے، مجبوری تھی، خطوں کی تعداد زیادہ ہوتی ہے اور صفحات کم۔ آپ نے جس طرح ہمیں سراہا۔ ہماری حوصلہ افزائی کی، اس کے لیے تہہ دل سے شکریہ اور ڈھیر ساری دعائیں۔ اللہ تعالیٰ آپ کو مزید ترقی دے۔ آمین۔

مسرت الطاف احمد۔۔۔ کراچی

اس بار خواتین ڈائجسٹ خلاف توقع کافی لیٹ ملا 12 تاریخ کو ہاتھ میں آیا۔ اس بار خواتین ڈائجسٹ اے ون تھا مکمل ناول، ناولٹ، افسانے اور سارے مستقل سلسلے قابل تعریف تھے۔

"آب حیات" عمیرہ احمد بہت ہی سبک روی سے

آگے کی جانب رواں دواں ہیں وسیم کی موت اور اپنوں کی بے حسی نے امامہ کو ڈپریشن کا شکار کر دیا، امامہ کی سالار سے لاتعلقی خود غرضی سے کم نہیں تھی۔ "بن مانگی دعا" یہ قسط بہت پسند آئی۔ "محبت میں انا نہیں ہوتی" یہ بات دل کو چھو گئی۔

"اب سوال یہ ہے کہ" آسیہ رزاقی کا پرمزاح اور دلچسپ انداز تحریر بہت اچھا لگا رشتوں سے جڑی تحریر بہت زیادہ پسند آئی۔ "نمل" نمرہ اپنے منفرد انداز میں دلچسپی کا عنصر برقرار رکھتے ہوئے اپنی منزل کی طرف رواں دواں ہیں۔ پلیز نمرہ جی فارس کے کردار کو تھوڑا سا اسٹرونگ کر دیں۔ زمر کے سامنے فارس کی خاموشی محبت میں ہی سہی ایک آنکھ نہیں بھاتی۔ "عید ہو جائے" ہنستی مسکراتی، ٹینشن فری، سوفٹ سی اسٹوری دل کو بھا گئی۔ "عہد الست" ایک ایسا مکمل اور معیاری ناول ہے۔ جس کا انداز تحریر جاندار موضوع کی گرفت بہت ہی مضبوط ہے۔ "محبت مار دی تم نے" فنٹاسٹک تحریر تھی۔ طرز تحریر بہت اثر انگیز اور الفاظ کا چناؤ بھی بہت زبردست تھا۔ "من چاہا بول دے" متاثر کن تحریر تھی موضوع بہت ہی جاندار تھا۔

افسانوں میں "آخری عیدی" آؤٹ اسٹینڈنگ تحریر تھی تحریر کا ہر جملہ مزاح سے بھرپور تھا بشریٰ کی قمیص کا ستیاناس ہونا، احزم کا زخمی ہونا اور گھر کے بچوں کا شور اور ندیدہ پن اور یاں زاہدہ کا بکرے کے منہ پر تھپڑ مارنا۔ کمال کی منظر نگاری تھی ڈائیلاگز بہت ہی زبردست تھے۔ "ویل ڈن"

"افطاری کی خوشی" اور "آب بستہ" بہت ہی متاثر کن اور دل کو چھو لینے والی تحریریں تھیں۔

ج۔ پیاری مسرت! تفصیلی تبصرہ دلچسپ اور متاثر کن ہے۔ بہت شکریہ۔

ثنا عابد۔۔۔ نارووال

اپنی رائے دینے سے پہلے میں یہ بتاتی چلوں کہ ہر ماہ جب پارسل گھر پہ ملتا ہے تو بے حد خوشی ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ دوسری خوشی تب ہوتی ہے جب رسالہ کھولتے ہی سب سے پہلے "ہمارے نام" پڑھنا شروع کرتی ہوں اور جب میں یہ دیکھتی ہوں کہ اس رسالے کی شوقین خواتین کیسے اپنی مصروفیات زندگی سے وقت نکال کر باقاعدگی سے پڑھتی ہیں اور یہی نہیں بلکہ سالوں سے بڑی محبت اور عقیدت کے ساتھ اس رسالے سے وابستہ ہیں۔ کوئی بہن دیہی علاقے سے لکھ رہی ہوتی ہے، جہاں رسالے پہنچنا بھی مشکل ہوتا ہے تو کوئی بارڈر لائن پہ رہنے کی وجہ سے بمشکل رسالہ ڈھونڈ کر پڑھتی ہے تو کوئی شادی کے بعد گھر اور بچوں کی ذمہ داریوں میں مصروف ہونے کے باوجود رسالے پڑھنا جاری رکھے ہوئے ہے۔ "مسرت الطاف احمد" کو میری طرف سے جاب ملنے پر مبارک باد کہہ دیجیے۔ میرے خیالات بھی ان کے خیالات سے ملتے جلتے ہی ہیں۔ عائشہ رباب، حنا گل، نمرہ کشور کے تبصرے بھی بہت دلچسپ لگے۔ سب سے پہلے بات ہو جائے "آب حیات" کی۔ اس دفعہ کی قسط میں افریقہ کے ملک کانگو کے حوالے سے معلومات اور پیٹرس ایبا کا کردار بہت دلچسپ اور اچھا اضافہ لگا۔

"بن مانگی دعا" آخری مراحل میں ہے جان کر خوشی ہوئی۔ شکر ہے ثانیہ کے بھی نخرے ختم ہوئے۔ "عہد الست" میں بہت عمدگی سے تمام راز کھل رہے ہیں۔ تنزیلہ جی کا انٹرویو آخر میں ضرور ہونا چاہیے۔ "نمل" کی تو بات ہی بہت خاص ہے، نمرہ احمد کی مختصر تعریف میں صرف اتنا ہی کہہ رہی ہوں کہ وہ بہت ذہین اور کامیاب رائٹر ثابت ہو رہی ہیں، میں نے کبھی بھی ان کی تحریر پر کسی قاری کی تنقید نہیں پڑھی۔ وہ خود بھی اپنی طرف سے ناول میں کسی کمی بیشی کا امکان ہونے کا خیال رکھتی ہیں۔ حنین اور سیم بہت مزے کے کردار ہیں۔ باقی سلسلوں میں آسیہ رزاقی کا ناول پسند آیا، مگر پچھلے مہینے والی کہانی رنگ حنا سے زیادہ بہتر نہیں لگا۔ ناولٹ میں "عید ہو جائے" زیادہ پسند آیا۔ "محبت مار دی تم نے" بھی بہت عمدہ کہانی تھی۔ افسانوں میں "آخری عید" زبردست تھا، مگر اس میں مجھے تھوڑا سا اعتراض ہے۔ ہیروئن زیبی کی اٹھارہ سالہ عمر۔۔۔ اتنی سی عمر میں شادی؟

ج۔ پیاری ثنا! تفصیلی تبصرہ بہت اچھا لگا، آپ نے بہت اچھا کیا کہ ہمیں پچھلے شماروں کا تبصرہ بھی پوسٹ کر دیا اور ہم آپ کی رائے جان سکے۔ خواتین کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔

گڑیا راجپوت۔۔۔ جاتری تحصیل و ضلع ننکانہ

مجھے ایک بات سمجھ میں نہیں آتی کہ میرے آدھے ادھورے خط کیوں شائع کیے جاتے ہیں۔ محبت کرنے والوں کی ایک خامی (میری ڈائجسٹ سے محبت) بلاوجہ ناکامی، حسرت اور مجبوری کے احساس میں گرفتار رہتے ہیں۔ پتا ہے جب ہر ماہ میرے ہاتھ ڈائجسٹ آتا ہے تو کافی دیر میں کھولتی ہی نہیں، ہاتھ میں لیے بیٹھی رہتی ہوں (گم صم) پتا نہیں میرا خط شائع ہے یا نہیں۔۔۔

راز نہاں زباں اغیار تک نہ پہنچا
کیا ایک بھی ہمارا خط یار تک نہ پہنچا

یا پھر چند الفاظ درج ہوتے ہیں کاٹ چھانٹ کے بعد۔

زیرِ دیوار ذرا جھانک کے تم دیکھ تو لو
ناتواں بھرتے ہیں دل تھام کے آہیں کیونکر

میرے جیسی بہت سی لڑکیوں کے پاس ایک ہی رستہ ہے۔ جس کے بل بوتے پر ہم اپنے منفرد انداز بیان کو برقرار رکھ سکیں، لیکن آسمان پر جانے والی سوچ کو زمین کی سطح پر رہنے کا بھی رستہ نہیں ملتا۔ معذرت کے ساتھ بڑا محسوس ہوتا ہے تیرا محسوس نہ کرنا۔

ج۔ پیاری گڑیا! آپ کا خط دلچسپ ہے، اشعار کا انتخاب بھی خوب ہے اور بیان بھی، لیکن آپ ہی بتائیں ہم کیا کریں۔ ہماری کوشش ہوتی ہے کہ محدود صفحات میں زیادہ سے زیادہ خطوط شامل کر سکیں۔ اس لیے خطوط کاٹ چھانٹ کر کے شامل کیے جاتے ہیں۔ سوچ کے اظہار کے لیے ہمارے ہاں بہت سے سلسلے ہیں۔ جیسے "میری خامشی کو بیاں ملے" خاص موقعوں پر قارئین سے سروے بھی شامل ہوتے ہیں۔ آپ ان میں شرکت کر سکتی ہیں۔

اسماء سیف۔۔۔ ایبٹ آباد

میں بازار گئی تھی ڈائجسٹ لینے پرس چوری ہو گیا، خالی ہاتھ واپس آئی۔ اگلے دن پھر گئی ڈائجسٹ لینے۔ خیر جب ڈائجسٹ دیکھا تو پھر افسوس ہوا، اتنا افسوس مجھے اپنا پرس چوری ہونے پر نہیں ہوا جتنا ڈائجسٹ دیکھ کر ہوا۔ ایسا نہیں ہے کہ ڈائجسٹ میں کوئی چیز پسند نہیں آئی، نہیں جی۔ سب کچھ ہمیشہ کی طرح اپنے معیار کو برقرار رکھے ہوئے ہے۔ مجھے تو بس دکھ اس بات سے ہوا کہ اس بار پھر میرا خط شائع نہیں ہوا اور میری کہانی؟ توبہ ہے اس کو تو چھوڑ ہی دیں۔ پلیز ایک بار پھر درخواست کر رہی ہوں کہ عمیرہ احمد کا انٹرویو ضرور لیں۔

ج۔ آپ کا خط تاخیر سے موصول ہونے کی بنا پر شائع نہ ہو سکا۔ آپ کی کہانی ابھی پڑھی نہیں، پڑھ کر ہی بتا سکتے ہیں۔ عمیرہ احمد اگر انٹرویو دینے پر رضامند ہوئیں تو ضرور لیں گے۔

فرحین بتول۔۔۔ لاہور

تحریر پختہ ہو نہ ہو، اظہار خیال کا شوق ہے، عمر صرف 17 سال۔ خواتین سے اپنی وابستگی لکھنے بیٹھی تو ایک پورا ڈائجسٹ ہی یہ کیفیت بیان کرے گا۔ عمیرہ احمد جی کی "آب حیات" دین اور دنیا دونوں پہلوؤں کا احاطہ کرتی تحریر سیدھی دل میں اترتی ہے۔ نمرہ احمد! کیا کہنے بھئی۔ آپ کے قلم سے لکھا ہر لفظ، ہر سطر پُر اثر ہے۔ اشعار تو کمال ہوتے ہیں۔ "عہد الست" ایمان کو مضبوط کرتے لفظ حیرت میں ڈال دیتے۔ سوچنے پر مجبور کر دیتے ہیں۔

بے حد خوب صورت تنزیلہ جی اور نمرہ جی پلیز سعدی کو کچھ مت ہونے دینا۔

ج۔ پیاری فرحین! خواتین کی محفل میں خوش آمدید۔ نمرہ تک آپ کا پیغام پہنچا رہے ہیں۔ خواتین کی پسندیدگی کے لیے تہہ دل سے شکریہ۔

سائرہ نازش خان۔۔۔ سانگھڑ

دو ماہ سے "آب حیات" سلو چل رہی ہے۔ "بن مانگی دعا" میں مجھے لگتا ہے ابیہا کو سیفی نے اغوا کیا ہے۔ "نمل" تو بہت بہت زبردست چل رہا ہے۔

ج۔ پیاری سائرہ! خواتین کی محفل میں خوش آمدید۔ ابیہا کو کس نے اغوا کیا ہے۔ اس ماہ کی قسط پڑھ کر جان لیں گی۔

آپ جو بھی ناول منگوانا چاہتی ہیں۔ اس کے لیے اس نمبر پر فون کریں۔ 021-2735021

حرا قریشی۔۔۔ بلال کالونی ملتان

بات ہے خوشبو کی اور خوشبو مرے آس پاس ہی ہے۔۔۔!

"عہد الست" کی تخلیق کار تنزیلہ جی، سے آغاز کی قندیل روشن کرنے لگی ہوں۔ تحریر کی اکثر باتیں ضرب المثل کی سی مٹھاس اور چاشنی برقرار رکھے ہوئے ہیں۔ اکثر باتیں تعویذ کی طرح گلے سے لگا کے رکھنے والی ہیں۔ حسن یہ ہے کہ اتنی گہرائی اور پر مغز گفتگو کے باوجود بھی شگفتگی کا پورا پورا سامان موجود ہے۔ اسلامی تعلیمات کے دائرہ کار کو بھی بڑے پر اثر انداز میں واضح کیا گیا ہے۔ بہترین تحریر کا معیار اور باریکیاں کیا ہوتی ہیں؟ یہ کوئی تنزیلہ ریاض سے پوچھے۔ ہم تو بس اس دریا دل رائٹر کی موجوں سے منتشر ہوتے لفظوں سے سیراب ہوتے جا رہے ہیں جتنا کاسہ ء دست بھرتے ہیں اتنی ہی پیاس باقی رہتی ہے۔ جناب کے ذہن کی اختراع تو دیکھیے۔۔۔ جن سوالات کے جواب ہمیں چاہیے تھے۔ بنا پوچھے، بنا کہے، بنا کھوج پرت در پرت سامنے رکھتے احسن طریقے سے جواب دیے ہی جا رہی ہیں۔ جن میں تنزیلہ جی! میں وثوق سے کہہ رہی ہوں۔ اگلی نسلیں ان راہنما لفظوں کی کوبج سنتی خود کو سنوارنے کا عہد کریں گی۔ نو آموز لکھاری روشنی حاصل کریں گے اور آپ کا یہ ادبی شہ پارہ ادبی حلقوں میں صدیوں تک لوگوں کے ذہنوں کو معطر کرنے کا باعث بنے گا۔ رب سوہنا کرے زور قلم اور زیادہ۔۔۔ شی۔۔۔ شش۔۔۔ چپ۔۔۔ خاموش۔۔۔ منہ پر انگلی۔۔۔ خبردار۔۔۔ جو کوئی بولا۔۔۔ جب پڑھیں "نمل"۔۔۔ قطعی مداخلت جائز نہیں!۔ حنین کے کارہائے کے بارے میں جان کر افسوس ہوا۔ "مسز کاردار" تحریر کا انتہائی قابل نفرت کریکٹر۔ دولت فانی کی اسیر۔۔۔ ایسی حسین محبوبہ جو محبوب کو زہر دینے پر مسرت محسوس کرے۔ "ہاشم" لعنت ہو ایسی ذہانت پہ جو ناجائز مقاصد کے لیے استعمال کی جائے۔ نمرہ! کیا کمزور طاقت ور کی یہ جنگ کبھی ختم نہ ہو سکے گی؟ ذرا یکجا ہو جائیں چیونٹیاں، پھر یہ سب گریں گے، منہ کے بل۔ شاعری نے جابجا تحریر کا حسن بڑھایا ہوا ہے۔ ذکر ہوتا ہے جب "عمیرہ" کا۔۔۔ جوئے بار نور میرے گرد پھیل جاتی ہے۔ "امامہ ہاشم" سالار کے لیے کڑی آزمائش بنی ہے۔ سود کا تصور بڑی جامہ زیبی سے پیش کیا گیا ہے۔ اس پر حلال، حرام کی تمیز اف! میرے تخیلات سے کہیں زیادہ خوب صورت! کبھی کبھی لفظ معذور ہونے لگتے ہیں۔ گونگے ہو جاتے ہیں۔۔۔ یہ سوچتے کہ ادراک کے اس سفر میں مزید کتنی منازل طے کریں؟ "اعجاز کا رنگ" وہ سلسلہ جس نے بند غبارے میں پھر سے ہوا بھر دی (حرا کی بچی! لکھو اور اپنی رائے جلد بھیجو فوری!) "امتل سے فرمائش (اب تو "ہیرو" لگ ہی جائے) سمیرا (مدلل، پر مغز، اعلا اقتباس۔ اپنی "آپ بیتی" لکھ دیں، حرا ضرور پڑھے گی) نمرہ بخاری کے لیے (دلکش تمہید، دراشتی شوق، تکی، فیملی میں گمنام، متنوع موضوعات پہ عبور، سوال نمبر 4 دل کو چھو تا انداز بیاں) آمنہ زریں کے لیے بس۔ تیری دہلیز پر گلاب جھولے۔۔۔ جب تو نے ماں باپ کے قدم چومے! عفت سحر (مزیدار، قدرے کھٹا میٹھا، قابل تعریف، لانگ ٹرم تعلق ڈائجسٹ کی دنیا سے! اکنیز نبوی (محبت کی سرخی + ممتا کی لذت سے پر) قرۃ العین (ہر لحاظ سے جامع، بے حد لاجواب، بے حد خوب صورت)۔

سہانہ میر کشمیری۔۔۔ آزاد کشمیر

"نمل" بہترین کہانی ہے، کافی حد تک اسلامی معلومات بھی ہو جاتی ہیں۔ باقی سب رائٹرز بھی بہت اچھا لکھتی ہیں سب ہی مجھے بہت اپنی اپنی لگتی ہیں یہ ان ہی کی محنت اور محبت ہے ان ہی کی وجہ سے میں نے بہت کچھ سیکھا ہے اور باقی لڑکیاں بھی سیکھتی ہیں۔ رسالوں سے دیکھ کریں نے

جو پچھ بنایا سب نے بہت پسند کیا اور بہت تعریف ہوئی۔ اسی لیے آپ سے کہا تھا کہ سفید چنے، دال ماش، پالک، گوشتابہ اور سفید کشمیری یخنی کی ترکیب بتادیں۔

ج۔ سہانہ! آپ نے اپنے بھائی کی تعلیم کے متعلق ہم سے مشورہ مانگا ہے۔ آپ کا بھائی قرآن پاک حفظ کرچکا ہے۔ اس کا مطلب ہے وہ ذہین ہے اگر میٹرک میں اس کے نمبر کم آئے ہیں تو یقیناً کوئی وجہ ہوگی۔ آپ اس سے وجہ دریافت کریں پھر آپ خود ہی کوئی فیصلہ کرسکیں گی، ہوسکتا ہے۔ اسے اپنے مضامین میں دلچسپی نہ ہو یا کوئی اور وجہ۔

خواتین کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔ آپ کی فرمائش نوٹ کرلی گئی ہے۔ جلد پوری کرنے کی کوشش کریں گے۔

تحریم شاہد بخاری، کرن بخاری.... کوٹ ادو

اس دفعہ کا رسالہ ہمیشہ کی طرح لاجواب تھا، رسالہ کھولتے ہی حدیث نبوی سے روح منور ہوجاتی ہے، مگر "آپ کی بیاض سے" اور میری "ڈائری" بالکل ایک جیسے لگتے ہیں۔ افسانوں کے معیار میں کافی بہتری آتی جارہی ہے۔ "کمل" بہت زبردست ہے۔ قرآن پاک کا ترجمہ اور تفسیر بیان کرنے کا انداز بہت پیارا ہے، مگر آپی! آپ نے میرے سعدی کے ساتھ کیا کیا، اف ف ف.... ! دل دھک سے رہ گیا۔ زمر اور فارس کا ساتھ کام کرنا اچھا لگا۔ اب آتے ہیں اپنی فیورٹ "بن مانگی دعا" کی طرف عفت آپی ثانیہ کے رویے میں عون کے لیے نرمی اچھی لگی، لیکن ابیہا.... !اس سے ایسی بے وقوفی کی امید نہیں تھی۔

پلیز معیز ابیہا کو ڈھونڈ لے۔ افسانوں میں "آب بستہ" بہت اچھا تھا۔

ج۔ تحریم اور سائرہ! خواتین کی پسندیدگی کے لیے تہہ دل سے شکریہ۔

فوزیہ ثمر بٹ، ام ہانیہ عمران.... گجرات

سرورق میں کچھ بھی تو اچھا نہیں لگا سوائے ماڈل کی خوب صورت آنکھوں کے۔ حسب عادت سب سے پہلے "کرن کرن روشنی" پڑھا۔ انٹرویو حسب روایت ہی رہے۔ یعنی کہ ڈائجسٹ کا لازمی جز ہے۔ حرف سادہ کو دیا

اعجاز کا رنگ۔ سعدیہ حمید صاحبہ سے ملاقات اچھی لگی۔ ان کی تحریریں کسی تعریف کی محتاج نہیں۔ میری تو ہارٹ فیورٹ ہیں۔ آپ اتنی اچھی لکھاری ہیں۔ ہر مہینے آپ کی تحریر ڈائجسٹ میں شامل ہونا چاہیے۔ سب سے پہلے "آب حیات" پڑھا۔

پچھلی قسط میں مجھے تو یہی لگا۔ امامہ ہاشم مبین کی سگی اولاد نہیں۔ یہ فرید کی بیٹی ہے۔ جو زندہ رہ جاتی ہے۔ عمیرہ احمد اپنی قارئین کے صبر کو آزمائش میں ڈال دیتی ہیں۔ ہاں نا مہینے کے پورے تیس دن انتظار جو ہوتا ہے۔ ایک ریکوسٹ بھی ہے۔ پلیز امامہ کو سالار سے جدا مت کیجیے

قارئین متوجہ ہوں!

1- خواتین ڈائجسٹ کے لیے تمام سلسلے ایک ہی لفافے میں بھجوائے جاسکتے ہیں، تاہم ہر سلسلے کے لیے الگ کاغذ استعمال کریں۔

2- افسانے یا ناول لکھنے کے لیے کوئی بھی کاغذ استعمال کر سکتے ہیں۔

3- ایک سطر چھوڑ کر خوش خط لکھیں اور صفحے کی پشت پر یعنی صفحے کی دوسری طرف ہرگز نہ لکھیں۔

4- کہانی کے شروع میں اپنا نام اور کہانی کا نام لکھیں اور اختتام پر اپنا مکمل ایڈریس اور فون نمبر ضرور لکھیں۔

5- مسودے کی ایک کاپی اپنے پاس ضرور رکھیں، نا قابل اشاعت کی صورت میں تحریر واپسی ممکن نہیں ہوگی۔

6- تحریر روانہ کرنے کے دو ماہ بعد صرف پانچ تاریخ کو اپنی کہانی کے بارے میں معلومات حاصل کریں۔

7- خواتین ڈائجسٹ کے لیے افسانے، خط یا سلسلوں کے لیے انتخاب، اشعار وغیرہ درج ذیل پتے پر رجسٹری کروائیں۔

خواتین ڈائجسٹ
37- اردو بازار کراچی

گا۔ مکمل ناول اب سوال یہ ہے۔ قلم آسیہ جی کا ہو تو تحریر میں شگفتگی نہ ہو ' ایسا کیسے ہو سکتا ہے ہیروئن تو ہمیشہ سے باادب سلیقہ شعار ہوتی ہے 'مگر ہیرو صاحب بھی مزے کے لگے۔ تنزیلہ ریاض ' نمرہ احمد ' عفت سحر طاہر کی ہر ماہ بہت تعریفیں پڑھ رہی ہوں ' مگر کچھ عرصہ پڑھ کر ان کے ناول چھوڑ دیے ہیں ' اکٹھے ایک بار پڑھ لوں گی۔ "عید ہو جائے '، عید اسپیشل لگی یہ تحریر۔ محبت ہار دی تم نے لفظ لفظ موتی بکھیرے یہ تحریر سیدھی دل کو لگی۔ آخری عیدی بھی بہت اچھی تحریر لگی عید کے حوالے سے۔ خاص کر جب زیبی کو دیکھنے آتے ہیں تو جو سین پیش کیا ہے خوب مزہ آیا۔

افسانے تینوں ہی اچھے اور سبق آموز تھے۔ خاص کر آب بستہ اماں جی کا فلسفہ پسند آیا۔ عید کے پکوان کے حوالے سے تمام ڈشیں پسند آئیں۔ "خبریں دبریں" واصفہ سہیل کے کمنٹس اس سلسلے کی جان ہیں۔ "ہمارے نام" میں حنا گل بنوں کا تبصرہ اچھا لگا۔ حنا! کیا تم سویرا قریشی بنوں کو جانتی ہو؟

ج۔ پیاری فوزیہ! پچھلے ماہ آپ کا خط تاخیر سے ملنے کے باعث شامل نہ ہو سکا۔

ہمیشہ کی طرح آپ کا تفصیلی تبصرہ بہت اچھا ہے، لیکن یہ کیا....؟ آپ خواتین کے ناول ختم ہونے کا انتظار کر رہی ہیں۔ پھر پڑھ کر اپنی رائے دیں گی۔ فوزیہ آپ ہر ماہ پڑھ کر ہمیں اپنی رائے لکھا کریں، ہمیں انتظار رہتا ہے۔

عمارہ جویریہ.... ڈونگہ بونگہ

نمرہ آپی کا ناول "نمل" اپنی مثال آپ ہے۔ ہاشم کی حقیقت اب سعدی کے گھر پہ رہ جانے والے پین اور حنہ کے پاس جو فلیش ہے 'اس سے کھل کر سامنے آجائے گی۔ یہ کہنا بے جا نہ ہو گا "نمل" خواتین کا دل ہے۔

ج۔ پیاری عمارہ! آپ کی کہانی ابھی پڑھی نہیں ' پڑھ کر رائے دے سکتے ہیں۔

نمرہ احمد تک آپ کی تعریف پہنچا رہے ہیں۔

عمیرہ احمد

آبِ حیات

آب حیات کی کہانی تاش کے تیرہ پتوں میں چھپی ہوئی ہے۔

2۔ ایک خوب صورت اتفاق نے امامہ اور سالار کو یکجا کردیا ہے۔ سالار نے امامہ کو ایر رنگز دیے ہیں۔ وہ بالکل ویسے ہی ہیں، جیسے امامہ شادی سے قبل پہنتی تھی اور جو اسے اس کے والد ہاشم نے دیے تھے۔ سکندر عثمان نے اس شادی کو کھلے دل سے قبول کیا۔

9۔ سی آئی اے ہیڈ کوارٹر کے ایک کمرے میں چار اشخاص گزشتہ ڈیڑھ ماہ سے ایک پروجیکٹ پر کام کر رہے ہیں۔ انہیں ایک شخص بلکہ اس کی پوری فیملی کے تمام بیرونی معاملات اور ذاتی زندگی کی تمام تر مکمل معلومات حاصل ہیں اور انہیں اس میں سے کسی ایسے پوائنٹ کی ضرورت ہے۔ جس کی بنیاد پر وہ اس شخص پر ہاتھ ڈال سکیں۔ لیکن اس شخص — سمیت اس کی فیملی کے نہایت شفاف ریکارڈ سے اب تک کوئی مشکوک بات نہیں نکال سکے مگر آخری پندرہ منٹ میں انہیں اس فیملی کی کسی لڑکی کی تاریخ پیدائش کے حوالے سے کوئی سراغ جاتا ہے۔
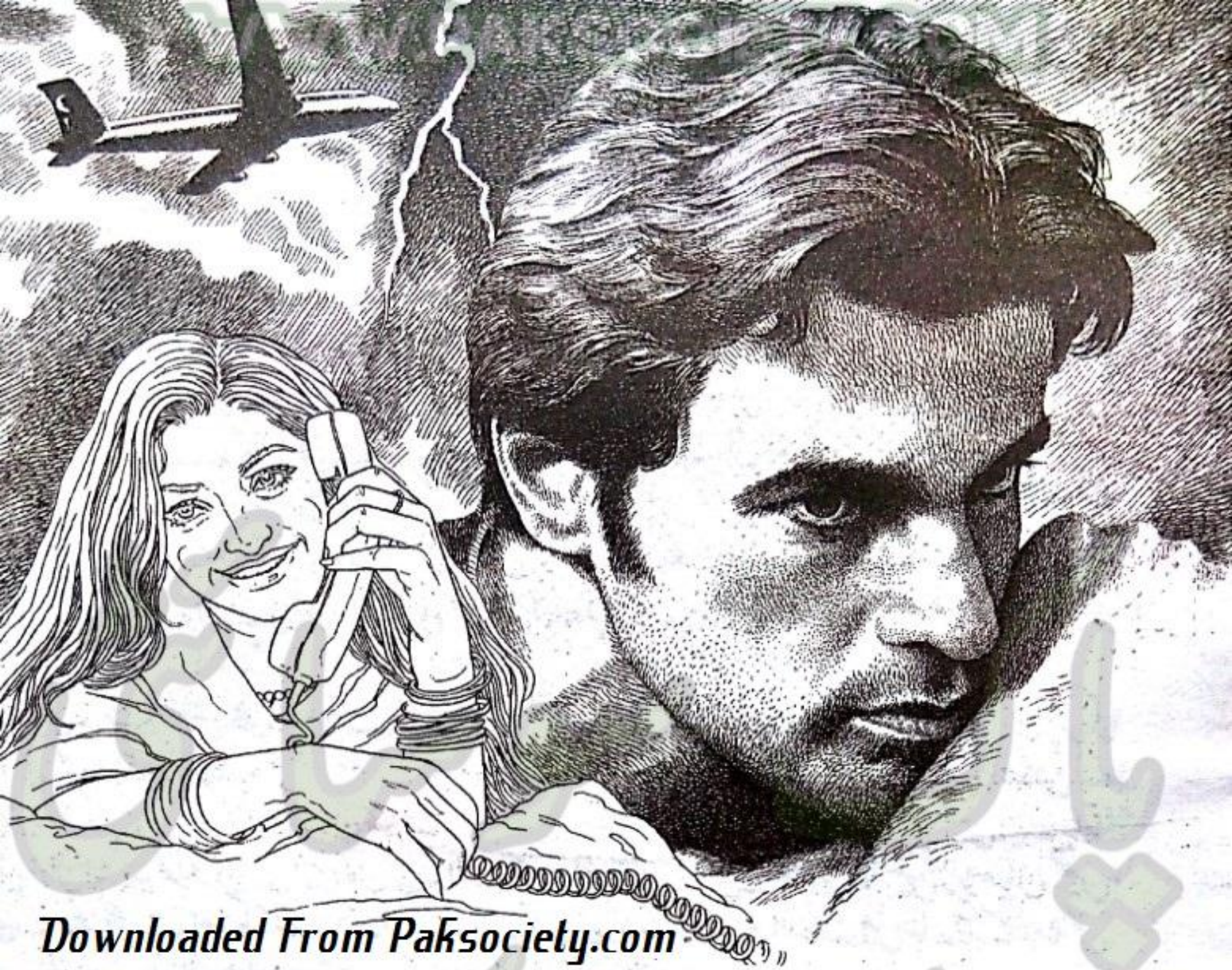
J۔ وہ کئی راتوں سے تکلیف میں تھی۔ سکون آور ادویات کے بغیر سو نہیں پا رہی تھی۔ وہ اپنے باپ سے بس ایک سوال کرنے آئی تھی کہ اس نے اس کی فیملی کو کیوں مار ڈالا۔

6۔ اسپیلنگ بی کے بانوے مقابلے کے فائنل میں تیرہ سالہ اور نو سالہ دو بچے چودھویں راؤنڈ میں ہیں۔ تیرہ سالہ نینسی نے نو حرفوں کے لفظ کا ایک حرف غلط بتایا۔ اس کے بعد نو سالہ ایک خود اعتماد بچے نے گیارہ حرفوں کے لفظ کی درست اسپیلنگ بتا دیں۔ ایک اضافی لفظ کے درست ہجے بتانے پر وہ مقابلہ جیت سکتا تھا۔ جسے غلط بتانے کی صورت میں تیرہ سالہ بچی دوبارہ فائنل میں آجاتی۔ وہ اضافی لفظ سن کر اس خود اعتماد، مطمئن اور ذہین بچے کے چہرے پر پریشانی پھیلی، جسے دیکھ کر اس کے والدین اور ہال کے دیگر مہمان بے چین ہوئے، مگر اس کی یہ کیفیت دیکھ کر اس کی سات سالہ بہن مسکرا دی۔

A۔ وہ جانتی تھی کہ وہ بددیانتی کر رہی ہے مگر پھر بھی اس نے اس کتاب کے پہلے باب میں تبدیلی کر دی اور ترمیم شدہ باب کا پرنٹ نکال کر دیگر ابواب کے ساتھ فائل میں رکھ دیا۔

7۔ وہ دونوں ایک ہوٹل کے بار میں تھے۔ لڑکی نے اسے ڈرنک کی آفر کی مگر مرد نے انکار کر دیا اور سگریٹ پینے لگا۔ لڑکی نے پھر ڈانس کی آفر کی، اس نے اس بار بھی انکار کر دیا۔ وہ لڑکی اس مرد سے متاثر ہو رہی تھی۔ وہ اسے رات ساتھ گزارنے کے بارے میں کہتی ہے۔ اب کے وہ انکار نہیں کرتا۔

4۔ وہ اپنے شوہر سے ناراض ہو کر اسے چھوڑ آئی ہے۔ ایک بوڑھی عورت کے سوال و جواب نے اسے سوچنے پر مجبور کر دیا ہے۔ اب وہ خود اپنے اس اقدام سے غیر مطمئن اور ملول نظر آتی ہے۔

دسویں قسط

حاصل و محصول

واشنگٹن میں ورلڈ بینک کے ہیڈ کوارٹرز میں وہ سالار سکندر کی پہلی میٹنگ اور پریزنٹیشن نہیں تھی۔ وہ سینکڑوں بار نہیں تو درجنوں بار وہاں آچکا تھا مگر اپنی زندگی میں وہ کبھی کسی بورڈ روم میں دماغ پر اتنا بوجھ لے کر نہیں بیٹھا تھا جتنا اس دن بیٹھا تھا۔

وہ جہاز میں اپنی فلائٹ کے دوران دو گھنٹے سویا تھا اور باقی کا وقت اس نے لیپ ٹاپ پر اس پریزنٹیشن کو بار بار دیکھتے اور اس میں تبدیلیاں اور اضافے کرتے گزارا تھا' جو وہ اس میٹنگ میں پیش کرنے آیا تھا۔ وہ اس پریزنٹیشن کے شان دار ہونے کے باوجود یہ جانتا تھا وہ ایک ہارا ہوا کیس ایک ایسی جیوری کے سامنے پیش کرنے جا رہا تھا جو اس کیس کے حوالے سے تصویر کا کوئی دوسرا رخ دیکھنے پر تیار نہیں ہونے والی تھی' کیوں کہ تصویر کا وہ دوسرا رخ بے حد بھیانک تھا لیکن بھیانک ہونا اس سے نظریں چرانے کی وجہ نہیں تھی' بلکہ اس بھیانک رخ میں نظر آنے والا اپنا عکس تھا جو ان عالمی طاقتوں کے نمائندوں کے ضمیر کو سلانے کا باعث بن رہا تھا۔ سالار سکندر کو سانپوں کے بل میں بیٹھ کر ان کا زہر نکالنے کی تجویز پیش کرنی تھی' اور اسے اپنی کامیابی کے بارے میں کوئی خوش فہمی یا غلط فہمی نہیں تھی۔

اس کی فلائٹ واشنگٹن میں جس وقت پہنچی' اس کے ٹھیک چار گھنٹے کے بعد ورلڈ بینک کے "دربار" میں اس کی حاضری تھی۔ وہ ایک بار پھر ہوٹل کے کمرے میں سوئے بغیر کاغذات کا وہ پلندہ دیکھتا رہا جو اسے اس پریزنٹیشن کے ساتھ بورڈ روم میں تقسیم کرنا تھے۔ ان کاغذات کے ڈھیر کو وہ اگر کسی کورٹ میں پیش کر دیتا تو وہ کیس جیت جاتا' لیکن سوال وہاں یہ تھا کہ دنیا میں ایسی کون سی عدالت تھی جو اس کیس کو سنتی۔۔۔ کانگو کی عدالتیں ریڑھیاں تھیں' جن سے کچھ بھی خریدا جا سکتا تھا۔۔۔ انصاف کے سوائے۔۔۔ ایبا کا عالمی عدالت انصاف میں جانے کے وسائل نہیں رکھتا تھا۔۔۔ انصاف ملنا نہ ملنا تو خیر دور کی بات تھی۔۔۔ اور سالار سکندر ورلڈ بینک میں کام کرتا تھا' وہ اپنے پروفیشنل معاملات کو خفیہ رکھنے کا پابند تھا۔۔۔ اور ان سب حالات میں صرف ایک میڈیا تھا جس کا گلا گھونٹنے کی ورلڈ بینک کوشش میں تھا' کیوں کہ وہ پیٹرس ایباکا کی آخری امید تھا اور سالار کو پتا تھا ایباکا کسی بھی حد تک جا سکتا تھا' ان جنگلات کی تباہی کو روکنے کے لیے' جو اس کے قبیلے کی بقا کے ضامن تھے' لیکن وہ یہ نہیں جانتا تھا کہ پیٹرس ایباکا کو اس کام سے روکنے کے لیے "مہذب دنیا" بھی کسی حد بھی تک جا سکتی تھی۔ اسے یہ معلوم بھی نہیں تھا کہ پیٹرس ایباکا اس وقت نیویارک کے ایک اسپتال میں زندگی اور موت کی جنگ لڑ رہا تھا۔

٭ ٭ ٭

اس بورڈ روم کا ماحول ویسا نہیں تھا جیسا اس نے ہمیشہ دیکھا تھا۔ سنجیدگی ہر بورڈ کا حصہ ہوتی تھی' لیکن جو اس نے اس دن وہاں دیکھی تھی' وہ سنجیدگی نہیں تھی وہ سرد مہری تھی اور وہ سرد مہری بورڈ روم میں بیٹھے صرف کسی ایک یا دو لوگوں کے انداز اور حرکات و سکنات سے نہیں جھلک رہی تھی۔۔۔ وہاں اس بورڈ روم میں بیٹھے سات کے سات لوگوں کے چہروں اور آنکھوں میں ایک جیسی ٹھنڈک اور سرد مہری تھی۔ ایسی سرد مہری جو کسی کمزور اعصاب کے انسان کو حواس باختہ کرنے کے لیے کافی تھی۔۔۔ بے تاثر چہرے' دوسرے کے اوسان خطا کر دینے والی نظریں۔۔۔ کسی دوستانہ مسکراہٹ سے عاری بھنچے ہوئے لب۔۔۔ جن پر اگر کبھی کوئی مسکراہٹ آتی بھی تو وہ ایک تضحیک آمیز اور توہین آمیز خم سے زیادہ کچھ نہیں ہوتا تھا جو پل بھر رہ کر غائب ہو جاتا تھا۔

ایک بیضوی شکل کی میز کے گرد ٹانگوں پر ٹانگیں رکھے وہ پانچ مرد اور دو عورتیں اس کام کے ماہر تھے جو اس وقت کر رہے تھے۔۔۔ وہ ورلڈ بینک کے سالار سکندر جیسے کئی "باضمیر" ایمپلائز کا دھڑن تختہ کر چکے تھے جنہیں زندگی میں

تحفظ فراہم کبھی بیٹھے بٹھائے ورلڈ بینک میں کام کرتے کرتے پروفیشنل ethics (اخلاقیات) کا دورہ پڑتا، انسانیت یاد آنا شروع ہو جاتی۔۔۔ سالار سکندر ان کے سامنے کیا شے تھا۔ کم از کم اس میٹنگ کے آغاز سے پہلے وہ یہی سوچ کر آئے تھے۔ اجتماعی طور پر ان کی حکمت یہ نہیں بھی تھی تو بھی انفرادی طور پر ان کا طریقہ کار یہی تھا۔

وہ واشنگٹن ڈی سی میں ورلڈ بینک کے ہیڈ کوارٹرز میں بیٹھے وہ لوگ تھے جو سمجھتے تھے وہ سرخاب کے پروں کے ساتھ پیدا ہوئے تھے اور ورلڈ بینک کے ساتھ ان کی کئی سالوں پر مشتمل ایسوسی ایشن اور ان کا کام ان کے اس ذہنی خلل کو اگر بڑھاتا جاتا تھا تو غلط بھی نہیں تھا۔۔۔ سالار سکندر اس آرگنائزیشن میں واحد ذہین اور قابل شخص نہیں تھا وہاں بڑے بڑے طرم خان بیٹھے تھے جو اپنے کئی دہائیوں کے تجربے اور قابلیت سے کسی کے بھی پرخچے اڑا سکتے تھے۔۔۔ واشنگٹن آنے سے پہلے سالار سکندر کو اندازہ تھا وہ کیا بھگتنے جا رہا تھا۔ اس بورڈ روم کے اندر، لیکن جس کے بارے میں اسے اندازہ نہیں تھا وہ بورڈ روم سے باہر پیش آنے والے حالات اور واقعات تھے۔

وہ سات لوگ سالار سکندر کے کیریئر کے حوالے سے ایک ایک چیز جانتے تھے اور اتنی ہی معلومات وہ ان کے بارے میں رکھتا تھا۔ ان میں سے کسی کو کسی کے تعارف کی ضرورت نہیں تھی۔ سالار سکندر نے میٹنگ کے آغاز میں اس میٹنگ کی سربراہی کرنے والے ہیڈ کے ابتدائی کلمات بڑے تحمل سے سنے تھے۔ وہ سالار سکندر کی نااہلی، کوتاہیوں اور ناکامیوں کو ڈسکس کر رہا تھا۔ سالار نے باقی چھ لوگوں کی نظریں خود پر جمی محسوس کیں۔ وہ ایک چارج شیٹ تھی جو اس پروجیکٹ کا ذکر کرتے ہوئے وہ مائیکل فرینک اس پر لگا رہا تھا۔ سالار بھی اتنے ہی بے تاثر چہرے کے ساتھ ان الزامات کو سنتا رہا۔۔۔ اس میٹنگ کا ایجنڈا یہ نہیں تھا، لیکن اس کے باوجود سالار کے لیے وہ سب الزامات غیر متوقع نہیں تھے۔

"میں ان میں سے کسی بھی بات کا جواب دینے سے پہلے اس پروجیکٹ کے حوالے سے ایک پریزنٹیشن دینا چاہتا ہوں کیوں کہ میرا خیال ہے یہ پریزنٹیشن ان میں سے بہت سارے سوالات اور اعتراضات کا جواب دے دے گی، جو آپ لوگ مجھ پر کر رہے ہیں۔"

سالار نے مائیکل کے ابتدائی کلمات کے بعد اس کے کسی الزام کا جواب دینے کے بجائے کہا تھا۔ ان سات افراد میں سے کسی نے اسے اس پریزنٹیشن کو پیش کرنے سے روکا نہیں تھا لیکن ان میں سے کسی نے اس پریزنٹیشن کی نوعیت اور مقصد جاننے میں دلچسپی بھی نہیں لی تھی۔

سالار ایک کے بعد ایک سلائیڈ پروجیکٹر پر دکھاتا گیا۔ اس میں بہت سارے حقائق اور اعداد و شمار تھے اور اس کی اپنی ذاتی تحقیق بھی۔۔۔ وہ ان تمام چیزوں کو ان سلائیڈز کے ذریعے دکھا رہا تھا۔ ورلڈ بینک کے تعاون سے اگر وہ منصوبہ تو چڑھ جاتا تو افریقہ کی جنگلی حیاتیات کے ساتھ ساتھ پگمیز کی ممکنہ تباہی کے حوالے سے ہولناک اعداد و شمار۔۔۔ ورلڈ بینک کے چارٹر کی کون کون سی شقوں کی خلاف ورزی اس پروجیکٹ کے ذریعے ہو رہی تھی۔ ان جنگلات میں کام کرنے والے کمپنیز کی طرف سے کانگو کی مقامی آبادی کے استحصال کے ڈاکومنٹری ثبوت۔۔۔ اور انٹرنیشنل ڈونر کمپنیز اور این جی اوز کے خدشات پر مشتمل رپورٹس کے حوالے۔۔۔ اس کی پریزنٹیشن مکمل تھی، اور وہ اگر کسی اخبار یا نیوز نیٹ ورک کے ہاتھ لگ جاتی تو افریقہ میں وہ ورلڈ بینک کا سب سے بڑا اسکینڈل ہوتا۔ ان سات لوگوں نے وہ پریزنٹیشن بے تاثر چہروں کے ساتھ اپنی اپنی کرسیوں پر ساکت بیٹھے دم سادھے دیکھی تھی۔ لیکن آدھ گھنٹہ کی اس پریزنٹیشن کے ختم ہونے کے بعد ان ساتوں کے ذہن میں جو خدشہ ابھرا تھا وہ ایک ہی تھا۔۔۔ سالار سکندر کے ہاتھ میں وہ گرینیڈ تھا جس کی پن وہ نکال کر اسے ہاتھ میں لیے بیٹھا تھا۔۔۔ مسئلہ یہ نہیں تھا کہ وہ گرینیڈ دوسرے کی طرف پھینک دینے سے ان کی جان چھوٹ جاتی۔۔۔ وہ جہاں بھی پھٹتا وہیں تباہی پھیلاتا۔

پروجیکٹر کی اسکرین تاریک ہوئی۔ سالار نے اپنے لیپ ٹاپ کو بند کرتے ہوئے ان ساتوں لوگوں کے چہروں

پر نظر ڈالی مائیکل کے چہرے کو دیکھا جو اس کی صدارت کر رہا تھا۔ اتنے سالوں کی پبلک ڈیلنگ کے بعد وہ اتنا اندازہ تو لگا ہی پایا تھا کہ اس نے پریزنٹیشن تیار کرنے اور اسے یہاں پیش کرنے میں اپنا وقت "ضائع" کیا تھا۔

"تو تم اس پروجیکٹ پر کام نہیں کرنا چاہتے؟"

مائیکل نے اپنی خاموشی توڑتے ہوئے اس سے جو سوال کیا تھا' اس نے بورڈ روم میں موجود لوگوں کے حوالے سے سالار کے خدشات کی جیسے تصدیق کی تھی۔

"میں یہ چاہتا ہوں کہ ورلڈ بینک کانگو میں اس پروجیکٹ کو ختم کردے۔" تمہید اگر مائیکل نے نہیں باندھی تھی تو سالار نے بھی اس پر اپنا وقت ضائع نہیں کیا تھا۔

"تم مضحکہ خیز باتیں کر رہے ہو۔ اتنے سالوں سے شروع کیے جانے والے ایک پروجیکٹ کو ورلڈ بینک' ایک چھوٹے سے عہدے دار کے کہنے پر ختم کردے کیوں کہ اسے بیٹھے بٹھائے یہ فوبیا ہو گیا ہے کہ بینک کانگو میں بنیادی انسانی حقوق کی خلاف ورزی کرنے والے پروجیکٹس کو سپورٹ کر رہا ہے۔"

وہ جولیا پٹرورڈ تھی جس نے بے حد تضحیک آمیز انداز میں' سلگا دینے والی مسکراہٹ کے ساتھ سالار سے کہا تھا۔ وہ اس کمرے میں مائیکل کے بعد سب سے سینیر تھی۔

"اگر میں فوبیا کا شکار یا یہ میرا دماغی خلل ہے اس حوالے سے تو یہ بیماری اس وقت ان جنگلات میں بسنے والے لاکھوں لوگوں کو لاحق ہو چکی ہے۔" سالار سکندر نے ترکی بہ ترکی جواب دیا تھا۔

"تم کیا ہو... ؟ کس حیثیت میں کانگو میں بیٹھے ہو؟ ورلڈ بینک کے ایک ایمپلائی کے طور پر یا ایک ہیومن رائٹس ایکٹوسٹ کے طور پر؟ کانگو کے لوگ یا پگمیز تمہارا سر درد نہیں ہیں۔ تمہاری ترجیح صرف ایک ہونی چاہیے کہ تم مقررہ وقت پر اس پروجیکٹ کو مکمل کرو اور تمام اہداف کے حصول کے ساتھ۔"

اس بار بات کو ترشی سے کاٹنے والا الیگزینڈر رافیل تھا جو ورلڈ بینک کے صدر کے قریب ترین معاونین میں سے ایک تھا۔

"تم نے اپنا کانٹریکٹ پڑھا ہے وہ شرائط و ضوابط پڑھی ہیں جو اس کانٹریکٹ میں ہیں اور جن سے تم نے اتفاق کرتے ہوئے سائن کیے ہیں؟ تم اپنے کانٹریکٹ کی خلاف ورزی کر رہے ہو... اور بینک تمہیں جاب سے نکالنے کا پورا اختیار رکھتا ہے اس کے بدلے میں۔"

اس کے لہجے کی رکھائی اس کا شناختی نشان تھی وہ اسی رکھائی اور بے مہری کے لیے جانا جاتا تھا... سالار وہاں موجود تمام لوگوں کو ان کی قابلیت کے علاوہ ان کی خصوصیات کے حوالے سے بھی جانتا تھا۔

"میں نے اپنا کانٹریکٹ پڑھا ہے اور صرف ایک بار نہیں کئی بار پڑھا ہے۔ میں نے ورلڈ بینک کا چارٹر بھی پڑھا ہے اور نہ میرے کانٹریکٹ میں نہ ورلڈ بینک کے چارٹر میں کہیں یہ تحریر ہے کہ مجھے کوئی ایسا کام کرنا پڑے گا جو بنیادی انسانی حقوق اور کسی ملک کے قوانین و ضابطوں کی دھجیاں اڑا کر ہو سکے... اگر ایسی کوئی شق میرے کانٹریکٹ میں شامل تھی اور میں اسے نظر انداز کر بیٹھا ہوں تو آپ مجھے ریفرنس دیں... میں ابھی اپنے کانٹریکٹ میں اسے پڑھ لیتا ہوں۔ ای میل کی صورت میں میرا کانٹریکٹ میرے پاس موجود ہے۔" اس نے لیپ ٹاپ ایک بار پھر آن کیا تھا۔

الیگزینڈر رافیل چند لمحوں کے لیے بول نہیں سکا۔ اس کے ماتھے پر بل تھے اور مسلسل تناؤ میں رہنے کی وجہ سے وہ مستقل جھریوں میں تبدیل ہو چکے تھے۔ وہ صرف اس وقت چہرے سے خوش گوار لگتا جب اس کے چہرے پر بھولے بھٹکے ہوئے مسکراہٹ آتی ورنہ کرختگی اس کے مزاج کے ساتھ ساتھ اس کے چہرے کا بھی ایک نمایاں حصہ تھی۔ اپنی کرنجی آنکھوں کو موڑتے ہوئے اس نے سالار سے کہا۔

"تم اپنے آپ کو ان لوگوں سے زیادہ قابل سمجھتے ہو جنہوں نے یہ پروجیکٹ کئی سال کی تحقیق کے بعد شروع کیا تھا۔ تم سمجھتے ہو جنہوں نے فزی بلٹی بنائی تھی۔ وہ ایڈیٹس تھے؟" وہ اب تضحیک آمیز انداز میں اس سے پوچھ رہا تھا۔

"نہیں.... وہ ایڈیٹس نہیں تھے اور نہ ہی میں ایڈیٹ ہوں.... وہ فیئر نہیں تھے اور میں ہوں' بات صرف اس دیانت کی ہے جو اس پروجیکٹ کی فزی بلٹی رپورٹ تیار کرتے ہوئے نظر انداز کی گئی ہے' ورنہ یہ ممکن ہی نہیں کہ اس پروجیکٹ کی فزیبلٹی رپورٹ تیار کرنے والے اتنے عقل کے اندھے اور نااہل ہوں کہ انہیں وہ سب نظر نہ آیا ہو جو مجھے نظر آرہا ہے اور میرے علاوہ اور لاکھوں مقامی لوگوں کو نظر آرہا ہے۔ ورلڈ بینک کو اس پروجیکٹ کے حوالے سے دوبارہ انویسٹی گیشن کرنی چاہیے ایک انکوائری کمیٹی بنا کر.... مجھے یقین ہے کہ اس کمیٹی نے دیانت داری سے کام کیا تو انہیں بھی یہ سب نظر آجائے گا جو مجھے نظر آرہا ہے۔" سالار سکندر نے رافیل کے ہتک آمیز جملوں کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا تھا۔

"میرے خیال میں بہتر ہے کہ اس ڈیڈ لاک کو ختم کرنے کے لیے ایک کام کیا جائے جو واشنگٹن اور گومبے میں تمہارے آفس میں اس پروجیکٹ کے حوالے سے پیدا ہو گیا ہے۔"

اس بار بولنے والا ابل جاولز تھا۔ وہ واشنگٹن میں ورلڈ بینک کی میڈیا کو آرڈی نیشن کو مانیٹر کرتا تھا اور اس پروجیکٹ کے حوالے سے انٹرنیشنل میڈیا میں آنے والی خبروں کو دبانے میں اس کی قابلیت اور اثر و رسوخ کا بڑا عمل دخل تھا۔ "تم ریزائن کردو جیسے تم نے پریزنٹیشن اور بینک کے ساتھ ہونے والی آفیشل خط و کتابت میں بھی آفر کیا تھا کہ اس پروجیکٹ کو تم اس طرح نہیں چلا سکتے۔"

وہ بڑے تحمل اور رسانیت سے سالار سکندر کو جیسے صلاح دے رہا تھا۔

"اگر یہ آپشن ورلڈ بینک کو زیادہ مناسب لگتا ہے تو مجھے بھی اس پر کوئی اعتراض نہیں ہے۔ مجھے بھی اس مسئلے کا حل صرف میرا استعفیٰ نظر آرہا ہے' لیکن میں اپنے استعفے کی وجوہات میں اس پریزنٹیشن میں دیے جانے والے سارے اعداد و شمار شامل کروں گا اور اپنے تحفظات بھی لکھوں گا اور میں اس استعفے کو پبلک کروں گا۔"

بورڈ روم میں چند لمحوں کے لیے خاموشی چھائی تھی۔ وہ بالآخر اس ایک نکتے پر آگئے تھے جس کے لیے سالار سکندر کو کانگو سے واشنگٹن طلب کیا گیا تھا اور جو ورلڈ بینک کے گلے میں ہڈی بن کر پھنسا ہوا تھا۔ بورڈ روم میں بیٹھے ان سات لوگوں کے پاس صرف دو ٹاسک تھے یا سالار سکندر کو اس پروجیکٹ کو جاری رکھنے کے لیے تیار کیا جائے اور اس سے کہا جائے کہ وہ.... وہ رپورٹ واپس لے لے جو اس نے ورلڈ بینک کو اس حوالے سے ارسال کی تھی یا پھر اس سے خاموشی سے استعفیٰ لیا جائے اور وہ استعفیٰ ذاتی وجوہات کی بنا پر ہونا چاہیے۔ اس کے علاوہ اور کوئی وجہ اس کے تحریری استعفے میں بیان نہیں ہونی چاہیے اور اب مسئلہ اس سے بڑھ گیا تھا۔ وہ نہ صرف استعفے میں یہ سب کچھ لکھنا چاہتا تھا بلکہ اس استعفے اور اس رپورٹ کو پبلک بھی کرنا چاہتا تھا۔

اگلے تین گھنٹے تک وہ بورڈ روم میں بیٹھے ہوئے سات افراد اس کے ساتھ بحث کر کے اسے قائل کرنے کی کوشش کرتے رہے تھے۔ انہوں نے اس پر ہر حربہ استعمال کر لیا تھا۔ جب دلیلوں سے کام نہیں بنا تھا تو انہوں نے بینک کے کانٹریکٹ میں استعفے کے حوالے سے کچھ شقوں کو اٹھا کر اسے دھمکی دی تھی کہ وہ جاب کے دوران اپنے علم میں لائے گئے تمام پروفیشنل معاملات کو صیغہ راز میں رکھنے کا پابند ہے اور اس استعفے کو پبلک کرنے اور اس رپورٹ کو میڈیا پر لانے پر اس کے خلاف قانونی کارروائی کی جا سکتی تھی اور اسے نہ صرف مالی طور پر لمبا چوڑا ہرجانہ بھرنا پڑتا' بلکہ وہ آئندہ بینک یا اس سے منسلک کسی بھی چھوٹے بڑے ادارے کی جاب کرنے کے لیے نااہل قرار دے دیا جاتا۔ سالار سکندر کو پتا تھا' یہ دھمکی نہیں تھی بہت بڑی دھمکی تھی۔ وہ بالواسطہ طور پر اسے بتا رہے

تھے کہ وہ اس کے پروفیشنل کیریئر کو کم از کم صرف ورلڈ بینک میں ہی نہیں بلکہ ان تمام انٹرنیشنل آرگنائزیشنز میں ختم کردیتے جو امریکا کی سرپرستی میں چلتی تھیں اور اسے پتا تھا وہ یہ کرسکتے تھے۔
وہ اب بین الاقوامی طور پر جس سطح پر کام کررہا تھا وہاں اس کے حوالے سے ایک چھوٹی سی قانونی چارہ جوئی بھی ایک اکنامسٹ فنانشل تجزیہ کار کے طور پر اس کی ساکھ تباہ کرکے رکھ دیتی۔ کوئی نامور ادارہ اس کے خلاف اس طرح کے الزامات پر ہونے والی قانونی چارہ جوئی کے بعد اسے کبھی نہ رکھتا کہ اس نے اپنے کانٹریکٹ میں موجود راز داری کی شق کی خلاف ورزی کی تھی۔ یہ اس کی ساکھ پر لگنے والا ایسا دھبا ہوتا جسے وہ کبھی بھی مٹا نہیں سکتا تھا۔ ان سات لوگوں نے اسے یہ دھمکی بھی دی تھی کہ ورلڈ بینک اس کے ماتحت کانگو میں چلنے والے پروجیکٹس کو نئے سرے سے آڈٹ کروائے گا اور مالی اور دوسری بے ضابطگیوں کے بہت سے ثبوت نکال کر اسے بہت بے عزت کرکے اس عہدے سے فارغ کیا جاسکتا تھا جس پر وہ کام کررہا تھا' پھر اگر وہ اس پروجیکٹ کے حوالے سے اپنی رپورٹ لے کر میڈیا کے پاس بھی جاتا تب بھی اس کے الزامات اور رپورٹ اپنی حیثیت کھودیتے' کیونکہ بینک کے پاس جوابی طور پر اس کے خلاف کہنے کے لیے بہت کچھ ہوتا اور میڈیا اس کی اس رپورٹ کو ذاتی عناد اور بغض کے علاوہ اور کچھ نہیں سمجھتا۔ وہ نچلے درجے کی بلیک میلنگ تھی جس پر وہ اتر آئے تھے۔ سالار جانتا تھا وہ یہ کربھی سکتے تھے۔ اس کی فنانشل اور پروفیشنل دیانت داری پر ورلڈ بینک میں کبھی انگلی نہیں اٹھائی گئی تھی اور اس کا پروفیشنل ریکارڈ اس حوالے سے قابل رشک تھا۔ لیکن وہ جانتا تھا اگر ورلڈ بینک کانگو میں اس کے آفس کے ذریعے چلنے والے پروجیکٹس میں کوئی سقم یا غبن تلاش کرنے پر مصر تھا تو وہ یہ ڈھونڈ ہی لیتے۔ وہ یا دنیا کا کوئی بندہ ورلڈ بینک کی آڈٹ ٹیم کی چھری سے نہیں بچ سکتا تھا اگر انہیں اس مقصد کے ساتھ بھیجا گیا ہو کہ انہیں کسی جگہ پر ہر صورت میں کوئی مالی بے ضابطگی تلاش کرنا ہی تھی۔
عام حالات میں سالار اس طرح کے کسی معاملے پر اپنے آپ کو اتنی مشکل صورت حال میں کبھی نہ ڈالتا' خاص طور پر اب جب اس کی ایک فیملی تھی۔ ایک بیوی تھی۔ کم سن بچے تھے۔ جو اس پر انحصار کرتے تھے لیکن یہ عام حالات نہیں تھے۔ پیٹرس ایباکا نے اسے ان سارے معاملات کے معاملے میں بے حس نہیں رہنے دیا تھا۔ یہ اس کی بدقسمتی تھی۔ وہ افریقہ اور پگمیز کے بارے میں جذباتی ہوکر سوچنے لگا تھا اور اس کی یہ ہی جذباتیت اس وقت اس کے آڑے آرہی تھی۔ خاموشی سے اس معاملے پر استعفیٰ دے کر اس سارے معاملے سے الگ ہوجانے کا مطلب صرف ایک تھا۔ وہ بھی اس جرم کا شریک کار ہوتا جو اکیسویں صدی کی اس دہائی میں کانگو میں پگمیز کے ساتھ کیا گیا ہوتا۔ وہ روکنے والوں اور احتجاج کرنے والوں میں شامل ہوکر تاریخ کا حصہ نہ بنتا مگر اس کا مسئلہ تاریخ کا حصہ بننے کی خواہش نہیں تھی' صرف ضمیر کی چبھن سے بچنے کی خواہش تھی جو زندگی کے کسی نہ کسی اسٹیج پر اسے احساس جرم کا شکار کرتی۔
دباؤ اور دھمکیاں جتنی بڑھتی گئی تھیں' سالار سکندر کی ضد بھی اتنی ہی بڑھتی گئی تھی۔ اگر سکندر عثمان اس کے بارے میں یہ کہتے تھے کہ ڈھٹائی میں اس کا کوئی مقابلہ نہیں تو وہ ٹھیک کہتے تھے۔ اس کا ایک عملی مظاہرہ اس نے واشنگٹن ڈی سی میں ورلڈ بینک کے ہیڈ کوارٹرز میں سات لوگوں کے اس گروپ کے سامنے بھی پیش کردیا تھا جو سالار سکندر جیسے عہدے داران کو چٹکی بجاتے میں موم کی ناک کی طرح موڑ لیتے تھے۔
"تم کیا چاہتے ہو؟" تین گھنٹے کے بعد بالآخر مائیکل نے اس کی ضد کے سامنے ہتھیار ڈالتے ہوئے جیسے اس سے پوچھا تھا۔
"ایک غیر جانب دارانہ انکوائری ٹیم جو اس پروجیکٹ کا نئے سرے سے جائزہ لے اور اس کے بعد پگمیز اور ان بارانی جنگلات کے بہترین مفاد میں اس پروجیکٹ کو ختم کردے یا کوئی ایسا حل نکالا جائے جو ان جنگلات میں

رہنے والے لوگوں کے لیے قابل قبول ہو اور میں مقامی لوگوں کی بات کر رہا ہوں۔ وہاں کی مقامی حکومت اور اس کے عہدے داران کی بات نہیں کر رہا۔"

سالار سکندر نے جواباً "وہی مطالبہ دہرایا تھا جو اس کی پریزنٹیشن کی بنیاد تھا۔

"تمہاری قیمت کیا ہے؟" الیگزنڈر نے جواباً" جو سوال اس سے کیا تھا اس نے سالار سکندر کو جیسے بات کرنے کے قابل نہیں چھوڑا تھا۔ وہ اس ہیڈ کوارٹرز میں ہر نرم گرم گفتگو کی توقع کر سکتا تھا لیکن معاملات کو نمٹانے کے لیے اس جملے کی نہیں۔ "کوئی تو ایسی چیز ہوگی جس کے لیے تم اپنے اس مطالبے سے ہٹ جاؤ۔ ہمیں بتاؤ وہ کون سی ایسی چیز ہے جس پر تم ہم سے سودا کرلو۔" رافیل نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ سالار نے ٹیبل پر رکھی اپنی چیزیں سمیٹنا شروع کردیں۔

"میری کوئی قیمت نہیں ہے اور میں نے ورلڈ بینک کو اسی غلط فہمی میں جوائن کیا تھا کہ میں ایسے لوگوں کے ساتھ کام کروں گا جو دنیا میں اپنی پروفیشنل مہارت اور قابلیت سے جانے جاتے ہیں۔ اگر بروکرز کے ساتھ کام کرنا ہوتا' بیچنے' خریدنے اور قیمت لگانے والا تو اسٹاک ایکسچینج میں کرتا یا کسی بینک میں انوسٹمنٹ بینکنگ۔"

وہ نرم لہجے میں ان کے منہ پر جوتا مار گیا تھا اور اس جوتے کی چوٹ ان ساتوں لوگوں نے ایک ہی شدت کے ساتھ محسوس کی تھی۔ وہ سادہ زبان میں انہیں دلال کہہ رہا تھا اور وہ ٹھیک کہہ رہا تھا۔ سالار سکندر کے ساتھ تو معاملات طے کرنے کے لیے انہیں جن لوگوں نے بھیجا تھا' وہ سالار سکندر کے ساتھ معاملات طے ہونے کے بعد انہیں ان کا کمیشن مختلف شکلوں میں ادا کرتے۔ وہ ورلڈ بینک کے اندر بنی ہوئی لابیز کے نمائندے تھے' جو بظاہر مختلف ملکوں اور قوموں کی نمائندگی کرتے تھے' لیکن درحقیقت وہ ان بڑے کارپوریٹ سیکٹرز کے مفادات کا تحفظ کرتے تھے جو اپنی اپنی حکومتوں کے عقب میں کارفرما ہوتے تھے۔

ان ساتوں لوگوں میں سے کسی نے مزید کچھ نہیں کہا تھا۔ تُتے ہوئے اور تنے ہوئے چہروں کے ساتھ وہ سب بھی اپنے کاغذات اور لیپ ٹاپ سنبھالنے لگے تھے۔ میٹنگ کسی نتیجے کے بغیر ختم ہوگئی تھی اور سالار کو اندازہ تھا کہ اس میٹنگ میں کی جانے والی باتوں کے بعد ورلڈ بینک میں اس کا کیریئر بھی ختم ہو گیا تھا۔

وہ میٹنگ ہیڈ کوارٹرز میں ہونے والی ہر میٹنگ کی طرح ریکارڈ ہوئی ہوگی۔ سالار کو اس کا اندازہ تھا لیکن اسے یہ توقع نہیں تھی کہ وہ میٹنگ براہ راست کسی دوسری جگہ پر پیش بھی کی جارہی تھی۔ سالار سکندر کے اس بورڈ روم سے باہر آنے سے پہلے اس سے نمٹنے کے لیے دوسری حکمت عملی طے ہوگئی تھی۔

الیگزنڈر رافیل بورڈ روم سے سالار کے پیچھے آیا تھا اور اس نے چند منٹوں کے لیے اس سے علیحدگی میں بات کرنے کی خواہش کا اظہار کیا تھا۔ سالار کچھ الجھا لیکن پھر آمادہ ہو گیا تھا۔ وہ کون سی بات تھی جو بورڈ روم میں نہیں کہی جاسکتی تھی اور اب اس ون ٹو ون میٹنگ میں کہی جاتی۔ وہاں وہ باتیں بھی کہہ دی گئی تھیں جو ورلڈ بینک جیسی معتبر آرگنائزیشن کے کسی فرد سے سالار انفرادی طور پر بھی سننے کی توقع نہیں رکھتا تھا چہ جائیکہ یہ کہ وہ اجتماعی طور پر اس سے کہی جائیں۔ وہ صرف مایوس نہیں ہوا تھا اس کی ہمت ٹوٹ گئی تھی۔ اس نے ورلڈ بینک کو اس لیے اور ان مقاصد کو پورا کرنے کے لیے جوائن نہیں کیا تھا۔

الیگزنڈر رافیل کے آفس میں وہ اسی پیرائے کی کوئی مزید گفتگو سننے کی توقع کے ساتھ گیا تھا' مگر اپنے آفس میں الیگزنڈر رافیل کا رویہ اس کے ساتھ حیران کن طور پر مختلف تھا۔

"مجھے یہ ماننے میں کوئی شبہ نہیں کہ میں تمہاری رپورٹ سے بہت متاثر ہوا ہوں اور صرف میں نہیں پریذیڈنٹ بھی۔" وہ کافی کا کپ اس کے سامنے رکھتے ہوئے اپنا کپ لیے اپنی اس کے پہلے ہی جملے نے اس کو حیران کر دیا تھا۔

سیٹ کی طرف چلا گیا تھا۔ پریذیڈنٹ سے مراد رالف ایڈگر تھا جو اس وقت ورلڈ بینک کا پریذیڈنٹ تھا اور رافیل اس کے قریب ترین معاونین میں سے تھا بلکہ کئی اعتبار سے اس کو پریذیڈنٹ کا دست راست سمجھا جاتا تھا۔ اپنی کرسی پر بیٹھتے ہوئے رافیل کا انداز بدل چکا تھا۔ اس کے چہرے کی کرختی ہونٹوں کے اس خم کی وجہ سے کچھ کم ہو چکی تھی جسے صرف ڈکشنری میں مسکراہٹ کہا جاتا تھا لیکن اس کا مقصد وہ نہیں تھا جو مسکراہٹ کا مطلب ہوتا تھا۔ الیگزنڈر رافیل اگر دنیا میں کسی کے ساتھ وفادار اور دوست تھا تو وہ اس کا کتا تھا اور صرف اس کتے کو دیکھ کر اس کے چہرے پر کبھی سچی مسکراہٹ آئی ہوگی' ورنہ دوست نظر آنے کی کوشش ہر اس بندے پر ناکام رہتی جو الیگزنڈر کو جانتا تھا اور سالار الیگزنڈر رافیل کو نہ صرف جانتا تھا بلکہ اس وقت اس کے اور اس کے کتے کے بارے میں کچھ اس طرح کی باتیں سوچ رہا تھا جنہیں وہ رافیل کے سامنے دہرا نہیں سکتا تھا' لیکن اس کے اس بدلے ہوئے رویے اور انداز نے اسے چوکنا کر دیا تھا۔ کافی کا گھونٹ لیے بغیر اور پلکیں جھپکائے بغیر وہ رافیل کی گفتگو سنتا رہا جو کافی کے گھونٹ لیتے ہوئے بڑے نرم دوستانہ انداز میں اس سے بات کر رہا تھا۔

"پریذیڈنٹ ہمیشہ سے تم سے بہت زیادہ توقعات رکھتے تھے۔ افریقہ کے لیے جو وژن ان کا ہے' اسے جو عملی جامہ پہنا سکتا ہے' وہ صرف تم ہو اور یہ پروجیکٹ تو ان سینکڑوں پروجیکٹس میں سے صرف ایک پروجیکٹ ہے' بہت چھوٹا پروجیکٹ۔۔۔ جو وہ تمہارے لیے سوچتے ہیں' وہ بہت بڑی شے ہے۔ تمہارے ذریعے افریقہ کی تقدیر بدلی جا سکتی ہے اور میں تمہیں یہ یقین دلانا چاہتا ہوں کہ پریذیڈنٹ افریقہ کے بارے میں بہت سنجیدہ ہیں۔ وہ مخلص ہیں اور وہاں سے بھوک' غربت اور بیماری کو واقعی مٹانا چاہتے ہیں۔ پیٹرس ایباکا ایک بے وقوف آدمی ہے' وہ کچھ ایسے لوگوں کے ہاتھوں میں کھیل رہا ہے' جو افریقہ کی ترقی کے راستے میں رکاوٹ ہیں۔"

سالار کو گفتگو میں پیٹرس ایباکا کا حوالہ سن کر حیرت نہیں ہوئی تھی۔ واشنگٹن میں بیٹھے لوگ مکمل طور پر اس بات سے باخبر تھے کہ اس کی ماہیت قلب کے پیچھے کون تھا۔

"تم نے کوئی سوال نہیں کیا؟" رافیل کو اچانک اس کی خاموشی چبھی۔ اگر وہ سالار کو "اس کے بارے میں' پریذیڈنٹ کے تعریفی کلمات پہنچا کر اسے جوش دلانا چاہتا تھا تو وہ ناکام ہو رہا تھا۔ سالار کے رویے میں کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی۔

"میرے پاس جو بھی سوال تھے وہ میں اپنی رپورٹ میں اٹھا چکا ہوں۔ مجھے خوشی ہے کہ پریذیڈنٹ "افریقہ میں میرے کام اور اس رپورٹ سے متاثر ہیں' لیکن میں زیادہ خوش تب ہوں گا جب اس رپورٹ پر مجھے ورلڈ بینک کا کوئی پازیٹو ریسپانس آئے۔"

"بینک تمہیں وائس پریذیڈنٹ کا عہدہ دینا چاہتا ہے اور یہ پریذیڈنٹ کی ذاتی دلچسپی کی وجہ سے ہو رہا ہے۔ اس مہینے کے آخر تک' دو وائس پریذیڈنٹس اپنی Tenure (مدت ملازمت) پوری کر کے اپنے عہدوں سے الگ ہو رہے ہیں اور ان میں سے ایک سیٹ پر تمہیں اپائنٹ کرنا چاہتے ہیں وہ۔۔۔ اور اس سلسلے میں امریکن گورنمنٹ سے بھی بات ہوئی ہے ان کی۔۔۔ وہاں سے بھی ریسپانس بہت پوزیٹو ہے۔۔۔ تم یقیناً "ڈیزرو کرتے ہو کہ تمہیں تمہاری صلاحیت اور قابلیت کے حساب سے عہدہ دیا جائے۔"

رافیل اس طرح بات کر رہا تھا جیسے بہت بڑا راز اس پر افشا کر رہا ہو۔ ایسا راز جس کو جاننے کے بعد سالار سکندر کی باچھیں کھل جاتیں۔۔۔ اس کی مایوسی کی انتہا نہیں رہی تھی جب اس نے میز کے دوسری طرف بیٹھے اپنے سے پندرہ سال چھوٹے اس سینتیس سالہ مرد کے چہرے کو اس خبر پر بھی بے تاثر پایا تھا۔

"اور وائس پریذیڈنٹ کے عہدے کے بدلے میں مجھے کیا کرنا ہے؟" رافیل کو اپنی اتنی لمبی تقریر کے جواب میں

اتنا ڈائریکٹ اور دو ٹوک سوال سننے کی توقع نہیں تھی۔

"پریذیڈنٹ کو اس پروجیکٹ پر تمہاری سپورٹ چاہیے۔ مطلق اور غیر مشروط سپورٹ۔"
رافیل نے اب لفاظی اور تمہیدوں میں وقت ضائع نہیں کیا تھا۔ اسے اندازہ ہو گیا تھا۔ سالار سکندر کے لیے یہ دونوں چیزیں بے کار اور بے اثر تھیں۔

"میرا خیال ہے میں وہ نہیں دے سکوں گا۔ اس پروجیکٹ کے حوالے سے میری جو رائے اور اسٹینڈ ہے' وہ میں بتا چکا ہوں۔ مراعات اور عہدے میرے اسٹینڈ کو بدل نہیں سکتے۔ میری خواہش ہے افریقہ کے لیے پریذیڈنٹ اگر اتنی ہمدردی اور اخلاص رکھتے ہیں تو وہ اس رپورٹ سے صرف متاثر نہ ہوں' وہ فوری طور پر اس پر کوئی ایکشن لیں۔ کیا کچھ اور ہے' جو آپ کو کہنا ہے؟"

سالار نے کافی کے اس کپ کو ہاتھ بھی نہیں لگایا تھا جو اس کے سامنے پڑا تھا۔ الیگزنڈر رافیل دنیا کی بہت بڑی بڑی آرگنائزیشنز میں ہر طرح کے لوگوں کے ساتھ کام کر چکا تھا۔ سالار سکندر کو وہ اس ملاقات سے پہلے کچھ بھی نہیں سمجھتا تھا۔ وہ اب اسے بے وقوف سمجھتا تھا۔ سینتس سال کی عمر میں ــ پلیٹ میں رکھ کر اسے اتنا بڑا عہدہ پیش کیا جا رہا تھا اور وہ اسے ٹھکرا رہا تھا۔۔۔ غرور تھا۔۔۔ تو بے جا تھا۔۔۔ بے وقوفی تھی تو انتہا کی اور تنک تھی تو بے مقصد۔۔۔ صدارت پیش کی اس نے اپنی پوری زندگی میں کسی "ذہین" آدمی کو اتنا "بے وقوف" اور "بے غرض" نہیں پایا تھا۔ وہ یہ اعتراف نہیں کرنا چاہتا تھا پر کر رہا تھا۔ وہ پہلی بار ذہانت کو بے لوث اور بے غرض دیکھ رہا تھا اور وہ جانتا تھا وہ جس دنیا میں کام کر رہا تھا' وہاں اس بے غرض اور بے لوث ذہانت کو عروج کبھی حاصل نہیں ہوتا۔ وہاں بیٹھے اس نے سالار سکندر سے کہا تھا۔

"تمہیں سب کچھ آتا ہے۔ ٹیکٹ نہیں آتے اس لیے تم کامیابی کے سب سے اوپر والے زینے پر کبھی کھڑے نہیں ہو سکو گے۔" وہ اس سے ایسی بات نہیں کہنا چاہتا تھا' پھر بھی کہہ بیٹھا تھا۔

"اگر ٹیکٹ فل ہونے کا مطلب بے ضمیر اور بددیانت ہونا ہے تو پھر یہ خصوصیت میں کبھی اپنے اندر پیدا نہیں کرنا چاہوں گا۔ میں اپنا استعفیٰ آج ہی میل کر دوں گا۔"

وہ اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ اس نے آخری مصافحے کے لیے الیگزنڈر رافیل کی طرف ٹیبل پر کچھ جھک کر ہاتھ بڑھایا تھا۔ رافیل اٹھنا نہیں چاہتا تھا لیکن اسے اٹھنا پڑا تھا۔ وہ مصافحہ کر کے دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے سالار سکندر کی پشت کو دیکھتا رہا اور کیوں دیکھتا رہا تھا۔ وہ یہ نہیں جان پایا تھا۔

☼ ☼ ☼

سالار سکندر جب ورلڈ بینک ہیڈ کوارٹرز سے نکلا اس وقت بوندا باندی ہو رہی تھی' وہ کیب پر وہاں آیا تھا اور واپسی پر بھی اس کو کیب میں ہی واپس جانا تھا مگر جو کچھ وہ پچھلے چند گھنٹوں میں اندر بھگت آیا تھا۔ اس کے بعد وہ بے مقصد ہیڈ کوارٹرز سے باہر آکر پیدل فٹ پاتھ پر چلتا رہا۔ اس کا ہوٹل وہاں سے قریب تھا۔ وہ پیدل چلتا رہتا تو آدھ پون گھنٹے میں وہاں پہنچ جاتا۔ وہاں آتے ہوئے اسے جلدی تھی۔ واپس جاتے ہوئے نہیں۔ بوندا باندی کی وجہ سے سردی بڑھ گئی تھی مگر وہ اپنے سوٹ کے اوپر لانگ کوٹ پہنے ہوئے تھا۔ وہ گو میسے سے چلتے ہوئے واشنگٹن کی اگلے تین دن کی موسم کی پیش گوئی پڑھ کر چلا تھا۔ اپنی زندگی کا ایک بڑا حصہ امریکا میں گزارنے کی وجہ سے' وہ جیسے عادی ہو گیا تھا۔ ایک لگی بندھی اور میکانکی انداز میں زندگی گزارنے کا' جہاں ہر چیز پہلے سے دیکھ کر کی جاتی ہے۔ موسم کا حال دیکھ کر سفر پلان کیا جاتا ہے۔ بکنگ کروا کر کسی ہوٹل کے لیے روانہ ہوا جاتا ہے۔ ہر چیز کے بارے میں

پہلے سے طے کر لیا جاتا ہے۔ اس نے ورلڈ بینک میں اس جاب کا بھی اسی میکانکی اور پروفیشنل انداز میں ادراک کیا تھا، لیکن جو کچھ وہ اب بھگت رہا تھا وہ کبھی اس کے فرشتوں نے بھی نہیں سوچا ہوگا۔

ڈاکٹریٹ کی ڈگری کے حصول کے بعد وہ اس کی پہلی جاب تھی اور وہ اس جاب سے بہت خوش تھا۔ وہ اب زندگی کو پانچ، دس، پندرہ، بیس سالوں کے تناظر میں دیکھتا تھا، کیونکہ اب اسے اپنے ساتھ ساتھ کچھ اور زندگیوں کی ذمہ داریوں کو بھی اٹھانا تھا اور اب یک دم وہ اپنی پیشہ ورانہ زندگی کے سب سے بڑے بحران میں پھنس گیا تھا۔ اس کے ساتھ بیوی اور بچوں کی ذمہ داریاں نہ ہوتیں، تب وہ اس طرح پریشان نہ ہوتا کیونکہ جو بھی نتائج ہوتے اس کے کسی بھی فیصلے کے، وہ صرف اسے بھگتنے پڑتے۔ کوئی اور اس کے کسی فیصلے سے پہنچنے والے کسی نقصان میں شریک نہ ہوتا.... لیکن اب....

فٹ پاتھ پر چلتے چلتے اس نے بے اختیار ایک گہرا سانس لیا۔ وہ چند دن پہلے تک اپنے آپ کو دنیا کا مصروف ترین انسان سمجھتا تھا اور اب ان چند گھنٹوں کے بعد دنیا کا بے کار ترین انسان....

کچھ عجیب سی ذہنی کیفیت تھی اس وقت اس کی.... فی الحال اس کے پاس کرنے کے لیے کچھ بھی نہیں تھا۔ کوئی میٹنگ.... کوئی وزٹ.... کوئی ایجنڈا نہیں.... کوئی فون کال کوئی ای میل کوئی پریزنٹیشن بھی نہیں.... لیکن سوچنے کے لیے بہت کچھ تھا۔ ایک لمحے کے لیے چلتے چلتے اسے خیال آیا.... کیا ہو اگر وہ سمجھوتا کر لے.... وہیں سے واپس ہیڈ کوارٹرز چلا جائے.... وہ پیش کش قبول کر لے جو ابھی اسے کی گئی تھی۔ کوئی مشکل اور ناممکن تو نہیں تھا یہ.... ابھی سب کچھ اس کے ہاتھ میں تھا۔ سب کچھ ٹھیک ہو جاتا.... زندگی پھر پہلے جیسی ہو جاتی۔ ورلڈ بینک میں پہلے سے بھی زیادہ بڑا عہدہ.... ترقی.... مراعات.... اسٹیٹس.... کیا برائی تھی اگر وہ ضمیر کو کچھ دیر کے لیے سلا دیتا.... کانگو اس کا ملک نہیں تھا، نہ پگمیز اس کے لوگ.... پھر؟

پھر.... واقعی ٹھیک کہا تھا رافیل نے، وہ کیوں ان کے لیے یہ سب کر رہا تھا اور یہ سب کرتے کرتے اپنے آپ کو وہاں لے آیا تھا۔ جہاں آگے کنواں تھا پیچھے کھائی.... لیکن پھر اسے وہ ساری غربت اور بدحالی یاد آئی تھی جو اس نے ان لوگوں سے ملاقاتوں میں دیکھی تھی.... وہ امید بھری نظریں یاد آئی تھیں.... جن سے وہ اسے دیکھتے تھے.... کاغذات کا وہ پلندہ یاد آیا تھا جس کا ایک ایک لفظ کہتا تھا کہ وہاں جو بھی ہو رہا تھا، وہ انسانیت کی تذلیل تھی۔ وہ غلامی اور غلامانہ استحصال تھا، جو اس کا مذہب چودہ سو سال پہلے ختم کر چکا تھا۔

اور یہ سب یاد کرتے ہوئے اسے امامہ بھی یاد آئی تھی۔

اس نے جیب سے سیل فون نکال کر فٹ پاتھ پر چلتے چلتے اسے کال کی، رابطہ نہیں ہوا۔ اسے لگا شاید سگنلز کا کوئی مسئلہ ہوگا۔ فون اس نے دوبارہ جیب میں ڈال لیا۔ ایک عجیب سی اداسی اور تنہائی نے اسے گھیرا تھا حالانکہ وہاں فٹ پاتھ پر اس کے آس پاس سے درجنوں لوگ گزر رہے تھے اور برابر میں سڑک پر کئی گاڑیاں چل رہی تھیں.... پھر بھی اس نے عجیب سی تنہائی محسوس کی تھی.... یہ ویسی ہی تنہائی تھی جو وہ امامہ کی عدم موجودگی میں محسوس کرتا تھا۔

امامہ سے شادی ہونے تک وہ ڈپریشن کے کئی ادوار میں سے گزرا تھا.... لیکن ہر بار وہ اس دور سے نکل آتا تھا.... وسیم کی موت کے بعد امامہ کی ذہنی حالت نے اسے ایک بار پھر بری طرح انتشار کا شکار کیا تھا، مگر یہ ڈپریشن پہلے جیسا نہیں تھا۔ اس نے کبھی بھی امید کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا تھا۔ اسے لگتا تھا، سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا اور سب کچھ واقعی ٹھیک ہو گیا تھا اور اب کئی سالوں سے سب کچھ ٹھیک تھا، اب ایک بار پھر سے زندگی عجیب مدوجزر میں آ پھنسی تھی۔

"مجھے لگتا ہے' میری زندگی میں سکون نہیں ہے۔ کچھ دیر کے لیے سب کچھ ٹھیک رہتا ہے' پھر کچھ نہ کچھ غلط ہونے لگتا ہے۔"

اس نے کئی بار امامہ سے یہ سنا تھا اور وہ کبھی اس سے یہ اعتراض نہیں کر سکا تھا کہ یہ صرف اس کی نہیں' خود اس کی اپنی زندگی کا بھی یہی انداز تھا۔۔۔ کہیں نہ کہیں کچھ ٹھیک نہیں رہتا تھا' اس کی زندگی میں بھی۔۔۔ پہلے کی بات اور تھی لیکن امامہ کے مل جانے کے بعد بھی۔۔۔ وہ ویسی زندگی نہیں جی رہا تھا جیسی زندگی وہ امامہ کے ساتھ گزارنے کا خواہش مند تھا یا تصور کرتا تھا۔۔۔ لیکن یہ صرف امامہ کے ساتھ اس کی ازدواجی زندگی ہی نہیں تھی جو نشیب و فراز سے گزرتی رہی تھی۔ اس کی پیشہ ورانہ زندگی میں بھی عجیب و غریب حالات پیدا ہوتے رہتے تھے۔

اس فٹ پاتھ پر چلتے ہوئے ایک لمبے عرصے کے بعد سالار سکندر نے اپنی سینتیس سالہ زندگی کے حاصل' محصول پر نظر دوڑائی تھی۔۔۔ نعمتیں یقیناً "بے شمار تھیں۔۔۔ اتنی کہ وہ گننے بیٹھتا تو گنتی بھول جاتا۔۔۔ لیکن بے سکونی تھی جو کسی بلا کی طرح ان کی زندگیوں کو اپنی گرفت میں لیے ہوئے تھی۔ وہ بے سکونی کی جڑ تک پہنچنے میں ناکام رہتا تھا۔ وہ حافظ قرآن تھا۔ عملی مسلمان تھا۔ عبادات اور حقوق العباد دونوں میں مثالی۔۔۔ گناہوں سے تائب۔۔۔ نعمتوں سے سرفراز۔۔۔ لیکن سکون دل کو ترستا ہوا۔۔۔ خالی پن کا شکار۔۔۔

سوچوں کی رفتار ایک دم ٹوٹی تھی۔۔۔ وہ حیران ہوا تھا۔۔۔ وہ کس بحران میں کیا سوچنے بیٹھ گیا تھا۔ وہ آزمائش میں پھنسا تھا لیکن وہ اتنی بڑی آزمائش نہیں تھی کہ وہ اپنی پوری زندگی کے حاصل و محصول کو اس بوندا باندی میں' ورلڈ بینک کی عمارت سے اپنے ہوٹل تک کے راستے میں ٹہلتے ہوئے سوچتا۔۔۔ اس کی چھٹی حس اسے جیسے بڑے عجیب انداز میں بے چین کر رہی تھی۔

اس نے اپنی ہر منفی سوچ کو ذہن سے جھٹک دیا تھا۔ شاید یہ ذہنی دباؤ کی وجہ سے ہو رہا تھا۔ اس نے چند لمحوں کے لیے سوچا تھا اور پھر خود کو پرسکون کرنے کی کوشش کی۔

اپنے ہوٹل کے کمرے میں پہنچ کر اپنا لیپ ٹاپ والا بیگ رکھتے ہوئے اس نے معمول کے انداز میں ٹی وی آن کیا تھا۔ ایک مقامی چینل پر واشنگٹن میں صبح سویرے ہونے والے ایک ٹریفک حادثے کی خبر چل رہی تھی' جس میں دو مسافر موقع پر مر گئے تھے' جبکہ تیسرا مسافر شدید زخمی حالت میں اسپتال میں تھا۔ لوکل چینل پر تباہ شدہ گاڑی کو جائے وقوع سے ہٹایا جا رہا تھا۔ اپنا لانگ کوٹ اتارتے ہوئے سالار نے ہاتھ میں پکڑے ریموٹ سے چینل بدلنا چاہا' لیکن پھر اسکرین پر چلنے والے ایک ٹکر کو دیکھتے ہوئے وہ جامد ہو گیا۔ اسکرین پر اسکرول میں اس حادثے کے متعلق مزید تفصیلات دی جا رہی تھیں اور اس میں زخمی ہونے والے شخص کا نام پیٹرس ایباکا بتایا جا رہا تھا جو ایک activist (انقلابی) تھا اور سی این این کے کسی پروگرام میں شرکت کے لیے آ رہا تھا۔ سالار کا دماغ جیسے بھک سے اڑ گیا تھا۔

دنیا میں ہزاروں پیٹرس ایباکا ہو سکتے تھے۔۔۔ لیکن کانگو میں پگمیز کے لیے کام کرنے والا پیٹرس ایباکا ایک ہی تھا۔ اور سالار یہ بھی جانتا تھا کہ وہ پچھلے کئی دنوں سے امریکا میں تھا۔ وہ امریکا روانہ ہونے سے پہلے اس سے ملنے آیا تھا' اور اس نے سالار کو بتایا تھا کہ اس کے کچھ دوستوں نے بالآخر بڑی کوششوں اور جدوجہد کے بعد کچھ بڑے نیوز چینلز کے نیوز پروگرامز میں اس کی شرکت کے انتظامات کیے تھے اور یہ گارڈین میں شائع ہونے والی رپورٹ کے بعد ممکن ہو سکا تھا۔

"اس کا مطلب ہے کہ چھری میری گردن پر گرنے والی ہے۔" سالار نے مسکراتے ہوئے اس سے کہا۔ "تم اگر اس پروجیکٹ کے حوالے سے ورلڈ بینک اور اس کے عہدے داران پر تنقید کرو گے تو سب سے پہلے میں ہی

نظروں میں آؤں گا اور یہ چینلز مجھ سے رسپانس لینے کے لیے رابطہ کریں گے۔"
سالار کو اس مشکل صورت حال کا اندازہ ہونے لگا تھا جس میں وہ پیٹرس ایباکا کے انٹرویوز کے بعد پھنستا۔ وہ آتش فشاں جو بہت عرصے سے پک رہا تھا' وہ اب پھٹنے والا تھا اور پھٹنے کے ساتھ ساتھ وہ بہت سوں کو بھی ڈبونے والا تھا۔
"میں تمہیں بچانے کی پوری کوشش کروں گا۔" ایباکا نے اسے یقین دلایا تھا۔ "میں تم پر کوئی تنقید نہیں کروں گا بلکہ تمہاری سپورٹ کے لیے تمہاری تعریف کروں گا۔ تم تو اب آئے ہو یہ پروجیکٹ تو تمہارے آنے سے پہلے سے جاری ہے۔"
ایباکا بے حد سنجیدہ تھا لیکن سالار کے ساتھ ساتھ وہ خود بھی جانتا تھا کہ اس کی یہ یقین دہانی ایک خوش فہمی کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے۔ سالار سکندر اس پروجیکٹ کی سربراہی کر رہا تھا اور نہ اسے جمعہ جمعہ چار دن ہوئے تھے وہاں آئے۔۔۔ نہ تو یہ وہ اتنا احمق ہو سکتا تھا کہ کسی پروجیکٹ کی تفصیلات جانے بغیر اسے جوائن کر لیتا۔ اگر وہ اس کا حصہ تھا تو کسی نہ کسی حد تک اسے بھی میڈیا کی شدید تنقید کا سامنا ہونے والا تھا۔ ایباکا کی تعریف ورلڈ بینک کی انتظامیہ کی نظروں میں اس کا امیج خراب کرتی اور اس کی خاموشی دنیا کی نظروں میں۔۔۔
"تم جلد سے جلد ورلڈ بینک چھوڑ دو۔ میں تمہاری رپورٹ کا حوالہ دوں گا کہ اس پروجیکٹ سے ناخوش تھے اور تمہارے اس پوزیشن کو چھوڑنے کی وجہ بھی یہ ہی ہے۔" ایباکا نے جیسے اسے ایک راہ دکھائی تھی۔
"میں اس سے پہلے ایک کوشش ضرور کروں گا کہ بینک کو مجبور کر سکوں کہ وہ اس پروجیکٹ پر نظر ثانی کرے۔"
جو راستہ وہ سالار کے لیے نکال رہا تھا وہ سالار کو بھی پتا تھا۔ اس کے باوجود وہ ایک آخری کوشش کرنا چاہتا تھا۔ بینک کا ردعمل جاننے کے لیے۔۔۔ اسے جیسے یہ امید تھی کہ بینک اگر فوری طور پر اس پروجیکٹ کو نہیں روک تا تب بھی کوئی انکوائری تو آرڈر کر ہی سکتا تھا۔ یہ کیسے ممکن تھا کہ اتنے تفصیلی ثبوتوں کے باوجود بینک آنکھیں بند کر کے "صم" "وبکم" کی طرح بیٹھا رہتا۔
ایباکا نے اس کے ساتھ کوئی بحث نہیں کی تھی۔ وہ ان دونوں کا آخری رابطہ تھا۔ وہ واشنگٹن آنے تک میڈیا پر ایباکا اور کانگو کے بارانی جنگلات کے حوالے سے کوئی نئی خبر تلاش کرتا رہا' لیکن وہ نئی خبر اسے آج ملی تھی۔ نیوز چینل بتا رہا تھا کہ بچنے والے مسافر کی حالت تشویش ناک تھی۔ سالار کچھ دیر شل ہوتے ہوئے اعصاب کے ساتھ کھڑا رہا پھر اس نے اپنا فون نکال کر یہ جاننے کی کوشش کی تھی کہ ایباکا کو کہاں لے جایا گیا تھا۔ عجیب اتفاق تھا' لیکن یک دم جیسے اس کا فون رابطوں کے مسائل کا شکار ہونے لگا تھا۔ کچھ دیر پہلے وہ کانگو میں امامہ سے رابطہ نہیں کر پایا تھا اور اب وہ کوئی لوکل کال نہیں کر پا رہا تھا' کچھ دیر اپنے سیل فون کے ساتھ مصروف رہنے کے بعد ناکامی پر سالار نے جیسے جھنجلا کر کمرے میں موجود فون لائن اٹھا کر اسے استعمال کرنے کی کوشش کی تھی۔ وہ فون لائن بھی کام نہیں کر رہی تھی۔ سالار حیران ہوا تھا۔ وہ ایک فائیو اسٹار ہوٹل تھا اور اس کی فون لائن کا ڈائریکٹ کام نہ کرنا حیران کن ہی تھا۔ اس نے انٹر کام پر آپریٹر کے ذریعے ایک کال بک کروائی تھی۔
اگلا آدھا گھنٹہ وہ آپریٹر کی کال کا انتظار کرتا رہا۔ وہ پہلا موقع تھا جب سالار کو ایک عجیب سی بے چینی محسوس ہوئی تھی' پہلی بار اسے لگا تھا جیسے اس کو کسی سے بھی رابطہ کرنے سے روکا جا رہا ہے۔ وہ اس شک کو اپنے ذہن سے جھٹک دینا چاہتا تھا۔ کچھ سوچے سمجھے بغیر وہ اسی بے چینی اور بے قراری کے عالم میں اپنے کمرے سے نکل کر نیچے استقبالیہ پر آ گیا تھا۔ اس بار کہیں بھی خود کال کرنے کے بجائے اس نے ریسپشنسٹ سے کہا تھا کہ وہ اسے پولیس انکوائری سے پتا کر کے بتائے کہ آج صبح واشنگٹن میں ہونے والے اس ٹریفک حادثے کے زخمی کو کہاں لے

جایا گیا تھا۔ ریپشنسٹ نے اسے لابی میں پڑے ایک صوفے پر بیٹھنے کے لیے کہا اور چند ہی منٹوں میں اس نے سالار کو اس اسپتال کا نام بتا دیا تھا جہاں پیٹرس ایباکا کو لے جایا گیا تھا۔ سالار نے اسی ریپشنسٹ کو کانگو میں اپنے گھر کے اور امامہ کا سیل فون نمبر دیا تھا۔ وہ اگلی کال وہاں کرنا چاہتا تھا۔ وہ جیسے اپنے خدشات کی تصدیق کرنا چاہتا تھا۔

کچھ دیر تک کوشش کرتے رہنے کے بعد ریپشنسٹ نے اسے کہا تھا کہ اس کے گھر کے نمبر یا امامہ کے سیل فون کسی پر کال نہیں ہو پا رہی تھی شاید کانگو اور امریکا کے درمیان اس وقت رابطوں میں گڑبڑ تھی۔ سالار کے خدشات کی لحہ بھر میں ہوا نکل گئی تھی۔ وہ شاید ضرورت سے زیادہ وہم کرنے لگا تھا۔ اس نے اپنا سر جھٹکتے ہوئے سوچا اور ریپشنسٹ سے اپنے کمرے کی ڈائریکٹ فون لائن کے فنکشنل نہ ہونے کی شکایت کرنے کے بعد وہ وہیں سے اسپتال کے لیے روانہ ہو گیا تھا جہاں پیٹرس داخل تھا۔

اسپتال پہنچ کر پیٹرس کو تلاش کرنا مشکل نہیں تھا' لیکن اسے ایباکا سے ملنے نہیں دیا گیا تھا۔ وہ مخدوش حالت میں تھا اور اس کی سرجری کے بعد اسے مصنوعی تنفس پر رکھا گیا تھا۔ اپنے آپ کو ایباکا کا رشتہ دار ظاہر کرنے پر اسے بہرحال ایباکا کو دور سے ایک نظر دیکھنے کی اجازت مل گئی تھی۔ مگر استقبالیہ پر موجود شخص نے اسے بے یقینی اور شبہ کی نظر سے دیکھا تھا۔ ایک پگمی اور ایک جنوبی ایشیا میں رہنے والے کی رشتہ داری کیسے ممکن تھی...؟ لیکن اب اگر کوئی اس کا دعوے دار ہو گیا تھا تو وہ کیا کر سکتا تھا۔ ایباکا کی حالت ویسے بھی اتنی نازک تھی کہ وہ کسی بھی وقت مر سکتا تھا۔ اس کا دماغ آہستہ آہستہ کام کرنا چھوڑ رہا تھا اور ریپشن پر موجود آدمی نے جیسے ایک مرتے ہوئے شخص کے لیے احساس ہمدردی دکھایا تھا۔

اسپتال کے آئی سی یو میں نلیوں' تاروں اور پٹیوں میں جکڑے ایباکا کو سالار پہلی نظر میں پہچان نہیں سکا تھا۔ وہ سیاہ فام پست قامت آدمی موٹی چمک دار آنکھوں اور ایسی مسکراہٹ کے لیے پہچانا جاتا تھا جو کسی چھوٹی سی بات پر بھی اس کے چہرے پر آجاتی۔ وہ بات بے بات قہقہے لگانے کا بھی عادی تھا اس کے موٹے موٹے سیاہ ہونٹوں سے نظر آنے والے دودھیا دانت اور مسوڑھے اس کے ہر قہقہے میں سب سے پہلے نمایاں ہوتے تھے۔

آئی سی یو کی کھڑکی سے اسے دیکھتے ہوئے سالار کی سمجھ میں نہیں آیا وہ کیا کرے۔ اس کا اور ایباکا کا انسانیت کے علاوہ کوئی رشتہ نہیں تھا' پھر بھی وہ عجیب غم زدہ حالت میں وہاں کھڑا تھا۔ ایباکا کی مخدوش حالت اس کے علم میں آچکی تھی۔ پگمیز اگر ایباکا کو کھو دیتے تو گونگے ہو جانے والے تھے' کوئی چیز ان کے مقاصد کو اس سے زیادہ نقصان نہ پہنچاتی جتنا ایباکا کی موت پہنچانے والی تھی۔ سالار گم صم کھڑا اسے دیکھتا رہا۔ وہ صرف پگمیز کا نہیں کانگو کا صدر بننا چاہتا تھا۔ ہارورڈ بزنس اسکول اور جان ایف کینیڈی اسکول آف گورنمنٹ سے فارغ التحصیل ہونے والے ممتاز ترین افراد میں سے ایک پیٹرس ایباکا بھی ہوتا' اگر زندگی اسے ایک موقع دیتی.... شاید وہ کبھی نہ کبھی کانگو کا صدر بن جاتا اور افریقہ کے نمایاں ترین لیڈرز میں اس کا شمار ہوتا.... لیکن زندگی فی الحال اسے یہ موقع نہیں دے رہی تھی۔

وہاں کھڑے کھڑے سالار کو ایک بار پھر جیسے خیال آیا تھا کہ وہ چاہتا تو اب بھی یہ سب ٹھیک کر سکتا تھا۔ ایباکا مر رہا تھا اور اس کے مرنے کے ساتھ ہی وہ سارے حقائق اور شواہد بھی غائب ہو جانے والے تھے۔ پگمیز کو فوری طور پر ایباکا کا متبادل نہیں مل سکتا تھا' جو امریکا میں کسی نہ کسی حد تک رسوخ رکھتا ہو۔ ایباکا کے ساتھ جو دوسرے لیڈرز تھے وہ سب مقامی تھے۔ زیادہ تر ان پڑھ... انہیں صرف جنگل میں لڑنا آتا تھا یا اپنی بقا کے لیے شکار کرنا... کانگو سے باہر کی دنیا میں اپنا کیس پیش کرنے کے لیے ان کے پاس باقی چیزیں اور زبان تو ایک طرف اعتماد تک نہیں

تھا جس کے ساتھ وہ سی پی آنکھ میں آنکھ ڈال کر اپنے حق کی بات اس ڈھنگ انداز میں کہہ سکیں، جس طرح ایبا کا کہتا تھا۔ شاید یہ ایک موقع اسے قدرت دے رہی تھی۔ وہ الجھا، بھٹکا Temnpt ہوا۔ ضمیر کا چابک ایک بار پھر اس پر برسا تھا اور ضمیر کا چابک واحد چیز نہیں تھی جس نے سالار کو جھٹکا دیا تھا۔ اس کی اپنے ہوٹل واپسی پر ایک اور بڑا سانحہ اس کا انتظار کر رہا تھا۔ اس کے کمرے میں اس کا لاکر کھلا ہوا تھا اور اس لاکر میں موجود اس کا پاسپورٹ اور کچھ دوسرے اہم ڈاکومنٹس غائب تھے، صرف اتنا ہی نہیں بلکہ اس کا وہ بیگ بھی غائب تھا جس میں اس کا لیپ ٹاپ اور اس رپورٹ سے متعلقہ تمام ثبوتوں کی کاپیاں تھیں۔ سالار کو چند لمحوں کے لیے یقین نہیں آیا، اسے لگا وہ اس کا کمرہ نہیں ہوگا۔ وہ شاید غلطی سے کسی اور کمرے میں داخل ہو گیا تھا۔ یہ حماقت کی انتہا تھی۔ لیکن اس نے جیسے اپنے کمرے سے نکل کر دروازے پر نمبر پڑھا تھا۔ وہ اسی کا کمرہ تھا۔ جو اس باختگی کے عالم میں وہ دوبارہ کمرے میں داخل ہوا اور اس نے پاگلوں کی طرح کمرے کے ایک ایک کونے کھدرے کو چھان مارا، صرف اس موہوم امید میں کہ شاید وہ جس ذہنی کیفیت سے گزر رہا تھا اس میں اس نے خود ہی ان سب چیزوں کو کہیں اور رکھ دیا تھا۔ کمرے میں کہیں کچھ نہیں تھا۔ وہ ایک فائیو اسٹار ہوٹل تھا اور اگرچہ ہوٹل کے کمرے میں رکھی جانے والی کسی بھی قسم کی قیمتی اشیا کے لیے لاکر فراہم کرنے کے ساتھ ہی وہ ہر طرح کی ذمہ داری سے بری الذمہ ہو چکے تھے۔ اس کے باوجود سالار کو یقین نہیں آیا کہ وہ سب ہو چکا تھا۔ کوئی اس کے کمرے سے اس کے ٹریول ڈاکومنٹس اور لیپ ٹاپ کیوں لے کر جاتا اور اس سے بھی بڑا سوال تھا کہ کون لے کر گیا تھا۔

بے حد طیش کے عالم میں اس نے فون اٹھا کر فوری طور پر اپنے ساتھ ہونے والے واقعے کی اطلاع مینجر کو دیتے ہوئے اسے کمرے میں طلب کیا تھا۔ اسے اس وقت بھی یقین تھا کہ کوریڈور میں لگے سی سی ٹی وی فوٹیج کی مدد سے بڑے آرام سے اس کی عدم موجودگی میں اس کے کمرے میں داخل ہونے والے کسی بھی شخص کا پتا چل جائے گا، لیکن مینجر اور سیکورٹی گارڈز کے اس کے کمرے میں آتے ہی سالار کا دماغ یہ جان کر بھک سے اڑ گیا تھا کہ اس پورے فلور پر صفائی سے متعلقہ کام کرنے کے لیے پچھلے دو گھنٹے اس فلور کے سی سی ٹی وی کیمرے آف کیے گئے تھے۔ یہ ناقابل یقین بات تھی۔ اسے لگا تھا ایک دم جیسے اس کے ہاتھ پاؤں کٹ گئے تھے۔ اس کے پاس جو بھی تھا وہ اس لیپ ٹاپ اور اس کے بیگ میں تھا۔ ان کے غائب ہونے کا مطلب تھا کہ وہ بالکل بے دست و پا ہو گیا تھا۔ وہ اپنی رپورٹ کے کسی الزام اور تحقیق کو ڈاکومنٹری ثبوت کے بغیر ثابت نہیں کر سکتا تھا اور ان دستاویزاتی ثبوتوں کی ایک کاپی اس کے پاس تھی اور ایک کاپی کومبے میں اس کے گھر کے اس لاکر میں، جو وہ امامہ کی تحویل میں دے کر آیا تھا۔

وہ پہلا موقع تھا جب سالار نے ایک عجیب سا خوف محسوس کیا تھا۔ ہر چیز کو اتفاق سمجھتے ہوئے وہ پہلی بار ان سب واقعات کو ایک دوسرے سے جوڑنے کی کوشش کر رہا تھا اور وہ بڑے آرام سے جڑتے جا رہے تھے۔ وہ وہمی نہیں تھا، نہ ہی سازشی نظریوں پر یقین رکھتا تھا، لیکن جو کچھ اس ایک دن میں ہوا تھا، وہ اتفاق نہیں ہو سکتا تھا۔

پیٹرس ایباکا کا ایک حادثہ میں زخمی ہونا بھی اب اسے ایک اتفاق نہیں لگ رہا تھا۔ کوئی تھا جو پیٹرس ایباکا کو نقصان پہنچانے کے بعد اب اس کے ہاتھ پاؤں کاٹ کر اسے بے بس کر رہا تھا۔ پہلا خیال جو اسے وہاں کھڑے کھڑے آیا تھا۔ وہ امامہ اور اپنے بچوں کے تحفظ کا تھا۔ ضروری تھا کہ وہ ان سے رابطہ کرتا اور ہر قیمت پر کرتا۔ اسے یقین تھا اس ہوٹل کے اندر وہ کبھی بھی کانگو میں امامہ سے رابطہ نہیں کر سکتا تھا، لیکن اسے امامہ کو متنبہ کرنا تھا، اس سے کہنا تھا کہ وہ ان ڈاکومنٹس کے ساتھ پاکستان ایمبیسی یا کسی پولیس اسٹیشن چلی جائے، کم از کم تب تک جب تک وہ خود وہاں نہیں پہنچ جاتا۔

اس نے مینیجر سے کہا تھا کہ وہ پولیس میں رپورٹ کروانا چاہتا تھا۔ اس کی قیمتی چیزوں کی حفاظت یقیناً "ہوٹل کی ذمہ داری نہیں تھی، لیکن ہوٹل کم از کم اتنی ذمہ داری ضرور رکھتا تاکہ اس کی عدم موجودگی میں اس فلور کے سی سی ٹی وی سسٹم کو صفائی کے لیے آف نہ کیا جاتا۔

مینیجر نے معذرت کرتے ہوئے فوری طور پر اسے اس کے نقصان کی تلافی کی آفر کی تھی اور اس سے درخواست کی تھی کہ وہ پولیس کو اس معاملے میں انوالو نہ کرے، لیکن سالار اس وقت اپنے حواسوں میں نہیں تھا۔ وہ اپنے کمرے سے ہی باہر نہیں نکلا تھا' وہ اس ہوٹل سے بھی باہر نکل آیا تھا۔

ایک فون بوتھ سے اس نے ایک بار پھر کانگو میں اپنے گھر کے نمبرز اور امامہ کا نمبر ملانے کی کوشش کی تھی۔ نتیجہ وہی آیا تھا۔ اس کا ذہن ماؤف ہو رہا تھا۔ اس نے اپنے فون پر ای میلز سوشل میسیجنگ کے ذریعے بھی امامہ سے رابطہ کرنے کی کوشش کی تھی۔ لیکن کسی ای میل کسی میسج کا جواب نہیں آیا تھا۔ سالار نے باری باری پاگلوں کی طرح اپنے آفس کے ہر شخص کو کال کرنی شروع کر دی تھی جو اس کے اسٹاف میں شامل تھا اور جن کے نمبرز اس وقت اس کے پاس تھے۔ کوئی ایک نمبر ایسا نہیں تھا جس پر رابطہ ہو پاتا۔

اس نے بالآخر پاکستان میں سکندر عثمان کو فون کیا تھا اور جب اسے فون پر ان کی آواز سنائی دی تو کچھ دیر کے لیے تو اسے یقین ہی نہیں آیا تھا کہ وہ بالآخر کسی سے بات کرنے میں کامیاب ہو پا رہا تھا۔ سکندر عثمان کو بھی اس کی آواز سے پتا چل گیا تھا کہ وہ پریشان تھا۔

سالار نے کوئی تفصیلات بتائے بغیر مختصراً" انہیں بتایا کہ "وہ اپنی سفری دستاویزات گنوا بیٹھا ہے اور اس وجہ سے وہ فوری طور پر اگلی فلائٹ پکڑ کر واپس نہیں جا سکتا تھا اور وہ امامہ سے رابطہ بھی نہیں کر پا رہا تھا۔ اس نے سکندر سے کہا کہ وہ پاکستان سے امامہ کو کال کریں اور اگر اس سے رابطہ نہ ہو سکے تو پھر فارن آفس میں اپنے جاننے والوں کے ذریعے کنشاسا میں پاکستان ایمبیسی کے ذریعے اسے تلاش کریں اور فوری طور پر اس سے کہیں کہ وہ لاکر میں پڑے سارے ڈاکومنٹس سمیت ایمبیسی چلی جائے۔" سکندر عثمان بری طرح کھٹکے تھے۔

"ایسا کیا ہوا ہے کہ تمہیں یہ سب کچھ کرنا پڑ رہا ہے؟ سالار سب کچھ ٹھیک ہے نا؟"

"پاپا! اس وقت آپ صرف وہ کریں جو میں کہہ رہا ہوں۔ میں ڈیٹیلز آپ کو بعد میں بتا دوں گا۔" وہ جھنجلا گیا تھا۔

"میں تھوڑی دیر تک آپ کو خود کال کر کے پوچھتا ہوں' آپ میرے فون پر کال مت کریں' نہ ہی میرے نمبر پر میرے لیے کوئی میسج چھوڑیں۔" اس نے باپ کو مزید تاکید کی۔

"سالار! تم مجھے پریشان کر رہے ہو۔" سکندر عثمان کا ان ہدایات کے بعد خوف زدہ ہونا لازمی تھا۔

سالار نے فون بند کر دیا تھا۔ وہ باپ کو یہ نہیں بتا سکتا تھا کہ اس کے اپنے حواس ان سے زیادہ خراب ہو رہے تھے۔ فون بوتھ سے کچھ فاصلے پر پڑی ایک بینچ پر بیٹھتے ہوئے اس نے بے اختیار خود کو ملامت کی تھی۔ اسے اپنی فیملی کو کانگو میں چھوڑ کر نہیں آنا چاہیے تھا اور ان حالات میں..... میٹنگ جاتی بھاڑ میں..... وہ اسے آگے پیچھے کروا دیتا..... کیا ضرورت تھی اتنی مستعدی دکھانے کی.....

اب رات ہو رہی تھی اور صبح سے لے کر اس وقت تک اس کے فون پر کوئی کال' کوئی ٹیکسٹ میسج نہیں آیا تھا۔ یہ ممکن نہیں تھا تب تک جب تک اس کے فون کو مانیٹر نہ کیا جا رہا ہو یا اس کے سگنلز کو کنٹرول نہ کیا جا رہا ہوتا۔ فون سگنلز کو بہترین حالت میں دکھا رہا تھا مگر سالار کو یقین تھا اس کا فون اور فون کے ذریعے ہوئے اس کے رابطوں کو کنٹرول کیا جا رہا تھا اور کس لیے.....؟ یہ وہ سمجھ نہیں پا رہا تھا۔

وہ اگر اسے نقصان پہنچانا چاہتے تھے تو ان سب ہتھکنڈوں کے بغیر نقصان پہنچاتے جیسے پیٹرس پر وار کیا گیا تھا اور انہیں اگر اسے بینک سے نکالنا تھا تو وہ یہ کام تو خود ہی کر رہا تھا پھر یہ سب کیوں کیا جا رہا تھا۔

اس کی ریڑھ کی ہڈی میں جیسے کوئی سنسناہٹ ہوئی تھی۔ اسے اچانک احساس ہوا وہ لوگ اسے یہ احساس ہی دلانا چاہتے تھے کہ اسے مانیٹر کیا جا رہا تھا۔ اسے نقصان پہنچایا جا سکتا تھا.... اور کس کس قسم کا.... اسے یہ بھی بتایا جا رہا تھا اور یہ سب ورلڈ بینک نہیں کر سکتا تھا صرف ورلڈ بینک نہیں.... اسے سی آئی اے چیک کر رہی تھی۔ پتا نہیں جو پسینے چھوٹے تھے وہ جسم کے ٹھنڈا ہونے پر چھوٹے تھے یا گرم ہونے پر.... لیکن سالار کچھ دیر کے لیے پانی میں نہا گیا تھا۔ اس کا دماغ اس وقت بالکل خالی ہو گیا تھا۔ یہ کبھی اس کے فرشتوں نے بھی نہیں سوچا ہوگا کہ وہ کبھی کسی ایسے معاملے میں انوالو ہو سکتا تھا کہ سی آئی اے اس کے پیچھے پڑ جاتی اور اب اسے اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ پروجیکٹ ورلڈ بینک کی خواہش نہیں امریکا کی خواہش تھا اور وہ اسے پایہ تکمیل تک پہنچانے کے لیے کسی بھی حد تک جا سکتا تھا۔

وہ ڈیڑھ گھنٹہ وہیں بت کی طرح بیٹھا رہا تھا۔ اسے تین دن کے لیے واشنگٹن میں رہنا تھا اور تیسرے دن واپس چلا جانا تھا لیکن اب اپنی ٹریول ڈاکومنٹس گم ہو جانے کے بعد اسے یقین تھا وہ فوری طور پر واپس نہیں جا سکتا تھا۔ کم از کم تب تک جب تک وہ ان مطالبات پر کچھ لچک نہ دکھاتا جو وہ لوگ اس سے کر رہے تھے۔

ڈیڑھ گھنٹے کے بعد سکندر عثمان کو اس نے دوبارہ فون کیا تھا اور انہوں نے اسے بتایا کہ امامہ اور اس کے بچے گھر پر نہیں ہیں۔ گھر لاکڈ ہے اور وہاں کوئی ملازم یا گارڈ نہیں ہے جو ان کے بارے میں کوئی اطلاع دیتا۔ ایمبیسی کے افسران نے کانگو کی وزارت داخلہ کے ساتھ اس سلسلے میں رابطہ کیا تھا مگر اس کی فیملی کے بارے میں جو بھی پتا چلتا وہ فوراً "پتا نہیں چل سکتا تھا۔ کچھ وقت تو لگتا ہے۔

جو کچھ وہ فون پر سن رہا تھا اس کے جسم میں کپکپاہٹ دوڑانے کے لیے کافی تھا۔ امامہ اور اس کے بچے کہیں نہ جا سکتے تھے۔ اس سے پوچھے اور اسے اطلاع دیے بغیر.... گارڈز بینک کے فراہم کیے ہوئے تھے۔ یہ کیسے ممکن تھا کہ گھر لاکڈ ہونے پر وہ بھی وہاں سے چلے گئے۔

"میں کوشش کر رہا ہوں فوری طور پر ایمبیسی میرے ویزے کا انتظام کرے اور میں وہاں جا کر خود اس سارے معاملے کو دیکھوں۔"

سکندر عثمان اسے تسلی دینے کی کوشش کر رہے تھے۔

"تم بھی کوشش کرو کہ فوری طور پر وہاں پہنچو۔ امریکن ایمبیسی کو ان کی گمشدگی کی اطلاع دو.... تم تو امریکن نیشنل ہو.... تمہارے بچے بھی.... وہ ہماری ایمبیسی سے زیادہ مستعدی سے انہیں تلاش کر لیں گے۔"

سکندر عثمان نے اسے ایک راستہ دکھایا تھا اور بالکل ٹھیک دکھایا تھا لیکن وہ باپ کو اس وقت یہ نہیں کہہ پایا تھا کہ وہ اس وقت امریکن گورنمنٹ کے ساتھ ہی الجھ پڑا تھا۔

"سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا سالار! تم پریشان مت ہو۔ کانگو میں ابھی اتنا بھی اندھیر نہیں مچا کہ تمہاری فیملی اس طرح غائب ہو جائے۔"

سکندر عثمان اگر کانگو میں رہ چکے ہوتے تو شاید کبھی یہ جملہ نہ کہتے۔ وہ شاید یہ سمجھ رہے تھے کہ ان کا بیٹا جو امریکن نیشنل اور ورلڈ بینک سے منسلک تھا اس کے یا اس کی فیملی کے ساتھ کچھ بھی غلط نہیں ہو سکتا تھا۔ جواب میں کہنے کے لیے سالار کے پاس کچھ بھی نہیں تھا.... کچھ بھی....

آج وہ محاورتاً نہیں حقیقتاً "گونگا" ہوا تھا اور جب کچھ بول نہیں پا رہا تھا تو اس کا دل چاہ رہا تھا وہ گلا پھاڑ پھاڑ کر بے ہنگم انداز میں چلائے.... سکندر عثمان سے مزید کچھ بھی کہے بغیر وہ فون رکھ کر فون بوتھ سے آ گیا تھا۔ اس فون

بوتھ سے واپس ہوٹل میں جانے میں اسے صرف پانچ منٹ لگے تھے' لیکن اس وقت وہ پانچ منٹ سالار کو پانچ ہزار سال لگ رہے تھے۔ وہ ملک اور وہ شہر اس کے دوستوں اور رشتہ داروں سے بھرا ہوا تھا۔ وہ ایک فون کال کرتا اور وہاں مجمع لگا لیتا۔ لیکن کوئی مجمع کوئی اس کا مسئلہ' اس کی آزمائش ختم نہیں کر سکتا تھا اور آزمائش تھی کہ بلا کی طرح اس کے سر پر آئی تھی' اس سے بھی بڑھ کر اس کی فیملی کے سر پر.....

وہ ہوٹل کے کمرے میں آ کر دروازہ بند کر کے خود پر قابو نہیں رکھ پایا تھا۔ وہ بے اختیار چیخیں مارتا رہا تھا۔ اس ہوٹل کے ساتویں فلور کے ایک ڈبل گلیزڈ شیشوں والے ساؤنڈ پروف کمرے کے دروازے کو اندر سے لاک کیے وہ اس کے ساتھ چپکا پاگلوں کی طرح چلاّتا رہا تھا۔ بالکل اسی طرح جب کئی سال پہلے مارگلہ کی پہاڑیوں پر ایک تاریک رات میں ایک درخت سے بندھا چلاّتا رہا تھا۔ بے بسی کی وہی انتہا اس نے آج بھی محسوس کی تھی اور اس سے زیادہ شدّت سے محسوس کی تھی۔ تب جو بھی گزر رہا تھا۔ اس کے اپنے اوپر گزر رہا تھا۔ جو بھی ہونا تھا صرف اسے ہونا تھا۔

آج جو بھی گزر رہا تھا' وہ اس کی بیوی اور کم سن بچوں پر گزر رہا تھا اور ان کو پہنچنے والی کسی تکلیف کا تصوّر بھی سالار سکندر کو جیسے صلیب پر لٹکا رہا تھا۔ اگر کوئی غلطی تھی تو اس کی تھی' اس کی فیملی کا کیا قصور تھا۔ وہ اسے مار دیتے' پیٹرس ایباکا کی طرح۔ اسے یہ بھی قبول تھا کہ وہ ایباکا کی طرح اس بستر پر اسی حالت میں پڑا ہوتا' لیکن امامہ' جبریل اور عنایہ اور وہ اس کا وہ بچہ جو ابھی دنیا میں آیا بھی نہیں تھا' ان کا کیا قصور تھا۔

وہ لوگ جو اس کے اعصاب کو شل کرنا چاہتے تھے' وہ اس میں کامیاب ہو رہے تھے۔ وہ اگر اسے گھٹنوں کے بل گرانا چاہتے تھے تو وہ گر گیا تھا۔ وہ اسے اوندھے منہ دیکھنا چاہتے تھے تو وہ اوندھے منہ پڑا تھا۔

وہ رات سالار پر بہت بھاری تھی۔ پتا نہیں وہ کتنی بار ہوٹل سے نکل کر فون بوتھ پر گیا تھا۔ سکندر عثمان کو فون کر کے وہ امامہ اور اپنے بچوں کے بارے میں کسی اطلاع کا پوچھتا اور پھر اسی طرح واپس آ جاتا۔ وہ ساری رات ایک لمحہ کے لیے بھی نہیں سو پایا تھا۔ امامہ' جبریل اور عنایہ کے چہرے اس کی آنکھوں کے سامنے گھومتے رہے تھے۔

اگلی صبح وہ آفس کے اوقات کے شروع ہونے سے بہت دیر پہلے ورلڈ بینک کے ہیڈ کوارٹر پہنچ گیا تھا۔

الیگزینڈر رافیل نے اپنے کمرے میں آتے ہوئے سالار سکندر کو بڑے اطمینان سے دیکھا تھا۔ یہ وہ سالار نہیں تھا جو کل یہاں آیا تھا۔ ایک دن اور ایک رات نے اسے جیسے پہاڑ سے مٹی کر دیا تھا۔

"مجھے پریذیڈنٹ سے ملنا ہے۔"

اس نے آتے ہی جو جملہ کہا تھا' رافیل اس سے اس جملے کی توقع نہیں کر رہا تھا۔ اس کا خیال تھا' وہ اس سے کہے گا کہ وہ ان کی تمام شرائط ماننے کے لیے تیار تھا' لیکن وہ کچھ اور کہہ رہا تھا۔

"پریذیڈنٹ سے ملاقات..... بہت مشکل ہے یہ تو..... کم از کم اس مہینے میں تو یہ ممکن نہیں ہے..... اور پھر اس ملاقات کی ضرورت کیوں پیش آئی تمہیں.....؟ اگر تمہیں وہ سب کچھ دہرانا ہے جو تم کل یہاں کہہ کر گئے تھے تو وہ میں پریذیڈنٹ تک پہنچا چکا ہوں۔"

رافیل آج اس ٹون میں بات کر رہا تھا جس ٹون میں وہ کل بورڈ روم میں بیٹھا بات کرتا رہا تھا۔ کچھ لمحوں کے لیے سالار کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کیا کہے۔ وہ ورلڈ بینک کے ہیڈ کوارٹر میں بیٹھ کر رونا نہیں چاہتا تھا' لیکن اس وقت اسے لگ رہا تھا' وہ کسی بھی لمحے پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے گا اور آخری چیز جو وہ کرنا چاہتا تھا' یہی ایک کام تھا۔

"کنشاسا میں کل سے میری فیملی غائب ہے..... میری بیوی..... میرا بیٹا..... میری بیٹی....." اپنے لہجے پر قابو پاتے ہوئے اس نے رافیل کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے کہنا شروع کیا۔

"اوہ... بہت افسوس ہوا... تمہیں فوری طور پر واپس جانا چاہیے کانگو' تاکہ پولیس کی مدد سے اپنی فیملی کو بر آمد کروا سکو... جو حالات کانگو میں ہیں ان میں کوئی گمشدہ شخص بہت کم ہی صحیح سلامت ملتا ہے' لیکن پھر بھی..."

رافیل یوں بات کر رہا تھا جیسے اخبار پڑھ رہا تھا۔ اس کے لہجے' چہرے' آنکھوں میں کہیں سالار کے انکشاف پر افسوس یا ہمدردی نہیں تھی۔ سالار نے اس کی بات کاٹ دی۔

"میرا پاسپورٹ اور سارے ڈاکومنٹس گم ہو چکے ہیں۔ ہوٹل کے کمرے سے سب کچھ غائب ہوا ہے کل... اور اب میں کل واپس کنشاسا نہیں جا سکتا۔ مجھے ہیڈ کوارٹر کی مدد چاہیے اپنے پاسپورٹ اور دوسری دستاویزات کے لیے... اور مجھے ورلڈ بینک سے فوری طور پر ڈاکومنٹس چاہئیں' تاکہ میں اپنا پاسپورٹ لے سکوں۔"

رافیل نے اس کی بات خاموشی سے سننے کے بعد اسے بڑے ہی ٹھنڈے انداز میں سرد مہری سے کہا۔

"ان حالات میں ورلڈ بینک تمہیں نئے پاسپورٹ کے لیے کوئی لیٹرز جاری نہیں کر سکے گا' کیونکہ تم آج ریزائن کر رہے ہو... میرا خیال ہے' تمہیں معمول کے طریقہ کار کے مطابق پاسپورٹ کے لیے اپلائی کرنا چاہیے اور پھر کانگو جانا چاہیے ایک وزیٹر کے طور پر... اگر تم ورلڈ بینک کے ایمپلائی ہوتے تو ہم تمہاری فیملی کے لیے کسی بھی حد تک جاتے' لیکن اب وہ اور ان کا تحفظ ہماری آرگنائزیشن کی ذمہ داری نہیں... تمہارے لیے زیادہ مناسب یہ ہے کہ تم کنشاسا میں امریکن ایمبیسی سے رابطہ کرو اور اپنی فیملی کے لیے مدد مانگو یا پھر پاکستانی ایمبیسی سے... تم اوریجنلی پاکستان سے ہی ہو نا؟"

رافیل نے اپنی گفتگو کے اختتام پر بڑے بھول پن سے اس سے یوں پوچھا جیسے اسے یہ اچانک یاد آیا ہو کہ وہ دہری شہریت رکھتا تھا۔

سالار اس کے اس تضحیک آمیز جملے کو شہد کے گھونٹ کی طرح پی گیا۔ ورلڈ بینک کے ایمپلائی کو بلو پاسپورٹ ایشو ہوتا تھا اور اس پاسپورٹ کے حصول کے لیے اسے ایک بار پھر سے ہیڈ کوارٹر سے اس کے لیے لیٹر چاہیے تھا یا پھر ورلڈ بینک اس کی جگہ پر خود اس پاسپورٹ کے لیے اپلائی کر کے اسے پاسپورٹ دلواتا... لیکن اب رافیل کے دوٹوک انکار نے سالار کے ذہنی ہیجان میں اضافہ کر دیا تھا۔ زندگی میں کبھی کسی مغربی ادارے سے اسے اتنی شدید نفرت محسوس نہیں ہوئی تھی جتنی اس دن ورلڈ بینک ہیڈ کوارٹر میں بیٹھے ہوئے ہوئی تھی۔

وہ اپنی زندگی کے بہترین سال اور بہترین صلاحیتیں مغرب کو دیتا آیا تھا... اقوام متحدہ کے باقی ادارے اور اب ورلڈ بینک... وہ اس ہیڈ کوارٹر میں کل تک ایک خاص اسٹیٹس کے ساتھ آتا رہا تھا اور آج وہ اس سے اس طرح برتاؤ کر رہے تھے جیسے وہ ایک بھکاری تھا۔ ایک ناکارہ' بے کار آدمی... جس کے پاس اب ورلڈ بینک کو دینے کے لیے کچھ نہیں تھا۔ انہیں اس کی اتنی ہی دیانت داری' اخلاص اور ضمیر چاہیے تھا جو صرف ان کے ادارے اور تہذیب کی ترقی کے لیے ضروری تھا۔ انسانیت' مادہ پرستی کے اس جنگل کے سامنے کچھ بھی نہیں تھی جسے مغرب ترقی کہتا تھا اور اسی ترقی کے حصول کی خواہش میں وہ بھی ساری عمر سرگرداں رہا تھا۔

بعض لمحے انسانوں کی زندگی میں تبدیلی کے لمحے ہوتے ہیں۔ بڑی بڑی تبدیلیوں کے... صرف ایک لمحے کی ضرورت ہوتی ہے جو انسان کو بہت ساری زنجیروں سے آزاد کر دیتا ہے... سینتیس سالہ زندگی میں آج دوسری بار سالار کی زندگی میں وہ لمحہ آیا تھا۔

پہلی بار مارگلہ کی پہاڑی پر موت کے خوف کی گرفت میں وہ اس طرز زندگی سے تائب ہو گیا تھا جو وہ گزارتا آیا تھا اور آج دوسری بار وہ امامہ اور اپنے بچوں کی موت کے خوف اور ورلڈ بینک میں اپنے سینیئرز کے ہاتھوں ملنے والی ہتک اور تذلیل کے بعد وہ فیصلہ کر بیٹھا تھا جو وہ اب تک کرتے ہوئے جھجکتا اور کتراتا رہا تھا۔

بعض خوف سارے خوف کھا جاتے ہیں... سالار سکندر کے ساتھ بھی اس دن یہ ہی ہوا تھا۔ وہاں بیٹھے اس

نے اس دن یہ طے کیا تھا' وہ اگلے دس سال میں ورلڈ بینک سے بڑا ادارہ بنائے گا۔ وہ دنیا کے اس مالیاتی نظام کو الٹ کر رکھ دے گا جس پر مغرب قابض تھا۔ وہ ساری عمر مغربی اداروں میں مغربی تعلیم حاصل کرتا رہا تھا۔ وہ مغرب کا مداح تھا' لیکن وہ مغرب کا مطیع نہیں بن سکتا تھا۔

ذلت بہت کم لوگوں کو مطیع بناتی ہے... تذلیل لوگوں کو منتقم المزاجی سکھاتی ہے... بدلہ لینے پر مجبور کرتی ہے... سالار سکندر نے اپنی پروفیشنل زندگی میں پہلی بار ایسی تذلیل چکھی تھی... ہتک... ذلت' تذلیل... جتنے بھی لفظ اس احساس کے لیے استعمال ہوسکتے ہیں۔ اس کو محسوس ہوئے تھے... مغرب کی مشینری کا ایک بہترین اور کارآمد پرزہ بن کر بھی وہ صرف ایک پرزہ ہی بن سکا تھا جس کی مدت میعاد اور ضرورت ختم ہونے پر اسے ناکارہ سمجھ کر پھینک دیا جاتا... وہ ساری عمر یہ سمجھتا رہا تھا۔ وہ اپنی قابلیت' اپنی مہارت' اپنے کام سے جزولاینفک بن چکا تھا۔ وہ خود کو اہم نہیں "اہم ترین" سمجھتا رہا تھا۔ اس کا یہ یقین خوش فہمی نکلی تھی۔

"تم مزید کسی ایشو کے بارے میں بات کرنا چاہتے ہو؟" الیگزینڈر رافیل نے بظاہر بے نیازی جتاتے ہوئے اس سے کہا۔

"نہیں..." وہ مزید کچھ بھی کہے بغیر اٹھ گیا تھا۔ رافیل بھونچکا رہ گیا تھا۔ وہ اسے اپنے بیوی' بچوں کی زندگی کے لیے گڑگڑاتا دیکھنا چاہتا تھا... اپنے پاسپورٹ کو ایشو کرانے کے لیے ورلڈ بینک کی اپروول اور تعاون کی بھیک مانگتے ہوئے اور پھر آخر کار ان ٹرمز اور کنڈیشنز کو مانتے ہوئے استعفیٰ دینے یا کانگو میں اس پروجیکٹ کو جاری رکھنے کی... جس کے لیے وہ کل یہاں بیٹھا تھا۔ لیکن سالار سکندر ان حالات میں بھی اٹھ کر چلا گیا تھا۔ رافیل کو لگا' اس کا ذہنی توازن خراب ہو گیا تھا۔

ہیڈ کوارٹرز کی عمارت سے اس طرح نکلتے ہوئے سالار کو خود بھی یہ ہی محسوس ہو رہا تھا جیسے اس کا ذہنی توازن خراب ہو گیا تھا۔ ورنہ وہ اتنا بے رحم اور بے حس تو نہیں ہو سکتا تھا کہ امامہ اور بچوں کے لیے وہاں کچھ بھی کہے بغیر آجائے۔ وہ وہاں کمپرومائز کرنے گیا تھا۔ اپنی بیوی اور بچوں کی زندگی بچانے کے لیے ان کی شرائط ماننے کی نیت سے وہاں گیا تھا۔ لیکن رافیل کے الفاظ اور رویے نے جیسے سالار سکندر کا ذہن ہی الٹ کر رکھ دیا تھا۔

"میں ان میں سے کسی سے بھی اپنی فیملی کی زندگی کی بھیک نہیں مانگوں گا۔ اگر گڑگڑاؤں گا تو بھی ان میں سے کسی کے سامنے نہیں گڑگڑاؤں گا۔ عزت اور ذلت دونوں اللہ کے ہاتھ میں ہیں۔ اللہ نے ہمیشہ مجھے عزت دی ہے۔ ذلت جب بھی میرا مقدر بنی ہے میرے فیصلوں' میرے انتخاب سے بنی ہے۔ میں آج بھی اللہ سے ہی عزت مانگوں گا... پھر اگر اللہ مجھے عزت نہیں ذلت دے گا تو میں اللہ کی دی ہوئی ذلت بھی قبول کروں گا' لیکن میں دنیا میں کسی اور شخص سے ذلت نہیں لوں گا... نہ جھکوں گا... نہ کمپرومائز کروں گا... کم از کم اب اس سب کے بعد نہیں۔"

وہ ریت کا ٹیلا بن کر اندر گیا تھا اور آتش فشاں بن کر باہر آیا تھا۔ وہ وہی لمحہ تھا جب اس نے امامہ اور اپنے بچوں کی زندگیاں بھی داؤ پر لگا دی تھیں۔

"امامہ... جبریل... عنایہ... یہ نعمتیں مجھے اللہ نے دی ہیں... کسی انسان سے تو کبھی بھی نہیں ملیں... تو پھر میں انسانوں سے ان کے لیے بھیک کیوں مانگوں۔"

وہ ضدی تھا' لیکن اس نے زندگی میں سوچا کبھی بھی نہیں تھا کہ ایک وقت ایسا آئے گا جب وہ امامہ اور اپنے بچوں کی زندگیوں کو اپنی ضد کے سامنے قربان کرنے پر تیار ہو جائے گا۔

سالار سکندر کو پھانسنے کے لیے جو پھندا تیار کیا گیا تھا' وہ اس سے بچ کر نکل گیا تھا اور جن لوگوں نے وہ پھندا تیار کیا تھا' انہیں اندازہ نہیں تھا۔ بساط کس طرح پلٹنے والی تھی' وہ اس کو مات دینا چاہتے تھے۔ وہ انہیں شہ مات دینا

چاہتا تھا۔

"اور اللہ بے شک بہترین تدبیر کرنے والا ہے۔"

☆ ☆ ☆

وہ دن ورلڈ بینک کے لیے بہت بڑی خوش خبری لے کر آیا تھا۔ پیٹرس ایباکا کوما کی حالت میں مر گیا تھا۔ سالار سکندر نے وہ خبر بینک سے واپس ہوٹل آکر ٹی وی پر سنی تھی۔ یہ اس کے لیے ایک اور دھچکا تھا۔ مگر یہ وہ خبر تھی جو اس کے لیے غیر متوقع نہیں تھی۔ وہ پیٹرس ایباکا کی جو حالت دیکھ آیا تھا' اس کے بعد اس کا دوبارہ نارمل ہونا ناممکن تھا۔ لیکن وہ رات ورلڈ بینک کے لیے' سیاہ ترین رات تھی۔

پیٹرس ایباکا مرنے سے پہلے ورلڈ بینک کی موت کا سامان کر گیا تھا۔

☆ ☆ ☆

"ایکسکیوزمی۔۔۔" وہ کہتے ہوئے اٹھ کر بار کی طرف چلی گئی تھی۔ اس کی نظروں نے جیکی کا تعاقب کیا۔ وہ بار کاؤنٹر پر بارٹینڈر سے بات کر رہی تھی۔ اس کے سیاہ بیک لیس لباس سے اس کی سفید خوب صورت پشت کمر کے خم تک نظر آرہی تھی۔

اس نے نظر ہٹاتے ہوئے اپنے سامنے پڑے اورنج ڈرنک کا ایک گھونٹ لیا۔ بہت عرصے کے بعد اس نے کسی عورت کے جسم پر غور کیا تھا اور بہت عرصے کے بعد وہ کسی عورت کے ساتھ اکیلے کسی بار میں بیٹھا تھا۔ وہ ایک ہوٹل کا بار روم تھا' لیکن وہ ایسی کسی جگہ پر بھی بہت عرصے کے بعد آیا تھا۔

وہ ہاتھ میں پکڑے گلاس سے دوسرا گھونٹ لے رہا تھا جب جیکی دو شیمپین گلاسز کے ساتھ واپس آگئی تھی۔

"میں نہیں پیتا۔" اس نے ایک گلاس اپنے سامنے رکھنے پر چونک کر اسے یاد دلایا تھا۔

"یہ شیمپین ہے۔" جیکی نے جواباً" ایک کندھے کو ہلاتے ہوئے بے حد گہری مسکراہٹ کے ساتھ اس سے کہا۔ اس کا اپنا گلاس اس کے ہاتھ میں تھا۔

"شیمپین شراب نہیں ہے کیا؟" اس نے جواباً" جیسے مذاق اڑانے والے انداز میں کہا۔ وہ ٹیبل پر پڑی سگریٹ کی ڈبیا سے اب ایک سگریٹ نکال کر لائٹر کی مدد سے سلگا رہا تھا۔

جیکی نے آگے جھکتے ہوئے بڑی سہولت سے اس کے ہونٹوں میں دبا سگریٹ نکال لیا۔ وہ اسے دیکھ کر رہ گیا۔ اس کی یہ حرکت بے حد غیر متوقع تھی۔ وہ اب اسی سگریٹ کو اپنے دائیں ہاتھ کی انگلیوں میں دبائے بائیں ہاتھ میں شیمپین گلاس پکڑے مسکراتے ہوئے سگریٹ کے کش لے رہی تھی۔

اس نے نظریں چراتے ہوئے سگریٹ کی ڈبیا سے ایک اور سگریٹ نکال لیا۔

"آؤ' ڈانس کریں۔" وہ جیکی کی آفر پر ایک بار پھر چونکا۔ وہ ڈانس فلور پر رقص کرتے چند جوڑوں کو دیکھ رہی تھی۔

بار روم میں اس وقت زیادہ لوگ نہیں تھے اور ان میں سے بھی صرف چند ایک ہی اس ڈانس فلور پر موجود تھے۔ جنہیں واقعی ڈانس کرنا تھا' وہ اسی ہوٹل کے نائٹ کلب میں موجود تھے۔

"میں ڈانس نہیں کرتا۔" اس نے سگریٹ کا کش لیتے ہوئے لائٹر رکھا۔

"آتا نہیں ہے؟" جیکی ہنسی تھی۔

"پسند نہیں ہے۔" وہ مسکرایا تھا۔ وہ ڈرنک کا گھونٹ بھرتے ہوئے عجیب سی مسکراہٹ کے ساتھ اس کی آنکھوں میں دیکھتی رہی۔ اس نے راکھ جھاڑنے کے بہانے نظریں چرائیں۔ جیکی کی مسکراہٹ مزید گہری ہو گئی

تھی۔

"شراب کبھی نہیں پی تم نے؟"

اس نے ہاتھ میں پکڑا گلاس میز پر رکھتے ہوئے کچھ آگے جھکتے ہوئے پوچھا۔ اس شخص کی نظریں ایک لمحہ کے لیے گلاس سے الجھی تھیں، پھر اس نے جیکی کو دیکھا۔

"بہت عرصہ پہلے۔" اس نے جیسے اعتراف کیا۔

"شیمپین؟" جیکی نے مصنوعی حیرت کے ساتھ کہا۔

"یہ بھی...." بے تاثر چہرے کے ساتھ اس نے ڈانس فلور کو دیکھتے ہوئے کہا۔

گلاس دوبارہ اٹھاتے ہوئے سامنے بیٹھے ہوئے مرد کے چہرے پر نظریں جمائے جیکی نے اپنی زندگی میں آنے والے پرکشش ترین مردوں کی فہرست میں اس کا شمار کیا تھا۔ وہ اس فہرست میں سب سے اوپر تھا۔ یہ اس کے جسمانی خدوخال نہیں تھے۔ جو اسے سب میں ممتاز کرتے تھے۔ اس کی زندگی میں شکل وصورت کے اعتبار سے اس سے زیادہ خوب صورت مرد آئے تھے۔ سامنے بیٹھے ہوئے شخص میں کچھ اور تھا جو اسے بے حد منفرد سب سے الگ بنا رہا تھا۔ اس کی بھاری مردانہ آواز، شائستہ رویہ، ذہین، تیز اور گہری آنکھیں اس کی مسکراہٹ یا پھر اس کی تمکنت اور رکھ رکھاؤ، وہ نہ چاہتے ہوئے بھی اس کی طرف ملتفت ہو رہی تھی اور بُری طرح ہو رہی تھی اور اس میں اس کا قصور نہیں تھا۔ وہ دعوے سے کہہ سکتی تھی کہ وہ مرد کسی بھی عورت کو متوجہ کر سکتا تھا۔ اس نے اس کے کریکٹر پروفائل میں پڑھا تھا کہ وہ عیاش نہیں تھا۔ اسے حیرت تھی، وہ کیوں نہیں تھا۔ اسے ہونا چاہیے تھا۔ اس پر نظریں جمائے اس نے سوچا اور بالکل اسی لمحے اس شخص نے ڈانس فلور سے نظر ہٹا کر اسے دیکھا۔ جیکی کی مسکراہٹ بے اختیار گہری ہوئی تھی۔ وہ بھی بے مقصد مسکرا دیا تھا۔ وہ بہت عرصے کے بعد کسی عورت کی کمپنی کو اتنا انجوائے کر رہا تھا۔ وہ خوب صورت تھی، اسمارٹ تھی اور وہ الجھا ہوا تھا، نہ ہوتا تو یہاں اس وقت دو گھنٹے ایک اجنبی عورت کے ساتھ کبھی نہ بیٹھا ہوتا۔

"تمہاری شیمپین!" جیکی نے اسے ایک بار پھر یاد دلایا۔

"تم لے سکتی ہو۔" اس نے جواباً گلاس کو اس کی طرف بڑھا دیا۔

"اگر پہلے پیتے تھے تو اب اس میں کیا برائی نظر آگئی تمہیں؟" جیکی اس بار سنجیدہ ہوئی تھی۔

"لطف حاصل کرنے کے لیے پیتا تھا، جب لطف ملنا ختم ہو گیا تو شراب چھوڑ دی میں نے۔"

وہ اس کی بات پر بے اختیار ہنسی۔ وہ اسے دیکھتا رہا۔ جیکی دونوں ہاتھ ٹیبل پر رکھتے ہوئے آگے جھکی اور اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے اس نے کہا۔

"کیا تم جانتے ہو، مجھے تم میں ایک ساحرانہ کشش محسوس ہوتی ہے۔"

وہ مسکرایا تھا یوں جیسے اس کے جملے سے محظوظ ہوا ہو۔

"زہے نصیب۔" اس نے جواباً کہا تھا۔

جیکی نے بڑے غیر محسوس انداز میں میز پر رکھے اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھا تھا۔ وہ ہاتھ ہٹانا چاہتا تھا، لیکن چاہتے ہوئے بھی نہیں ہٹا سکا۔ وہ اس کے ہاتھ کی پشت پر بظاہر غیر محسوس انداز میں انگلیاں پھیر رہی تھی۔ اس نے بائیں ہاتھ میں پکڑا سگریٹ ایش ٹرے میں بجھا دیا۔ وہ دونوں اب ایک دوسرے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے ایک دوسرے کو خاموشی سے دیکھ رہے تھے، پھر جیکی نے کہا۔

"کیا تم ایک رات کے تعلق پر یقین رکھتے ہو؟"

جواب فوری آیا تھا۔ "بالکل۔"

(باقی آئندہ ماہ ان شاءاللہ)

نادیہ جہانگیر

"سوری امی! میں آج نہیں آسکوں گی۔" کالج کے لیے تیار ہو کر تیز تیز چلتی وہ باہر آئی تھی' جب اس کے کانوں میں اپنی بھابی کی آواز پڑی۔ جو ٹی وی لاؤنج کے کونے میں پڑے فون پہ شاید اپنی ماں سے بات کر رہی تھیں۔ وہ ذرا سی دیر کے لیے رکی۔

"گڈ مارننگ۔۔۔" مسکرا کر بھابی کو صبح کا سلام پیش کرتی وہ ڈائننگ ٹیبل کی طرف آ گئی۔ بھابی نے سر کے اشارے سے سلام کا جواب دیا اور فوراً "اپنی ماں کو خدا حافظ کہتی اس کی طرف آ گئیں۔

"پراٹھا لو گی؟"

"اگر بنا ہے تو دے دیں' ورنہ اس بریڈ سے کام چل جائے گا۔"

"تم یہ بریڈ رکھو' میں ایک منٹ میں پراٹھا لے آتی ہوں۔" بھابی تیزی سے کچن میں چلی گئیں۔ وہ بھی اٹھ کر پیچھے ادھر ہی آ گئی۔

"آپ کی امی آج پھر آپ کو بلا رہی تھیں؟" وہ وہاں پڑی ایک کرسی پر بیٹھ گئی۔

"ہاں' ان کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے نا ان دنوں' اس لیے روز فون کرتی ہیں۔" آٹے کا پیڑا بناتے ہوئے بھابی نے بتایا۔

"تو آپ چلی جائیں نا۔ روز انہیں ٹال دیتی ہیں۔"

"آج خالہ کی کمر میں درد ہے' بس تم کالج میں ہو گی اور پیچھے ان سے کوئی کام نہیں ہو گا۔ میں نے سوچا کل چلی جاؤں گی۔"

توے پہ تیزی سے پراٹھا ڈال کر وہ اس کے لیے چائے بنانے لگیں۔

"بھابی! آپ کتنی اچھی ہیں۔ ہماری خاطر آپ اپنے میکے بھی نہیں جا رہیں۔"

"جانتی ہوں نا میں اپنے گھر کے حالات' پھر کیسے سب کچھ چھوڑ کے چلی جاؤں۔"

مسکرا کر بھابی نے کہا اور اس کے سامنے چائے کا کپ رکھ دیا۔ وہ تشکر سے انہیں دیکھنے لگی۔

"پھر یاد سے کل میکے چلی جایئے گا۔" اس نے کہا تو بھابی نے سر ہلا دیا۔ وہ ناشتہ کرنے لگی جب کہ بھابی فرحت بی کے لیے ناشتہ تیار کرنے لگیں۔

☆ ☆ ☆

"آپ آج بھی میکے نہیں گئیں؟" دوسرے دن وہ کالج سے لوٹی تو بھابی کو کچن میں گھسے پایا۔

"شام تک جاؤں گی۔ آج خالہ ڈاکٹر کے پاس گئی ہیں' عصر تک واپس آئیں گی۔" بھابی نے آٹا گوندھ کر سائیڈ پر رکھا اور ایک طرف پکتی ہنڈیا میں سبزی ڈال دی۔

"میرے خیال میں تو بھابی! میں آ گئی ہوں۔۔۔ اب آپ کھانا کھا کر چلی جایئے گا۔" اس نے محبت سے کہا تو بھابی سر ہلانے لگیں۔

"ہاں۔۔۔ ٹھیک ہے۔"

"اور اب آپ تیاری کریں۔ میں خود روٹی ڈال لیتی ہوں۔" سائیڈ پہ دوپٹہ ڈال کر وہ ہنڈیا میں چمچ ہلانے لگی تو بھابی مطمئن سی ہو کر باہر نکل گئیں' تب ہی اس کی آنکھوں پہ کسی نے ہاتھ رکھے تھے۔ وہ چونک سی گئی۔

"کک۔۔۔ کون؟"

"اپنے دل سے پوچھو۔" دانیال نے مسکراتے ہوئے اس کی آنکھوں سے ہاتھ ہٹا لیے۔
"ارے آپ ....؟" وہ جھینپی 'دانیال گہری نظروں سے اسے دیکھنے لگا۔
"آپ .... آپ کب آئے ....؟" وہ جز بز ہونے لگی۔
"اٹھائیس سال پہلے۔"
میرا یہ کہنے کا مطلب نہیں تھا.... میں تو۔"
"محترمہ! زیادہ کنفیوز نہ ہوں.... میں باہر پھوپھو کو چھوڑنے آیا تھا جو مجھے اندر لے آئیں.... اور ہاں.... آپ کے ہاں کچھ پانی شانی ہو گا؟" اس نے شرارت سے پوچھا تو وہ شرمندہ ہو گئی۔
"آئم سوری.... مم 'میں ابھی لائی۔"
"کہاں لائیں گی۔ میں تو یہیں ہوں۔" وہ شرارتاً گویا ہوا تو وہ اور نروس ہوئی.... ہاتھوں کی انگلیاں مروڑنے لگی۔ دانیال قہقہہ لگا کر ہنس پڑا۔
"آپ پانی باہر ہی لے آئیں۔ ورنہ یہاں تو پیاسا ہی مرنا پڑے گا۔"
وہ اس کی حالت کو یقیناً "انجوائے" کر رہا تھا۔ وہ اس پہ پیار بھری نظر ڈالتا باہر چلا گیا۔ اس نے کھل کر سانس لی۔ اسی وقت بھابی اندر چلی آئیں۔
"دانیال آیا ہے۔"
"ہاں نظر تو مجھے بھی آیا ہے۔" اپنی اتھل پتھل ہوتی سانسوں کو اس نے یکجا کرنے کی کوشش کی تو حیا سے سرخ پڑتے چہرے کو دیکھ کر بھابی مسکراتے ہوئے اس کے پاس چلی آئیں۔
"صرف نظر آیا ہے یا....؟" بھابی نے چھیڑنا چاہا۔
"بھابی پلیز۔" وہ روہانسی ہو گئی۔
"چلو بھئی۔ خالہ نے کہا ہے کہ دانیال کھانا کھا کر جائے گا۔ اب بریانی بھی بنانی پڑے گی۔ تم پیاز کاٹو' میں گوشت نکال لوں۔" وہ فریج کی طرف مڑ گئیں۔
"یعنی کہ آپ امی کے گھر نہیں جا سکیں گی؟" وہ افسوس سے بھابی کو دیکھنے لگی' بھابی لب بھینچ کر نفی

میں گردن ہلانے لگیں۔

✶ ✶ ✶

اگلے دن سنڈے تھا۔ اس کا ارادہ تھا کہ صبح صبح ہی وہ بھابی کو میکے بھیج دے گی۔ بھائی پچھلے دو ہفتوں سے کسی کام کے سلسلے میں شہر سے باہر گئے ہوئے تھے اور بھابی تب سے اپنے میکے نہیں گئی تھیں۔ بھابی کی ماں کا روز فون آتا بھابی کا کام کی وجہ سے ان کے ہاں نہ جانا اسے بہت شرمندہ کرتا تھا جب ہی صبح جلدی اٹھ کر اس نے خود ہی ناشتہ تیار کرلیا اور ٹیبل پہ لگا کر سب کو بلانے لگی۔

"ماہ نور! ناشتہ تو تم نے تیار کرلیا لیکن یہ بھول گئیں کہ ہم سنڈے کو حلوہ پوری کا ناشتہ کرتے ہیں۔" اس کی ماں نے بیٹھتے ہوئے کہا۔

"اوہ امی! یہ تو مجھے یاد ہی نہیں تھا.... اور ویسے بھی حلوہ اور پوری مجھے کون سا بنانا آتی ہے۔"

"تو پھر آپ مائرہ کو ہی ناشتہ بنانے دیتیں۔"

"امی! بھابی نے آج میکے جانا ہے جب ہی میں جلدی اٹھ گئی۔"

"تم سے کس نے کہا کہ مائرہ نے میکے جانا ہے؟" امی کا لہجہ سخت ہو گیا تو اس کی آواز ذرا سی آہستہ پڑ گئی۔

"بھابی! دو ہفتوں سے اپنی امی کی طرف نہیں گئیں، ان کی امی روزانہ فون کرتی ہیں۔"

"کرنے دو۔ اور یہ چلی جائے گی دو تین دن ٹھہر کر۔ ابھی میری طبیعت ٹھیک نہیں۔" امی نے حتمی انداز سے کہا تب ہی اس کی نظر پیچھے کھڑی بھابی پر پڑی۔ وہ شرمندگی سے انہیں دیکھنے لگی۔

"کوئی بات نہیں ماہ نور! میں دو تین دن میں چلی جاؤں گی۔ خالہ کی ذرا طبیعت سنبھل لے پھر۔" فرحت بی کے اندر اٹھ کر جانے کے بعد بھابی نے نرمی سے کہا تھا۔ وہ چپ چاپ ان کا چہرہ دیکھنے لگی۔

"لیکن بھابی....."

"پتا ہے ماہ نور... میکہ بنا بنایا ہوتا ہے جبکہ سسرال بنانا پڑتا ہے ایسے ہی جیسے نیا گھر بنانا ہو... اینٹ سے اینٹ جوڑنی ہو۔ اس کی تعمیر تک اس کے میٹریل کا باقاعدہ خیال رکھنا ہو۔" بھابی بڑی سمجھ داری سے کہہ رہی تھیں وہ سر ہلانے لگی۔

"اور ہاں ہم نے بھی اگلے گھر جانا ہے۔ آؤ میرے ساتھ، تمہیں ذرا حلوہ پوری بنانا سکھاؤں۔"

"ارے چھوڑیں بھابی۔ میں اتنی بامروت نہیں ہوں کہ خوامخواہ دوسروں کی خاطر اپنی جان جوکھوں میں ڈالوں.... میری سسرال میں اگر کسی کو حلوہ پوری کھانا ہوا تو خود ہی بنانا پڑے گا انہیں۔" اس نے چمک کر کہا تو بھابی ہنس کر برتن اٹھانے لگیں۔

✶ ✶ ✶

بھابی کو تین دن بعد امی نے میکے جانے کی اجازت دے دی تو وہ خوشی خوشی تیاری کرنے لگیں لیکن ابھی وہ نہا کر نکلی ہی تھیں، جب نور نے آ کر انہیں بتایا کہ اس کی دوست گل مہر آرہی ہے۔ ساتھ اس کا خاوند بھی ہے۔ گل مہر نور کی پکی دوست بلکہ سہیلی [illegible] ہی ہوئے تھے شادی کو اور وہ آج پہلی بار اپنے خاوند کے ساتھ ان کے ہاں آرہی تھی۔ ایسے میں ان کے لیے اسپیشل قسم کا کھانا تیار کرنا بنتا تھا.... ماں کے گھر جانے کے لیے بھابی نے جو کپڑے استری کر کے رکھے تھے، ان پہ ایک حسرت بھری نظر ڈال کر بھابی باہر نکل گئیں۔ نور بھی چھوٹے موٹے کام میں ان کی مدد کرنے لگی۔ بڑی بڑی ہانڈیاں اسے بنانی نہیں آتی تھیں سوائے روٹیوں کے روٹیاں وہ اچھی گول گول سی بنا لیتی تھی۔ لیکن ابھی کسی بھی قسم کا سالن یا پلاؤ وغیرہ اسے بنانا نہیں آتا تھا۔ تھوڑی بہت بھابی کی مدد کر کے وہ اپنے کمرے میں تیار ہونے چلی آئی۔ تیار ہو کر نکلی تو گل مہر کو اپنی ماں کے پاس بیٹھے پایا۔

"ہائیں! تم آ بھی گئیں۔" خوشی کے مارے بے ساختہ اس کے منہ سے چیخ نکلی تو فرحت بی کے پاس بیٹھ کر نئے گھر کی باتیں سناتی گل مہر نے جھٹکے سے مڑ کر اسے دیکھا اور دوڑتے ہوئے اس کے گلے آ لگی۔ بہت گرم جوشی اور بے تابی سے وہ کافی دیر تک ایک

دوسرے سے لپٹی رہیں تو ان کی یہ گرم جوشی فرحت بی کے ہونٹوں پہ مسکراہٹ پھیلا گئی۔

"بھئی۔ بس بھی کرو۔" مسکراتے ہوئے انہوں نے کہا تو دونوں جھینپ گئیں۔

"تم یہ بتاؤ۔ اتنے دنوں بعد تمہیں میری یاد آ کیسے گئی؟" الگ ہوتے ہوئے بے ساختہ نور کے منہ سے شکوہ ابھرا تو گل مہر مسکرانے لگی۔

"قسم سے تمہاری طرف آنے کا روز سوچتی ہوں مگر فرید کی امی بہت بیمار رہتی ہیں۔ اسی لیے گھر سے نکلنا بہت مشکل ہوتا ہے۔"

"ہاں 'ہاں 'اب تو تمہیں فرید 'فرید کی ماں اور فرید کے گھر والے ہی اچھے لگیں گے نا..." اس کی بات پر گل مہر ہولے سے ہنس پڑی۔

"بے وقوف رشتے تو سب ہی اچھے ہوتے ہیں چاہے وہ میکے والے ہوں یا سسرال والے۔ بس یہ ہے کہ سسرال والوں کو اہمیت ذرا زیادہ دینی پڑتی ہے کہ وہاں تاحیات قدم جو جمانے ہوتے ہیں۔"

"گل بیٹا بالکل ٹھیک کہہ رہی ہے۔ جب لڑکی شادی شدہ ہو جائے تو لڑکی کے لیے اولین ترجیح سسرال اور سسرال والے ہی ہونے چاہئیں۔" فرحت بی نے گل مہر کو سراہا۔ تو ماہ نور سر جھٹک کر ناگواری سے ان کی بات کو رد کرنے لگی۔

"ایسا بھی کیا... بندہ اپنے آپ کو دیکھے ہی نا۔ اپنی صحت 'اپنی خواہش اور اپنے احساسات سسرال جیسی بلا پہ قربان کر دے۔"

"کرنے پڑتے ہیں بی بی 'سب کچھ قربان کرنا پڑتا ہے۔ ابھی تم کنواری ہو... جب ہو گی نا تمہاری شادی 'تب تم سے پوچھوں گی۔" گل مہر نے جیسے اسے دھمکایا۔ وہ ہنس پڑی۔

"دیکھ لینا 'میں تمہارے جیسی جی حضوریاں نہیں کروں گی۔ چاہے مجھ سے کوئی خوش رہے یا ناخوش۔"

"میری پیاری بہن! شوہر اور شوہر کے گھر والوں کے دل جیتنے کے لیے ایسی جی حضوریاں کرنی ہی پڑتی ہیں۔"

"ارے جاؤ! ایسا بھی کیا سسرال نہ ہوا... کوئی بلا ہو گئی۔ میں تو نہ کسی کو خاطر میں لاؤں۔" اس نے جیسے ناک سے مکھی اڑائی۔

"یہ صرف ماں باپ کے گھر کی باتیں ہیں بیٹا! جب شوہر کے گھر چلے جاؤ تو اس کی مرضی اور اس کی خوشیاں ہی عورت کے لیے اولین ترجیح ہونی چاہئیں کیونکہ ایسے ہی میں گھر اور گھر کے مکین مضبوط رہتے ہیں۔"

"جی آنٹی بالکل۔ میری امی بھی یہی کہتی ہیں اور انہوں نے ہمیشہ مجھے یہی سمجھایا ہے کہ شادی کے بعد شوہر اور شوہر کے گھر والے ہی عورت کا سب کچھ ہوتے ہیں۔ ان کا خیال رکھنا 'ان کی قدر کرنا عورت کے کردار کو بلند کرتا ہے۔"

"گل بیٹا 'اس کی ممانی (ساس) بھی اب شادی کی تاریخ مانگ رہی ہیں۔"

"اس سے اچھی کیا بات ہے آنٹی... دو سال منگنی کو ہو گئے ہیں 'دانیال بھائی اپنی تعلیم مکمل کر کے بزنس بھی سیٹ کر چکے ہیں 'دو سال منگنی کو کافی ہیں۔

آپ بس انہیں بلا لیں اور اپنا فرض ادا کریں۔" گل مہر نے نہایت جوش سے فرحت بی کو مشورہ دیا۔

"ارے 'ارے ابھی کہاں 'ابھی تو میرے فائنل ایگزامز رہتے ہیں بھلا میں اتنی جلدی شادی کر سکتی ہوں۔"

"ایسے بہانے تو چلتے ہی رہتے ہیں ڈیر... فائنل ایگزامز کو کون سا اتنا وقت رہ گیا ہے 'صرف ڈیڑھ ماہ ہے... میں بھی تو سسرال ہی جا کے ایگزامز دے رہی ہوں... آنٹی ڈیڑھ ماہ بعد کی شادی کی ڈیٹ رکھ لیجیے گا۔"

"اپنے مشورے اپنے پاس ہی رکھو۔ مجھے نہ صرف آگے پڑھنا ہے بلکہ کچھ بننا بھی ہے۔" اس نے اس کے مشوروں کو فوراً مسترد کیا۔

"فضول کے بہانے ہیں یہ۔ لڑکی کی شادی کرنے کی عمر یہی ہوتی ہے۔ اگر اس سنہری دور کو کھو دیں تو آخری دور میں شادی کرنے کا فائدہ۔ آنٹی میری مانیں 'دانیال

بھائی کے گھر والوں کو بلالیں۔ بعد کی بعد میں دیکھی جائے گی۔" گل مہر نے نہایت سنجیدگی سے کہا تو وہ اسے چٹکی کاٹتی رہ گئی۔

اور پھر ایسا ہی ہوا تھا۔ فرحت بی نے اس کی ڈیٹ فکس کردی' وہ نہ' نہ ہی کرتی رہ گئی اور شادی کا دن بھی آن پہنچا۔

حجلہ عروسی میں دانیال کا آنا' اس سے اظہار محبت کرنا اس کے حسن کو سراہنا اس کی ہر "نہ" کو بھلا گیا۔

اور پھر ایسا ہوا دانیال کے پاس رہنا' اس کے کام کرنا' اس کی ہر بات ماننا اسے اچھا لگنے لگا' ممانی کی طبیعت و مزاج بہت سخت تھا' اسے شادی سے پہلے ہی ان کے سخت مزاج سے چڑ تھی' اب بھی ایسا ہی تھا لیکن وہ اس کا اظہار دانیال یا ممانی کے سامنے نہ کر پارہی تھی لیکن اس دن جب ممانی نے اسے بریانی بنانے کا کہا تو جواباً اس کا جز بز ہونا انہیں غصہ دلا گیا جس پہ انہوں نے اسے کافی سخت سست سنادیں۔

دانیال آیا تو روتے ہوئے اس نے اس کے سامنے ممانی کے رویے کا بتایا لیکن وہ حیران رہ گئی جب دانیال نے الٹا اسے ڈانٹا کہ وہ ذرا سی بات کو لے کر اسے ماں سے بدظن کرنے کی کوشش کررہی ہے۔

اسے جہاں ممانی پہ غصہ تھا وہیں دانیال پہ بھی کم نہ تھا کہ وہ حق پہ تھی پھر کیوں دانیال نے اس کا ساتھ نہ دیا۔ اس نے سوچا۔

وہ تھوڑی دیر کے لیے امی کے گھر چلی جائے تاکہ اس کا اپنا غصہ کم ہوسکے.... اس نے اپنے آنے کی اطلاع بھابی کو بھی دے دی۔

وہ تیار ہو کر کمرے سے نکلنے لگی۔ تو دانیال نے اسے اپنی بڑی بہن کے آنے کی اطلاع دی جس پہ اس نے سر جھٹک دیا کہ میں کیا کروں۔

وہ اسی تنفر سے باہر نکلی تھی جب ممانی کی آواز نے اس کے قدم پکڑ لیے۔

"میں تمہیں آخری بار کہہ رہی ہوں مریم.... تمہاری لڑائی تمہاری نند سے ہے تو تم اس کی سزا اپنی ساس اور شوہر کو کیوں دے رہی ہو۔ نند نے اگر تمہیں کچھ برا بھلا کہہ ہی دیا ہے تو تم ہی دل بڑا کرلو' معاف کردو اسے.... اور خبردار کوئی شکایت لے کر ادھر آئیں تو۔ سسرال کے جھگڑے سسرال ہی میں نبٹاؤ۔ ادھر آنا ہے تو خوشی خوشی ورنہ نہیں۔ یاد رکھو تمہاری پہلی ترجیح تمہارے شوہر کا گھر اور اس کے گھر والے ہونے چاہئیں' سمجھیں...." ممانی فون پہ لگی اپنی چھوٹی بیٹی کو نہایت ترشی اور سختی سے سمجھا رہی تھیں۔

ماہ نور ہکا بکا رہ گئی کہ اس کا سسرال بھی کسی کا میکا تھا اور میکے والے اپنی بیٹیوں کو وہی سبق دے رہے تھے جو ایک لڑکی کو اس کا گھر بسانے میں معاون ثابت ہوتا ہے۔

تب ہی اسے یاد آیا کہ بھابھی ابھی تک ان کے گھر کامیاب کیوں تھیں....؟ اور گل مہر جاتے ہی سسرال سسرال کا راگ کیوں الاپنے لگی تھی۔ کیونکہ عورت کا اصل اور پکا ٹھکانہ سسرال ہی ہوتا ہے۔ جسے عورت کو اپنے احساسات' جذبات اور خواہشات سے بڑھ کر چاہنا ہوتا ہے تب ہی تو عورت دوسرے گھر جاکر اسے اپنا گھر بناتی ہے۔

وہ گہری سانس لے کر واپس مڑی۔ بھابھی کا نمبر ڈائل کیا۔

"بھابی میں آج نہیں آسکوں گی۔ نیہا باجی آرہی ہیں' مجھے ان کے لیے کچھ کھانے پکانے کا انتظام بھی کرنا ہے.... اور آپ مجھے بریانی بنانے کی ترکیب تو بتا دیں۔ مجھے ابھی بنانی ہے۔" اس کی بات سن کر دانیال چونکا تھا اور پھر اس کے قریب آگیا۔

"تھینک یو۔" دانیال نے اس کا ہاتھ تھام کر کہا تو وہ اندر تک نہال ہوگئی۔ وہ ممانی کو ساتھ لگا کے بریانی بنا رہی تھی اور سوچ رہی تھی کہ اب حلوہ پوری بھی بنانا جلد ہی سیکھ لے گی۔

سائرہ رضا

"زندگی میں پہلی بار تو ہمارے گھر میں کوئی مہمان رہنے آرہا ہے.... اور آپ کو اس بات پر اتنا غصہ آرہا ہے۔" صومی کے سوال میں حیرت تھی۔

"اور کیا ہم اتنے غریب ہیں کہ کسی مہمان داری کو افورڈ ہی نہیں کرسکتے۔" سونی بے تحاشا دکھی ہوگیا یہ بات کہتے ہوئے.... منہ صومی کا بھی لٹک گیا۔ ہاں اس پہلو پر تو اس نے سوچا ہی نہیں کہ وہ کتنے زیادہ غریب ہیں۔

"او بے وقوف ہم غریب لوگ نہیں ہیں۔" صومی نے سونی کو ٹوکا۔ "ہم سفید پوش ہیں۔"

"سفید پوش؟ وہ کیا ہوتا ہے' میں نے چوغہ پوش پڑھا ہے' بچوں کی کہانیوں میں۔"

"اوہو۔" سونی کو ایک بالکل الگ سوال برا لگا۔ سونی موضوع سے ہٹ رہا تھا۔ اور موضوع' اس وقت ان کے سر پر آکھڑا ہوا تھا۔

"یہ فالتو کی بکواس ختم ہوگئی ہو تو چارپائی سے اٹھو۔ مجھے یہ چادر بھی دھونی نہیں ہے۔"

"اوہ؟" بہت دیر بعد آپا کے لب سے کچھ پھول چھڑے تھے۔ دونوں اب ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے۔ چادر اتارتی آپا کے چہرے پر پتھریلے تاثرات لوٹ آئے تھے۔

صومی نے چاروں جانب دیکھا۔ کھڑکیوں' دروازوں

کے پردے اتر چکے تھے تکیوں کے غلاف، تخت پوش، پنکھا پوش، کولر پوش، مٹکا پوش۔ یعنی کہ سب کچھ۔ دھلائی کے لیے زمین پر ڈھیر کی صورت پڑا تھا۔

"آپ نے تو سارا گھر ننگا کر دیا آپا!" صومی کے انکشاف پر سونی چونکا۔ آپا کے جنون کا کیا بھروسا۔ اگر ابھی ان کی نظر ان معصوموں پر پڑ گئی تو کیا ان کو بھی۔

"نہیں، نہیں۔" وہ خود میں سمٹا۔

سونی نے آپا پر نظر ڈالی۔ جو زمین پر کپڑے کی ڈھیریاں بنا رہی تھیں۔ مشین میں پائپ لگا ہوا تھا۔ سرف نیل۔ بلیچ اور آپا کا سوجا کپا منہ۔ دونوں دکھی ہوئے۔

"آپا کب تک ایسے خفا رہیں گی؟" سونی نے

مکمل ناول

پوچھا۔

"جب تک یہ کپڑوں کا ڈھیر دُھل نہیں جاتا۔" مومی مزاج آشنا تھا۔

یعنی مہمانوں کی آمد پلس رمضان کی آمد پلس غصہ، یہ صفائیاں ان سارے مسئلوں کا حل ہیں۔" سونی نے نکتہ پکڑا۔

بالکل، مومی نے سرہلایا۔

دونوں نے آپا کو دیکھا۔ جو آستین اوپر کو موڑتے ہوئے۔ شلوار اُٹنگتے کے بعد اب بالوں کو سر کے اوپر کس رہی تھیں۔

✡ ✡ ✡

توے سے اترے پہلے پھلکے اور دال کے بگھار کی شوں کی آواز کے ساتھ اشتہا انگیز خوشبو گہری نیند سوئے ازین کے نتھنوں سے ٹکرائی تو اس نے ٹچ بٹن کی طرح آنکھیں کھول دیں۔ ساتھ ہی اسے شدید بھوک کا احساس ہوا۔

"یہ بھلا کون سی دال ہو سکتی ہے۔" اسے پہلا خیال آیا۔ چنے کی دال پر پیاز کا بگھار لگتا ہے۔ لال مسور پر کڑی پتے کا۔ تو پھر یقیناً" چنے کی دال ہوگی اور یہ بھی یقین ہے کہ پیاز کے ساتھ زیرہ اور گول لال مرچ بھی بگھار میں شامل تھی۔

سامنے وال کلاک پر دن کا ڈیڑھ بجا تھا۔ اور نائٹ ڈیوٹی کرنے کے بعد یہ ازین کے لیے گہری نیند سونے کا ٹائم تھا۔ اس کے سر پر کھڑے ہو کر ڈھول بجالو یا اس کی چارپائی اٹھا کر چوک پر رکھ آؤ۔

بھلے سے سوئے ازین کی ناک یا کان میں جھاڑو کا باریک تنکا چلانا شروع کردو۔ پر اس کی آنکھ نہیں کھل سکتی تھی۔

مگر۔ مگر یہ جو صیام عرف صومی۔ اور ریان عرف سونی کی پیاری آپا 'پورے ڈیڑھ بجے روزانہ دالوں کو بگھار لگاتی تھیں اور ہانڈیاں بھونتی تھیں۔ اور سب سے بڑھ کر پھلکے اتارتی تھیں۔

ازین مر بھی رہا ہوتا تو ایک جھٹکا تو ضرور کھا لیتا۔

سب سے بڑی ستم کی بات یہ تھی کہ اس بے چارے نے آج تک خوشبو ہی سونگھی تھی۔ چکھنے کے مواقع تو وہ انگلیوں پر گن سکتا تھا۔ بس دو بار۔ ہاں ایک بار کھیر اور ایک بار نیاز کے چاول ہائے....

حالانکہ کھانے چکھنے بلکہ پیٹ بھر بھر کے کھانے کا سب سے زیادہ حق ازین کے نزدیک خود اسی کا تھا۔

کیونکہ وہ سب سے نزدیک ترین پڑوسی تھا بلکہ کرایہ دار تھا۔ اور اس پر حقداری اس لیے بھی زیادہ تھی کہ بے چارہ چھڑا تھا۔ وہ چھڑا جس کے بارے میں شاعر کہتا ہے۔

رناں والے ہاں دے لیکن پراٹھے تے چھڑیاں دی اگ نہ اُبلے (بیوی والوں کے گھر پراٹھے بنتے ہیں اور چھڑوں بے چاروں کے گھر چولہا بھی نہیں جلتا)

مگر یہاں صرف کھانے سونگھنے کی سہولت تھی، خوشبوئیں سارا بھید دیتی تھیں۔ ایک ایک مسالے کی پہچان ہو جاتی۔ مگر بات اس سے آگے کبھی نہیں بڑھی۔ دراصل صومی، سونی کی آپا کا فرمان تھا۔

"کرائے دار آئے دن بدلنے والی چیز ہیں، آج ایک تو کل دوسرا۔"

"آپ نے شیری، ثناء لوگوں سے بھی دوستی نہیں کرنے دی۔ حالانکہ وہ پانچ سال ہمارے کرائے دار رہے۔ ہمارے اسکول میٹ بھی تھے، مگر آپ کے منع کرنے کی وجہ سے ہم نے کبھی ان سے دوستی نہیں کی۔" سونی نے شکوہ کیا۔

"ہاں جبکہ ان کے گھر میں کیرم بورڈ بھی تھا اور انہوں نے ہمیں کھیلنے کے لیے بلایا بھی کئی بار۔" صومی کو یہ بات ہمیشہ یاد رہتی تھی۔

"بس میں نے کہہ دیا تو کہہ دیا۔" آپا کی فطرت میں قطعی پن تھا۔

ازین کے نئے مالک مکان یعنی آپا اور دو برادرز کے بعد ایک دادی نعمت آرا بھی تھیں جو پوتی سے بالکل الٹ تھیں۔

اور ازین سے خصوصی شفقت کا برتاؤ کرتی تھیں۔ جس پر پوتی یعنی آپا کو شدید اعتراض ہوتا۔ کرایہ دار

سے زیادہ بنانے نباہنے کی ضرورت نہیں اور ازین تک یہ فرمودات اور اس جیسے تمام ارشادات بہت آسانی سے حرف بہ حرف پہنچتے کیونکہ آپا زیادہ وقت کچن میں گزارتی تھیں۔ اور یقیناً" اس بات سے ناواقف تھیں کہ ان کی بڑبڑاہٹ تک کرائے کے کمرے میں صاف سنائی دیتی ہے۔

اور آپا بڑبڑاتی بھی با آواز بلند تھیں۔ دوسرے آپا کی آواز قدرتی بھاری تھی۔ جیسے حنا ربانی کھر۔ یا چلو رانی مکھر جی جیسی کرلو۔

اوپر سے ہمہ وقت کا خفا لہجہ۔ بلکہ کسی حد تک کرختگی کا عنصر بھی نمایاں ہو جاتا۔

صبح آپا' اپنے بھائیوں کو اسکول بھیجنے' تیار کروانے ناشتے' لنچ بکس کے بکھیڑے میں الجھی ہوتیں۔ بار بار گھڑی دیکھا کرتیں اور پکارنے کا انداز ہر بار بدل جاتا۔

"سورج سر پر کھڑا ہو کر ناچنے لگا ہے سونی' صومی سات بج گئے ہیں۔"

"سوا سات ہونے والے۔ چائے جل جل کر کالی ہو گئی مگر تم لوگوں کے کانوں پر جوں نہیں رینگتی۔ اب میں خود ہی آرہی ہوں۔ شرافت تم لوگوں کو راس نہیں۔"

ازین کو آواز کے اتار چڑھاؤ سے آپا کے موڈ کا اندازہ ہو تا تھا۔ وہ چھ سے چھ کی نائٹ بھگتا کر کوئی پونے سات بجے ہی گھر لوٹتا تھا۔ اور تالے میں چابی گھماتے ہوئے روزانہ ہی جملوں سے استقبال ہوتا۔

"ساڑھے سات ہو گئے سمجھو۔ آرہی ہوں میں۔ (پل بھر کی خاموشی) پوستیوں' بدمعاشوں۔ اٹھو (یا تو تکیہ مارا جاتا یا بڑے بڑے تھپڑ۔ وہ بھی لگاتار۔)

اس کے بعد کیا ہوتا تھا وہ ازین تصور کی آنکھ سے خود ہی دیکھ لیتا' محض دس منٹ بعد صومی' سونی ناشتے کے لیے کچن میں آجاتے تھے۔

یہاں بھی آپا کے فرمودات جاری رہتے۔

وہ پراٹھا کھانے پر اصرار کرتیں' ساتھ ساتھ دونوں کو ان کے عیب اور کوتاہیاں گنواتیں' راگ تو الاپتیں ہی۔

کبھی کبھار صومی جھنجلا جاتا۔ "آپ نے گھڑی بھی دس منٹ آگے کر رکھی ہے اور منہ سے ٹائم مزید دس منٹ آگے بتاتی ہیں۔"

"ہم خالی اسکول میں سب سے پہلے پہنچتے ہیں۔ لڑکے ہمارا انداق اڑاتے ہیں کہ صومی' سونی تو چوکیدار ہیں۔ سونی بھی ہمت کرتا۔

"فالتو بکواس نہیں۔" آپا جلال میں آجاتیں اور پھر وقت کی قدر' قیمت پر ایک لیکچر چلتا جو ازین کو ازبر ہو چکا تھا۔

صومی' سونی اسکول کے لیے روانہ ہو جاتے۔ گہری خاموشی چھا جاتی۔ کسی برتن کی آواز۔ ازین کی آنکھیں بند ہونے لگتیں۔

تب آپا کی آوازوں کا نیا سیشن شروع ہوتا مگر اس بار ساتھ دادی نعمت آرا کی آواز بھی ہوتی۔

"تھوڑا سا میٹھا تو چائے میں ڈال دے عینا!"

"دادی! آپ کو شوگر ہے۔"

"ارے سارے جسم میں چینی بھر گئی۔ مگر بس یہ بے چاری زبان ترس گئی مٹھاس کو۔"

"ارے عینا۔ اے بچے عینا۔ تھوڑا نمک ہی دے دے۔ کیسے اتاروں حلق سے پھیکا بے سواد سالن۔"

"آپ ہارٹ پیشنٹ ہیں دادی۔" ٹھہرا پر سکون جواب۔

"ارے آپا۔!" دادی یقیناً" سر پیٹتیں۔ "ان دو تکلیفوں سے مری نہ مری' ایک دن اس غم سے ضرور مر جاؤں گی کہ کھانے کو نہ ملا۔"

"دادی مارننگ شو لگالیں۔ وہاں کے تماشے دیکھتے ہوئے پتا نہیں چلے گا حلق سے کیا اتر رہا ہے۔"

"اے خواہ مخواہ! میرا معدہ ہے کہ لفٹ ہے۔ کیا گیا کیا اترا کچھ خبر نہیں۔"

عینا کی طرف خاموشی۔

"میں تو کہتی ہوں۔ جب مرنے کا طے ہے تو بھوکی کیوں مروں۔ کچھ کھا کر کیوں نہ مروں۔"

"تو بس آپ خود ہی سنبھال لیں کچن۔ جو دل چاہے پکا کر کھاتی رہیں۔ میری طرف سے صاف جواب ہے۔"

غضب خدا کا! ایک تو خیال رکھو۔ پتا ہے آپ کی وجہ سے ہم سب بھی یہی سب کھاتے ہیں مگر آپ کو خیال ہی نہیں۔ بس کل سے میں کچھ نہیں پکاؤں گی۔"
عینا کا انداز فیصلہ کن ہوتا۔

دادی یقیناً" گھبرا جاتیں۔ مگر تھیں تو عینا کی دادی۔ فوراً" پینترا بدل لیتیں۔

"ہاں اب یہی کسر رہ گئی تھی۔ ستر برس کی بڑھیا چولہا جھونکے گی۔"

آئے ہائے مولوی صاحب !کس کے سہارے چھوڑ گئے مجھ بڑھیا کو۔" دادی کو شوہر صاحب یاد آجاتے جو ابھی تین سال پہلے بیاسی برس کی عمر میں عدم کو سدھارے تھے۔ "کیسے کٹے گی یہ لمبی عمر۔"

ازین کو دادی کے یہ جملے بہت پسند آتے۔ لمبی عمر کہتے ہوئے دادی جیسے جملے کو کھینچتی تھیں اور ہُوکا بھرتی تھیں۔ ازین کو وہم گزرا دادی سترہ برس کی تو نہیں۔ مگر وہ ستر برس کی ہی ہیں۔ یہ عینا کے جل کے کباب ہوجانے والے لہجے کے جواب سے ہو گیا۔ ساتھ ساتھ آپا کے دانت کچکچانے کی آواز تک اسے سنائی دیتی۔

"کون سی لمبی عمر دادی۔ ستر برس بعد لمبی عمر نہیں رہتی۔ الٹی گنتی کا پھیرا ہوتا ہے۔ کب زیرو پر پہنچیں؟"

"ہائے عینا اب تو مجھے یوں مرنے کا کہے گی۔ کہ بڑھیا نکل لو۔ اب تمہارا کوئی کام نہیں۔ آئے ہائے۔" دادی باقاعدہ بین ڈالنے لگتیں۔

"ہائے عبد الغفار! ماں کو کس کے سہارے چھوڑ گیا۔"

دادی کو اپنا بیٹا یعنی آپا کے والد یاد آجاتے اور ساتھ ہی وہ یادِ ماضی میں کھو جاتیں جو سراسر دکھ کا باب تھا۔ ہر ورق غم زدہ۔ ہر سطر اندوہناک۔

پہلے دادی کے ہاں بچے ہوتے نہیں تھے پھر جب ہونے لگے تو بچتے نہیں تھے۔ شیر خوارگی میں ہی داغ مفارقت دے جاتے۔ بس ایک عبد الغفار بچ گیا۔ عبد الغفار کی شادی بھی جلدی کی۔ پہلے عینا ہوئی پھر عینا کے سالوں بعد اوپر تلے صومی اور سونی ہوگئے (ازین نے سالوں بعد کو پندرہ بیس سال سوچ رکھا تھا۔ وہی عینا کی بھاری آواز اور کرخت لہجہ۔ سنجیدگی)

دادی کی زندگی خوشیوں کے ہنڈولے میں جھولتی تھی۔ جب جھولتے جھولتے وہ جیسے منہ کے بل گریں۔ ہوا میں اوپر کو اٹھے جھولے کی زنجیر ٹوٹ جائے تو بندہ کتنی بلندی سے گرتا ہے ناں۔

روز مرہ کا سبزی گوشت لاتے عبد الغفار واہلیہ موٹر سائیکل حادثے کا شکار ہو کر وہیں جاں بحق ہو گئے۔

اس کے بعد کی کہانی روز دہراتی تھیں۔ وہ ہر روز بعد نماز عصر بیٹے بہو اور مولوی صاحب کی بخشش کی دعا کرتیں۔ اور با آواز بلند اس صدمے کا ذکر کرتیں جو انہوں نے اپنی جان پر جھیلا۔ اور ان مصیبتوں کا جو بچوں کو پالنے کے لیے کاٹیں (اور ایسے میں روز ہی آپا انہیں دلاسا دیتی تھیں اور اس وقت بہت ہمدرد دکھی محسوس ہوتی تھیں۔ جو کسی بھی طرح روتی دادی کو چپ کروادینا چاہتی ہیں)

مگر جب دادی محض نمک اور چینی پر مرنے والوں کو پکار پکار کر عینا کی شکایتیں لگا رہی ہوتیں۔ آپا بھی گویا کانوں میں روئی دے کر بیٹھ جاتیں۔

دادی جب جی بھر کے جی ہلکا کر لیتیں۔ تب یقیناً" وہی بدمزہ کھانا کھالیتی تھیں۔ اور پھر مکمل خاموشی۔ مگر صرف زبان بند ہوتی تھی۔ اب آپا جھاڑو لگا رہی ہوتیں۔ رگڑ رگڑ کر۔ اور ازین کو اسی مدھر سڑک سڑک سروں کے درمیان سونا پڑتا۔ اب تو وہ جھاڑو کی اس آواز کا اتنا عادی ہو گیا تھا کہ یہ آواز لوری کا کام دینے لگی تھی۔ کبھی جو آپا کو جھاڑو لگانے میں دیر ہو جاتی۔ ازین بستر پر کروٹیں بدلنے لگتا۔

(اور شکر اس کمزوری کا آپا کو پتا نہیں تھا۔ ورنہ وہ کرائے میں مزید اضافے لگا دیتیں بجلی، گیس، پانی اور کرایہ اور مینٹیننس آہ۔ ازین سوچ کر ہی کراہ اٹھتا۔

کرائے کا یہ کمرہ (گھر) دروازہ کھلتے ہی آنگن تھا۔ دائیں جانب ٹوائلٹ پلس واش روم اور کچن۔ جسے

ازین نے صرف سردیوں میں پانی ابالنے کے لیے استعمال کیا تھا۔ آنگن کے خاتمے پر ایک کمرہ۔ اسی کمرے کی بائیں دیوار آپا کے کچن کی دیوار تھی۔ اسی جانب آنگن میں کھلتی کھڑکی تھی اور وہیں ازین کا پلنگ بچھا تھا۔

وہ کمرے میں ہوتا تو کچن کی ساری آوازیں آتیں۔ وہ آنگن میں بائیں دیوار کے ساتھ چارپائی ڈال کر لیٹتا تو بھی کان کھلے رہتے۔

دراصل بائیں دیوار کے اس جانب امرود کا گھنا پیڑ تھا۔ ساتھ ہی ایک لمبا پپیتا۔ امرود کا آدھا سایہ مالک مکان کا اور آدھا کرائے دار کا۔ ازین لائٹ جانے پر اسی سائے میں دیوار کی طرف کروٹ بدل کر سوتا۔ جبکہ ادھر آپا۔ اپنے سارے کام، سینا پرونا، سبزی بنانا' دادی سے باتیں کرنا (اختلافی موضوعات) بھائیوں سے باتیں کرنا (زیادہ تر نصیحتیں) یا پھر عصر کے بعد محلے کے بچوں کی ٹیوشن کلاس لینا۔ سب یہیں نبٹاتی تھیں۔

اور ایسے میں ازین ایک لحاظ سے گھر کا بھیدی تھا۔ اسے بائیں جانب ہونے والی ہربات کی خبر رہتی۔ اب جیسے یہ آنے والے مہمان۔ آپا کے خیالات و جذبات نے ازین کو باقاعدہ ہلا دیا تھا۔ اب بھی وہ بائیں طرف کی ساری زندگی کو سوچتا دوبارہ نیند کی وادی میں کھونے لگا۔

بے سدھ ہونے سے پہلے جو جملے اس نے آپا کی زبان سے سنے وہ بھی اس متوقع مہمان داری سے متعلق تھے۔

☼ ☼ ☼

"اگر اسکول سے آکر تھکے ہوئے ہو تو سو جاؤ۔ ورنہ جالے اتار کر تم پردے لگا دو۔" آپا کی فیصلہ کن آواز گونج رہی تھی۔

"اور تم سونی! سرف ملے پانی میں کپڑا بھگو کر کھڑکیوں اور دروازوں کو رگڑ رگڑ کر صاف کر دو۔"

"جی آپا۔ جی آپا۔!" صومی، سونی ہم آواز بولے۔ کل آپا سارا دن ناراض اور چپ رہی تھیں۔ لہٰذا آج اختلاف نہ کرنے ہی میں بہتری تھی۔ دونوں نے ایک دوسرے کی آنکھوں میں دیکھا۔ صومی ہی زیادہ باہمت تھا۔

"یہ صفائی آنے والے مہمانوں کے لیے ہے؟"

"نہیں نہیں۔ رمضانوں کے لیے۔" سونی نے ٹوکا۔ "ہے ناں آپا؟"

"دونوں کے لیے۔" آپا نے اختصار مگر قطعیت سے کام لیا۔

صومی سونی نے مزید سوالات سے گریز کیا۔ (فی الحال)

"میں کہہ رہی تھی عینا کلو گوشت کے کباب چڑھا لیتے ہیں۔ افطاری بھی نبٹ جائے گی اور مہمان داری بھی ہو جائے گی۔" دادی کی آواز میں بھناپا سا تھا۔

"جی اچھا!"

"ماش کی دال چکی بھجوا دیتے' دہی بڑوں کے لیے آٹا بن جاتا۔ بیسن کی تو صرف پھلکیاں اچھی لگتی ہیں۔"

"صومی! راشن کی لسٹ میں لکھ لو۔ ماش کی دال دو کلو۔" عینا کی آواز صاف تھی۔

"ویسے تو اتنی گرمی کے روزوں میں گوشت کے نام سے ہول آتا ہے مگر سحری میں پاؤ بھر کی بوٹی سبزی میں ذائقہ لے آتی ہے۔" دادی کی نئی رائے آئی۔ "اپنے لیے نہیں کہہ رہی میں۔ اس بڑھاپے میں کیا کھایا جاسکتا ہے مگر۔" دادی کے لہجے میں تاسف سا گھل گیا۔

"جی دادی! مجھے پتا ہے آپ مہمانوں کے لیے کہہ رہی ہیں۔" آپا کے جملے میں سادگی تھی۔ مگر ازین کو صاف پتا لگا کس قدر جل بھن کر یہ جملہ کہا گیا ہے دادی اپنی ہی دھن میں تھیں۔

"گوشت کا تاں فائدہ رہتا ہے کچھ چیزیں بنا کر فریز ہو سکتی ہیں۔ کباب اور کوفتے مسالہ لگا کر قیمہ رکھ دو' دس منٹ میں بن جاتے ہیں۔ میرا تو یہ بھی ارادہ تھا کچھ بنوا لیتے مگر۔ جتنی بھی احتیاط کرلو پھر دوسرے دن پانی

چھوڑ دیتی ہے۔"

دادی کو کھیر کی اس کمزوری پر غصہ اور دکھ دونوں تھا۔

"صومی!" عینا کا ٹھنڈا ٹھار لہجہ ازین کو صاف محسوس ہوا۔

"رمضان والی لسٹ میں روز کے پاؤ بھر گوشت' قیمے کے حساب سے لکھ لو' آٹھ کلو گوشت۔ کباب کے لیے ملا کر نو کلو اور کوفتوں کا۔ ہاں تو لکھ لو دس کلو گوشت۔ اور آگے قیمت لکھ دو تقریباً" تین ہزار چھ سو اور چار جمعہ کے حساب سے بریانی بنے گی تو چکن لکھو چار کلو تو یہ بنے بارہ سو روپے۔

اور ہاں دودھ والے سے کہہ دینا کہ ایک کلو کی جگہ ڈھائی کلو دودھ دے رمضان میں۔ کیونکہ دادی نے دہی جمانے کا بھی گھر میں کہہ رکھا ہے اور فریج میں میٹھا خراب ہوتا ہے تو ظاہر ہے روز بنے گا۔ کلو سے کم کیا تو بل ایڈوانس لکھو 5000 روپے۔

آپا اس وقت صومی' سونی کے کرتوں پر بٹن ٹانک رہی تھیں۔ مگر بڑی ذمہ داری سے لسٹ بھی بن رہی

صومی تن دہی سے لکھ رہا تھا۔ جبکہ سونی حق دق تھا۔ جبکہ دادی نے وہیں کھڑے ہاتھ سے موٹا موٹا حساب کیا۔ تو دل سکڑنے لگا۔

"ہاں اور کھجور' شربت چنے بیسن کا حساب میں پہلے لکھوا چکی ہوں' پھل روز کے حساب سے آئے گا۔"

"پھل بھی!" سونی کی آواز میں بے یقینی تھی۔ رمضان آرہے تھے یا شاہی دعوت۔ یعنی کہ۔

"ہاں۔ ابھی تم نے سنا نہیں' دادی نے کیا کہا۔ ایسے ہی پھل کاٹ کر ٹرے بھر دینا تو بڑی بدسلیقگی ہے۔ لہٰذا فروٹ چاٹ تو لازمی بنے گی۔"

آپا کو دادی کے تمام فرمودات یاد تھے۔ ایسے ہی وہ کہتی رہتی تھیں عینا ان کی باتیں غور سے سنتی نہیں' خوامخواہ۔

"اور آپا! آپ نے فروٹ کا بجٹ تو دیا نہیں۔" صومی نے یاد دلایا۔

"فروٹ کا بجٹ۔ اس کے ریٹ تو ہر روز کے حساب سے ہونگے ناں۔ لیکن خیر تم۔ پانچ ہزار تک رکھ لو۔"

"اور آپا۔ وہ بجلی گیس کے بل۔ اسکول میں اور روٹین کے خرچے۔" سونی بھی الرٹ تھا۔

"وہ تو لازمی ہیں ان پر آندھی آئے طوفان۔ کسی چیز کا اثر نہیں ہوتا یعنی وہ تو کرنے ہی کرنے ہیں۔"

"اور عید کے کپڑے۔ میرا مطلب ہے جوتے۔" سونی کے لہجے میں جھجک تھی۔

"ہاں وہ بھی۔" عینا کا لہجہ لاپرواہ تھا۔

"تو آپا یہ تو کوئی چالیس پچاس ہزار کا خرچہ نہیں ہو گیا۔" صومی نے کچھ دہل کر' رجسٹر بند کر کے پین ہونٹوں کے بیچ پھنسایا۔

"اور ہماری کل آمدن تو بہت کم ہے' چالیس پچاس ہزار کے آدھے سے بھی کم۔"

"دو ہزار ازین بھائی کرایہ دیتے ہیں۔ چار ہزار دکان کا۔ پانچ ہزار ابو کی پنشن اور نو ہزار دادو کی تو۔ یہ تو بنے کل بیس ہزار اور ہاں آپ کی ٹیوشن

فیس۔ لیکن وہ تو تھوڑی ہے اور آپ کو کمیٹی بھی بھرنی ہوتی ہے۔"

سونی کے ماتھے پر تفکر کی لکیریں پھیل گئیں۔

اب مہمان داری تو نبھانی ہے نا۔" آپا کا انداز سادہ تھا۔ یہ لاتعلقی کی ایک قسم تھی۔ اس نے اب کچھ نہیں بولنا۔ اتنے دن سے سمجھا سمجھا کر تھک گئی تھی۔ مگر دادی سمجھتی ہی نہیں تھیں۔ لہٰذا اب وہ بولے گی بھی نہیں۔

یہاں تو ہر کام بجٹ بنا کر کرنے کی عادت تھی سو۔ حساب کتاب ہو رہا تھا۔ سونی۔ صومی نے فکر سے ایک دوسرے کو دیکھا۔ پھر دونوں کی نگاہ دادی پر گئی۔ جو ناک پر انگلی رکھے حیران سی عینا کو دیکھ رہی تھیں۔

بٹن لگا کر دانت سے دھاگا توڑتی آپا نے پہلے بھائیوں کو دیکھا اور پھر دادی کو۔ دادی کی نگاہوں میں

شدید بے یقینی تھی۔ جیسے عینا تو جھوٹی ہو۔ ورنہ دنیا میں ایسا بھی کوئی اندھیر ہے کہ۔

ہاں ٹھیک ہے کہ مہنگائی بہت بڑھ چکی ہے۔ چٹکی بھر چیزوں کے لیے مٹھی بھر نوٹ دینے والی مثال ہو گئی۔ مگر ایسا بھی کیا کہ دو "فقط دو معزز مہمانوں کو دو وقت کا کھانا بھی عزت سے نہ کھلایا جا سکے (رمضان کے باعث دو وقت سحری، افطاری) یہ عینا کو تو بات بڑھا چڑھا کر اور خاص طور پر دادی کو ہولانے کا شوق ہے۔ یہ بھی نہیں دیکھتی بوڑھی بیمار دادی کو صدمہ نہ پہنچے۔

دادی نعمت آرا نے سب حساب کتاب کو آپا کے بڑھانے چڑھانے کے زمرے میں ڈالا اور پرسکون ہو گئیں۔

"اب ایسی بھی کوئی بات نہیں بچو۔" مخاطب پوتے تھے مگر جتا وہ عینا کو رہی تھیں۔ "مان لیا مہنگائی کا زمانہ ہے۔ اور رمضان میں منافع خوری ہوتی ہے۔ مگر پانچ افراد کے نام پر پچاس ہزار کا خرچا۔ ایسی بھی قیامت نہیں مچی۔"

"آپ ٹھیک کہتی ہیں دادی۔" عینا کے فوراً قائل ہونے پر سننے والوں کو حیرت ہوئی۔ "اسی لیے میں نے یہ بھی فیصلہ کیا ہے کہ اس بار راشن خریدنے میں نہیں، آپ جائیں گی۔ میں آپ کو پیسے پکڑا دوں گی، جو جیسا جتنا دل چاہے خریدیے گا۔ اور اگر پیسے بچ جائیں جو کہ آپ یقیناً بچا بھی لیں گی تو میری طرف سے وہ بھی آپ ہی رکھ لیجیے گا۔ اور جہاں دل چاہے خرچ کیجیے گا۔ میں نہیں مانگتی۔"

"آئے کیا؟" دادی نے تو زبان دانتوں تلے داب لی۔ پھر انہیں لگا شاید سننے میں غلطی کی ہو۔ مگر وہاں بلا کی سنجیدگی تھی۔

"واقعی۔ سچ۔" صومی، سونی کے دو لفظوں میں اچھنبا تھا۔

(باقی پیسے دادی کے۔ آپا تو سکے تک کا حساب لینے والوں میں سے تھیں)

"اب اس عمر میں۔ پوتی بازاروں کے دھکے لگوائے گی اور مجھ سے تو اب کچھ جانچ پڑتال بھی نہیں ہوتی۔ سب خراب اٹھا لے آؤں گی۔

"سونی صومی آپ کے ساتھ ہوں گے۔"

"اے عینا! مجھے تو اب صحیح سے دکھتا بھی نہیں۔"

"چشمہ لگا کر جایے گا۔"

"آئے ہے مجھے کیا مصیبت پڑی ہے کہ بیٹھے بٹھائے بازاروں کو نکل پڑوں۔"

"بیٹھے بٹھائے کیا۔ آپ بھی ذرا گھر سے باہر نکلیے تاکہ پتا لگے دنیا اب کس بھاؤ بکتی ہے۔"

آپا اپنی کہہ کر جگہ سے اٹھ گئیں۔ دادی، پوتے حق دق۔

✡ ✡ ✡

جوس کارنر پر بیٹھے ازین کے دماغ میں دادی، پوتی کی گفتگو چکرا رہی تھی۔ ازین کی نانی کہتی تھیں۔ ہمسائے کا مطلب ہے ہم سا ہی یعنی جیسے ہم ویسا ہمارا پڑوسی۔ دیوار نکال دیں تو گھر ایک ہو جائے۔ اور یہ کہ ہمسائے ماں جائے تو نہیں ہوتے مگر ساتھ ماں جائے کی طرح کا ہی نبھاتے ہیں زندگی بھر کا اور یہاں تو ازین کرائے دار بھی تھا۔ اور چاہتے اور نا چاہتے ہوئے۔ جانے انجانے میں ہی سہی وہ بائیں جانب ہونے والی ہر بات اور واقعہ سے واقف ہو جاتا۔

شروع میں تو اسے ان آوازوں نے ڈسٹرب کیا تھا۔ مگر بعد میں یہ ایک مزے دار سا کھیل بن گیا۔ آوازوں کے اتار چڑھاؤ سے اس نے بولنے والوں کی شکلیں گھڑ لیں۔ دادی ایسی۔ اور بچے ایسے۔ اور آپا۔ ایسی اور ویسی۔

دادی سے تو ایڈوانس دیتے اور کرائے کی بابت بات چیت کرتے ہوئے بالمشافہ ملاقات بھی ہوئی۔ اور بچے بھی مل جاتے (مگر آپا کی ہدایات کے پیش نظر وہ زیادہ گھلتے ملتے نہیں تھے)

ہاں آپا سے کبھی ملاقات نہ ہوئی۔ البتہ آپا کی پاٹ دار آواز اور لہجے کی تلخی) سے خوب آشنائی ہوئی اور وہ اس حد تک آ گیا تھا کہ آپا کی آواز یا فقط

کسی ایک آدھ لفظ ہی سے 'موڈ' بتا سکتا تھا۔
اور ادھر آپا کا یہ خراب موڈ اور گھر میں پندرہ بیس روز سے چلنے والی چپقلش نے تو ساری صورتحال واضح کر دی تھی۔
وہ آپا کے مزاج و خیالات سے مزید تفصیل سے آگاہ ہو گیا۔ آپا کی شخصیت کے کچھ اور پہلو نمایاں ہو گئے۔ ورنہ عام طور پر تو آپا دادی کے پرانے قصوں پر ہوں ہاں ہاں کرتی تھیں یا پھر کبھی کبھار رائے دیتیں۔ ٹیوشن والے بچوں سے سخت استانی کا سا رویہ اور بھائیوں کی تربیت و نصیحت۔ مگر یہ نئی صورت حال۔
دراصل یہ سارا قصہ اس دن شروع ہوا جب دادی نعمت آرا کی کپکپاتی جوشیلی پکار نے سب کے کان کھڑے کر دیے۔ اور سویا ازین تک ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔

☼ ☼ ☼

عینا کو پہلے تو دادی نعمت آرا کی ساری بات سمجھ میں نہ آئی۔ وہ چلا اٹھی۔
"اتنا قریبی رشتہ!" اس نے خوب کھینچ کر کہا۔
"تو اور کیا قریبی نہیں لگ رہا تمہیں۔"
آپ کی چچا زاد بہن کی بیٹی کی بیٹی اپنے بیٹے کے ساتھ ہمارے گھر آ رہی ہیں۔ اتنے بڑے شہر بلکہ اس پورے ملک میں آپ کے علاوہ ان کا اور کوئی رشتے دار نہیں؟"
"اے اگر ہو بھی تو۔ جب میں نعمت آرا زوجہ مولوی صاحب یہاں موجود ہوں۔ تو انہیں کیا ضرورت ہے ادھر ادھر رشتے تلاشنے کی۔ خالہ لگتی ہوں میں اس کی۔" دادی کو تو برا ہی لگ گیا۔
"تو اتنے سگے رشتے کی یاد آنے میں اتنے سال۔"
عینا کا لہجہ طنزیہ تھا۔
"یاد تو وہ کرتی ہو گی' اس لیے کہ یاد کرنے پر ویزے پاسپورٹ اور کرائے نہیں لگتے۔ اس نے تو پھر امریکہ سے آنا تھا۔ یہاں تو لوگ شہر کے ایک کونے سے دوسرے کونے کی یاد میں عمریں گزار دیتے ہیں۔
دادی کچھ تلخ بیانی پر اتر آئیں 'جس بھرے پرے خاندان کو یاد کرنا اب زندگی کا مقصد تھا گویا۔ وہ ایک ہی شہر میں رہنے کے باوجود غربت زدہ یتیمی والے گھر میں آنے سے کتراتے تھے۔ ایسی اندھیر پڑی تھی۔ خوشی میں بلانا بھول جاتے۔ اور غمی میں دھڑلے سے گلے کرتے۔
آپ نے تو ملنا ہی چھوڑ دیا نعمت آرا۔"
اور نعمت آرا کیا جواب دیتیں یونہی مسکرا دیتیں ایک شرمسار سی مسکراہٹ 'جیسے وہی ہوں قطع تعلق کی ذمہ دار۔ اس وقت بھی۔ بہت خوش دادی 'یکدم خاموش ہو گئیں۔ تب آپا نے بھی چپ کر جانا مناسب سمجھا۔
بڑھاپے میں ایسے لوگ ہی تو درکار ہوتے ہیں۔ جن کے ساتھ مل کر کچھ پرانے سنہری اوراق کو پلٹا جا سکے۔ کچھ کہنے کی خواہش۔ کچھ سننے کی طلب۔
تو اگر آنے والے مہمان 'دادی کی اس خواہش کو پورا کرنے کا باعث بن جاتے تو کیا برائی تھی۔ ٹھیک ہے آ جائیں آنے والے۔
صومی' سونی بھی خوش ہو گئے۔ بہت سے رشتوں کا سنا ضرور تھا مگر دیکھا صرف دادا' دادی اور بڑی بہن کو تھا۔
اور اب ان ہی تنہا اکیلے لوگوں کے بیچ رہنے آ رہے تھے' دو مہمان۔
آپا گھر چلاتی تھیں۔ بڑے نپے تلے انداز سے دادی کی بیماری' دوائیاں۔ بھائیوں کے لیے اچھی تعلیم کی کوششیں اور آج کے اس زمانے میں کوئی کوشش بار آور نہیں ہوتی جب تک نوٹوں کا تڑکا نہ لگایا جائے۔ نوٹوں کو بچایا نہ جائے۔ دانتوں سے پکڑا نہ جائے۔
اور آپا ان کاموں میں طاق ہو چکی تھیں۔ اپنے بجٹ سے ایک انچ آگے پیچھے نہ سرکتی تھیں۔ لیکن وہ مان گئیں دادی کا دمکتا چہرہ دیکھ کر۔ مگر دادی کی دوسری بات۔ اوخدا۔

☼ ☼ ☼

"شادی۔ دادی۔!" آپا کے دونوں لفظ شدید ترین

حیرت اور کسی حد تک چیخ تھے۔

"یہ کس نے کہا؟"

"آئے کس نے کہنا ہے میں نے سوچا ہے بھئی۔"
دادی کے لہجے میں فخر ہی فخر تھا جیسے آپا کی شادی کا نہ سوچا ہو، علامہ اقبال کی طرح ایک نیا ملک بنانے کا خواب دیکھ لیا ہو۔

"او خدا...!" آپا نے اپنی پھٹی پھٹی آنکھیں بھائیوں پر ٹکا دیں، جن کے لیے بھی یہ انکشاف حیرت مگر مسرت کا باعث تھا۔

"اس امریکہ پلٹ بھانجی کے بیٹے سے۔ جس کے نہ سر پیر کا پتا ہے نہ آگا پیچھا۔ ویسے تو کہتی ہیں رشتے چھان پھٹک کر کرنے چاہئیں۔"

"اب سگی بھانجی کے لیے کیسی چھان پھٹک۔ اور اس کے آگے پیچھے کو میں نہ جانوں گی تو پھر کون جانے گا۔ جو ہمارا آگا پیچھا۔ وہی ان کا۔"

دادی کا ہوم ورک پورا تھا ایسے ہی منہ سے بات نہیں نکالی تھی۔ مگر آپا کے تو چودہ طبق روشن ہو چکے تھے۔

"خدا کے لیے یہ بات اب کسی اور کے سامنے مت دُہرا دیجیے گا۔ لوگ مذاق بنائیں گے کہ بڑھاپے میں نعمت آرا کا دماغ چل گیا ہے۔"

"آئے لو۔" دادی نے ناک پر انگلی جمائی۔ "اپنی بچی کی شادی کے بارے میں سوچنے والے کیا ادھر سے خالی ہو جاتے ہیں۔" دادی نے ناک والی انگلی کنپٹی کے پاس پیچ کس کی طرح گھمائی۔

"بچی کی شادی کے بارے میں سوچنے کو نہیں کہہ رہی۔ مگر آپ جوڑ تو دیکھیے ناں۔"

"جوڑ ہی جوڑ۔ تم سے تو کوئی سات آٹھ برس بڑا ہی ہوگا نازنین کا لڑکا" دادی بے فکر تھیں۔

"دادی! آپ اتنی ہی معصوم ہیں یا واقعی بڑھاپے کا اثر ہو گیا ہے؟"

وہ زچ ہو گئی۔ اور ادھر دادی بھی بھڑک اٹھیں۔

"یہ کیا تم نے بڑھاپے بڑھاپے کا راگ الاپنا شروع کر دیا۔ ایسا بھی کون سا بڑھاپا۔ ہیں بولو۔ میری اپنی دادی نوے برس کی عمر میں سارے گھر کے کام نبٹا دیتی تھیں۔ پیدل چلا کرتیں، کنویں سے پانی نکالتیں اور۔"

"بس دادی۔ اپنی دادی کا قصہ مت شروع کریں۔ مجھے کوئی دلچسپی نہیں کہ آپ کی دادی کیا کرتی تھیں۔ میں تو بس یہ سوچ رہی ہوں کہ میری دادی کیا کر رہی ہیں۔"

"اب تم بہت بول لیں عینا۔ خاموش ہو جاؤ میں بہت سوچ سمجھ کر اس فیصلے تک پہنچی ہوں۔ اس سے اچھا رشتہ تو مل ہی نہیں سکتا۔" دادی نے رعب سے کہا۔

"ایک بات بتایئے" عینا چونکی تھی۔ "یہ واقعی آپ کے اپنے خیالات ہیں یا آپ کی ان بھانجی نے کوئی اشارہ دیا ہے۔"

دادی نے کچھ چونک کر پوتی کو دیکھا۔ نکتے کی بات تو اب کی تھی۔ صومی، سونی بھی آپا کی عقل و شعور کے قائل ہوئے۔ دادی کو کچھ پل کے لیے چپ لگ گئی تھی۔ مگر عینا کی نوکیلی سوالیہ نگاہیں ہنوز ان پر گڑی تھیں جواب تو دینا ہی تھا۔

"ایسی باتیں منہ پھاڑ کر تو نہیں کہی جاتیں۔" دادی کا لہجہ و انداز مدہم ہو گیا۔ "انسان اپنی عقل خود سے استعمال کر لیتا ہے۔ اپنے جوان بیٹے کو لے کر لاکھوں روپے کا ٹکٹ خرچ کر کے کوئی خوامخواہ کا سفر تو نہیں کرتا۔"

"اوہ دادی!" آپا نے سر پکڑ لیا۔ "آپ کتنی خوش فہم ہیں۔"

"ہاں ہاں خوش تو میں ہوں ہی۔" دادی جھومیں۔

"میں نے خوش فہم کہا ہے دادی۔" عینا نے دانت کچکچائے۔

"اے بی بی۔ اپنا فہم اپنے پاس رکھو اور مجھ کم عقل کو صرف خوش ہی رہنے دو بڑی آئیں ارزو دان۔ اونہہ! میں نے کیا یہ بال دھوپ میں سفید کیے ہیں۔"

دادی اب جلال میں آ گئی تھیں۔ عینا نے کچھ کہنے کے لیے لب کھولے مگر صومی، سونی کو کچھ ہڑبونگ

کے عالم میں نشست بدلتے دیکھ کر وہ جملہ بھول گئی۔ دونوں آنگن والی چارپائی سے برآمدے کی کرسی پر آگئے تھے۔

"تم دونوں کو کیا ہوا؟" آپا کا لہجہ کڑک مگر اچھنبے سے بھرپور کسی حد تک فکر مند تھا۔

"کچھ نہیں۔" دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا، کچھ بھی تو نہیں۔"

"تو کیا چارپائی پر کیڑے نے کاٹ لیا۔ کرنٹ لگ گیا کیا۔ ابھی میں نے کرسیوں پر کشن رکھے تھے۔" عینا صفائی و سلیقے کے معاملے میں بھی دوٹوک تھی۔

نہیں، وہ دادی نے ابھی کہا ناں کہ۔" صومی کچھ ہچکچاتے ہوئے بولا۔

"دراصل دادی کہہ رہی ہیں ناں کہ بال دھوپ میں سفید ہو جاتے ہیں۔ تو ہم دونوں کے سروں پر دھوپ پڑ رہی تھی۔ تو ہم نے سوچا کہ جگہ بدل لیں ابھی تو ہم بہت چھوٹے ہیں ناں تو.... سفید بال۔"

"ہائیں...." عینا آپا کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ جبکہ دادی نے ہاتھ کا پنکھا بمشکل کوشش سے آگے ہو کر دونوں کے شانوں پر باری باری مارا۔

"دادی کا مذاق بناتے ہیں نالائق!"

"آپ ہی تو کہتی ہیں۔ احتیاط علاج سے بہتر ہے۔" صومی شانہ سہلا رہا تھا۔

"ایسے فالتو کے ناٹک مہمانوں کے سامنے کرنے سے گریز کرنا۔ سمجھے۔" دادی کو یاد آیا کہ بچوں کو کچھ مینرز بھی سکھا دیے جائیں۔ (حالانکہ زیادہ خطرہ عینا کی طرف سے تھا)

"نہیں نہیں۔ ہم تو بہت اچھی طرح مہمانوں کی دیکھ بھال کریں گے۔ ان کا خیال رکھیں گے ان کا...."

"چپ.... بالکل چپ.... مہمان کیا دودھ پیتے بچے ہیں جو تم دیکھ بھال کرو گے۔ ان کا خیال رکھیں گے۔" دادی نے نقل اتاری۔

"تم لوگ بس انسان کا بچہ بن کر رہ لینا، وہی کافی ہو گا۔"

"ہاں ہاں!" دونوں بھائیوں نے ایک دوسرے کو دیکھا۔ "ہم آپ کی ساری باتیں مانیں گے دادی.... اب دونوں کی نگاہیں آپا پر تھیں۔ جو جبڑے بھینچے ماتھے پر تفکر کی لکیریں اور آنکھوں میں غصہ لیے اب دادی کے ساتھ ان دونوں کو بھی گھور رہی تھیں۔

"آخر کو ہماری آپا کی شادی کا سوال ہے۔" سونی نے جملہ مکمل کیا۔ لہجہ ذمہ دارانہ تھا۔ دادی کے چہرے پر رونق آگئی جبکہ عینا کے تیور بھیانک ہو گئے۔

"بکومت.... اور خبردار جو تم لوگ اس معاملے میں بولے تو...." عینا واک آوٹ کے لیے کھڑی ہو گئی۔

"آخر آپ کو اعتراض کس بات پر ہے آپا.... اچھا ہے ناں، آپ رات و رات امریکی ہو جائیں گی۔" صومی تھوڑا باہمت تھا۔ شیر کی کچھار، مطلب آپا سے سوال تو پوچھ ہی سکتا تھا۔

"خاموش ہو جاؤ۔ تمہیں اس معاملے میں بولنے کی ضرورت نہیں۔"

"ضرورت کیوں نہیں۔" صومی فوجی جوان کی طرح کھڑا ہو گیا۔ سونی نے بھی تقلید کی۔

"آخر ہم آپ کے بھائی ہیں۔" صومی کا انداز و لہجہ بھروسے سے بھرپور تھا۔

اور دو.... دو بھائیوں کی بہن کو پریشان ہونے کی کوئی ضرورت نہیں ہوتی۔ اس کے بھائی ہوتے ہیں ناں۔ اگر آپ کو امریکی دولہا پسند نہیں آئے گا تو بس بات ختم۔" سونی کا انداز فلمی ہو گیا۔

عینا کے چہرے کا تناؤ کم ہو گیا۔ اس نے ہمیشہ بڑا بن کر زندگی گزاری تھی۔ دادی تک اکثر اسے آپا کہہ کر بلاتی تھیں۔ وہ سیاہ و سفید کی مالک تھی۔ گویا اچھا برا.... چھوٹا، بڑا ہر فیصلہ بہت بچپن میں خود سے کرنا شروع کر دیا تھا۔ جگت آپا بن گئی تھی۔ ٹیوشن پڑھنے والے بچوں کی مائیں جو اس سے عمر میں دوگنی ہوتی تھیں وہ بھی نام کے بجائے آپا ہی پکارتیں۔

نام تو شاید لوگ جانتے ہی نہیں تھے۔ بس آپا.... صرف آپا یا عینا آپا....

تو آپا.... یعنی عینا آپا.... اپنے ابا کی نور عین کے لیے بھائیوں کے بچگانہ لہجے والے یہ بھاری بھرکم جملے....

یوں تھے جیسے کسی نے اس پر چادر ڈال دی۔ اس کے آگے آکھڑے ہوئے کہ پہلے ہم..... اور ہم ہیں ناں۔ اور کوئی کچھ نہ بھی کرے۔ کر نہ سکے مگر بس کہہ دے کہ ہم ہیں ناں فکر مند مت ہونا۔ تو آپا نے یعنی **عینا** اوہ ہو نور عین نے اپنی زندگی میں پہلی بار اس پل کو دیکھا محسوس کیا بہت چھوٹے سہی دو سہارے اس کے بھی ہیں۔

نور عین کو اپنے دل کا کمزور ہو کر پگھلنا پہلی بار برا نہ لگا۔

☆ ☆ ☆

دادی کا خیال تھا آپا نے بس یونہی غصے میں کہہ دیا تھا۔ اس بار شاپنگ کرنے آپ ہی جائیں گی۔ مگر اس وقت سپر اسٹور میں ٹرالی کو گھسیٹتے صومی، سونی کے ساتھ گھسٹتی وہ اس پل کو کوس رہی تھیں جب آپا نے یہ سب کہا۔

"اندازہ ہو گا ناں اسے ادھر کتنی خواری ہے۔ اے سی کے باوجود وہ پسینے میں تربتر تھیں۔" اچھی خاصی گھر کے نزدیک ہی سے چیزیں منگوائی جا سکتی تھیں۔ مگر اس نے جان بوجھ کر مجھے بھیجا، پتا ہو گا ناں ادھر کیسا حشر پڑا ہے۔"

دادی کے مخاطب دونوں پوتے تھے۔ جو صبر سے ٹرالی گھسیٹنے اور دادی کے جملے سننے کو کھڑے تھے۔

"آئے بیٹا..... تپا کرنا ادھر کیا مفت میں بٹ رہا ہے سامان، جو دھکے پڑ رہے ہیں۔" دادی کی صدا نے گردو پیش میں کھڑے لوگوں کے لبوں پر مسکراہٹ بکھیر دی۔

"اے لو! روزے رکھنے ہیں مسلمانوں نے کہ تیل پینا ہے۔" کوکنگ آئل والے پورشن میں پڑی آپا دھاپی نے دادی کے ہوش اڑا دیے۔

بیسن خریدنے میں دانتوں کو پسینہ آگیا۔ "آئے اتنا بیسن تو دنبوں کو کھلاتے ہیں پیٹ پھلانے اور زیادہ وزن دکھانے کے لیے۔"

"دادی! آپ خاموش کیوں نہیں ہو جاتیں۔ سب لوگ آپ کی باتیں سن رہے ہیں۔" صومی تنگ آیا پڑا تھا۔ "بھائی لوگ ہنس بھی رہے ہیں۔" سونی کی نظر ہر جانب تھی۔ "سوچ رہے ہیں ہوں گے یہ پینڈو لوگ پہلی بار کسی بڑے سپر اسٹور میں آئے ہیں۔"

"ہم تو ہر مہینے آتے ہیں بس یہ ہماری دادی کا فرسٹ **ایکسپیرینس** ہے۔" صومی نے ذرا بلند آواز میں کہا۔

آخری والا بھی کہہ دے بچے..... میں نہ آتی ادھر کبھی دوبارہ۔" دادی نے کانوں کو ہاتھ لگائے، پتا ہو گا اس **عینا** کی بچی کو یہاں غدر پڑا ہے۔ جب ہی مجھے دھکیلا ورنہ یہ میری عمر ہے کیا دھکے کھانے کی۔"

"آئے اوئی....." ساتھ ہی دادی پیچھے کو مڑیں، انہیں پیچھے سے دھکا لگا تھا پیچھے والی ٹرالی میں رکھے، چھوٹے کچن **وائپر** کا نکلا ڈنڈا کب سے ان کی پسلی میں چبھ رہا تھا۔

"اے بیٹا.....! ان کا مخاطب پچھلی ٹرالی والا تھا۔ "پھنس گئی ہوں ادھر آکر..... نہ پیچھے ہٹنے جوگی نہ آگے بڑھنے کے قابل..... تم نے بھی وائپر کو دونالی کی طرح میری کمر سے ہی لگا لیا۔"

ٹرالی والا جوان شرمندہ ہو گیا۔ "سوری اماں! آپ رش دیکھ ہی رہی ہیں۔"

"آئے بیٹا رش کیا..... خدا کی شان دیکھ رہی ہوں۔ سچ کہوں، قحط زدہ قوم لگ رہی ہے۔ کھانے پینے کی اشیا کے لیے پاگل ہوتے لوگ۔"

"روزہ تو بھوکے کی بھوک کے احساس کا نام ہے۔ ادھر تو سب کو اپنی ہی پڑی ہے۔ سارا سال اتنے نہ کھاتے ہوں گے جتنا اس ایک مہینے میں کھا جائیں گے۔"

دادی ایک مفکر عالم دین کا سا لہجہ لیے ہوئے تھیں۔ رش میں ذرا ذرا سرکتے لوگوں کے لیے دادی دلچسپی کا باعث بن گئی تھیں۔

"اماں! آپ بھی تو یہی سب خریدنے آئی ہیں۔" کسی نے بھری ٹرالی کو دیکھ کر جتایا۔

"ہاں بیٹا!" دادی نے ٹھنڈی آہ بھری۔ یہ بھی صحیح

کہا مگر میرے گھر تو میری پوتی کے رشتے والے آرہے ہیں ناں۔ تو مجبوری پڑگئی۔ اور اب یہ تو نئے زمانے کا چلن ہوگیا ہے... ہمارے زمانے میں تو کپڑے کا تھیلا سلتا تھا۔ اچھی چیز خریدو یا سستی سب اندر غائب... بڑے بزرگ کہتے تھے کھانے پینے کی چیزیں ڈھک کر لانی چاہئیں کہ نہ کسی کی نظر لگے، نہ کسی کو حسرت آئے۔"

پر یہ آج کے لوگوں کو تو نظر کا بھی ڈر نہیں۔"

دادی سچ مچ حیران تھیں۔

"اب تو بڑھاپے نے اس حال میں پہنچا دیا۔ میں تو خود کپڑے کا تھیلا پکڑتی تھی سر پر برقعہ ڈالا گول مارکیٹ چلی گئی یا لالوکھیت اب یہ نئے نئے ناموں کے اسٹور... کم بخت مارے بھاؤ تاؤ بھی نہیں کرنے دیتے۔"

آئے میں کہتی ہوں... ادھر تو چوری کے اتنے موقع ہیں پھر کیسے ممکن ہے موئے ہاتھ صاف نہ کرتے ہوں۔" دادی نے سادگی اور بھول پن کی حد کردی۔

"اماں ادھر جگہ جگہ کیمرے لگے ہیں۔ ہر چیز ریکارڈ ہوتی ہے۔" کوئی بولا۔

"کیمرے..." دادی کی آنکھیں پھیلیں۔

"ہاں اماں! خفیہ کیمرے ہو سکتا ہے یہ سر پر لگا بلب کیمرہ ہو۔ یہ جیم کی بوتل بھی کیمرہ ہو سکتی ہے۔" ایک اور بندے نے بھی سنسنی کو بڑھاوا دیا۔

"اے صومی... سونی... کس قدر نالائق اولاد ہے۔ ذرا جو بڑوں کی عزت کا خیال ہو۔" دادی یکدم اشتعال میں آگئیں اور شدید شرمندہ، دادی سے کسی قدر اجنبی کا تعلق بنے پوتوں کو باری باری دو ہتھڑ رسید کیے۔

"اب ہم نے کیا کر دیا دادی... صومی، سونی کو رشتے کا پاس تھا۔ سونی نے تھپڑ کی تکلیف برداشت کر لی مگر پلٹ کر اس قدر تماشا بنوانی دادی کی طرف دیکھا نہیں۔

"تمہیں پتا تھا کہ ادھر جگہ جگہ کیمرے لگے ہوئے ہیں۔"

"ہاں دادی...! اب تو سیفٹی کے لیے ہر جگہ کیمرہ لگا ہے۔" صومی بے زار تھا۔

"اف آپا...! خود شاپنگ کی سزا دادی کے لیے تھی؟ بیڑہ غرق تو ان دونوں بھائیوں کا ہوا تھا۔"

"ارے گدھے... تو مجھے پہلے بتانا تھا ناں۔" دادی کے چہرے پہ سراسیمگی پھیلی۔ سونی یک لخت کرنٹ کھا کر مڑا... اس نے دادی کو دیکھا اور پھر چاروں جانب کی دنیا کو، جو سب خریداری بھول بھال بس دادی کو سنتے تھے اور اب دیکھ بھی رہے تھے۔

"اوخدا!" سونی دادی کے نزدیک ہوا۔

"آپ نے کہیں کچھ اٹھا تو نہیں لیا... چپکے سے؟" صومی کا رنگ فق ہوگیا سونی کا تو حلق پہلے ہی خشک ہوگیا تھا۔ اور سونی نے لاکھ سرگوشی کی تھی مگر کئی کانوں میں پڑی تھی۔

"اے منحوس مارے... میں کیا کوئی چور ہوں۔" دادی کو تو جیسے کسی نے گریبان سے سرعام پکڑ لیا۔ مارنے کو ہاتھ بڑھایا مگر سونی ذرا ڈرا ہوا تھا۔ بازو کا گوشت تو چونٹنے میں نہ بھر سکا شرٹ ہی نچوڑ ڈالی۔

"تو پھر اتنا صدمہ کس چیز کا... کیمرہ لگے نہ لگے۔" سونی کسی سے نظریں نہیں ملا پا رہا تھا۔ شرٹ کی ساری استری خراب کر دی۔

"ارے نابنجار... میں اس لیے جوڑے کی جگہ اپنا نیا چکن والا سوٹ پہن آئی۔ اور بال بھی اچھے سے بنا لیتی۔ مگر یہ آج کل کی اولاد اپنی پینٹوں کی کریزیں بنانے سے فرصت ملتی تو دادی کے لیے کچھ سوچتے۔"

"دادی!" صومی، سونی کی بے یقین صدمانی آواز ایک ساتھ ابھری جبکہ دوسری طرف جہاں تک دادی کی آواز پہنچ رہی تھی۔ قہقہے گونجنے لگے تھے۔

لوگ سب بھول بھال کر گردنیں اچکا اچکا کر دادی کو دیکھنا چاہ رہے تھے۔ دادی، جو ہاتھوں سے بالوں کو سنوارتے ہوئے اب دوپٹے کو درست کر رہی تھیں۔ نگاہیں اوپر جیم کی بوتل پر تھیں۔ بے خبری تک تو ٹھیک تھا اب جبکہ انہیں کیمرہ کی موجودگی کا پتا تھا تو... بعد کی ساری شاپنگ صومی، سونی نے کسی قدر سکون

سے کی کہ دادی کی زبان بند تھی۔ وہی چیزیں لیتے رہے جن کے بارے میں لسٹ میں درج تھا۔

ورنہ اس سے پہلے تو دادی باآواز بلند ہدایات جاری کر رہی تھیں۔

"اے صومی! وہی کیچ اپ اٹھانا جس کے ساتھ چاٹ مسالا فری ہے۔ اور وہی صرف لے جس کے ساتھ برتن دھونے کا صابن دے رہے ہیں۔" جبکہ کنجوس محتاط آپا... کوالٹی پر کمپرومائز نہیں کرتی تھیں۔ مگر دادی کو کون سمجھاتا۔

مگر یہ دنیا... اسٹور میں موجود تمام لوگوں کی نظریں پھر بھی دادی... اور صومی 'سونی پر تھیں۔

کیونکہ تھک ہار کر دادی پر زور فرمائش کر کے بچوں کی طرح ٹرالی کے اندر جا بیٹھی تھیں۔ اور صومی 'سونی ایک ہاتھ میں سامان پکڑے دوسرے سے ٹرالی کو دیکھتے۔ اپنی پیدائش پر افسوس کرتے 'دادی کو لیے اسٹور سے باہر تک آئے۔ پہلے سارا سامان رکشے میں بھرا پھر دادی کو بمشکل تمام ٹرالی سے نکال کر رکشہ میں گھسیڑا اور محاورتاً "نہیں حقیقتاً" منہ چھپا کر بھاگے۔

✡ ✡ ✡

"آپا یہ طلعت بھائی جان تو بالکل بھی ایسے نہیں ہیں جیسے ڈراموں کے ہیرو ہوتے ہیں۔" سونی کے سوال میں مایوسی تھی۔ جیسے وہ چاہتا ہو آپا کہہ دیں، نہیں یہ ہیرو جیسے ہیں۔

اور ہیرو تو وہ پہلی نظر میں ہی نہ لگے تھے۔ دوسری تیسری نظر بلاوجہ کی محنت ہی ہوتی۔

اونچے لمبے سے... سریالوں سے بھرا تھا۔ یونہی بلاوجہ کی کرخت نگاہیں اور بے حد سنجیدگی... سانولے نقوش میں کوئی جاذبیت نہیں تھی۔ کھلے ہاتھ پیر کا ایک آدمی... ہاں ایک پکا آدمی... لڑکے والی تو کوئی بات تھی ہی نہیں۔

"نہیں، ہیرو تو وہ ہیں۔" آپا کی آواز ٹھنڈی آہ کی صورت تھی۔ ایک عجیب سی ناقابل فہم مسکراہٹ بھی تھی۔

"اچھا... افسانوں والے ہیرو... سچ۔" صومی نے کون سے افسانے پڑھے تھے۔ آپا نے تو پڑھے تھے بہت سارے... اب صومی کو کیا پتا ہیرو کتنی قسموں کے ہوتے ہیں۔

"افسانوں میں طلعت نام کا ہیرو نہیں ہوتا۔ وہ اتنا کرخت چہرے اور روکھے رویے والا بھی نہیں ہوتا۔ بے تاثر آنکھیں تو بالکل نہیں ہوتیں۔ افسانوں کے ہیرو کا نام بہت خوب صورت ہوتا ہے۔ وہ منہ سے نہ بولے تب بھی آنکھوں سے سب کہہ دیتا ہے۔ ملنسار ہوتا ہے۔ محبت 'خیال سے گندھا' بے غرض اور..." آپا خلا میں دیکھتے ہوئے ہیرو کی خصوصیات کھوج رہی تھیں۔

"تو پھر آپ کیوں کہہ رہی ہیں کہ وہ ہیرو ہیں۔" سونی کو یہ دوہرے جواب پسند نہیں آرہے تھے۔

"بہت بھولے ہو تم دونوں۔" آپا کا لہجہ مدھم ہو گیا۔ مگر لہجے میں در آنے والی حسرت 'کم مائیگی... مایوسی اور ایسی ہی کتنی ساری کیفیتیں صاف محسوس ہو رہی تھیں۔

"ہیرو والی کوئی بھی کوالٹی نہ ہونے کے باوجود وہ ہیرو اس لیے ہیں کہ ایک غریب یتیم... بے آسرا اس بڑے سے شہر بلکہ اس بڑی سی دنیا کے کسی کونے میں بے نام ونشان لڑکی... جو شاید خوب صورت بھی نہیں ہے 'سیدھی سادی پرائیویٹ بی اے اور سب سے بڑھ کر جس کی عمر ہر گزرتے سیکنڈ میں گھنٹوں کے حساب سے بڑھتی ہے۔ ایسی لڑکی کو پسند کرنے والا... اپنی زندگی کا حصہ بنانے کا خواہش مند ہیرو ہی کہلائے گا ناں اتنا باہمت... اتنا دل والا..."

آپا لمبے جواب کے بعد تھک گئی تھیں شاید... لہسن چھیلنے میں جت گئیں۔ اور کیا یہ بھائی لمبا جواب فقط سننے سے تھک گئے تھے۔ جو خاموشی اتنی طویل ہوئی کہ جون کی گرمی سے بڑھ کر محسوس ہونے لگی۔

"آپ اپنا مذاق اڑا رہی ہیں آپا!" صومی صدمے میں گھرا بہت دیر بعد بول پایا تھا۔ لیکن اس سے پہلے کہ آپا ایک جھوٹا سچا جواب دیتیں۔ سونی کی شاکڈ آواز آئی،

وہ جیسے کسی کنوئیں کی گہرائی سے بول رہا تھا۔

"آپ میں اتنی برائیاں ہیں آپا؟"

آپا کے ہاتھ رک گئے اور نظریں اٹھ گئیں۔

"اور یہ آپ کو کس نے بتائیں۔ ہمیں تو آج تک نہیں پتا چلا۔ ہم تو کہتے ہیں دنیا کی سب سے بہترین آپا.... صرف ہماری **عینا** آپا ہیں۔ آپ مجھے صرف اس شخص کا نام بتا دیں جس نے آپ کے بارے میں یہ بکواس کی ہے۔"

صدماتی لہجہ کچھ جارحانہ اور منتقم ہو گیا۔ سونی کے نتھنے پھڑکنے لگے تھے۔ اس کا چہرہ بھی سرخ ہو گیا تھا۔ وہ اپنے اشتعال پر قابو نہیں پا رہا تھا۔

"یہ باتیں کبھی کوئی زبان سے نہیں کہتا۔ سمجھنے کی ہوتی ہیں۔" آپا کا جواب قطعیت لیے ہوئے تھا۔

"آپ اتنی بری باتیں سوچتی ہیں آپا!" سونی کو آپا کی سوچ کی کمتری پر افسوس ہوا تھا۔

"ہمیں تو آپ ہمیشہ پازیٹو رہنے کا درس دیتی تھیں۔" صومی کو بھی صدمہ تھا۔

"ہاں تو، میں اب بھی پازیٹو ہوں.... اتنا سب ہونے کے باوجود میں اپنی قسمت پہ روتی نہیں بصبر و شکر کرتی ہوں۔ اور اس بات پر یقین رکھتی ہوں کہ اللہ نے یقیناً "میرے لیے بہت کچھ اچھا سنبھال کر رکھا ہے۔" جو وقت آنے پر مجھے مل جائے گا۔ میں مایوس یا بدگمان تو نہیں۔" آپا اب مسکرائی تھیں۔

مگر صومی، سونی کے لبوں پر ذرا پھیلاؤ نہ آیا۔

"تو طلعت بھائی جو کہ بالکل بھی ہیرو نہیں ہیں۔ آپ پھر بھی ان سے شادی کرنے کو تیار ہیں۔" صومی کے لہجے میں بڑا پن آگیا۔ جیسے وہی تو اصل فیصلہ ساز ہو۔

آپا نے چند پل سوچ کر جواب کے لیے لب کھولنے چاہے، مگر تب ہی سونی کو جیسے کچھ یاد آیا۔ اس نے ہاتھ اٹھا کر چپ رہنے کا اشارہ دیا۔ اسے پہلے ایک ضروری سوال پوچھنا تھا۔ جو دراصل سب سے زیادہ اہم تھا۔

"بھائی! یہ مت پوچھ کہ آپا ان طلعت بھائی سے شادی پر تیار ہیں، یہ پوچھو یہ دراصل شادی کس قسم کے شخص سے کرنا پسند کریں گی؟"

صومی تو صومی.... آپا تک کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ ہمیشہ ایک قدم پیچھے رہنے والا اس کا چھوٹا سا بھائی، جو ہر بات پوچھتا تھا اور وضاحت کے بغیر تسلی نہیں پاتا تھا۔ اتنی گہری بات کر دے گا وہ بھی اس قدر سنجیدگی سے....

اور **عینا** نے سوچا وہ کیا بتائے، کس قسم کا آدمی.... وہ عمر، معاشرتی رتبے، شکل و صورت کے جس مقام پر کھڑی تھی۔ وہاں تو بس شکر ادا کرنا رہ جاتا کہ وہ اب بھی پسند کر لی گئی ہے اور گھر بس جائے گا۔ دادی کی بے چینی کو قرار آجائے گا۔ دادی جو بہت خوش تھیں بے حد، بے حساب، یہ حقیقت تھی کہ نازنین کے بیٹے سے نور عین کا رشتہ کر دینا، یہ خواہش کرنا ایک قیاس و قیافہ تھا کہ یوں بھی ہو سکتا ہے یا اگر ہو جائے۔

تب **عینا** نے اس بات کو ان کی خوش گمانی کے خانے میں ڈال دیا تھا۔ مگر وہ حیران رہ گئی جب نازنین نے اپنی آمد کے ساتھ ہی نور عین کا ماتھا چومتے ہوئے کچھ اس قسم کے روایتی جملے بولے، جو دادی کی امیدوں پر پورا اترتے تھے۔ دادی نے چمکتی جتاتی نگاہ سے **عینا** کو دیکھا تھا۔ **عینا** نے نگاہیں جھکا لی تھیں۔ دادی کا اعتماد اور جوش و خروش حد سے سوا ہو گیا۔

اور اس کے بعد کسی چیز کی گنجائش بچتی ہی نہیں۔ متوقع منگیتر طلعت گھر کے اندر ہی ہوتا تھا، **عینا** نے کوئی گھونگھٹ نہیں کاڑھا تھا۔ وہ اپنی روٹین کے فرائض انجام دیتی۔ پھر رمضان کے باعث ویسے بھی ہر شے بڑی سلو موشن میں ہو جاتی ہے۔ ہاں وہ طلعت کو آتا جاتا دیکھ کر ایک پل کو خاموش ضرور ہوتی تھی یا ایک سرسری سی نظر ڈال کر دوبارہ مگن....

اور یہ سرسری نظر ہی بتاتی تھی۔ کسی حد تک بے زار مگر مروت میں بندھا شخص.... جو ہمہ وقت ایک بہت بڑی سکرین والے جدید موبائل کے ساتھ لگا رہتا۔ دادی بڑی محبت سے اسے لے کر بیٹھتی تھیں۔ تو جواب اتنے مختصر ہوتے عموماً "ہوں ہاں" کہ دادی کو بات برائے بات میں شدید پریشانی ہونے لگتی۔

گفتگو تو تب ہی بڑھتی ہے ناں.... جب باہم کی

جائے۔ اب ایک ہی بولے تو تو بات نہیں بنے گی۔ شخصیت بھی تب ہی کھلتی ہے۔ جب خیالات کا اظہار کیا جائے۔ جبکہ دادی نے یہ تک بڑی مشکل سے جانا تھا کہ وہ کھانے میں سب سے زیادہ شوق سے کیا کھاتا ہے۔

کسی کو مائل کرنے کے لیے پہلے قائل کرنا پڑتا ہے۔ متوجہ کرنا پڑتا ہے۔ آپا کو ایسی کوئی ضرورت محسوس نہیں ہوئی۔ جبکہ ادھر ضرورت تھی ہی نہیں۔ موصوف نے تو صومی.... سونی تک کو ہوں.... ہاں سے آگے بڑھنے نہیں دیا تھا اور وہ دونوں کون سی لگی لپٹی رکھتے تھے۔ دادی کو جتا دیا۔ اتنے چپ "اکڑو اور اجنبی سرد آنکھوں والے آدمی کو بھائی بنانا مشکل کام ہے" کجا کہ دولہا بھائی۔

دونوں کے پاس پوری ایک لسٹ تھی جس کے مطابق انہیں یہ شخص اچھا لگا ہی نہیں تھا۔ مگر دادی.... انہوں نے اپنے مخصوص انداز میں دونوں کو جھاڑ دیا تھا۔

"ارے امریکی ہے وہ امریکی.... تمہاری ہماری طرح باتوں کے چسکورے ہوتے یہ امریکی تو آج اتنی ترقی کر لیتے.... نہیں ناں۔"

"یعنی امریکہ کی ترقی کا راز چپ رہنے بلکہ گم صم رہنے میں ہے۔ اتنا پراؤڈ تو اوباما بھی نہیں ہو گا جتنا کہ۔"

"تو پھر یہ طے ہوا کہ آپا کو شادی کے بعد دو دو کام کرنے ہوں گے۔"

"دو دو کام...." صومی سمجھا نہیں۔

"اپنے حصے کا تو بولیں گی.... دولہا بھائی کے حصے کا بھی بولنا پڑے گا۔"

اس نکتہ دانی پر دونوں بھائیوں نے ہاتھ پر ہاتھ مارا اور دادی کا ناراض ہنکارا سنا۔

"تو جب بات یہاں تک پہنچ جائے تو پھر سوال کے کیا معنی.... مگر...."

"میں ان سے شادی کر لوں گی صومی! سونی!" عینا سوچوں سے ابھری تو فیصلہ سنایا جس نے دونوں کو چونکا دیا۔

"اوہ ہو.... وہ تو آپ کریں گی ہی...."

"آپ صرف یہ بتائیں کہ آپ کیسے آدمی سے شادی کرنا چاہتی ہیں؟"

"میں نے کبھی اس بارے میں سوچا ہی نہیں۔"

"تو اب سوچ لیں.... یہ کون سا مشکل کام ہے اور دیکھیں ہمیں بہلانے کی کوشش نہ کریں۔ ہم سب جانتے ہیں اور ہمیں شریک راز کر کے آپ گھاٹے میں نہیں رہیں گی۔"

اور بھائیوں کے لہجے میں کچھ تھا۔ عینا بولنا شروع ہو گئی۔

اس نے کبھی محل گاڑیوں کے خواب نہیں دیکھے تھے۔ اور رشتے اپنے جیسوں میں طے کرنا چاہئیں ایک اجنبی شخص ' اجنبی ماحول.... سب کچھ اجنبی وہ ریوڑ سے بچھڑی بکری نہ بن جائے گی سات سمندر پار.... اور وہ اپنی دادی اور بالخصوص چھوٹے بھائیوں کو چھوڑ کر شادی کے نام پر اتنا دور بستا ہی نہیں چاہتی تھی۔

"تو آپ اس آدمی کی کوالٹی بتائیں جس سے آپ شادی کر لیں گی خوشی خوشی...." سونی کا سوال ہنوز جواب کا منتظر تھا۔

"ایک عام سا آدمی سونی.... اسی شہر' محلے' گلی کا رہنے والا.... دیکھنے چلنے پھرنے بات کرنے میں ہم سا ہی ہو۔ محنت اور جدوجہد والی زندگی جس میں دونوں برابر کے حصے دار ہوں۔ دو آنکھیں مگر خواب ایک....

ذہن دو مگر سوچ ایک....

ایک ہی دستر خوان پر ایک ہی روٹی کے اکٹھے ٹوٹتے نوالے' ایک پلیٹ کا سالن یہ نہیں کہ الگ سے میز کرسی رکھ کے اجنبی ناموں اور اجنبی ذائقوں والے کھانے کھاتا شخص.... ایسی اجنبیت میں زندگی کیسے گزر سکتی ہے۔"

"آپ کو نوڈلز اور اسپگٹی کھانے پہ اعتراض ہے آپا؟" صومی نے حیران ہو کر پوچھا (طلعت صاحب نے دادی کے کھانوں کی ساری فہرست کو مسترد کرتے ہوئے ایک بڑے سپر اسٹور سے سب ڈبا پیک کھانے

خود ہی لا کر دے دیے تھے جو وہ کھانا پسند کرتے تھے۔
"بات نوڈلز یا اسپگٹی کی نہیں ہے۔ بات اس اجنبیت کی ہے۔ جو اس عمل سے ہم سب کو محسوس ہوئی۔ وہ سب سے الگ بیٹھ کر کرسی ٹیبل پر مزے سے کھا رہے تھے اور ہم سب نیچے زمین پر۔ کیا یوں نہیں لگتا تھا کہ ساری بھوک ہی اڑ گئی۔"
رعایا... پرجا والی صورت حال بن گئی تھی۔
"وہ امریکہ میں پیدا ہوئے ہیں آپا... ساری زندگی وہیں گزاری' وہ وہاں کا حصہ ہیں۔ تو ان کا طرز زندگی بھی تو ویسا ہی ہو گا۔" صومی نے معاملہ فہمی کا مظاہرہ کیا۔
"مجھے اس بات پر اعتراض نہیں۔ مگر وہ اپنا منہ بند رکھ کے خاموشی سے کھا بھی تو سکتے تھے۔"
"میرے نزدیک تو یہ برائی نہیں' یہ تو بلکہ صاف گوئی ہوئی۔ مروت میں آجاتے تو بھوکے نہ مرتے۔" صومی بہت سنجیدگی سے ہر اعتراض کی وضاحت دے رہا تھا۔
"ایسی صاف گوئی کس کام کی جو دوسروں کا دل توڑ دے۔"
"میں ایسے بدمزہ تیز مرچ والے ہیوی کھانے کھا ہی نہیں سکتا مام... پلیز مجھے بریڈ میں سلاد رکھ دیں۔" آپا نے نقل اتاری۔
"آپ کو اس بات کا غصہ ہے کہ انہوں نے آپ کے کھانوں کی برائی کی۔" صومی کا یہ بچکانہ پن تھا۔
"انہوں نے کھانوں کو چکھا تک نہیں۔" عینا نے تیزی سے حقیقت بیان کی۔
"آپ تو سارے کھانے اچھے بناتی ہیں آپا... آپ ان کے فلیور کے حساب سے بنا دیتا۔" سونی نے آسان حل پیش کیا۔
"رہنے دو... عینا اس بحث سے اکتا گئی۔" مجھے کچھ نہیں کرنا اور اگر سیدھی بات سننا ہی چاہتے ہو تو وہ تو پھر یہی ہے کہ مجھے یہ آدمی پسند ہی نہیں آیا۔"
"تو ٹھیک ہے ہم دادی سے کہہ دیتے ہیں آپ کو شادی نہیں کرنی۔" سونی نے پر سکون انداز میں کہا۔

شکر بحث نتیجہ خیز ثابت ہوئی تھی۔
"آں... ہاں۔" آپا نے سونی کا ہاتھ پکڑ کر روکا مبادا ابھی جا کر اعلان کر دے۔
"پسند نہ آنے کے باوجود میں شادی کروں گی۔" عینا کا لہجہ قطعی تھا۔
"مگر کیوں؟" صومی کے انداز میں احتجاج تھا۔
"ہاں آپا... پھر بھی۔" سونی نے بھائی کی تائید کی۔
"تمہیں پتا ہے میرا' آخری رشتہ تین سال پہلے آیا تھا۔" آپا کی آواز صاف تھی۔
"رشتے والی اماں سیداں' دو سال تک اس رنڈوے کا رشتہ لے آئیں جس کے چار بچے ہیں۔ اور بے حد اچھا ہے اور خوب کماتا ہے۔ نماز روزے کا پابند پھر بھی دو سال سے اسے رشتہ نہیں ملا اور اماں سیداں کہتی ہیں۔ میرے لیے وہ بہترین بر ہے۔"
"اور لوگ تو یہ بھی کہتے ہیں' دادی نعمت آرا! جان بوجھ کر پوتی کو نہیں بیاہتیں کہ اس بڑھاپے میں انہیں چولہا چوکا کرنے پڑے گا۔ اور جو شادی کی عمر تھی اس میں تو عینا بھائیوں کو پال رہی تھی۔"
"آپ ابھی بالکل ینگ ہیں آپا!" سونی کی آواز اچنبھے سے بھرپور تھی۔
"اور دن بھر مجھ سے یونہی بلاوجہ لڑتی جھگڑتی دادی۔ رات کو سجدے میں گر گر اتنا روتی ہیں کہ جاء نماز بھیگ جاتی ہے۔"
"ہمارے معاشرے میں بیٹی کے رشتے کے لیے خود سے پیغام نہیں بھجواتے۔ دادی نے پورے خاندان میں جا کر خود اپنے منہ سے کہا۔ نام نہاد رشتے داروں کو بلاوجہ گھر بلا بلا کر میرے ہاتھوں کے خوب ذائقے دار پکوان کھلائے' مجھ سے دوپٹے کڑھوا کر... کروشیہ بنوا بنوا کر لڑکوں کی ماؤں' دادیوں کو بھیجے۔ مگر کیا حاصل ہوا۔ جب ان لڑکوں کی شادیاں کہیں اور طے کر دی گئیں تو مجھے بری کے جوڑوں پر کروشیہ اور قمیصوں پر کڑھائی کروانے کے لیے بھیج دی گئی کہ آپ کی پوتی کے ہاتھ میں بہت صفائی ہے۔"
عینا کو پتا نہیں چلا کب گالوں پر آنسو بہنے لگے

تھے۔

"دنیا اسٹیٹس دیکھتی ہے۔ یا تو لڑکی کے اباء مال و زر ہوں یا بھائی بڑے عہدوں پر.... یا پھر لڑکی خود بلینک چیک جیسی ہو۔ خالی سلیقے کو کون پوچھتا ہے۔ اچھے کھانے بنانے کے لیے کک رکھ سکتے ہیں۔ کڑھائیاں، سلائیاں کرنے کو درزی ہیں ناں! ایسے میں یتیم و لاسیر لڑکی اپنے ساتھ کیا لائے گی۔ اس لیے میرے بھائی میں یہ شادی ضرور کروں گی۔ یہ طلعت جیسے بھی ہیں ہمیں گزارا کرلوں گی۔ وہاں جاکر کمانا پڑا تو کمالوں گی۔ خوب محنت کروں گی۔ بلکہ میں نے تو یہ بھی سوچ لیا ہے جب وہاں سیٹ ہو جاؤں گی تو تم دونوں کو بھی بلالوں گی۔ پھر خوب پڑھنا اور پیسے کمانا امیر ہو جانا۔"

آپا نے بہت سنجیدہ، دکھی باتوں کو مزاح کا رنگ دیا اور سونی کو امیر ہو جانے کی خوش خبری سنا کر مسکرا دینے کی خواہش میں گدگدایا مگر......

"بس میں دادی سے کہہ دیتا ہوں کہ ان مہمانوں کو منع کردیں۔ ہمیں نہیں کرنی یہ شادی۔"

"شادی تمہیں نہیں، مجھے کرنی ہے اور میں راضی ہوں۔ سمجھے۔"

عینا نے لہجے کو بشاش کرلیا۔ چند لمحے پہلے کی کسی بات کا شائبہ تک نہ تھا۔ جیسے کچھ ہوا ہی نہیں، کچھ کیا بھی نہیں۔

"اب تم یہاں سے اٹھو..... روزے میں مجھے اتنا بلوایا تم نے — افطاری کا اہتمام کرنا ہے۔"

"فائدہ..... ان طلعت بھائی نے کون سا روزہ رکھا ہے۔ آنٹی کے پاس بھی بیماریوں کی پوری لسٹ ہے۔"

صومی نے منہ بنایا۔

"لیکن میرے پیارے بھائیوں کا تو روزہ ہے ناں۔"

آپا نے صومی کی ناک دبائی۔

"تو بولو کیا کھاؤ گے؟" اب سونی سے پوچھا۔

صومی، سونی نے اس ٹاپک پر یقیناً" پہلی بار اتنی تفصیلی گفتگو کی تھی۔ باقاعدہ بحث مباحثہ اور نتیجہ بھی۔ مگر دیوار کے اس پار ازین کو اس ساری بات چیت میں کوئی نیا پن محسوس نہیں ہوا تھا۔ یا پھر یہ کہ اس کی سوئی ایک پوائنٹ پر آکر رک گئی تھی۔ سونی اور صومی اور آپا۔ چند ایک جملوں کے فرق سے ازین اور ازین کی اپنی آپا۔

ازین کو لگا جیسے کسی نے سالوں پہلے کی ایک فلم ریوائنڈ کر کے چلادی ہو۔

ہاں یہ خوش آئند (شاید) بات تھی کہ نئی کہانی کے انجام کا صفحہ ابھی خالی تھا۔ اس وقت ردو بدل کی گنجائش تھی۔ جبکہ پرانی کہانی۔ پرانی کہانی اختتام پذیر ہو چکی تھی۔ آخری ریل چل رہی تھی۔

وہ کہانی جو ازین کے گھر سے شروع ہوئی تھی۔ جب ازین ایک چھوٹا بچہ تھا ایک حساس، بحث کرنے والا، تین بہنوں کے بعد پیدا ہونے والا بیٹا۔

ہاں بعد میں ازین کی دو بہنیں اور دو بھائی اور بھی پیدا ہوئے مگر ازین، ازین ہی تھا۔

ازین کے والد۔ ایک گارمنٹس کمپنی میں ڈیلی ویجز پر کام کرنے والے آدمی جن کی زندگی اوور ٹائم کے گھنٹوں کو گنتے ہوئے یوں گزر رہی تھی۔ جیسے کسی نلکے سے بے آواز رستا پانی۔ بظاہر ٹونٹی کسی ہوئی لگتی ہے۔ مگر دراصل سب ختم ہو رہا ہوتا ہے۔

ازین کی امی۔ سلائی کر کے آمدنی بڑھانے کچھ سہولت حاصل کرنے اور شوہر کا بوجھ کم کرنے کی خواہش مند ایک مخلص، جفاکش، صابر عورت۔

ازین کی نانی۔ جو بیوہ ہو جانے کے بعد بہو کے ناروا رویے سے عاجز آکر ایک روز بس یونہی نجانے کہاں جانے کے لیے گھر سے نکل کھڑی ہوئیں یہ سوچ کر کہ اب دوبارہ بیٹے کے گھر قدم نہیں رکھیں گی۔

تب ازین کے ابو نے یاد دلایا آپ نے بیٹے کے گھر نہ جانے کی قسم کھائی ہے بیٹی کے گھر آکر رہیے۔

نانی کو کرنٹ لگا "اوئی۔ اس عمر میں اپنی تھو تھو کروالوں۔ بیٹی کا گھر..... کوئی بیٹی کے گھر بھی آکر رہتا ہے۔ دنیا جینے نہ دے گی۔ توبہ کرو توبہ۔"

"آپ بیٹی کے گھر آکر رہیں گی تو دنیا یقیناً" باتیں

کرے گی۔ آپ بھتیجے کے گھر آکر رہیں۔ کسی مائی کے لال میں جرات نہیں کہ منہ سے بھاپ بھی نکالے۔ اگر آج آپ کے بھائی، میرے ابا زندہ ہوتے تو ان کے پاس جاتیں؟''

''آئے ہائے!'' نانی نے ہوکا بھرا۔ ''وہ تو مجھے ہاتھ پکڑ کر لے آتا' بلکہ منہ باندھ اور ہاتھ باندھ کے۔'' نانی کو بھائی کی محبت و مان یاد آگیا۔

''اچھا اور یہ جو گھر ہے۔ جواب میرا اور میرے بچوں کا ہے۔ یہ کس نے بنایا تھا۔؟''

''کس نے بنانا تھا۔ آبائی گھر ہے میرا۔ اللہ اس کی رونق برقرار رکھے۔'' نانی جوشیلی سی ہوگئیں۔

''اب آپ کچھ نہیں بولیں گی پھوپھو۔''

نانی کار گزار تھیں۔ وہ چند دنوں میں یوں گھر کا حصہ بن گئیں جیسے ہمیشہ یہیں تو رہتی تھیں۔ اور پھر وہ دن آیا جب وہ گھر کا جزو لاینفک بن گئیں کہ سلائی مشین پر جھکی۔ کھانستی۔ آنکھ صاف کرتی امی۔ ایسے ہی کھانستے کھانستے دم دے گئیں۔ بہت بڑا صدمہ۔ مگر جھیل لیا گیا۔ بہت بڑا خلا مگر نانی نے یوں پُر کردیا جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔

بچوں کی تربیت۔ باورچی خانہ۔ روٹی ہانڈی۔ وہ کسی جفاکش تنومند ماں کی طرح کرتی تھیں۔ پھر بیٹی کی چھوڑی سلائی مشین سنبھالنے کی کوشش کی مگر یہ مشکل کام تھا۔ بڑھاپا آڑے آگیا۔ ہمت جوان تھی مگر کمر اور نظر نے ساتھ دینے سے صاف انکار کردیا۔

پہلی بار احساس ہوا۔ کتنے بہت سارے خاموش خرچے تھے جو اس سلائی مشین نے اٹھا رکھے تھے۔ اور اب منہ پھاڑ کر بولنے لگے تھے۔ اور اس سے پہلے کہ چلا اٹھتے۔ مشین پر ازین کی آپا زینی بیٹھ گئیں۔

وہی تخت' وہی مشین' وہی مشین کے چلنے کی آواز۔ بظاہر کچھ نہیں بدلا تھا۔ مگر ازین کو آپا کا وہاں بیٹھنا کھلتا تھا۔ وہ اسے اپنے ساتھ لپٹا کر سلاتی تھیں۔ پڑھاتی تھیں اور کھلاتی تھیں اب اتنی مصروف۔

''تم پڑھ لکھ کر بڑے آدمی بن جاؤ گے تو مشین چھوڑ دوں گی۔''

اور ازین کو پڑھنے کا۔ اور کچھ بننے کا شوق تھا۔ اسے یہ شرط مشکل نہ لگی۔ آپا کی مشین چلتی رہی۔ اور وہ امتحانات میں پوزیشن لاتا رہا۔

اسے کیا پڑھنا ہے۔ کہاں پڑھنا ہے۔ کیا کتاب لینی ہے۔ کوئی کوچنگ' بس آپا کو سرسری سا بتادیتا۔ اور وہ چیز ہوجاتی تھی۔

آپا سے چھوٹی والی دونوں باجیوں کی شادیاں بھی ہوگئیں۔ آپا مشین چلاتی رہیں' ازین کا ہر قدم کامیابی کی جانب گامزن تھا۔ چھوٹے بہن بھائی پرائیوٹ اسکولوں میں زیر تعلیم تھے۔

اور ایک ایسا وقت جب وہ کامیابیاں سمیٹ رہا تھا۔ ابا کے جھکے کندھے اور نانی کے سجدوں کی طوالت اور ہوکے اور وظیفے۔

وہ ہائی بلڈ پریشر کی مریض بن گئیں۔ اور ابا ہارٹ پیشنٹ۔

''بس آپ مریض کو ٹینشن سے دور رکھیں۔ ٹینشن اسی طرح کے مریض کے لیے ٹھیک نہیں۔ بس مریض کو خوش رکھیں۔ مریض ٹینشن نہ لے۔'' دونوں جانب کے ڈاکٹرز کی سب سے اہم ہدایت یہی ہوتی۔

''آخر کس چیز کی فکر و پریشانی ہے۔ آپ کو آئے دن زبان کے نیچے گولی رکھنی پڑتی ہے اور نانی آپ کا بی پی ہربار ڈینجر زون میں ہوتا ہے۔ اب کس چیز کی فکر نانی۔ میری تعلیم مکمل ہونے والی ہے۔ پھر جاب۔ مشکل وقت تو کٹ گیا ناں۔'' ازین کا لہجہ تسلی اور یقین سے بھرپور تھا۔ مگر نانی سنبھلنے کے بجائے بری طرح سے بکھر گئیں۔

''کون کہتا ہے مشکل وقت کٹ گیا۔ وقت تو ٹھہر گیا ازین۔'' وہ پھٹ پڑی تھیں گویا اور پھر جب بولنا شروع ہوئیں تو ازین صرف حیران تھا۔ یہ اتنی سامنے کی بات کیسے اوجھل رہ گئی۔ نانی اپنی کہہ کر اس رات ہلکا پھلکا ہو کر سو گئیں۔ شاید بوجھ اتار۔ اور ننگی چارپائی پر بازو

کے تکیے پر سر رکھے ازین آسمان کو دیکھتا تھا۔ کبھی کبھار ابا کے کھانسنے کی آواز آجاتی۔ دو چھوٹی بہنیں ایک ہی چارپائی پر گہری نیند میں غرق ہلکے ہلکے خراٹے لے رہی تھیں۔ بے فکر، پرسکون نیند۔

دونوں چھوٹے بھائی چھت پر سوئے تھے۔

اگر نیند بھی قسمت میں لکھی ہوتی ہے اور آرام بھی۔ تو وہ تو ازین کو آج پتا چلا آپا کی قسمت میں نیند کتنی کم لکھی گئی تھی۔ اور آرام۔؟

اس نے تو کبھی نہیں دیکھا تھا آپا کو آرام کرتے ہوئے۔ وہ کام کام اور بس کام کی عملی تفسیر تھیں۔ اور سوتے بھی۔ ہاں وہ سب کے سونے کے بعد نجانے کب سوتی تھیں۔ سب کے اٹھنے سے پہلے یقیناً اٹھی ہوتی تھیں۔

اور کیا پتا۔ ازین نے کروٹ بدلی۔ سوتی بھی تھیں یا نہیں۔

تخت پر آپا کی سلائی مشین ذرا سرکی پڑی تھی۔ مشین میں ایک کپڑا اب بھی لگا تھا۔ ادھ کھلی قینچی۔ اور دیوار کی طرف رخ موڑے کہنی پر بازو ٹکائے سوتی آپا۔

"وہ عام شکل و صورت کی ہے۔ اس کی عمر زیادہ ہوگئی ہے۔ اس سے چھوٹی بہنوں کو بیاہ دیا گیا۔ اور سب سے بڑا عیب اب یہ بھی ہے کہ ان سب باتوں کے باوجود اگر اسے کوئی بیاہتا بھی ہے تو غریب باپ کیا دے سکے گا۔ جہیز کے نام پر۔ اس لیے۔"

ازین ذہین تھا پڑھاکو۔ لیکن اس معاملے پر اس نے کبھی سوچا ہی نہیں تھا۔ ہاں آپا کی شادی تو سب سے پہلے ہونی چاہیے تھی۔ اسے اب خیال آیا۔

"جہیز جمع ہو جائے گا نانی۔ اور یہ عام شکل و صورت کیا ہوتی ہے۔ اتنی پیاری ہیں آپا۔!" ظاہر ہے یہ جملے ایک بھائی کی بہن کے لیے محبت تھے۔ نانی نفی میں سر ہلاتی رہیں۔

"کون کرے گا جہیز جمع۔ نجانے کتنی کمیٹیاں بھرتی ہے۔ اور سب کی سب لے چکی ہے اور جو نئی لے گی، اس کا حساب پہلے جوڑ چکی ہے۔ تمہاری فلاں فیس۔ چھوٹوں کا کالج میں داخلہ۔ بہنوں کے لیے فلاں ڈھمکاں۔"

"اور ابا کی تنخواہ۔؟" ازین نے پوچھا۔

"اس تنخواہ سے تو بس سب لوگ تین ٹائم روٹی کھا پاتے ہیں۔ سیدھی اور صاف بات تو یہی ہے کہ تم سب بہن بھائیوں کی پڑھائیاں۔ زینی کی سلائی کا ایک ایک ٹانکا ہے۔"

"تو آپ انتظار کریں نانی۔ میری پڑھائی مکمل ہونے والی ہے۔"

نانی اچھل پڑیں۔ "ارے کتنے آرام سے کہہ دیا انتظار کرلوں۔" نانی نے اس کی کم عقلی پر ماتم کیا۔

"شادی بیاہ کی ایک عمر ہوتی ہے بچے۔ اب یہ رشتہ جو آیا ہے اسے بھی غنیمت جانو۔ بیوی سے بنی نہیں تو اسے فارغ کردیا۔ اب گھر میں ایک باپ بیٹا ہی بچے۔ زینی محبت والی ہے سنبھال لے گی۔"

"آپا کسی اور کا بچہ کیوں پالیں گی۔"

"کسی کا کیوں۔ اپنے شوہر کا ہوگا۔" نانی سب سوچ چکی تھیں۔

"مگر نانی۔!"

ازین کو پہلی بار بات سمجھ میں آنے لگی۔

وہ اپنی پڑھائی کی دنیا میں مگن۔ اپنے مقصد کے پیچھے دوڑنے والے ازین کو اندازہ ہی نہ ہوا کہ آپا ان سب کے لیے کیا کر رہی ہیں یا پھر وہ اتنی گہرائی میں سمجھی گیا ہی نہیں۔

"ازین تو بات کرنا بچے زینی سے۔ اسے سمجھا اور قائل کرلے، تیری تو وہ بہت سنتی ہے ناں۔" نانی کو ایک اور حل سوجھا۔ اور ازین نے ہامی بھرلی ہاں آپا اسے انکار نہیں کرسکتی ہیں۔ مگر۔

✲ ✲ ✲

"مجھے شادی کرنا ہی نہیں ہے بھیا۔!" آپا زمین پر گھٹنوں کے بل جھکی کسی گلابی کپڑے پر چاک سے لگے نشانوں پر قینچی چلاتے ہوئے مگن تھیں۔ اور اسے یوں پچکارتے انداز میں مخاطب کر رہی تھیں۔

جیسے کسی بچے کو بہلا رہی ہوں۔

"شادی نہیں کرنی مگر کیوں۔؟" ازین نے حیرت سے پوچھا۔

"بس۔" آپا اب کپڑے پر کاٹنے کے نئے نشان لگا رہی تھیں۔

"بس کا کیا مطلب ہے؟"

"شادی کی ایک عمر ہوتی ہے ازین۔" آپا کی آواز بہت مدھم تھی۔ "اور میری وہ عمر گزرے بھی ایک عمر گزری۔"

"جی۔!" ازین حیران رہ گیا۔ "عمر گزر گئی کب؟"

"وہ میرا جہیز تھا جو میں نے منجھلی کو دے دیا تھا۔" آپا بہت آہستگی سے بول رہی تھیں۔ آواز میں ملال نہیں تھا۔ مگر بس جیسے انہیں یاد کرنے میں کچھ مشکل ہو رہی ہو۔ "اور یہ بارہ سال پہلے کی بات ہے۔"

"اور وہ تمام چیزیں بھی نانی نے میرے نام سے جمع کی تھیں جو بیلا کو دے دی گئیں۔" آپا نے خود سے نمبر تین والی کا ذکر کیا۔ "اور یہ دس سال پرانی بات ہے۔ اور اب دونوں کے بچے میرے کندھوں سے اوپر ہیں۔"

"تو آپ نے یہ بات اس وقت کیوں نہ کہی جب یہ سال گزر رہے تھے بڑھتے جاتے تھے۔" ازین بہت دیر بعد صدمے سے ابھرا تو چلا اٹھا۔

"اتنا وقت ملا ہی نہیں۔" آپا اب کسی کپڑے کو ہاتھ سے شانے کی لمبائی تک سے ناپ رہی تھیں۔

"تم لوگوں کی پڑھائی ہم لوگوں کا مستقبل۔ اس سب نے کچھ سوچنے دیا ہی نہیں۔"

"تو یہ پہاڑ جیسی زندگی اب آپ کس کے سہارے گزاریں گی؟" ازین کے منہ سے اچانک نکل جانے والا یہ جملہ نانی کا تھا۔ مگر کپڑا ناپتی آپا کا ہاتھ جہاں کا تہاں رک گیا۔ چہرے کا رنگ اڑ گیا۔

ان کی آنکھیں نم ہو گئیں۔ بڑا چبھتا سوال تھا۔

اور اس کا جواب۔

"میری زندگی اب پہاڑ جتنی بچی ہی کب ہے۔ بھیا۔ تم نہیں رکھو گے مجھے اپنے ساتھ۔؟" آپا کے جملے دل چیر دینے، کلیجہ شق کر دینے والے یا پھر کند چھری سے ذبح کرنے جیسے تھے۔ مگر ان کا مسکراتا چہرہ اور امید بھری آنکھیں۔

اور یہی وہ پل تھا جب ازین کو احساس ہوا۔ آپا کیا تھیں اور ان کے لیے کیا کرتی رہی تھیں۔ پوری زندگی۔ پوری جوانی۔ نہ کوئی گلہ نہ ملال۔ بس ایک سوال۔ اور ایسا سوال۔ آہ۔

"آپا۔!" وہ بجلی کی پھرتی سے اٹھا تھا اور آپا کو خود سے لپٹا لیا۔ خود میں بھینچ لیا۔ ان کے ماتھے کے بوسے لیے اور ہاتھوں کو ہونٹوں سے لگا لیا۔

"میرا سہارا آپا۔ لیں یہ میرے ہاتھ رکھے ہیں۔" اس نے اپنی ہتھیلیاں زمین پر سیدھی رکھیں۔ "آپ ان پر اپنے پیر رکھیں آپا۔ اور میرا سہارا آپا۔ آپ نے سر پر ہاتھ نہ رکھا ہوتا۔ سب کچھ ہوتا مگر وہ نہ ہوتا جو آج ہوں۔ اور آپ سہارا مانگتی ہیں میں تو دنیا کو آج بھی آپ کی آنکھ سے دیکھتا ہوں۔ آپ نے ہمیشہ دکھایا۔ میری زندگی میں سب اچھا ہے اور میں نے کبھی نہیں سوچا کہ کیسے اچھا ہے۔"

وہ جذباتی ہیجانی کیفیت کے زیر اثر تھا۔

"لیکن اب بس۔ بہت ہو گیا۔ مزید نہیں۔"

"کیا کرو گے تم بے وقوف۔" آپا نے گال پر ہلکا سا تھپڑ لگایا۔ "تمہارے پڑھنے کے دن ہیں بھیا۔"

"پڑھنے سے منع نہیں کر رہا آپا۔" وہ پرعزم انداز سے بولا "مگر اب بے خبری اور لاپروائی سے نہیں جیوں گا۔" وہ کھڑا ہو گیا تھا۔

اور یہ واقعی اپنے پیروں پر کھڑا ہو جانے کا وقت تھا۔

☆ ☆ ☆

"اے عمنا۔ میں کیا کہہ رہی تھی کہ۔" دادی کے جملے کے پیش لفظ سے اندازہ ہو رہا تھا وہ کوئی بہت ہی خاص بات کہنے والی ہیں۔ ورنہ دادی اور تمہید۔ ہچکچاہٹ۔

"کہیے دادی! میں سن رہی ہوں۔" عمنا کی آواز سے مصروفیت کا اندازہ ہو رہا تھا۔ (وہ صومی۔ سونی کے

کرتوں پر کڑھائی کے لیے چھاپہ لگا رہی تھی۔)

"کب تک بن جائیں گے یہ کرتے؟" دادی نے چھاپہ لگے کرتے کو اٹھا کر ستائش سے دیکھا۔

"جلدی ہی بن جائیں گے دادی!"

"وہ میں کہہ رہی تھی کہ ایک کرتا طلعت کے لیے بھی کاڑھ دیتی۔ نئی نئی رشتے داری بن رہی ہے۔"

"وہ ہمارے پرانے رشتے دار ہیں دادی!" **عینا** نے نگاہ اٹھا کر دیکھا۔

"ارے ہاں۔ پر اب تو رشتہ بدل رہا ہے ناں۔ اور پھر وہ مہمان بھی تو ہے۔ مہمان کو تو تحفہ دینا یوں بھی اچھی بات ہوتی ہے۔ اور پھر اسے یہ بھی تو پتا چلے میری **عینا** کتنی سلیقہ شعار ہے۔" دادی شروع ہو گئی تھیں۔

"میں امریکہ جا کر کڑھائی فریم لے کر بیٹھوں گی ؟" **عینا** نے ٹوکا۔

"اوہو! بیچ میں ٹوکا مت کرو۔ پوری بات سنو۔" دادی نے رعب سے کہا۔

"اچھا۔ ابھی بات پوری نہیں ہوئی۔"

"ہاں ہاں۔ میں چاہ رہی تھی تم بھی ـــ پارلر والر جا کر وہ جو لڑکیاں منہ پر کرواتی ہیں کروالو۔ وہ فیشل ویشل۔ روپ کھل اٹھے گا ویسے تو ماشاء اللہ صورت بڑی پیاری ہے۔"

"دادی! آپ کے بقول نازنین آنٹی۔ اور ان کے بیٹے تو مجھے پسند کر ہی چکے ہیں تو پھر۔"

"اے ہاں ہاں بالکل۔ مگر میں کہہ رہی تھی۔ عید بھی ہے پھر میں عید پر ہی رسم کرنا چاہ رہی ہوں۔ ایک تو قیامت کی گرمی۔ اللہ اپنے بندوں پر رحم کرے اس موئے سورج نے تو جھلسا دینے کی قسم کھالی۔ اوپر سے لوڈ شیڈنگ۔ رنگ بھی دب گیا اور گرمی دانوں کی سرخی بھی ماتھے تھوڑی پر آ گئی ہے۔ پھر صبح شام چولہے کے آگے بھی کھڑا ہونا پڑتا ہے۔ تو میں اسی لیے کہہ رہی تھی۔" دادی نے وضاحت پیش کی۔

اپنا کام روک کر تسلی سے دادی کو سنتی **عینا** نے ٹھنڈی سانس بھری۔

"میں گھر ہی میں بیسن، دہی اور ملتانی مٹی لگا لوں گی دادی۔! آپا نے ٹھہرے لہجے میں کہا۔ "خوامخواہ میں اتنے پیسے لے لے گی وہ پارلر والی۔ ابھی صومی۔ سونی کے عید کے جوتے بھی لینے باقی ہیں۔"

"مگر **عینا**۔!" دادی نے کچھ کہنا چاہا۔

"دونوں کو تو پینٹ شرٹ لینے کا شوق ہے۔ وہی اتنی مہنگی آئی کہ سارا بجٹ خراب ہو گیا۔ یہ بنے بنائے کڑھے کرتے اتنے مہنگے مل رہے ہیں کہ ہاتھ لگاتے ڈر لگے۔ سو میں نے سوچا کہ خود ہی کچھ کرلوں۔" آپا نے تفصیلی جواب دیا تھا۔

"تم کون سا جوڑا پہنو گی **عینا** عید پر۔؟" دادی کو اچانک خیال آیا۔

عینا چونکی۔ ابھی کل ہی تو بازار میں ایک آتشی گلابی جوڑا پسند کر کے آئی تھی پر ڈھائی ہزار قیمت تھی۔ اس نے تو پندرہ سو بڑی مشکل سے کیے تھے۔ اور دل کو راضی کیا تھا کہ اس بار وہ لے ہی لے گی ایک پندرہ سو والا جوڑا۔ مگر اب۔

خود پر خرچ کرنے سے ہمیشہ جان جاتی تھی۔ ہزار بار سوچتی تھی۔ کہ ان پیسوں سے اور کیا کیا جا سکتا تھا۔ اور ہمیشہ دوسری چیزیں جیت جاتی تھیں۔ اس بار بھی یہی ہوا۔ خود پر خرچ کرنے والی ہچکچاہٹ سے جان چھوٹی۔ سیدھا سیدھا کل بازار جاتی اور طلعت کے کرتے کے لیے کپڑا خرید لاتی۔ جان چھوٹی۔

☼ ☼ ☼

"اور آپ کے عید کے کپڑے آپا۔؟" صومی نے پوچھا تھا۔ دونوں آج عید کے لیے جوتے خرید کر لے آئے تھے۔ پینٹ شرٹ پہلے ہی آ چکی تھی۔ دونوں خوشی سے نہال تھے۔ سونی نے تو ڈان اسٹائل کے سن گلاسز بھی خریدے تھے۔ صومی کو رسٹ واچ کا شوق تھا، اپنی شاپنگ کو دیکھ دیکھ کر دل ہی نہ بھرتا تھا۔ تب ہی آپا نے کڑھائی والے ـــ سفید کرتا شلوار بھی سامنے رکھ دیا۔

"اللہ آپا" دو دو سوٹ!" سونی کو یقین نہ آیا۔

"اب ان چیزوں کو سمیٹ لو۔ دیکھ دیکھ کر ہی میلے کر دو گے۔" آپا کو اب افطاری بنانا تھی۔

دادی، نازنین آنٹی کے ساتھ کسی رشتے دار کے گھر گئی ہوئی تھیں اور وہ موصوف طلعت صاحب تو صبح کے غائب ہوئے کہیں رات کو لوٹتے اور زیادہ تر کھائے پیے ہوتے۔ سو سارے مزے نازنین آنٹی کے ہوتے۔ جو جی بھر کے کھاتیں۔ ٹھہر ٹھہر کر کھاتیں۔

نازنین آنٹی کے علاوہ اگر کسی کے مزے تھے تو وہ صومی سونی کے تھے جو ہر روز ایک نیا ذائقہ چکھتے اور آپا کی تعریفیں کرتے۔

"آپ آج کیا بنا رہی ہیں آپا!" سونی فریج سے نکلے سامان کو کچن کے نزدیک ٹیبل پر رکھ رہا تھا۔ جبکہ صومی بڑی احتیاط سے کپڑے سنبھال رہا تھا۔

"مونگ کی دال کے سموسے، چکن ویجی ٹیبل رول، اور شاہی ٹکڑے اسپیشل ہیں۔ باقی وہی روٹین کی چیزیں ہوں گی۔"

"آپ مسالا بنا دیں میں سموسے اور رول بھر دوں گا۔" سونی یہ کام شوق سے کر لیتا تھا۔

"اور تم شاہی ٹکڑے اچھے سے سجا دو گے۔" آپا نے صومی کو دیکھا۔ مگر صومی کا دھیان کہیں اور تھا۔ اس نے عجیب سی نگاہوں سے آپا کو دیکھا پھر شاپنگ کے ڈھیر کو۔

"اور آپ کے عید کے کپڑے آپا؟ صومی نے پوچھا اور سبزی کا شاپر اندر لے جاتی عمنا رک گئی۔

"میں لے لوں گی۔ ابھی تو کافی دن ہیں۔" لاپروائی سے کہا۔

"آخری عشرے میں تو آپ گھر سے نکلتی ہی نہیں۔"

"تھوڑی دیر کو نکل جاؤں گی۔ ایک سوٹ ہی تو لینا ہے۔" آپا نے سرسری لہجہ اختیار کیا۔

آپا.... سونی کے انداز میں تنبیہہ تھی۔

"صاف صاف بات کریں۔ آپ نے وہ پیسے خرچ کر دیے ہیں۔"

"وہ دادی نے کہا کہ ایک کرتا شلوار اور بھی کاڑھ دوں تو اور.....؟"

"طلعت بھائی کے لیے۔" صومی ہی بولا۔

آپا نے جواب کے بجائے سر جھکا لیا۔

"تم آپا! آخر آپ سب سے آخر میں خود کو کیوں رکھتی ہیں۔" سونی نے گویا سر پیٹا۔

"میں بنا لوں گی۔" آپا نے تسلی کرانی چاہی۔

"آپ ہمیشہ یہی کرتی ہیں آپا' ہم جانتے ہیں۔" صومی کو گڑے مردے اکھاڑنے میں بھی مہارت حاصل تھی اور بات ہو آپا کی کوتاہیوں کی تو.... اس کی یادداشت میں سب ترتیب وار.... تاریخ اور سن کے ساتھ درج تھا۔

"اچھی بوٹیاں ہمیں دے دیتی ہیں۔ خود مسالے سے لگا لگا کر کھاتی ہیں۔"

"ہمیں دودھ پینے کے لیے دیتی ہیں اور خود...."

"صومی پلیز...." آپا نے ٹوکا۔

"بھائی ٹھیک کہہ رہا ہے۔ آپ ہمیشہ ایسا ہی کرتی ہیں ہم آپ کو بچپن سے جانتے ہیں آپا.... وہ بھی اچھی طرح سے۔" سونی کچھ سننے کو تیار نہیں تھا۔

جب تک لاعلمی تھی ٹھیک تھا مگر اگلی صبح ہی سے ازین کے دماغ میں ایک نیا آغاز تھا۔ ابا جس کمپنی میں ساری زندگی ڈیلی ویجر تھے۔ وہ پکے تو نہیں ہو سکے تھے مگر کچھ افسران کی نظروں میں اچھی جگہ ضرور رکھتے تھے۔ ازین نے اسی چیز کا فائدہ اٹھایا۔ اس نے رات کی شفٹ میں ملازمت شروع کر دی۔ رات میں چند گھنٹے سونے کا موقع مل جاتا تھا۔ صبح کالج.... پھر اس نے شام کو دو گھنٹے کے لیے دو لڑکے ٹیوشن کے لیے پکڑ لیے۔ اور گھر کے باہر کوچنگ سینٹر کا بورڈ لگا کر ایک پورا کمرہ.... کلاس روم میں بدل دیا۔

خوش قسمتی سے چھوٹے چاروں بہن بھائی لائق فائق اور ذہین تھے انہیں یہ نئی مصروفیت بہت پسند آئی ازین نے کچھ خواب ان کی مٹھی میں تھمائے کچھ امید کے جگنو۔ تھوڑا سا احساس ذمہ داری اپنا بوجھ اپنے کندھوں پہ۔

ازین نے بتایا آپا نے اپنا آپ تیاگ کر انہیں ایک شاہانہ زندگی دی تھی اور تب تک تو ٹھیک تھا جب تک وہ اپنا بوجھ نہیں اٹھا سکتے تھے۔ اب جبکہ وہ اٹھا سکتے تھے اور حقیقت سے باخبر ہو چکے تھے تو پھر بھی کیوں؟" سب لاپروائی میں جی رہے تھے مگر اب اور نہیں۔

✡ ✡ ✡

ادھر دائیں جانب اپنی چارپائی پر پیر لٹکائے.... قمیص اتارے شانوں پر گیلا تولیہ رکھے خود کو گرمی سے بچانے کی کوشش کرتا.... ازین.... سوچ رہا تھا وہ اپنی آپا سے محبت میں شاید صومی سونی سے زیادہ ہی ہو اگر جو کسی پیمانے میں محبت کو ناپا جائے۔

لیکن اگر کوئی یہ پوچھتا کہ وہ اپنی آپا کی عادات پسند ناپسند، خوشی غمی کے بارے میں کچھ بتائے تو اس کے پاس اس چیز کا جواب نہیں ہوتا اسے کبھی پتا ہی نہ چلا۔

اور اس نے خود کو بہت باکمال مانا تھا جب اس نے صحیح وقت پر فیصلہ کر کے آپا کو بلاوجہ کی ذمہ داریوں سے دور کر دیا۔ ان کی زندگی میں آسانی پیدا کر دی یہاں تک کہ جب اسے ملازمت ملی تو بھلے سے وہ فلمی انداز تھا۔ مگر اس نے گھر میں داخل ہو کر سب سے پہلے آپا کو دیکھا تھا، وہ مشین چلا رہی تھیں۔ گردوپیش سے انجان.... ازین نے مشین کے گھومتے پہیے پر ہاتھ رکھ دیے۔

"بس آپا! اب مشین اور نہیں....." اور آپا اس کی صورت دیکھتی رہ گئیں بعد میں یہ بات بہت سنجیدہ معنوں میں دونوں بہن بھائیوں کے بیچ ہوئی۔

"مشین نہیں چلاؤں گی تو اب اور کیا کروں گی بھیا! اس کے بغیر تو زندگی ادھوری لگے گی۔"

"کوئی نہیں لگے گی، آپ اور دلچسپیاں ڈھونڈیں، کتابیں پڑھیں ٹی وی دیکھیں۔ دوست بنائیں، محلے پڑوس میں آیا جایا کریں۔"

آپا اتنے خیال پر مسکرا دیں یہ نہ کہہ سکیں "دوست بنانے کا موقع ہی نہ ملا۔ آنے جانے والی بہت.... مگر سب سلائی والیاں.... کتاب پڑھنے سے نظر دھندلاتی تھی۔ ٹی وی پر شکل ڈبل نظر آتی (سلائی تو اب تجربے اور مہارت کی بنیاد پر کرتی تھیں، آنکھ بند کر کے بھی سلائی لگاتیں تو یوں لگتا اسکیل سے کھینچی ہے۔)

"مزید کیا دلچسپی.....؟"

"ہاں مزید دلچسپی کو کھوجنے ڈھونڈنے میں وقت گزارا جا سکتا ہے مگر کیا زندگی بس اتنی سی..... یوں بے مصرف.... اتنی جلدی۔"

کتنا مشکل لگتا تھا یہ سفر۔ امی کے بعد ان کی مشین سنبھالتے ہوئے کبھی خیال نہ تھا، زندگی کی دوسرا ہٹ مشین ہی ہو گی۔ پھر ابا جو گھر میں صرف راشن ڈلوا پاتے تھے اور جیب خالی.... اور نانی کہتی تھیں خدا کے خاص بندے ہوتے ہیں جنہیں وہ ہنر سے نوازتا ہے۔ اپنے ہاتھ کی محنت.... پھر خدا کی نوازی ہوئی تحفہ کی ہوئی چیزوں کو اپنایا نہ جائے گویا اتنا بڑا کفران نعمت۔

اور وہ تو شکر گزار فرماں بردار بندی تھیں۔

بھائی نے اب کہہ دیا تھا۔ دوسری دلچسپیاں ڈھونڈیں تو انہوں نے ڈھونڈنی شروع کر دیں۔ نئے بنے گھر کو سجانے سنوارنے لگیں۔ آدھی زندگی گزارنے کے بعد پتا چلا۔ انہیں پھول پودے کس قدر بھاتے ہیں اور مٹی کی سوندھی خوشبو، تازہ نکلتے پتے.... منہ بند کلیاں۔

کسی سے کہے سنے بغیر.... نجانے کتنے ڈھیر گملے خرید لیے۔ گھر.... گھر کم نرسری زیادہ لگنے لگا۔ آپا خوش رہنے لگیں۔ گھر مہکتا تھا چوٹی پر موتیا کی کلیاں لپیٹ لیتیں اور یونہی مسکرائے جاتیں۔ اپنا معطر وجود ہلکی پھلکی ہو جاتیں اور ازین آپا کو دیکھ کر خوش ہوتا اس نے آپا کو ان کی من پسند زندگی دے دی آخر۔

اور کتنی بڑی بے وقوفی تھی ناں یہ سوچ.....

اس نے آخر کیوں فرض کر لیا تھا کہ اس نے سب فرائض ادا کر دیے ہیں اور آپا کا فرض تو بخوبی.... چھوٹی بہنوں کی شادیاں کر دے گا (ایک کی تو منگنی بھی کر دی تھی) بھائی ایک باہر چلا گیا تھا۔ دوسرا ڈاکٹری پڑھ رہا تھا۔ ایک بہن کمپیوٹر انجینئر بن گئی تھی۔ اپنے پیروں پر کھڑی تھی اور وہ خود....

تعلیم جاری رکھنے کے ساتھ ساتھ وہ نوکری بھی کرنے لگا تھا۔ پڑھا لکھا تھا۔ اسے ابا ہی کی کمپنی میں اچھی پوسٹ آفر ہوئی۔ مگر یہ اس کے خوابوں کی تعبیر نہیں تھی۔ یہ منزل پر جاتے ہوئے یونہی راستے میں ٹھہر جانے کو ایک سرائے تھی جیسے... وہ کورسز کرتا رہا' امتحان دیتا رہا اور بالآخر ایک دواؤں کی کمپنی میں ایک اچھے عہدے پر جا پہنچا۔ مگر سفر رکا نہیں (اب بھی ایک کورس کے سلسلے میں کمپنی سے چھٹی لے کر چھ ماہ کے لیے کراچی آگیا تھا اور ایک دوست کی وساطت سے کرائے کے کسی گھر کی تلاش نے اسے یہاں پہنچا دیا تھا۔ جہاں پہنچ کر اس نے سوچا' اسے بہت پہلے یہاں آجانا چاہیے تھا۔

تب شاید وہ آپا کو اور آپا کی زندگی کو زیادہ بہتر طور پر سمجھ پاتا اور تب شاید کوئی حل بھی نکل آتا۔ جبکہ اب تو ایک نئے امتحان میں گھر گیا تھا۔ مگر ازین اب غلطی کی گنجائش نہیں رہی۔ وہ خود کو مخاطب کر رہا تھا۔ کچھ بھی ہو ایسا کوئی فیصلہ نہیں کرنا جو آپا کی زندگی پر برا اثر ڈالے۔ پہلے آپا' بعد میں وہ اور بعد ہی میں مایا... ہاں اب اصل مسئلہ تو مایا کا تھا ناں مایا جو کہ...

☼ ☼ ☼

"تم اکیلے بھائی تو نہیں ہو ازین... دو بھائی اور بھی ہیں۔ وہ رکھ لیں گے تمہاری آپا کو اپنے ساتھ..."

"ہاں دو بھائی اور ہیں۔ مگر میں ان کو بھی اپنے ساتھ رکھنا چاہتا ہوں ایک بھرا پرا گھر مایا... جوائنٹ فیملی سسٹم ہوگا اور آپا گھر کی سربراہ..."

ازین نے خوابوں کی گٹھڑی سے پہلا خواب نکالا اور مایا کو سو والٹ کا جھٹکا لگا۔

"جوائنٹ فیملی سسٹم... آئی ہیٹ جوائنٹ فیملی سسٹم... ساری زندگی میں نے یہی زندگی گزاری ایک سیپریٹ لائف اسٹائل میرا خواب ہے ازین اینڈ آئی ایم سوری نو کمپرومائز۔ یہ تو تم لکھ لو کہیں۔"

"اوہ... چلو اس پر بات کی جا سکتی ہے۔ مگر آپا بہرحال میرے ساتھ ہی رہیں گی۔" ازین کے لہجے کا قطعی پن نمایاں تھا۔

"مگر کیوں؟" مایا چلا اٹھی۔

"وہ میری ماں کی جگہ ہیں مایا... بلکہ ماں سے اوپر اگر کوئی درجہ ہو۔ وہ گڑیا کھیلنے کی عمر میں ہمارے منہ میں نوالے... دیتی تھیں۔ ہمیں کھلاتی تھیں' ہمیں پالنے لگی تھیں میں ان کے بغیر کچھ بھی نہیں ہوں۔ ان سے دور رہنے کا تو تصور بھی نہیں کر سکتا۔"

ازین کا لہجہ محبت سے گندھا تھا۔

"مائیں مر جائیں تو بڑی بہنیں ایسے ہی چھوٹے بہن بھائیوں کی کیئر کرتی ہیں۔" مایا نے اپنی خوب صورت سی ناک چڑھا کر بے نیازی سے کہا (اس نامعقول کو یہ خبر تھی۔ اس کی ننھی سی ناک کا یوں چڑھنا ازین کو پیارا لگتا ہے)

"ہاں۔ ٹھیک کہتی ہو' مگر کیا اب جبکہ انہیں کیئر کی ضرورت ہے میں انہیں تنہا چھوڑ دوں۔"

"اوہو! میں اتنی دیر سے تم کو یہی تو سمجھا رہی ہوں... تمہارے اور بہن بھائی بھی تو ہیں ناں۔ یا آپا نے صرف تمہیں ہی پالا بلکہ تم ایسا کیوں نہیں کرتے ان کی شادی کر دو۔" مایا نے چٹکی بجائی۔

"شادی... اب؟" وہ بھونچکا رہ گیا۔

"ہاں' اب سے کیا مطلب ہے۔ وہ اب اتنی بھی بڑھیا نہیں ہوں گی۔"

"وہ مانیں گی بھلا... فضول مت بولو۔"

"بھئی۔ میں نے تو ایک حل پیش کیا ہے۔ ماننا چاہو تو مانو ورنہ رہنے دو' پر یہ طے ہے میری اچھی فیملی کے اندر... میں' میرا شوہر اور میرے بچے ہوں گے بس۔" مایا نے ہاتھ اٹھا دیے۔

اور ازین مایا کے خود غرضانہ... بلکہ سفاکانہ خیالات سے واقف تو تھا مگر اس نے سوچا' محبت کرنے والے بڑے دل والے ہوتے ہیں ایک بار جام محبت سے گھونٹ بھر لیں پھر عمر بھر زبان سے شیرینی جاتی نہیں۔ پیار کرنے والے تو صحرا میں قدم رکھیں تو گل و گلزار ہو جائے۔

مگر مایا نیم کا پتا تھی سو سال شہد میں رکھ دو پر منہ میں

پڑتے ہی آرخ تھو۔

بات آپا کو ساتھ رکھنے سے ہٹی تو دوسرا معاملہ زیادہ گمبھیر تھا۔

"تم کیوں کرو گے اپنے بہن بھائیوں کو سپورٹ۔ وہ اب اتنے بڑے ہو چکے ہیں کہ خود کو افورڈ کریں۔"

"ہاں الحمدللہ" ازین نے شکر ادا کیا۔ "بس یہی کوئی دو ایک سال۔ اور پھر ان کی شادیاں بھی تو کرنی ہیں ناں۔"

"ہاں تو ضرور کرنی ہیں شادی۔ ہو جائیں گی۔ مگر ابھی اتنی جلدی کیا ہے شادی کرنے سے پہلے شادی کی تیاری کریں۔ جیسے ہم کر رہے ہیں ازین۔ میں نے پہلے اپنا کیریئر بنایا ہے پھر دن رات محنت کر کے خود کو تنگ رکھ کے میں نے اپنا بینک بیلنس بنایا ہے اور اب میں شادی کی بات کرتی ہوں۔"

"تم محنتی لڑکی ہو مایا!"

"ہاں وہ تو میں ہوں۔"

"اور دیکھو بہنوں کی شادیاں تو بھائی کرتے ہی ہیں۔" ازین نے رسانیت سے کہا۔

"کوئی نہیں۔" مایا نے ناخ کی آواز نکال کر نفی میں سرہلایا۔ "میرے بھائیوں نے تو میری شادی کا بوجھ نہیں اٹھایا۔ ہماری تو جناب سیلف سروس ہے۔" اس نے اپنے جملے سے حظ اٹھایا تھا۔ نجانے وہ کس پر ہنسی تھی۔

"خود پر مت ہنسو۔" ازین کو دکھ ہوا تھا۔

"ہم نے خود پر جلنا کب سے چھوڑ دیا بلکہ وہ کیا کہتے ہیں۔ دل کو جلانا ہم نے چھوڑ دیا۔ چھوڑ دیا۔" وہ گنگنائی۔ اور ذرا سا فلمی بہت نشیلا انداز اپنانے پر وہ اتنی دل نشین لگی تھی۔ کہ ازین سب بھلائے اسے دیکھتا چلا گیا۔

بے حد دبلی پتلی۔ نازک سی۔ شانوں پر جھولتے

ریشمی بال جو ذرا جنبش پر چہرے کے اطراف پر رقص کرتے تھے۔ خوب صورت کٹاؤ والے ہونٹ جنہیں وہ مختلف رنگوں سے سجا کر رکھتی تھی اور سیاہ ذہین

آنکھیں۔ مگر ان آنکھوں میں ایک بے چینی اور کھوج ہمہ وقت رہتی۔ بے چین آنکھیں جبکہ ازین کو وہ بولتی آنکھیں لگتی تھیں۔ مگر چھوٹی بہنا نے کہا۔

"وہ بہت پیاری ہیں مگر ان کی آنکھوں میں خود غرضی سی نظر آتی ہے۔ بلکہ اگر یہ جملہ موزوں ہو تو میں کہوں گی۔ سفاکیت سی ہے۔" اس نے کہہ دیا جو دراصل اسے محسوس ہوا تھا۔

"ارے نہیں یار۔!" ازین نے چھوٹی کی عقل اور آنکھ کو بھی چھوٹا سمجھ کر نظر انداز کر دیا۔

"وہ بہت پیاری ہیں ناں بھائی! اسی لیے آپ کو کچھ اور نظر نہیں آ رہا۔ آپا کہتی ہیں 'آپ بہت حسن پرست ہیں۔"

ازین مسکرا دیا۔

"اور وہ حسن کے معیار پر پوری اترتی ہیں۔ مگر ہم سوچتے ہیں آپ کی بیوی جو بھی بنے وہ اندر سے خوب صورت ہو۔ اتنی جتنے کہ آپ ہیں۔"

"میں صرف اندر سے خوب صورت ہوں؟" ازین نے اسے گھورا۔

"ارے بھائی۔!" چھوٹی ہنس دی۔ "آپ بہت پیارے ہیں۔ سچ میں سوچتی ہوں اگر آپ ڈراموں کے لیے ٹرائی کریں تو۔" چھوٹی نے آنکھیں میچیں۔

"ایک دم اسمارٹ ڈیشنگ ایجوکیٹڈ، ہینڈسم اینڈ رومانٹک ہیرو بن جائیں گے۔"

"رومانٹک بھی۔" ازین نے اسے چھیڑا۔

"ہاں بھائی۔ آپ نفرت کر ہی نہیں سکتے۔ پورا پیکیج ہے آپ کے اندر۔ ہر رول میں فٹ آئیں گے۔ بس یہ مایا والے معاملے میں آپ کی عقل پر حیرت ہے۔ باقی تو آپ کے نمبر پورے ہیں۔" چھوٹی ڈھکے چھپے انداز میں کہہ ہی جاتی تھی۔

"اونہوں۔ بہت اچھی اور محبت کرنے والی لڑکی ہے مایا۔" ازین دوبارہ اپنے کردار میں لوٹا۔ وہی وکیل صفائی کا کردار۔

"آپ کہتے ہیں تو مان لیتی ہوں جبکہ مجھے لگتا ہے وہ

محبت کی الف بے سے بھی واقف نہیں یے تک کا سفر کیسے کریں گی۔"

"الف ایثار۔ احساس۔ اخوت۔" ب' برداشت' بردباری' بھروسہ۔

پ' پیار۔

ت' تحمل' تہذیب' تمیز' اورٹ۔

"ارے ارے بس بس۔ تم تھیسس لکھ رہی ہو محبت پر۔" ازین واقعی گھبرا گیا۔ "تم اسے جانتی نہیں ہو چھوٹی۔ وہ بہت اچھی ہے۔"

"چلیے بھائی آپ کہتے ہیں تو ٹھیک ہے مگر۔ نانی کہتی تھیں۔ کانچ کے برتن کی خوب صورتی بہت زیادہ ہوتی ہے مگر پائیدار پیتل کی گڑوی ہی ہوتی ہے۔ باقی آپ بڑے ہیں اور سمجھ دار بھی۔"

چھوٹی نے گیند اس کے کورٹ میں ڈال دی۔ اور ماما نے بھی گیند اسی کے کورٹ میں ڈال دی۔ ازین کے اندر' دل و دماغ میں جنگ چھڑ گئی۔ دل ماما کا حامی تھا۔ اور ہمک ہمک جاتا تھا۔ کہتی چھوٹی بھی غلط نہیں تھی۔ ہاں یہ تھا کہ ماما کا پلڑا بھاری تھا۔

اور ماما کی جن باتوں کو وہ یونہی نا سمجھ۔ بھولی پن کہہ کر نظر انداز کر دیا کرتا تھا۔ جب ماما نے سنجیدگی سے حتمی جواب مانگا اور کہا کہ وہ اپنے کہے سے ایک انچ پیچھے نہ ہٹے گی۔ دور اہا تب آیا۔

☆ ☆ ☆

"تم اس سے بات کیا کرو طلعت۔"

یہ مہمان آنٹی کی آواز تھی جو دادی کے ساتھ بلند آہنگ قہقہے لگاتی تھیں۔ بہت شیریں بیان تھیں۔ لہجے سے شہد ٹپکا کرتا تھا۔ خاص طور پر جب وہ آپا کو پکارتیں۔ اور تب ہی پہلی بار ازین کو آپا کا نام پتا لگا کہ پہلے تو دادی تک آپا پکارتی تھیں۔ یا کبھی ہوا تو عینا کہہ دیا۔ مگر میٹھی آنٹی منہ میں مانو پورا رس گلا رکھ کر پکارتی تھیں۔ بیٹا نور عین۔ ازین کو نام بہت پسند آیا۔ اور پھر جب آگے سے بھاری آواز والی آپا۔ بہت مؤدب ہو کر حتی الامکان نرمی اور لوچ سے۔ جی آنٹی۔ کہتیں۔ تب ازین کو پتا نہیں کیوں گدگدی ہوتی۔

ازین نے معزز مہمانان گرامی کا دیدار بھی کر لیا تھا۔ آنٹی تو خیر ٹھیک تھیں۔ مگر منگیتر صاحب۔ عجیب سڑا بسا سا شخص تھا' ہر وقت بگ اسکرین موبائل میں غرق۔ ازین نے تو خود کو میزبان سمجھتے ہوئے بڑے خلوص سے سلام بھی جھاڑا تھا۔ مگر موصوف نے جواب دینا تو در کنار۔ ایسی خالی اور اجنبی حیران نگاہوں سے دیکھا کہ ازین پانی پانی ہو گیا۔ تو کون میں خوامخواہ۔ ازین نے اپنا بڑھایا ہاتھ واپس جیب میں سنبھال لیا۔

دراصل گرمی نے ازین کی مت مار دی تھی۔ یا اللہ۔ یہ کورس ختم ہوا اور پھر وہ جائے جان چھوٹے۔ سب نے ہی منع کیا تھا ایسے تجربے نہ کرے' مگر اسے کچھ نیا کرنے کا شوق تھا اور ادھر سونے لگو تو یا تو بجلی نہیں ہے۔ یا پھر آپا کے کھانے یا آپا کا شور۔

اور آج آپا کی آواز نہیں تھی۔ (شکر خدا کا) تو یہ مہمان میٹھی آنٹی۔ اور بے حد روکھا بیٹا۔ امرود کے درخت کے نیچے راز و نیاز کرنے آ گئے۔

اس نے اپنے اوپر گیلی چادر ڈالی اور ایک بار پھر سب پر لعنت بھیج کر سونے کی کوشش کرنے لگا۔ مگر۔ معزز مہمان کی آواز۔ اور وہ بھی کرخت بے زار اور بدتمیز سی۔

"کیا باتیں کروں مام! آپ نے نجانے کہاں پھنسا دیا ہے۔ اتنے دنوں سے ادھر آ کر بیٹھ گئی ہیں۔ یہ ایریا دیکھیں۔ وائی فائی تک کام نہیں کرتا۔ لوڈ شیڈنگ۔ یو پی ایس تک نہیں ہے۔ اے سی کا تو سوال ہی کیا۔" وہ دو احمق سے بوائز ہیں۔ جو طلعت بھائی' طلعت بھائی کر کے میری گود میں گھسنے کی کوشش کرتے ہیں' وہ تو میں نے انہیں بڑی مشکل سے کنٹرول کیا۔ روڈ ہو کر۔ اور ایک وہ آپ کی خالہ۔ یہ دادی نعمت آرا۔ مجھے بالکل پسند نہیں آئیں یہ لیڈی۔"

"میں نور عین سے بات کرنے کی بات کر رہی تھی طلعت۔" نازنین آنٹی نے دانت پیسے۔

"اوہ۔ ہاں وہ نو ۔۔۔۔ ر۔۔۔۔ عین۔ یعنی آپا۔ مام! میری سمجھ میں نہیں آتا۔ مان لیا ادھر امریکہ میں آپ کو گرلز پسند نہیں تھیں۔ تو ادھر پاکستان میں اور ریلیٹوز بھی جن کی لڑکیاں کسی قابل بھی تھیں۔ اسمارٹ' کانفیڈنٹ' اینڈ ایجوکیٹڈ آپ ان میں سے کسی کو چوز کر لیتیں۔ ادھر اس گھر میں آپ کو کیا نظر آ گیا۔"

"اسٹوپڈ۔ ان سب لڑکیوں کے باپ بھائی ایک فون کال سے تمہارا سارا کچا چٹھا نکلوا لیتے اور پھر ہم کو بھی دھکے دے کر نکال دیتے بلکہ جان سے مار دیتے اور جن اسمارٹ' کانفیڈنٹ' ایجوکیٹڈ گرلز کے نام پر منہ میں پانی آ رہا ہے ناں' وہ ایک منٹ میں تمہیں آئینہ دکھا دیتیں۔" آنٹی نے چٹکیاں بجا کر بتایا۔

"پہلے ہی اپنی اسی اسمارٹ والی بات کے پیچھے تم نے اینجی جیسی دہریہ کو گھر میں گھسایا۔ کتنا نقصان اٹھایا بیٹی پیدا کروالی۔ اب ساری انکم اس کی ماں ہتھیا جاتی ہے۔ پرورش کے نام پر۔ نسل الگ خراب کی۔ مستقبل بھی اور حال تو خیر نظر آ ہی رہا ہے۔"

میٹھی آنٹی کے منہ سے سچ کڑوے کریلے کی طرح نکل رہا تھا۔

"اوہو۔ ایک تو ہر بات میں آپ اینجی کو لے آتی ہیں۔" صاحبزادے برامان رہے تھے۔

"میں لے کر نہیں آتی بیٹا جی۔ وہ خود ہی آ جاتی ہے ہر مہینے۔ تھیلا بھر کے نوٹ لینے اور آگے وہ پوتی۔ اللہ معاف کرے' اسے بھی دہریہ بنا دیا اس نے' ارے کسی مذہب کو تو ماننے والی بن جاتی۔ ہر مذہب انسانیت سکھاتا ہے۔ دہریہ ماں۔ بیٹی کو دہریہ بنا دے گی۔ بلکہ بنائے گی کیا۔ بنا چکی۔"

نازنین آنٹی کے لہجے میں غصہ حقارت اور صدمہ نمایاں تھا۔ ادھر بیٹے صاحب کے نتھنے پھڑک رہے تھے۔ ماں آخر یہ بات بھول کیوں نہیں جاتی۔ اور ماں بیٹے کی سوچوں تک سے واقف تھیں۔ جب ہی اگلا سوال اسی بابت تھا۔

"اب مجھے کیا گھورے جاتے ہو۔ میں کیا غلط کہتی ہوں۔ پہلے پہل جوانی کے دنوں میں یہی لگتا ہے۔ بس شادی ہی تو کرنی ہے۔ شکل دیکھ لی' مٹکنا لچکنا دیکھ لیا۔ بس جی یہ بیسٹ لائف پارٹنر ہے۔ ارے شادی دو خاندانوں کا ملاپ ہوتا ہے' ایک نئی نسل کی بنیاد پڑتی ہے۔ مگر نہیں۔ دیکھ لیں۔ نیلی آنکھیں' سنہرے بال۔ ارے وہ سیاہی لگا کالا دل نہیں دیکھا۔ جس پر کسی نبی کے نام کا کلمہ نہیں۔"

آنٹی واقعتاً" دکھی تھیں۔ مگر بیٹے صاحب بھڑک کر بولے۔

"تو اب کر تو رہا ہوں آپ کی پسند سے شادی۔ نہ آنکھ دیکھ رہا ہوں۔ نہ بال' تھان لپیٹ کر تو وہ گھومتی ہے۔ دیکھنے کو دل ہی نہیں کیا۔"

"ارے نامعقول۔ کاش ایک ڈنڈا ہوتا جسے پکڑ کر میں تجھے دھو سکتی۔ بیٹا! وہ تھان نہیں ہے۔ دوپٹا ہے۔ اور آنکھ' بال نظر نہیں بھی آ رہے تو کیا۔ پانچ وقت نماز قرآن کرنے والی بچی۔ ایثار پسند' محبت والی' محنتی' صابر میری اگلی نسل ایسی ماں کی گود میں ہی پلے تو شاید تیرا دیا زخم بھر جائے۔"

ازین کو آنٹی پر ترس آنے لگا۔ مگر اگلے جملے نے اس کے ہاتھوں کے توتے اڑا دیے۔

"جیسے رکھیں گے رہ لے گی۔ جو کھلائے گا کھائے گی۔ الٹے ہاتھ کے دو جما بھی دے گا ناں تو اسے نہیں پتا ہو گا' کس نمبر پر کال کر کے پولیس کو بلاتے ہیں۔ بلکہ بلاتے بھی ہیں کہ نہیں' ویسے تو اللہ اس گھر ہستی کو چلائے مگر یہ نان نفقہ نہیں مانگتیں' پاکستان بلکہ مشرقی عورت دن بھر محنت کر کے کما کر بھی لاتی ہے۔ میاں کے ٹھڈے بھی کھا لیتی ہے پھر بھی رات کو ٹانگیں داب کر وہیں کہیں قدموں میں ڈھیر ہو جاتی ہے۔ (آنٹی کے ذہن میں شاید رہا نہیں' وہ بھی تو مشرقی اور پاکستانی عورت ہی تھیں۔)

"تو آپ کوئی اور دیکھ لیتیں یہ جو آپ کی۔۔۔۔ یہ کیا نام ہے عینا مینا اس میں تو کوئی اٹریکشن ہے ہی نہیں۔ چادر لپیٹ کر روڈ ہو کر ادھر ادھر پھرتی رہتی ہے۔

اتنی ایج بھی نہیں ہے مگر....." طلعت صاحب نے ایک اور عیب ڈھونڈا۔

"اب تم کوئی اتنے چھوٹے بچے بھی نہیں ہو طلعت!" آنٹی بیزار ہوئیں اور بات ختم کرتے ہوئے کھڑی ہو گئیں۔

"ذرا امریکہ کی ہوا لگنے دو۔ چوٹی کاٹ کر خود اپنے ہاتھوں سے پارلر والی کو بیچ آئے گی اور ڈالر گنتی کر کے جیب میں .... پینٹ شرٹ بھی پہن لے گی اور اسکرٹ تک بھی آجائے گی۔ ذرا صبر کرو اور عقل سے رہو سارے میرے بنے بنائے گیم کو خراب کر دو گے۔

وہ دونوں لڑکے معصوم سے ہیں۔ پیار سے بلاؤ۔ کچھ گیمز وغیرہ دکھاؤ موبائل پر۔ اس عمر کے لڑکوں کو یوں بھی ان چیزوں کا شوق ہوتا ہے۔ اور پھر یہ تو غریب غربا بچے ہیں۔

خالہ نعمت آرا سے بھی حال چال پوچھو۔ دو گھڑی بیٹھ جاؤ اور سب سے بڑھ کر نور عین کو ہنس کر دیکھ لو۔ کوئی جملہ کہہ دو۔ یونہی کہ آپ کھانا اچھا بناتی ہیں۔ یا رنگ کون سا پسند ہے۔ یا برائیڈل سوٹ ریڈ کلر کا لیتا مجھے پسند ہے۔ لڑکیاں ان چار باتوں سے ہی بہل جاتی ہیں، بے وقوف۔"

طلعت کو بہت سے آئیڈیے پسند نہیں آئے تھے مگر اس نے سر ہلا دیا۔

جبکہ ادھر ازین .... کے لیے ساری گفتگو صدمہ تھی۔ دکھ افسوس۔ آہ، دھوکا.... کچھ بھی تھا آپا جیسی سیدھی سادی لڑکی کو ایک امریکی یوں دھوکا دے جائے۔ نہیں۔ یہ نہیں ہونا چاہیے اور میٹھی آنٹی نے یہ کیا کہا۔ لڑکیاں چار باتوں سے ہی بہل جاتی ہیں.... مگر وہ مایا تو.... آج بھی اڑی کھڑی تھی۔

"او خدا....!" ازین نے سر ہاتھوں پر گرا لیا۔

☆ ☆ ☆

"پھر تم نے کیا فیصلہ کیا ازین .... میں اپنے ڈاکومنٹس کے ساتھ تمہارے بھی جمع کروا دوں؟"

"مایا کالنگ....." بہت دیر تک بجتے فون کو اس نے بہت تھکے انداز سے اٹھایا تھا یہ تکان کیسی تھی؟ کام کا لوڈ لوڈشیڈنگ؟ نیند کی کمی.... یا پھر ان ماں بیٹے کی گفتگو

ہاں شاید وہی۔ اس نے بالوں میں انگلیاں چلائیں دوسری طرف مایا وہی گفتگو کر رہی تھی جو ہمیشہ کرتی تھی۔ کوئی نیا پن نہیں تھا۔

"دیکھو میں سب کچھ دیکھ آئی ہوں۔ بھلے سے یہ اسلام آباد سے دور ایک نئی کمپنی ہے۔ مگر وہ لوگ ریذیڈنسی کے ساتھ ساتھ تمام سہولیات دے رہے ہیں اور پھر یہاں کا ماحول، موسم، مائی گاڈ۔"

"میں سن رہا ہوں مایا۔"

"اتنے بے زار سے کیوں لگ رہے ہو۔"

"ایک ہی بات کتنی بار سنوں.... تم یہ سب باتیں مجھے ہزار بار بتا چکی ہو۔"

"ہاں۔ پھر بھی تم پر اثر نہیں ہوا۔ تمہیں پتا ہے، وہ کل کا آیا بندہ ظہیر اس کا تو لیٹر بھی آنے والا ہے۔ جبکہ تمہارے اپنے ڈیپارٹمنٹ میں کتنے ہی لوگ ایپلیکیشن دے کر دن رات دعا مانگ رہے ہیں کہ ایک بار ہو جائے اور تم۔"

"ہو گا تو وہی مایا جو اللہ نے سوچ رکھا ہے۔"

"پوستیوں کی طرح اللہ کو بیچ میں مت لاؤ۔ یہ نکموں کا کام ہوتا ہے۔ اللہ نے عقل دی ہے کہ نہیں۔" وہ بے مروتی سے بول رہی تھی۔

"سوچو ازین۔" اب اس نے لہجہ بدلا اور اس سیلز گرل کی طرح ہو گئی جو اپنی پروڈکٹ بیچنے کے لیے لہجے میں شہد گھول کر للچاتی ہے۔

"ایک بہترین مستقبل .... اور پتا ہے اچھی پروگریس والوں کے لیے کمپنی کی مین برانچ میں ٹرانسفر کا آپشن بھی ہے اور تمہیں پتا ہے مین آفس کہاں ہے؟ امریکہ میں.... امریکہ ازین! جسٹ امیجن۔"

اپنی تمام بے زاری کو پرے ڈال کر مایا کو سنتا ازین چونکا۔

"امریکا.... ہاں امریکا...." وہی تو شام سے اعصاب پر سوار تھا۔ "امریکا دھوکا، دوغلا پن، منہ میں کچھ اور دل

....دل میں بہت کچھ۔"

"ہم پھر کسی وقت بات کریں مایا!" اس کے منہ سے بے ارادہ نکلا۔

"واٹ....؟" مایا کو شاک لگا' وہ اتنی اہم بات کر رہی ہے اس نے اپنی ایپلیکیشن بھی اب تک صرف ازین کی وجہ سے روک رکھی ہے حالانکہ وہ.... وہ ...... بھی جو سب سے پہلے وہاں جانا چاہتی تھی۔ مگر یہ ازین اور اس کے جذباتی خیالات.... محبت 'خلوص' ایثار 'بہن بھائی رشتے اور آپا.... قربانی' بدلہ' اجر ثواب ہونہہ۔

بہت اچھے پیارے ازین میں یہی ایک خامی تھی۔ پر اتنی بڑی بھی نہیں ایک بار وہ اپنے دائرے (آپا' بہن' بھائی) سے باہر آجاتا اور آگے تو مایا کی مایا نگری ہوتی جہاں مایا کا راج ہوتا' جہاں مایا کی چلتی' مایا جو مایا تھی مایا کی پجاری....

ایک حساب دان جیسی زندگی گزارنے کی خواہش مند....

ایک یتیم لڑکی' اپنی ماں اور بہن بھائیوں کے ہمراہ رشتے داروں کے در کی ٹھوکریں کھاتی' بے مایہ سی مایا' خود غرضی کی گود میں پلتی مایا۔ نفرت اور بیزاری کے گھونٹ بھرتی مایا....

چنگیر کے نوالوں پر عقابی نظر رکھنے والی.... آخری لقمے پر جھپٹ پڑنے والی مایا.... پھر اب اور کیسی مایا.... جیسی اب بن گئی ویسی مایا۔

تو پھر مایا کو ایسا ہی ہونا چاہیے تھا اور اگر وہ ایسی تھی تو شاید اپنی جگہ درست تھی۔

اسے زندگی اب سیدھی چاہیے تھی۔ ہر چیز مکمل اور اپنی دسترس میں' ایک دو تین جیسی نہ ڈھائی نہ ڈیڑھ اور نہ آدھی۔

جبکہ ازین نے ہمیشہ بانٹ کر کھایا تھا۔ اسے بانٹنے کی عادت تھی۔ پھر کیسے گزارا ہوتا ایک اور آدھے کو جمع کریں تو ڈیڑھ بنتا ہے اور وہی مایا کو پسند نہیں تھا.... قبول ہی نہیں تھا تو پھر....

"کسی اور وقت۔ کب ازین....؟ اس کے علاوہ اور کون سا وقت؟ تمہاری وجہ سے تمہاری سوچ لینے کی مہلت کے باعث میں آل ریڈی لیٹ ہو چکی ہوں۔ اتنا مشکل فیصلہ تو نہیں ہے۔ شادی کرتے وقت کچھ شرائط تو دنیا کے ہر معاشرے میں طے کر ہی لی جاتی ہیں' اور میں صرف تم ہی کو تو نہیں کہہ رہی کہ تم اپنے بہن بھائیوں سے الگ رہو۔ مجھے اپنے بہن بھائیوں سے بھی ایک حد میں رہ کر ملنا ہے اور یہ طے ہے۔

میں تمہیں قطع تعلق کے لیے تو نہیں کہہ رہی۔ ہم ان سے مل لیں گے عید وغیرہ یا کوئی اور موقع.... لیکن میں اپنے گھر میں کسی اور کو برداشت کر ہی نہیں سکتی۔ خواہ وہ تمہاری آپا ہوں یا میری۔

میں بچپن سے پرائیویسی نام کی چیز کو ترسی ہوں ازین.... اپنے ایک تکیے کے لیے.... مجھے تو میری ذاتی کتابیں تک نہیں ملیں.... صبح میں کتابیں اسکول لے کر جاتی تھی اور اسی اسکول میں دوپہر کو بھائی آتا تھا۔ میں گیٹ پر رک کر اس کا ویٹ کرتی تھی۔ اندر آفٹر نون کی اسمبلی شروع ہو جاتی تھی اور ہم گیٹ کے کونے پر چھپ کر بیگ بدلتے تھے۔ میں اپنی کاپیاں پنسل نکال لیتی تھی اور وہ بیگ لے کر اندر بھاگ جاتا تھا۔ مجھے بانٹنے سے نفرت ہے ازین!"

مایا کی آواز کپکپانے لگی۔ وہ اپنے ہاتھوں کی لرزش پر قابو نہیں پا رہی تھی۔ اس کی سانسیں بھی ہانپنے لگی تھیں۔

"تم جلد فیصلہ کرو.... یہ اتنا مشکل بھی نہیں.... تمہیں کھونا میری زندگی کا سب سے بڑا نقصان ہوگا۔"

مایا کا لہجہ' انداز خود اذیتی کا شکار مریض کا سا کچھ نفسیاتی ہو گیا۔

"مگر میں اس نقصان کو جھیل لوں گی مگر میں.... میں۔" مایا کے ہاتھ سے فون گر گیا تھا شاید.... ازین نے فون کو دیکھا اور تھکے انداز سے فون کو یونہی ڈال دیا۔

یہ مجبوروں کی دنیا.... مظلوموں کی نگری اور سب اپنی اپنی طرز کے جوگی.... اپنا راگ سنانے والے اور

مجبوریاں بندے کو کیسے بے بس کر دیتی ہیں ناں۔

جیسے ازین کا دوبارہ فون ملانے کا دل ہی نہ چاہا۔

اور جیسے مایا جو.... وہ بھی تو کتنی بے بس لگ رہی تھی ناں۔ اپنی خواہشوں کا پس منظر بتاتے ہوئے.. لاچار جیسے وہ اب کچھ نہیں کر سکتی۔

اور ازین نے بڑی مجبوری ہی کے عالم میں آپا..... صومی، سومی کی آپا کا دروازہ بجایا تھا۔ اس کی مجبوری کی بھی تو حد ہو گئی تھی ناں۔"

☆ ☆ ☆

"آپ کچھ بولیں گی نہیں۔" ازین نے حیرت سے پوچھا۔

"بولنے کے لیے کیا بچا ہے؟" عینا کی آواز مردانہ وار تھی مگر اس وقت شکنجے میں جکڑے میمنے کی سی لاچاری اور دھیمی تھی۔

"آپ دھوکا کھانے والی ہیں آپا....؟" ازین نے پُر زور انداز سے کہا۔

"اور اگر میں یہ کہوں ازین صاحب کہ میں یہ سب جانتی ہوں تو...." عینا کا لہجہ.... سرسری ہی سا تھا مگر دکھ کی آنچ تھی جو ازین کی سماعتوں سے ٹکراتی دل تک پہنچی۔

"تو....؟" ازین کی سمجھ میں نہ آیا وہ اب اور کیا پوچھے کیا کہے۔

"تو کچھ بھی نہیں...." عینا کا لہجہ سرسری تھا اور ازین حیران تھا لوگ تو انڈا ٹوٹ جانے کا غم بھی پانچ منٹ تک پال لیتے ہیں۔ عینا کا تو پھر دل ٹوٹا تھا اور اعتبار ٹوٹا تھا۔ مان اور بھرم.... اپنی شخصیت کی پامالی۔

"آپ یہ سب باتیں اپنی دادی جان کو بتایئے آپا۔"

"اس سے کیا ہو گا؟" عینا پُرسکون تھی۔

"اس سے یہ ہو گا کہ وہ انہیں دھکے دے کر گھر سے نکال دیں گی اور۔"

"ان کا ہارٹ فیل بھی ہو سکتا ہے ازین صاحب!" آپا کی آواز سنجیدہ اور قطعی تھی "آپ نے اتنی فکر دکھائی، آپ یہاں تک چلے آئے۔ میں آپ کا شکریہ ادا کروں گی لیکن ایک بات کہوں۔ اگر یہ دھوکا ہے تو میں دھوکا کھانے کو تیار ہوں، یہ ظلم ہے تو مجھے مظلوم ہونے میں کوئی اعتراض نہیں۔"

"اور اگر یہ...." عینا کوئی نئی مثال دینے لگی تھی۔ مگر ازین چلا اٹھا۔

"مگر کیوں آپ ایسا کیوں کریں گی؟ جانتے بوجھتے کھائی میں کودنے والی بات ہے یہ تو.... آپ کو پتا ہے خود کشی حرام ہوتی ہے اور۔"

"ارے....!" عینا ہلکا سا ہنسی۔ ازین کو لگا کیونکہ وہ چادر سے چہرہ چھپائے رخ موڑے کھڑی تھی۔ گھر سے باہر تین فٹی گیلری سی تھی۔ ازین وہیں اندر ہو کر کھڑا تھا جبکہ آپا اندرونی دروازے کو بھیڑے پیچھے کو ہو کر کھڑی تھیں جب ازین شدید جذباتی و ہیجانی کیفیت میں گھر سے نکلا۔ تب اس نے نفس مضمون تیار نہیں کیا تھا بس صرف عنوان اور خیال.... اور اس سے بھی پہلے اسے یہ بھی بتانا تھا کہ اس گھر کی سب آوازیں اس کے کمرے تک صاف سنائی دیتی ہیں اور یہ مجرمانہ اعتراف بھی کہ وہ سب سنتا رہتا تھا اور تب ہی کل شام.... اور.... اور.... اور

عینا کو شدید حیرانی ہوئی تھی۔ مگر وہ سننے کھڑی ہو گئی کہ جب ازین نے کہا اسے آپا ہی سے تو بات کرنی ہے۔ اگر وہ دو منٹ کو سن لیں بات بہت ضروری ہے۔ زندگی موت کے مسئلے جیسی.... اور اب.... اس کی یہ ہنسی....؟

"آپ ہنس رہی ہیں۔"

"ہاں ہنستی ہی ہوں ازین صاحب.... یہ جو آج کل کی دنیا ہے ناں یہ حساب کتاب کی دنیا ہے۔ کیا دے رہے ہیں۔ کیا مل رہا ہے۔ آپ مجھے بھی خود غرض کہیں، مگر ایک حساب تو رات بھر جاگ کر میں نے بھی جوڑا ہے فائدے کی ایک فہرست میں نے بھی بنائی ہے۔ طلعت صاحب کا رشتہ میرے لیے بھی لاٹری جیسا ہے۔ میرے لیے اب ادھر جو رشتے آتے ہیں، وہ

ایسے ہی ہوتے ہیں۔ شادی شدہ بچے والے بڈھے قبر میں پیر لٹکائے بابے جن کی بیٹیاں میری کلاس فیلوز رہی ہیں۔ تو پھر یہ رشتہ تو میرے لیے بہت اچھا ہے۔"

میں وہاں جا کر محنت کروں گی۔ اپنی دادی اور بھائیوں کو کما کما کر بھیجوں گی پھر کوشش کر کے.... بھائیوں کو بھی وہیں بلوالوں گی۔" آپا کے لہجے میں امید و عزم در آیا۔ "آپ اور میں طلعت صاحب یا نازنین آنٹی کو برا کیوں کہیں ایک حساب تو میں نے بھی جوڑ لیا۔ ایک غرض تو میری بھی نکلی۔" عینا کی آواز گھٹ گئی۔

"اتنی باہمت ہیں تو پھر آواز میں لرزش کیسی"....لہجے میں نوحہ خواں جیسی تڑپ اور مرثیہ گو جیسا کرب کیسے جھلک آیا۔

"میرے بھائیوں کا مستقبل بن جائے گا ازین صاحب.... آپ بتائیے کیا پھر یہ گھاٹے کا سودا ہوا؟" آپا نے سوال کیا اور جواب کے لیے ازین کو ایک عمر لگتی سوچنے کو۔

"آپ کا شکریہ۔ آپ نے دیواروں کے لیے پتلے ہونے کا بتا دیا۔ آئندہ ہم محتاط رہیں گے۔ ویسے آپ کب تک گھر خالی کرنے والے ہیں؟"

"بس عید کے بعد کورس ختم ہوتے ہی۔" ازین کا جی ہر شے سے اچاٹ ہو گیا تھا۔

آسمان پر بادل تھے اور بارش کے بعد موسم خوشگوار تھا۔ ٹھنڈی ہوا مٹی کی سوندھی خوشبو.... شہر کراچی کے بام و در دھلے دھلے نکھرے، ہر شے نکھر گئی تھی۔ ازین تراویح سے لوٹنے کے بعد چھت پر آ گیا۔ گلی بھیگی ہوئی تھی اور اب تک پانی بہہ رہا تھا۔

چھت سے آسمان کو دیکھنا بہت اچھا لگ رہا تھا۔ ذہنی کثافت جیسے چھٹ رہی تھی۔ رات کی رانی کی مہک آ...ہااس نے لمبے سانس کھینچے۔

وہ خوشبو کے تعاقب میں چھت پر چلا۔ پیچھے والے گھر کی چھت پودوں سے بھری تھی۔ باقاعدہ لان کا تاثر دیتی وہیں سے اٹھ رہی تھیں یہ متوالی خوشبوئیں۔ مگر تب ہی وہ چونکا.... یہ کیسی بدبو تھی۔ عجیب سی۔ اب وہ بدبو کے تعاقب میں گیا اوہ.... یہ امریکی مہمان طلعت صاحب تھے۔ ایک ننگی ادھڑی چارپائی پر بیٹھے.... قمیص اتار رکھی تھی اور توند نمایاں تھی اور ان کے ہاتھ میں چپٹی بوتل.... جیسے وہ ایک سرور کے عالم میں چڑھائے چلے جاتے تھے۔

نعتوں والی مسجد سے اب تلاوت کلام پاک شروع ہو گئی تھی۔

اس کا دل چاہا، وہ چھت کے اس طرف جائے اس شرابی کو گریبان سے پکڑ کر جھٹکا دے اور پھر ناک پر ایک گھونسہ مار دے۔ پھر گریبان چھوڑ کر اس کے بالوں کے گچھے کو مٹھی میں پکڑے اسے گھسیٹتا ہوا آپا (موی سوی کی آپا) کے سامنے پھینک دے۔ سارا حساب کتاب قربانی، غرض اپنی جگہ۔ وہ ایک بار اس ذلیل شخص کو بغور دیکھ تو لیں مگر....

☼ ☼ ☼

رات کو تھم جانے والی بارش.... سحری کے وقت پھر سے شروع ہو گئی تھی۔ برآمدے کی چھت سے ایک تار کا برستا پانی....پانی گرنے کی آواز مختلف ساز کی طرح تھی۔ فرش پر گری تو ٹپ ٹپ ٹپ.... مٹکے پر ڈھکی پلیٹ سے ٹن ٹن ٹن.... پلاسٹک کی ترپال پر پٹ پٹ پٹ.... اور امرود کے سبز پتوں پر پڑتی پھر پھسلتی تو سڑ سڑ سڑ....

عینا کو یہ آوازیں بہت اچھی لگتی تھیں۔ خوشبودار.... دلدار موسم، موسم گل بار آوری کا موسم نکھرنے دھلنے نئے ہو جانے کا موسم.... ساری رات بھی وہ ایک سرخوشی کے عالم میں قدرت کے سازینے سے مدھر دھنیں سنتی رہی۔

اور جب سحری بنانے کے لیے آئی تب بس ہر شے کو فراموش کر کے کتنی ہی دیر آنگن کے بیچ و بیچ آسمان کی طرف منہ اٹھائے.... ہتھیلیاں پھیلائے خود کو بھگوتی رہی۔ کسی مست مورنی کی طرح دھیرے دھیرے گھومتی۔ ایک سرخوشی کا عالم.... بارش کا عالم

.... برسات .... خوشی .... بوندیں' برکھا' بادل .... اور بس کافی ہے۔ ب کا یہ کلمہ ....

پر اس وقت آٹے کے پیڑے کو کب سے مٹھی میں بند کیے وہ دادی کو دیکھتی تھی۔ جو روتی جاتی تھیں۔ رونا یوں بھی تکلیف دہ' پھر اپنے کسی پیارے کو روتا دیکھنا اور وہ بھی ایسے تڑپ تڑپ کر۔

"میں دھوکا کھا گئی عینا ...." انہوں نے بے کسی سے آپا کو دیکھا۔

"دنیا میں اتنا دھوکا کہاں سے آ گیا' عینا؟" دادی کا لہجہ' سوال اور چہرہ کسی بچے کی سی معصومیت لیے ہوئے تھا۔

"اور اتنا جھوٹ ...." دادی کی آنکھوں میں آنسو تھے۔

"آپ کو ہماری باتیں نہیں سنی چاہیے تھیں دادی۔" آپا کا لہجہ دکھی تھا۔

"ہاں' تاکہ بے خبری میں ماری جاتی۔"

"مجھے اس شادی پر کوئی اعتراض نہیں ہے۔" آپا کے یہ جملے دادی کے لیے دھماکا ہی تھے۔

"عینا!" دادی ششدر رہ گئی تھیں۔

"ہاں دادی۔" عینا پُرسکون تھی۔

"مگر کیوں؟" دادی یہ سوال چلا کر کرنا چاہتی تھیں' مگر آواز نہ نکل پائی اس لیے کہ وادی .... آگے سارا وہی مضمون تھا جو آپا نے کل شام ازین کو سنایا تھا ہاں بس یہ زیادہ تفصیلی تھا اور اس میں کچھ بھی ڈھکا چھپا نہیں رکھا گیا تھا۔ دادی نے قطعیت بھرے انداز میں نفی میں سر ہلایا تھا۔

"نہیں عینا! میں تمہیں اس کی اجازت نہیں دے سکتی۔ کہنے سننے کو بھلے یہ سب بہت اچھا لگ رہا ہے۔ مگر دو بیٹوں کے مستقبل کے لیے میں بیٹی کی قربانی دے دوں' یہ تم نے سوچ بھی کیسے لیا۔ میں بڑھیا آج آنکھیں بند کروں تو کل دوسرا دن .... اور صوفی اور سونی .... وہ لڑکے ہیں عینا .... لڑکے پل جاتے ہیں' وہ بھی پل جائیں گے اور جو ان کی قسمت میں ہوگا' وہ انہیں مل کر ہی رہے گا۔ تم نے کیا سوچا تم نہیں ہو گی تو وہ یوں ہی رہ جائیں گے۔

خود رو پودے جلد بڑھتے ہیں۔ زیادہ پھلتے پھولتے ہیں میری بچی ...."

"آپ خود ہی تو کہہ رہی تھیں اب تو کوئی اچھا بچوں والا بھی رشتہ مل جائے تو کر دیں گی۔"

"میں نے اچھا بھی کہا تھا ساتھ میں ...."

"اچھا بھی ہو جائے گا دادی۔" آپا نے گھڑی کی طرف دیکھا۔ ایک خاموشی چھا گئی۔ بارش کی گفتگو .... بوندوں کی کھلکھلاہٹیں .... ہوا کی مستیاں .... موسم تو کھو جانے کا تھا پر دادی اب خاموش آنسو بہا رہی تھیں ایک برسات اندر ایک برسات باہر۔

☼ ☼ ☼

"چھوٹی کو ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا آپا ....!" ازین فون پر اپنی آپا سے محو گفتگو تھا۔ اس کا لہجہ تکان زدہ تھا۔ اور بولنے کو دل نہیں کرتا تھا۔

بعض دفعہ انسان اندر سے خالی ہوتا ہے تب بول بول کر خالی پن کو دور کرتا ہے۔

اور ازین .... اس کے اندر اتنی گفتگو تھی' اتنی تکرار بلکہ مباحثہ .... وہ کسی تقابلی جائزے میں مبتلا تھا' ہاں کے دلائل بھی اس کو دینے تھے اور ناں کے دلائل بھی۔

پھر جب اتنا شور ہو .... تو وہ باہر کیا بولے مگر آپا کو جواب درکار تھا۔

"تم مان جاؤ ماما کی بات ...." آپا دلی رضامندی سے کہہ رہی تھیں (یا پھر ایک اور قربانی ....؟)

"کیسی بات کر رہی ہیں آپ آپا .... یہ کوئی ماننے کی بات ہے؟"

"آخر میں تو سب الگ الگ ہو ہی جاتے ہیں۔ اپنی اپنی دنیا میں مگن۔" آپا نے حقیقت بتائی۔ ازین جھلا اٹھا۔

"آخر میں ناں .... اور آپ مجھے شروع ہی میں کہہ رہی ہیں۔"

"وہ تم سے محبت کرتی ہے ازین .... اور تم بھی تو کرتے ہو ناں۔"

"میں آپ سب سے بھی محبت کرتا ہوں آپا .... بالخصوص آپ سے۔" ازین نے تصحیح کی۔

"تو میں کب کہہ رہی ہوں کہ تم ہم سے یا مجھ سے محبت کرنا چھوڑ دو۔" آپا ہنسیں۔

"آپ کو نہیں پتا آپا! جب ہم کسی سے ملنا چھوڑ دیتے ہیں۔ کسی سے دور ہو جاتے ہیں اور پھر ایک دن محبت بیچ میں سے نکل جاتی ہے۔" ازین کی بات میں گہرائی تھی۔

"ہم ملا کریں گے ناں۔۔۔"

"لیکن میں دور ہونا ہی نہیں چاہتا کہ ملنے کے لیے پلان بناؤں۔"

"مایا کی فرمائش اتنی غلط بھی نہیں ازین۔۔۔ گھر تو پھر دو لوگ ہی مل کر بناتے ہیں۔ چڑیا لائی دال کا دانہ 'چڑا لایا چاول کا دانہ۔۔۔ ان کے گھر تو کوئی آپا نہیں ہوتی۔۔۔" آپا کا انداز چھیڑتا ہوا تھا۔ مگر ازین سنجیدہ ہو گیا۔

"ہاں آپا۔۔۔ گھونسلہ ہمیشہ چڑیا اور چڑا مل کر بناتے ہیں۔ تیسرا کوئی نہیں۔۔۔ شاید پھر اسی لیے ان کے بچے پر پاتے ہی اڑان بھر لیتے ہیں۔ کبھی نہ لوٹنے کے لیے۔۔۔ اور میں ایسا آشیانہ نہیں بنانا چاہتا۔ جس کے انجام میں تنہائی اور خود غرضی کا نوحہ پڑھنا پڑے۔"

"یہ تو نظام قدرت ہے۔ احکام خداوندی۔۔۔ دنیا کا چلن۔" آپا تھک سی گئیں۔

"تو حکم خداوندی تو یہ بھی ہے کہ بڑھاپے میں اپنے والدین کو ساتھ رکھو ان کی اطاعت کرو' خدمت کرو' ان کو صلہ دو۔۔۔ خاص طور پر ماں کو۔"

"کون سی ماں کو یاد کر رہے ہو ازین۔۔۔ ہماری ماں کو مرے زمانے بیتے۔"

"آپ کو آپا۔۔۔ آپ میری ماں نہیں کیا؟ آپ کو چھوڑ دوں۔۔۔ ایسے ہی اکیلا یا در در بھٹکنے کے لیے۔"

اس نے بات ختم کر دی تھی۔ آپا کے ہاتھ میں فون لرز کر رہ گیا۔ کبھی کبھی اندر کوئی بولتا تھا۔ زندگی میں سراسر خسارہ پایا۔ یونہی گھاٹے کا سودا۔۔۔ یہ قربانی ایثار۔۔۔ سب کتابی باتیں۔۔۔

"نہیں آج پتا لگا۔ کتابیں جھوٹ نہیں بولتیں' ان میں لکھی اچھی باتیں خوب صورت خیال۔۔۔ کہیں نہ کہیں ہوتے ہیں۔ جب ہی تو کار دنیا چل رہا ہے۔ لگتا ہے ہم نے تمام عمر گھاٹا کمایا۔۔۔ بات یہ نہیں ہوتی۔

بات یہ ہوتی ہے کہ ہمیں منافع کی پہچان نہیں ہوتی۔"

اور ادھر ازین۔۔۔ فیصلے کی رسی کے ایک سرے کو مضبوطی سے پکڑ لینے کے باوجود بے چین تھا۔۔۔ کیوں تھا۔۔۔ پتا نہیں چلتا تھا اور ابھی تو اسے آپا کو (صومی' سونی کی آپا کو) ایک بار پھر احمقانہ فیصلے سے باز رکھنے کی کوشش کرنی تھی۔

پھر اس کے بعد ہی مایا کو سمجھانے والے مشن پر جانا۔

☼ ☼ ☼

بارش کے بعد کی تازگی اور نکھرا پن محسوس کرنے وہ گھر سے دور پیدل چلتا چلتا ایک پارک میں آبیٹھا۔۔۔ آسمان اب بھی بادلوں سے بھرا تھا۔ ٹھنڈی ہوائیں۔۔۔ پتوں سے ٹکرا کر ردھم پیدا کر رہی تھیں۔

ذہنی کثافت دور کرنے کے لیے پارک آنا بہت مفید ثابت ہوا۔ ازین ہلکا پھلکا سا لوگوں کو دیکھ کر خوش ہو رہا تھا۔

وہ اتنا مگن تھا کہ اسے موبائل بجنے کا پتا ہی نہ چلا۔۔۔

"اوہ۔۔۔!" وہ چونکا۔۔۔ مایا کالنگ' تیسری مسڈ کال اوہ۔ نجانے کیوں اس کے ہوا میں جھولتے اعصاب سرکس کی رسی کی طرح پل بھر میں تن گئے۔ نپے تلے قدموں اور توازن وار تکاز کا کھیل شروع۔

"ہیلو۔۔۔" اس کی آواز میں شگفتگی کا فقدان تھا۔

"ہاں ہیلو ازین! ویر آر یو۔۔۔ فون کیوں نہیں پک کر رہے تھے؟" مایا کی آواز میں تشویش تو تھی مگر چہکار بھی تھی۔

"سائلنس پہ تھا۔ پتا نہیں چلا۔"

"اوہ۔۔۔ مجھے لگا تم سو رہے ہو گے' بس یہ لاسٹ ٹرائی تھی پھر میں رات کو ہی کرتی۔ مگر بات ہی ایسی تھی مجھ سے رہا نہیں گیا۔" وہ بہت پر جوش لگ رہی تھی۔

"اب کیا ہو گیا مایا؟"

"اوہ گاڈ! تم سنو گے ناں تو اچھل پڑو گے۔"

مایا اس کے اندر اشتیاق بیدار کرنا چاہ رہی تھی۔ جبکہ وہ اتنا ڈل تھا جیسے رنگ اڑی دھوپ میں جلی چیز۔

"اب سنا بھی دو...."

"پتا ہے۔ میں اپنی اور تمہاری ایپلیکیشن سب مٹ کروانے جب باس کے پاس پہنچی تو وہاں مجھے پتا چلا کہ۔"

"مجھ سے پرمیشن لیے بغیر تم ایپلیکیشن سب مٹ کروانے چلی گئیں مایا؟" وہ خفا ہو گیا۔

"ارے .... ہاہاہا!" مایا کی ہنسی کا جلترنگ۔ "بھول جاؤ ازین! بھول جاؤ سگنل اینڈ پرمیشن .... تمہیں پتا ہے جن دس بارہ لوگوں کو آفس کی طرف سے خود سلیکٹ کر کے آگے بھیجا جا رہا ہے۔ ان میں تمہارا .... اور، اور میرا نام ٹاپ آف دی لسٹ ہے۔ ازین .... اوہ مائی گاڈ۔"

"اوہ!" ازین کا اوہ بہت پھس سا تھا۔

"تم سوچ نہیں سکتے ازین! میں کتنی خوش ہوں مائی گاڈ!"

"میں سوچ سکتا ہوں مایا .... تم کتنی خوش ہو۔"

"ہاں ناں۔ بات ہی خوشی کی ہے کیا تم خوش نہیں ہو؟"

"نہیں ...." ازین نے حلق صاف کیا۔ "مجھے شاید اس لیے خوشی محسوس نہیں ہو رہی کہ میں وہاں جانا ہی نہیں چاہتا مایا .... مجھے یہیں رہنا ہے اپنے گھر والوں کے ساتھ اپنے شہر میں .... میں کسی فیصلے پر نہیں پہنچا مگر مجھے لگا ہے میں نے جب بھی فیصلہ کیا۔ وہ کم از کم سب کچھ چھوڑ کر وہاں جانے کا نہیں ہو گا۔"

آخر کار اس نے کہہ دیا۔

"ازین ....!" مایا کی صدمہ زدہ آواز بلند ہو کر گم ہو گئی تھی۔

☼ ☼ ☼

شکستہ قدموں سے گلی میں داخل ہوتے ہوئے اس کی چال گھر کے نزدیک ہوتے ہوتے اور دھیمی ہو گئی۔

صومی اور سونی .... طلعت کے ہمراہ بیٹھے تھے۔ طلعت کے ہاتھ میں قیمتی بڑا سا موبائل سیٹ تھا اور دونوں نو عمر لڑکوں کے چہرے پر اشتیاق کا جہان آباد تھا۔ معصوم، بے خبر، پرندے جیسے بچے .... ازین نے سوچا۔

اور یہ یقیناً" ماں کی ہدایتوں پر عمل ہو رہا ہو گا۔ غریب غربا بچے .... کاش وہ کچھ کر سکتا۔

یا پھر اسے ماں بیٹے کی اصلیت آپا کو نہیں دادی کو بتانی چاہیے تھی۔ وہ کبھی پھر یہ سب نہ ہونے دیتیں، جبکہ اب تو انہوں نے ازین سے کہا تھا۔ اگر وہ کرایہ مقررہ تاریخ سے کچھ پہلے دے دے تو .... پوتی کا نکاح کرنا ہے عید کی شام ....

تو اگر وہ کچھ پہلے کرایہ دینے سے معذرت کر لے تو .... شاید یہ نکاح نہ ہو سکے۔ مگر یہ تو کوئی حل نہ ہوا۔

پھر وہ رات گئے کرائے کی رقم لے کر دروازہ بجا رہا تھا۔ ذہن خالی سا تھا۔

دروازہ کھولنے والی آپا تھیں "کون؟"

"میں ازین! آپ کا کرایہ دار ...."

"اوہ .... کیسے۔"

"وہ یہ پیسے دادی نے کہا تھا کہ ...." اس نے جملہ ادھورا چھوڑ کر رقم بڑھا دی۔ آپا نے ہاتھ آگے کر کے نوٹ تھام لیے، نہیں گنا گیا۔

"شکریہ!" وہ دروازہ بند کر کے پلٹنے لگیں۔

ازین نے بھی رخ موڑا۔ اب اور کیا کرے۔ پھر یکدم پلٹا اور پکارا۔

"آپا .... آپا .... میری بات سنیں!" اس کے لہجے میں بے تابی سی تھی۔ جیسے دروازہ نہ کھلا تو وہ خود سے ہی پٹ توڑتا اندر جا گھسے گا۔

"آپ کو پتا ہے، یہ جو طلعت صاحب ہیں .... یہ پرسوں رات چھت پر شراب پی رہے تھے اور جس طرح سے پی رہے تھے ناں .... صاف پتا لگ رہا تھا۔ پکے شرابی ہیں بلکہ عادی ہیں .... کیا آپ شرابی سے بھی شادی کر لیں گی؟"

وہ بہت بے تابی سے پٹ کو کھوج رہا تھا۔ ہلکا سا نظر

آتا۔ نیلا سفید قمیض کا دامن۔۔۔ اور پٹ کو تھامے نظر آتی انگلیاں۔۔۔
سادہ، صاف گندمی ہاتھ۔ ترشے ناخن۔۔۔ اور وہاں ان میں آجانی والی لرزش پھر ہاتھ کا پھسلنا۔۔۔ مگر پھر مضبوطی سے انگلیوں کا جم جانا۔۔۔ اتنی سخت گرفت کہ رگیں نمایاں ہو گئیں۔

"آپ کو پتا ہے ازین صاحب!" اور آپا کے ٹھہرے لہجے کی پکار نے ازین کے باقی کے جملے روک دیے۔

"آپ اپنی طرف سے ہمدردی کر رہے ہیں۔ جبکہ سچ کہوں تو آپ میرے لیے مشکل پیدا کر رہے ہیں۔ پلیز آپ جائیے۔ پلیز۔"

"میں مشکل پیدا نہیں کر رہا۔۔۔ مجھے فکر ہے آپ کی آپا! مجھے آپ سے ہمدردی ہے۔" ازین کی آواز بھی اونچی اور لہجہ تیز ہو گیا۔

"اچھا تو آپ کو مجھ سے ہمدردی ہے۔" آپا نے بھی چلا کر کہا۔ "تو آپ کریں گے مجھ سے شادی۔۔۔ بولیے کریں گے؟"

"جی۔۔۔!" ازین نے ہلتے پٹ کو دیکھا۔

"دیکھا سانس تک اٹک گئی آپ کی۔۔۔ کہنا آسان ہوتا ہے۔" آپا کی آواز بھرا گئی "کرنا بہت مشکل۔۔۔ آپ چلے جائیے یہاں سے۔ مجھے کسی ہمدردی کی ضرورت نہیں۔ ہاں، زندگی میں جب جب پچھتاؤں گی تو آپ کو یاد ضرور کرلوں گی کہ آپ نے روکا تھا۔ مگر ازین صاحب! میں اس وقت رک نہیں سکتی۔

خدارا آپ جائیے۔ آپ کی اپنی بھی ایک دنیا ہوگی، اپنے لوگ، اپنے رشتے، اور اپنے خواب، کیوں اپنا رستہ اور کسی کی منزل خراب کرتے ہیں، جائیے۔"

آپا نے دھاڑ سے پٹ بند کر دیے۔ پھر ان کے قدموں کی معدوم ہوتی آواز نے بتایا وہ کہیں اندر جا چکی ہیں۔

جبکہ ازین وہ وہیں بت بن گیا تھا۔ ایستادہ کر دیا گیا تھا۔ یہ کیا ہوا تھا۔ کیا ہو گیا تھا ازین۔۔۔ گیند اس کے کورٹ میں آگئی۔ جبکہ وہ تو اس پورے گیم میں کہیں تھا ہی نہیں۔۔۔ تو پھر۔۔۔

اس کا ذہن خالی ہو گیا تھا۔ یا سوچنے سمجھنے کی صلاحیت چھن گئی تھی۔ یا پھر۔۔۔

☼ ☼ ☼

اس نے مایا کو نئی کمپنی میں جوائننگ سے منع کیا تھا۔ مایا نے اسے ہر چیز سے منع کر دیا اور حیرت انگیز بات یہ ہوئی، اسے دکھ نہیں ہوا۔ وہ مایا فون پر بولتی رہی۔ بکتی جھکتی رہی، تھوڑا صحیح، تھوڑا غلط۔۔۔ اور وہ چپ چاپ سنتا رہا۔ فون بند ہوا تھا۔ اسے اپنا آپ بہت ہلکا پھلکا لگا۔ تب وہ اپنی اس کیفیت پر حیران رہ گیا۔ جیسے سر سے بوجھ اتر گیا۔

محبت دلوں میں پھول کھلاتی ہے۔ مگر بعض محبتوں میں مسلسل کسی کانٹے کی چبھن کا احساس ہوتا ہے۔

ازین کو لگا، وہ کانٹا نکل گیا۔ وہ پھانس نکل گئی۔ مگر آپا کچھ سننے کو تیار نہیں تھیں۔

"تم اس کی مان لیتے ازین۔۔۔! اتنی آسانی سے راستے الگ ہوتے ہیں بھلا۔۔۔ یونی ورسٹی اور پھر وہ کولیگ تھی تمہاری۔۔۔ ایک راستہ، ایک منزل۔۔۔"

"دوراہا آگیا تھا آپا! پھر دونوں نے اپنی اپنی راہ پکڑی۔"

"تم بھی اسی کے راستے کو پکڑ لیتے۔"

"اس نے میرا راستہ کیوں نہ پکڑا۔"

"یہ محبت تو نہ ہوئی، ضد بحث ہو گئی۔" وہ بحث کے لیے تیار تھا۔

"کیا یہ سب اتنا آسان ہے بھیا! جتنے مزے سے آپ کہہ رہے ہیں۔" کانفرنس کال میں چھوٹی بھی تھی اور کب سے خاموش تھی۔

"ہاں۔ شاید۔۔۔ پتا نہیں۔" وہ پہلی بار اٹکا۔

"ایک جواب دیں بھیا!" چھوٹی نے کہا۔ "پر وہ تو شاید آپ کے اپنے پاس بھی نہیں۔"

"ابھی نہیں ہے ایک جواب مگر شاید کچھ دن بعد دے سکوں۔" ازین کے لہجے میں یقین تھا۔

"پھر۔۔۔ شاید۔" چھوٹی جھنجلائی۔

"شاید یقین کے سفر کا آغاز ہوتا ہے۔"

"وہ اتنی آسانی سے بھولے جانے والی چیز نہیں ہیں

بھیا۔۔۔ گڑیا جیسی ، کرسٹل کی گڑیا۔۔۔ باربی ڈول لگتی ہیں۔" چھوٹی کو حسین بھابھی کے ہاتھ سے نکل جانے کا دکھ تھا۔

"نانی کہا کرتی تھیں۔ کانچ کا برتن خوب صورت ہوتا ہے پر پائیدار پیتل کی گڑوی ہوتی ہے۔"

"لوگ تو اب شیش محل میں پوری زندگی گزار لیتے ہیں بھیا۔" آپا کی آواز میں دکھ تھا۔

"اچھا تو یہ بتائیں۔ ماہا کو تو آپ نے کانچ کا برتن کہہ دیا۔ کیا پیتل کی گڑوی ڈھونڈلی۔" چھوٹی کا دماغ تیز چلتا تھا۔

"ارے۔۔۔" وہ بے ساختہ ہنس دیا۔ اور اسے خود احساس ہوا کہ وہ کتنے دنوں کے بعد یوں بے فکری سے ہنسا ہے۔

"جلد بازی کے فیصلے اچھے نہیں ہوتے۔" آپا نے ایک اور حقیقت بتائی۔

"اچھے تو نہیں ہوتے آپا۔۔۔ مگر سچے ضرور ہوتے ہیں۔" اس کا دھیان کہیں اور چلا گیا تھا۔

"کیا فیصلہ کرلیا ہے بھیا؟" چھوٹی کے سوال نے اسے چونکایا۔

یہی سوال تو وہ خود سے پوچھ نہیں پا رہا تھا۔ پر اب جب سوال سامنے آ ہی گیا تو جواب کیا دے۔

☼ ☼ ☼

دروازہ بجاتے ہوئے اس کے اعتماد کا درجہ بہت اوپر تھا۔ مگر دروازہ خلاف توقع دادی نے کھولا۔

"ہائیں۔۔۔!" وہ بری طرح چونکا پر بروقت سنبھلا۔

"السلام علیکم!"

"وعلیکم السلام۔ جیتے رہو۔" دادی نے بھی پرجوش جواب دیا اور اس کی صورت دیکھی جو کچھ پریشان اور ہونق ہو گئی تھی۔ ابھی کچھ دیر پہلے ہی تو اس نے سنا تھا۔ مہمان آنٹی اور ان کا عزیز بیٹا بازار جارہے تھے اور دادی بھی حسب معمول ساتھ ہی جاتیں۔ مگر یہ کیا۔ وہ تو سامنے تھیں اور سوالیہ نگاہیں اسی پر گڑی تھیں۔

"کوئی کام تھا بیٹا؟" دادی اب الجھ رہی تھیں۔

"جی۔۔۔ ہاں کام۔۔۔ بالکل کام تھا۔ میں اندر آجاؤں؟"

"اندر۔۔۔؟" دادی حیران ہوئیں "اچھا آجاؤ۔"

ازین اندر آگیا۔ یہ آج اس کی دوسری بار آمد تھی۔ ایک بار بالکل شروع میں جب اس کے گھر پانی کی لائن مسئلہ کر رہی تھی تب اسے ادھر آکر چیک کرنا پڑا تھا اور آج۔۔۔ پر آج اندر اتنا سناٹا کیوں تھا۔ اس نے چاروں جانب جائزہ لیا۔ نظریں گھوم پھر کر دادی پر آ ٹکیں جو حیران سی اسے تکے جا رہی تھیں۔

"وہ صومی۔۔۔ سونی نظر نہیں آرہے۔" اسے بروقت سوجھا۔

"ارے بچے۔۔۔ یہ جو انتیسویں روزے کو چاند کی تلاش ہوتی ہے۔ بندے کو باؤلا کر دیتی ہے۔ اب بھلا بتاؤ' جو دسویں مالے (بلڈنگ) پر چڑھ کر مولویوں کو نظر نہ آیا۔ وہ گلیوں چوراہوں میں گھومنے سے کیا خاک ملے گا۔ مگر بھئی۔ سب نے منہ اٹھا کر بے نتھے بیل کی طرح نکل پڑنا ہے۔" دادی سخت برافروختہ تھیں۔

"اب جب انتیس رکھ لیے تو تیسویں میں کیا موت پڑ رہی ہے مگر نہیں بھئی۔۔۔" دادی نفی میں سر ہلا رہی تھیں۔

"اور ہاں۔ تم نے نہیں بتایا۔۔۔ تم ادھر کیوں نکل آئے؟"

"میں۔۔۔!" ازین چونکا۔ اسے ایک اندرونی کمرے میں ہیولہ سا دکھا تھا۔ "ہاں میں بھی دادی! میں بھی چاند دیکھنے۔۔۔ میرا مطلب ہے ڈھونڈنے ہی نکلا تھا۔"

"چاند ڈھونڈنے۔۔۔ ہمارے گھر۔۔۔ اے بیٹا خیر تو ہے۔ طبیعت تو ٹھیک ہے۔ روزہ تو نہیں لگ گیا۔ چائے بنواؤں یا پھر سکنجبین؟ اے آپا۔۔۔ عینا عینا' دادی کو ترس آیا۔ گھر سے دور پردیسی بچہ۔۔۔

"نہیں دادی! طبیعت ٹھیک ہے۔ وہ آپا۔۔۔ آپا کدھر ہیں؟"

"آپا۔۔۔ عینا کو پوچھ رہے ہو۔۔۔ عینا سے کیا کام بھلا؟" دادی کا لہجہ سخت ہوا۔

"جی دادی پلیز۔۔۔ ان ہی کو بلانا ہے۔" ازین نے

اپنے بوکھلے پن پر لات مارتے ہوئے تھوڑی ہوش مندی اور سنجیدگی کا لبادہ اوڑھ لیا۔

"آپا کو بلاؤں... عینا کو؟" اب کی دفعہ دادی کی آواز بلند ہوئی۔ ازین کا سر زور زور سے ہلا اور اس سے پہلے کہ دادی طیش میں آکر کھڑی ہوتیں۔

آپا کی بھاری آواز پر دونوں چونکے۔

"آپ نے بلایا دادی..." اس نے ساتھ ہی دوپٹا درست کر کے رخ بھی بدلا۔

"ہاں میں نے ہی بلایا۔ یہ ازین کو تم سے کوئی کام ہے۔"

رخ موڑ کر کھڑی آپا کو بدستور دیکھتے ازین نے نفی میں گردن ہلائی۔

"مجھے ان سے نہیں "آپا سے بات کرنی تھی۔"

"اے بھیا... کچھ الٹا سیدھا کھا بیٹھے ہو کیا؟ یہی آپا ہے اور کوئی نظر آرہا ہے تمہیں؟"

"یہ آپا ہیں۔" ازین کھڑا ہو گیا۔ "آپا!" وہ تو ایک پکی عمر کی عام صورت والی (بھاری آواز) والی آپا کو سوچتا رہا تھا۔

"پھر یہ تو تیس بتیس برس کی گندمی رنگت والی لڑکی تھی۔ جس کی آنکھیں شہد رنگ تھیں اور وہ شانے پر پڑی بل دار سی رسی اوں ہوں... رسی نہیں چوٹی... دامن تک چوٹی... ریشمی سی۔"

"یہ آپا نہیں ہو سکتیں۔" وہ صاف مکرا۔

"اے بیٹا... تم تو سچ مچ کے کھسکے ہوئے لگتے ہو۔ ڈبل پتی کا پان تو نہیں کھا بیٹھے۔ ہیں۔" دادی اب خوف زدہ ہو گئی تھیں۔

"میں ہی آپا ہوں ازین صاحب...! آپ کہیے اب کیا کہنے آئے ہیں؟" آپا نے دوپٹا اپنے گرد لپیٹا۔ ماتھے سے بھی کھینچا (مگر شہد رنگ آنکھیں نمایاں تھیں۔ رخ اب پھیرا ہوا تھا اور ان آنکھوں میں تادیب تھی)

"اور پلیز وہ نہ کہیے گا جو آپ گزشتہ دنوں کہتے رہے ہیں۔ اسے گزارش سمجھیے یا پھر حکم...۔"

ازین نے بھنویں اچکائیں۔ ہاں یہ آپا ہی تھیں۔

اتنی مردانہ وار آواز آپا ہی کی تھی اور لہجہ بھی مگر... آپا اندر سے ایسی نکلیں گی۔ یہ تو اس نے خواب میں بھی نہ سوچا تھا۔

"اے بات سن عینا!" دادی کو لگا اب ان کی انٹری بنتی ہی ہے۔ تیزی سے اٹھ کر عینا کے نزدیک پہنچیں اور شانے سے پکڑ کر اپنی طرف موڑا (چادر اور بھی سرک گئی)

"یہ تین دن سے کیا کہتا رہا تھا... اور اب کیا کہنے آیا ہے؟"

سوال کا دوسرا حصہ ازین کے لیے تھا اور ازین نے اپنی ساری گھبراہٹ اور حیرت کو کسی اور وقت کے لیے اٹھایا۔ وہ دو قدم آگے آیا اور آپا کے عین روبرو ہو گیا۔ نظریں آپا کے چہرے پر گڑی تھیں۔

عینا کو پہلی بار کسمساہٹ سی ہوئی۔ وہ ایک قدم پیچھے کو سرکی۔

"میں وہ سب نہیں کہوں گا آپا...! جو تین دن سے کہتا رہا۔ میں نئی بات کروں گا۔ ہاں ہے وہ آپ کی بات کا ہی جواب... مگر سوال میں مخفی... میں آپ سے شادی کروں گا آپا..." اس نے کہہ ہی دیا۔

"کیا...؟" آپا اور دادی دونوں کے سر پر ایک ساتھ پہاڑ ٹوٹا تھا۔ جیسے۔

"ہائے۔" دادی نے دل پکڑا تھا۔

عینا لپک کر دادی تک آگئی۔ ازین نے بھی تقلید کی۔ پانی پلایا۔ کمر ملی... دادی کی سانسیں بحال ہوئی۔

تب تینوں کو یاد آیا یہاں کیا کہنے سننے آئے تھے۔

ازین نے عینا کو دیکھا جس نے دوپٹا دوبارہ لپیٹ کر منہ پھیرا تھا۔ سو ازین ہی کو بولنا پڑا۔ پہلے دن سے آج کے دن تک کی کہانی... حرف بہ حرف ازین نے مایا کو بھی نہیں چھپایا۔ سب کہہ دیا۔

"اور اپنے بارے میں کیا کہوں۔ آپ کو سب تحقیقات کا حق ہے۔ مگر میری آپا کہتی ہیں۔ خدا مجھ سا بھائی اور بیٹا ہراں کو دے۔ ہو سکتا ہے یہ ان کی محبت ہو مگر میں اتنا ضرور جانتا ہوں میں آپ کے اس امریکی نواسے سے ضرور اچھا ہوں بلکہ بہترین ہوں۔"

دادی کیا بولتیں۔ رونا رکتا تو بات کرتیں ناں، کتنی مشکل سے دل کو منایا تھا۔ طوعاً وکرعاً ان کی پوتی کا حق تو تھا کہ راج کمار اسے بیاہے اور سامنے بیٹھا یہ نوجوان راج کماروں سے بڑھ کر لگ رہا تھا۔

دعاؤں کے پورا ہونے کا یقین تو ہمیشہ سے تھا۔ بس یہ گلا تھا اسے اللہ جب آپ دعا قبول کرلیں تو بتادیں۔ کب پوری جائے گی دن، تاریخ بلکہ گھنٹہ سیکنڈ تک .... ورنہ یہ انسان کا فطری اتاولا پن چین نہیں لینے دیتا۔ تو دعا قبول ہوگئی تھی۔ دادی کے آنسو تھمتے نہیں تھے۔

"اور آپا! آپ سے یہ کہوں گا۔ میں بالکل آپ ہی کے جیسا ہوں۔ بالکل ویسا جیسا آپ نے ایک دن صومی، سوٹی کو بتایا تھا۔ اب تو آپ کو کوئی اعتراض نہیں ہونا چاہیے۔"

اور آپا .... یعنی عینا .... اوہ ہو نور عین کیا جواب دیتی۔ صلے کی تمنا کبھی نہیں کی تھی۔ مگر سنا تھا، صلہ ملتا ہے بعض دفعہ دنیا ہی میں ملتا ہے۔ جب نیکی بوئیں تو شجر بھی نیکی کا ہوتا ہے اور پھل بھی....

اور جب اللہ کسی کی آخرت سنوار دے۔ تو تھوڑی جھلک دنیا میں نظر آہی جاتی ہے۔ جیسے ازین کے لیے نور عین.... اور نور عین کے لیے ازین....

دادی اور پوتی کی سوچوں سے پرے ازین سوچ رہا تھا۔ اس نے سب سچ بتا دیا ہے مگر ابھی تک جواب نہیں ملا۔

اسے بے چینی ہونے لگی۔ اگر جو جواب خدانخواستہ انکار ہو گیا تو وہ جو دل میں تازہ تازہ سی خوشی پھیلنے لگی تھی اس کا کیا ہوگا۔ شہد رنگ آنکھیں جب استعجاب میں گھریں تو کیسے ٹمٹمانے لگی تھیں۔ پھر پلکیں جھکیں تو تاریکی کا گمان ہوا۔ اب اگر یہ ایک بار اور اٹھیں تو....

اور یہ جو خوشی نہیں سکون دل میں پھیل رہا تھا۔ اور یہ جو خدشے کا دو مونہا سانپ بار بار پھن پھیلاتا تھا اگر جواب مل جائے تو گویا جیسے وہ سانپ کا سر کچل دے۔

مگر یہ آپا.... آپا آخر بولتی کیوں نہیں.... مجھے ایک بار پھر پوچھنا چاہیے، ازین کے اندر کا پاسبان عقل صحیح ہدایت دے رہا تھا۔

اس نے لہجے کو مزید عاجزانہ کیا۔

"آپ نے جواب نہیں دیا آپا.... آپ مجھ سے شادی کریں گی؟"

دادی اور پوتی بری طرح چونکیں پھر ایک دوسرے کو دیکھا۔

"اے بیٹا! ویسے تو سب ٹھیک ہے۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں، مگر بندے کو اتنا بھی سیدھا نہیں ہونا چاہیے۔ منہ سے پکارتے ہو آپا.... اور پیام دے رہے ہو شادی کا۔"

دادی کو ویسے تو لڑکا پسند آ گیا تھا مگر یہ جو آپا کی گردان تھی۔ پہلے رشتہ تو صحیح کرے باقی باتیں بعد میں....

ازین نے بری طرح چونک کر دادی کو دیکھا پھر آپا کو.... اوہ ہو نور عین کو.... جو نگاہ ملنے پر بے ساختہ ہنس دی تھی۔

اور پھر ازین کی بھی ہنسی چھوٹ گئی۔ وہ اتنا گھامڑ تو نہیں تھا۔ ایک بار بھی نہ سوچا کہ کہہ کیا رہا تھا۔ "آپ مجھ سے شادی کریں گی آپا؟"

اس نے جملہ زیر لب دہرایا تو خود کا قہقہہ آسمان کو چھو گیا۔

تب ہی دروازہ کھلا۔ یہ صومی سوٹی تھے برے منہ سے "چاند نظر نہیں آیا آپا۔"

دادی نے نانجاروں کو "ایک اور روزہ رکھنے پر کیا تکلیف ہے۔" کہہ کر ایک لیکچر دیا۔

جبکہ ازین اور نور عین سوچ رہے تھے۔ چاند نظر آ گیا تھا ناں ابھی پل بھر کو ایک دوسرے کو دیکھ کر دونوں کی آنکھوں میں جگمگاہٹیں اتری تھیں۔ ان کے آگے چاند تاروں کی روشنی ماند تھی۔

قرۃ العین رائے

"سعد کہیں جا رہے ہو بیٹا؟" انہوں نے نک سک سے تیار بیٹے کو بائیک کی چابی ہاتھ میں پکڑے دیکھ کر پوچھا۔

"جی امی....." مختصر جواب موصول ہوا۔

"تو مجھے آپا کی طرف چھوڑتے ہوئے جاؤ۔ تقریباً دس پندرہ دن ہو گئے دوبارہ جا کر ان کی خیریت معلوم ہی نہیں کر سکی۔ آج ذرا فرصت ہے اور ارادہ بھی۔" کرسی سے بمشکل اٹھتے ہوئے انہوں نے اپنا ارادہ ظاہر کیا۔

"لیکن امی میں تو بائیک پر جا رہا ہوں' آپ اس پر کیسے بیٹھیں گی۔" سعد کو تامل ہوا۔

"ارے بیٹا! اسی وجہ سے تو ابھی تک آپا کی طرف جا نہیں پائی' کم بخت یہ جوڑوں کا درد صرف دو گلیاں چھوڑ کر ان کا گھر ہے اور مجھے اتنے دن ہو گئے ہیں۔ فکر ہو رہی ہے ان کی۔" بمشکل کھڑے ہوتے ہوئے انہوں نے کہا۔

"آنٹی! آپ سعد کے ساتھ بائیک پر کیسے جائیں گی۔ آج واجد آفس سے جلدی آجائیں گے۔ آپ تیار رہیے گا وہ آپ کو خالہ رقیہ کے گھر کار پر چھوڑ آئیں گے۔" ان کی بہو فرح نے جلدی سے آن کر کہا۔ اور سعد کے چہرے پر سکون جھلکا۔ امی کو ان کے بھاری بھر کم وجود کے ساتھ بائیک پر لے جانا بے حد مشکل تھا۔

"اچھا! چلو ٹھیک ہے۔ میں تیار ہوں۔ بس واجد جیسے ہی آئے مجھے چھوڑ آئے۔ آپا کیا سوچیں گی کہ ایسی مشکل کی گھڑی میں ان کی سگی بہن ہی ان سے لاپروا ہے تو دوسروں سے کیا شکایت۔" دوبارہ کرسی پر بیٹھتے ہوئے انہوں نے آہ بھرتے ہوئے کہا۔

"تو میں جاؤں امی!" سعد نے جلدی سے پوچھا۔

"ہاں بیٹا خیر سے جاؤ..... لیکن جلدی آجانا۔" انہوں نے سر ہلاتے ہوئے کہا اور سعد سر اثبات میں ہلاتا جلدی سے لاؤنج سے نکلتا باہر کھڑی بائیک پر اپنے دوست کے گھر کی جانب روانہ ہو گیا۔

"آپ حماد بھائی سے روزانہ ہی تو فون پر بات کر کے خالہ رقیہ کی خیریت دریافت کرتی ہیں۔ ویسے بھی وہ آپ کے جوڑوں کے درد سے واقف ہیں۔" فرح نے قریبی صوفے پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ چائے کا کپ اس نے صفیہ بیگم کے پاس رکھ دیا تھا اور ایک کافی کا مگ اس نے تھام رکھا تھا۔ وہ چائے کے بجائے کافی پیتی تھی اور آج اسے اسکول سے چھٹی تھی تو دو گھڑی ساس کے پاس آن بیٹھی' ان کی یہ پڑھی لکھی بہو جو کافی ذہین ہونے کے ساتھ ساتھ کافی سلیقہ مند بھی تھی۔ ایک بہترین اور مہنگے پرائیویٹ اسکول میں جاب کرتی تھی۔ آج ہفتہ تھا اور اسے اسکول سے چھٹی تھی۔ باقی دنوں میں وہ بے حد مصروف رہتی تھی۔ گھر اور باہر کے کاموں کو وہ باخوبی نبھا رہی تھی اور پھر اس کے دو بچے آیان اور ایمان تھے جو بالترتیب چھ اور پانچ سال کی عمر کے تھے۔ اپنی مما کے ساتھ ہی اسکول جاتے تھے۔ یہ وقت ان کے قاری صاحب کے آنے کا تھا اور وہ قاری صاحب سے سپارہ پڑھ رہے تھے۔ ڈرائنگ روم میں بیٹھے۔ فرح بے حد اصول پسند تھی۔ ہر چیز کا وقت مقرر تھا۔ بے ترتیبی' بے ہنگم کام اسے سخت ناپسند

تھے۔ بلاوجہ کا شور وہ برداشت نہیں کر سکتی تھی۔ پورا گھر اس کے ڈسپلن کا عادی ہو چکا تھا۔ جب ہی تو گھر میں بچوں کے ہوتے ہوئے بھی خاموشی اور سکون رہتا تھا۔ کبھی کبھی صفیہ بیگم کو یہ خاموشی اور سکون کھلتا تھا۔ ہر چیز جیسے وقت کی سوئیوں کے ساتھ بس ہلکی ہلکی ٹک ٹک کے ساتھ چلتی تھی۔ ان سب لوگوں کی سانسیں بھی؟ انہوں نے سینے سے لمبا سانس خارج کرتے ہوئے بہو کی جانب دیکھا جو سادہ سے حلیے میں ہلکے رنگ کا سوٹ پہنے بیٹھی تھی۔

"فون پر پوچھنا اور روبرو مل کر خیریت دریافت کرنے میں فرق ہوتا ہے۔ ویسے بھی ان کی بہو بہت لاپروا اور لاابالی طبیعت کی ہے۔ بہت بچپنا ہے اس میں، اور آپا تو بالکل تمہاری طرح ہر کام سلیقے، قرینے سے کرنے کی قائل، وہ آپا کو سنبھال نہیں پائے گی۔ حماد تو بس یوں ہی کہہ دیتا ہے کہ امی پہلے سے بہتر ہیں۔ کیا خاک بہتر ہوں گی، جب ان کے اٹیک کا سن کر میں حماد

کے ساتھ وہاں گئی تھی، ایک دن میں ہی جان لیا تھا کہ آپا کا برا وقت شروع ہو گیا ہے۔ ساری عمر انہوں نے اصولوں کے ساتھ زندگی گزاری، ہر چیز سلیقے طریقے سے، چلتے ہوئے آہٹ تک نہیں کرتی تھیں۔ انہیں بے ہنگم شور کہاں برداشت اور ان کی بہو صاحبہ ڈیک پر یا ٹی وی پر اونچی آواز کر کے گانے سنتی ہیں جس گھر میں سکون کا راج تھا اب وہاں پر چھن چھناہٹ کا راج ہے۔" صفیہ بیگم کو بہو سے چند منٹ ملے تھے بات کرنے کو، سو وہ جلدی جلدی بولتی چلی گئیں۔

"چھن چھناہٹ!" فرح نے قدرے حیرانی سے جملہ دہرایا۔

"ارے ہاں نہیں تو! چوڑیوں کی چھن چھن.... پراندے میں لگے گھنگھروں کی چھن چھن، پازیب کی چھن چھن، ارے وہ لڑکی تو چلتی پھرتی چھن چھناہٹ ہی ہے۔ اللہ جانے اسے سکون اور خاموشی سے اتنا بیر کیوں ہے۔ ہر وقت چھن کھن کرتی رہتی ہے۔ آپا بے چاری تو بول پاتی نہیں۔ چند الفاظ بمشکل ادا کر پاتی

ہیں۔ ورنہ تو اپنی بہو کو وہ صلواتیں سنائیں کہ دن میں تارے نظر آجائیں محترمہ کو۔" بات کرتے ہوئے ان کی نظریں ہی فرح کی سونی کلائیوں پر ٹکی تھیں اور رنگ برنگی کانچ کی چوڑیوں کا تصور آتے ہی انہیں فرح کی کلائیاں کچھ زیادہ ہی سونی لگی تھیں۔

"خالہ خوش بھی تو شاید اسی لیے حماد کی شادی پر نہیں تھیں اور ابھی تو محض ایک ہفتہ ہی ہوا تھا ان کی شادی کو کہ خالہ کو فالج کا اٹیک ہو گیا۔" فرح نے تبصرہ کیا اور اتنی دیر میں دونوں بچے پڑھ کر ان کی جانب چلے آئے اور ان کی باتوں کا سلسلہ بھی وہیں پر تھم گیا۔

"اوکے امی! میں ذرا بچوں کو ان کا ہوم ورک کروالوں، ان کی اسٹڈی کا ٹائم ہو رہا ہے۔" فرح بچوں کو دیکھ کر فوراً اٹھ کھڑی ہوئی اور صفیہ بیگم جو مزید باتیں کرنا چاہ رہی تھیں۔ بس خاموش ہی بیٹھی رہ گئیں۔ جی تو چاہا کہ فرح سے کہیں کل اتوار ہے، کل ہوم ورک کروالینا، ابھی کچھ دیر اور یہاں بیٹھو، لیکن انہیں فرح کا جواب معلوم تھا۔

"نہیں امی ہر چیز وقت پر اچھی لگتی ہے۔ بچوں میں وقت کی پابندی کی عادت پختہ ہو گی ابھی سے تو وہ آج کا کام کل پر نہ چھوڑنے کا سبق سیکھیں گے۔ ایسے ہی کوئی جملے ادا کرتی وہ سہولت سے انہیں منع کرتی اٹھ جائے گی۔ وہ اچھی طرح سے جانتی تھیں اور وہ بچوں کو پڑھاتی بھی ان کے اسٹڈی روم میں تھی۔ لاؤنج میں اسٹڈی کرنے کا کیا مطلب ایسی بے ترتیبی اسے پسند نہیں تھی۔ لہٰذا صفیہ بیگم اکیلی اور چپ چاپ بیٹھی رہ گئیں۔

✲ ✲ ✲

جدوں ہولی جئی لینا ایہہ میرا ناں
میں تھاں مرجانی آں وے
میں تھاں مرجانی آں.... ہائے ہائے
ہائے.... ہائے کو ایک ادا اور سر کے ساتھ باآواز بلند گاتے ہوئے وہ رقیہ بیگم کے پاس دھم سے آکر بیٹھی تھی وہ جو سکون سے آنکھیں موندے لیٹی تھیں۔ اس

کے یوں دھم سے بیٹھنے پر چونک گئیں اور ناگواری سے اس کی جانب دیکھا تھا۔

"امی جی اٹھیے! آپ کے سر میں تیل ڈال کر مالش کردوں بادا موں کا تیل ہے بڑا سکون ملے گا۔

اور انہیں اپنا رہا سہا سکون بھی غارت ہوتا نظر آیا۔ یہ سچ ہے کہ اس کی انگلیوں میں جادو تھا۔ روزانہ وہ ان کی مالش کرتی تھی۔ سر ہلکا پھلکا ہو جاتا تھا۔ لیکن اس کے ساتھ بندھے اس کے بے ہنگم ساز ان کے سکون کو غارت کر ڈالتے تھے۔ اعصاب ڈھیلے ہو کر پر سکون سے ہو کر غنودگی مائل ہوتے تھے وہیں پر ان کی سماعت عجیب و غریب شور سے بے زار ہوتی تھی۔ طبیعت میں تضاد بھر جاتا تھا۔

"اٹھیے بھی!" سر پر کھڑی تھی وہ ان کے چارو ناچار بمشکل انہوں نے اپنے وجود کو آہستہ آہستہ بٹھانے کی کوشش شروع کی۔ ذرا سا سہارا دے کر وہ پھر لاپرواسی پیچھے ہو کر کھڑی ہو گئی اور وہ اپنے وجود کو خود ہی بمشکل بٹھا پائیں۔ زبان تو ان کی صحیح طرح سے چل نہ پاتی، لیکن دل میں وہ اسے خوب گالیوں سے نوازتی تھیں۔ وہ سمجھ نہ پاتیں کہ وہ واقعی اتنی لاپروا اور کم عقل سی ہے یا جان بوجھ کر انہیں ستانے کے لیے کرتی ہے۔

جدوں ہولی جئی لینا ایہ میرا ناں

ہائے.... جدوں ہولی جی

ایک دو جملوں کی تکرار کرتی وہ با آواز بلند گانے میں مگن ہو چکی تھی۔ تیزی سے چلتے اس کے ہاتھ اور درجن بھر دونوں کلائیوں میں بھری چوڑیوں کی جھنکار یہ ہی تو وہ شور تھا جو ان کی سماعت پر بھاری تھا۔

"ہائے میں مر گئی حماد کے آنے کا وقت ہو رہا ہے اور میں نے ابھی تک کھانا نہیں بنایا۔ میں نا جلدی جلدی آٹا گوندھ لیتی ہوں اور مٹر آپ کو دے جاتی ہوں۔ میرے آنے تک نکالیے۔ آج مٹر قیمہ پکا لیتی ہوں۔" اچانک ہی یاد آنے پر اس نے زور سے اپنے سر پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا اور رقیہ کا دل اسے کھری کھری سنانے کو چاہا۔

شوہر کے آنے کا وقت ہو رہا ہے اور ابھی تک ہنڈیا چولہے پر نہیں دھری تھی۔ اپنے ہار سنگھار سے فرصت ہو تب نا بالوں میں لگی گلاب کی تین کلیوں کو دیکھ کر انہوں نے جل کر سوچا۔ ویسے وہ اس روپ میں لگ بہت پیاری رہی تھی۔

"اوئی...."

"سنبھل کے...." سامنے پڑی میز سے بری طرح ٹکر پر بے ساختہ ان کے منہ سے نکلا تھا اور وہ جو گھٹنے پر چوٹ لگنے پر وہیں بیٹھ گئی تھی۔ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ اس کی قل قل کرتی ہنسی پر بے اختیار ان کے لبوں پر مسکان آن ٹھہری تھی۔

"پاگل...." وہ سر ہلا کر بڑبڑائی تھیں۔

"لیں جلدی سے مٹر نکالیں میں آئی۔" وہ مٹروں کی بھری ٹوکری ان کی گود میں رکھ یہ جا وہ جا سیدھے ہاتھ سے کپکپاتے ہوئے انہوں نے مٹر چھیلنے شروع کیے۔

"ارے.... بند کر جا.... اسے بند کر جا۔" زور سے بمشکل بولتے ہوتے انہوں نے کچھ ہی دیر بعد اسے آواز دی تھی۔ ٹی وی کا والیوم کافی بلند تھا۔ وہ جھٹ سے آکر آواز کم کر گئی تھی اور کچن میں جاتے ہوئے وہ اپنی چالاکی پر بے حد خوش تھی۔ ایسی حرکتیں کر کے وہ انہیں بولنے پر اکسا لیتی تھی۔ کچھ ہی دیر بعد اس نے کوئی نہ کوئی ایسی حرکت ضرور کرنی تھی جس پر وہ بے اختیار بول اٹھتیں۔ وہ نہ خود زیادہ دیر خاموش رہ سکتی تھی اور نہ انہیں رہنے دیتی تھی، جان بوجھ کر وہ چیزوں سے ٹکرا کر اپنے پاؤں، گھٹنوں پر چوٹیں لگواتی رہتی اور یہ درد اس وقت ختم ہو جاتا جب وہ بے اختیار فکر مند ہو کر اسے کچھ کہتیں، وہ جانتی تھی رقیہ بیگم اسے اتنا پسند نہیں کرتی تھیں، لیکن اب حالات بدل رہے تھے۔

بے حد دھچکا لگا تھا۔ رقیہ بیگم کو حماد کی پسند سن کر وہ تو صفیہ کی بہو فرح کی طرح کوئی سلیقہ مند، خاموش طبع سی بہو لانا چاہ رہی تھیں، جبکہ حماد نے کسی خاندانی

شادی کی تقریب میں شوخ و چنچل تانیہ کو پہلی نظر میں ہی پسند کر کے شادی کا فیصلہ کر ڈالا تھا اور اپنی ضد اس نے ماں سے منوا کر چھوڑی تھی۔ رقیہ بیگم جنہوں نے جوانی مرحوم شوہر کی نشانی حماد کو اپنی آغوش میں سمیٹ کر گزاری اور اب بڑھاپا حماد اور اس کے بیوی، بچوں کے ساتھ گزارنے کی آرزو میں حماد کی نوکری لگتے ہی شادی کر کے گزارنا چاہتی تھیں۔ اکلوتے بیٹے کی ضد آخر کار انہیں ماننی پڑی، دل سے وہ اس کی پسند پر خوش نہیں تھیں اور یہ بے زاری شادی کے بعد تک ان پر طاری رہی اور پھر شاید انہیں پریشان کن سوچوں نے فالج کا روپ دھار کر ان کے وجود کے داہنے حصے اور زبان پر حملہ کیا تھا۔ گو کہ اٹیک بے حد معمولی تھا۔ وہ کسی حد تک اپنے وجود کو ہلا جلا لیتی تھیں۔ البتہ شروع کے دنوں میں وہ بالکل خاموش ہو گئی تھیں۔ حماد کے بارہا پکارنے پر بھی بس اس کے پریشان چہرے کو خاموشی سے تکے جاتیں۔

حماد گھبرا کر صفیہ خالہ کو لے آیا تھا کہ ایک ہفتے کی نو بیاہتا دلہن سے وہ حد سے زیادہ امیدیں کیا باندھتا.... لیکن صفیہ خالہ اپنے جوڑوں کے درد سے پریشان بس

دو دن ہی رہ پائی تھیں اور تو کوئی اس کا قریبی رشتے دار تھا نہیں۔ لہٰذا اب تانیہ کو ہی امی کو سنبھالنا تھا۔ جیسے بھی سنبھالتی، لیکن چند دن ہی میں امی میں آتا نمایاں فرق اسے حیران کر گیا تھا۔ اس نے جس خواہش کو لے کر تانیہ سے شادی کی تھی اور ہمیشہ کا فرماں بردار حماد صرف اس ایک بات پر امی کے آگے بضد ہوا تھا، نا صرف وہ پوری ہو گئی تھی۔ بلکہ اس کی ضد بھی بے جا نہیں تھی۔ وقت نے یہ ثابت کر دیا تھا۔

ماہی آوے گا میں پھلاں نال دھرتی سجاواں گی
اونوں دل والے رنگلے پلنگ تے بٹھاواں گی
جھلا نگی ہکھماں.... فیر بڑا کجھ کہین گیاں انکھیاں
ماہی آوے گا

جس وقت صفیہ بیگم ہائے ہائے کرتی واجد کے ساتھ رقیہ آپا کے گھر داخل ہوئیں۔ لاؤنج میں رکھے ٹی وی پر بلند آواز میں مرحومہ نور جہاں لہک لہک کر یہ گانا گانے میں مگن تھیں اور ساتھ ہی چیزوں کی ڈسٹنگ کرتی ہوئی تانیہ بھی نور جہاں کا بھرپور ساتھ دیتی ہوئی مگن تھی۔

تانیہ انہیں لاؤنج میں داخل ہوتے دیکھ چکی تھی، لیکن ان کی جانب پیٹھ کیے وہ اپنے کام میں مگن رہی۔ تخت پر نیم دراز رقیہ بیگم نے انہیں دیکھا۔

”تانی.... تانی.... بند کرا سے.... بند کر....“ رقیہ نے قدرے بلند آواز میں اسے پکارا، جس پر جھٹ مڑ کر اس نے دیکھا اور جلدی سے ریموٹ کنٹرول سے ٹی وی آف کیا اور ان کے خیر مقدم کو بڑھی، سلام دعا کر کے وہ فوراً ”چائے بنانے کچن میں چلی آئی۔

صفیہ بیگم، رقیہ آپا کو خود سے بیٹھتے اور یوں بولتے دیکھ کر بے حد خوش بھی تھیں اور حیران بھی.... وہ تو تصور میں بے بس، لاچار، بستر پر دراز غم زدہ صورت آپا کو دیکھنے اور تسلی دینے آئی تھیں، لیکن صاف ستھرے لباس اور فریش چہرہ لیے آپا تو لگ ہی نہیں رہی تھیں۔

واجد چند ایک باتیں کر کے جلد ہی اٹھ گیا تھا۔ ان کے بچوں کی زندگی ان کے اپنے تیار شدہ شیڈول میں بے حد مصروف تھی۔ تانیہ پھر ان کے پاس ہی آن بیٹھی تھی۔

”آپا کا تخت! آپا آپ نے اسے اپنے کمرے سے نکلوا لیا۔“

صفیہ بیگم نے لاؤنج میں رکھے تخت کی جانب دیکھتے ہوئے پوچھا۔ جس پر آپا بڑے طمطراق سے براجمان تھیں اور یہ تخت کافی سالوں سے آپا کے کمرے میں رکھا ہوا تھا جو چیز جہاں پر سیٹ تھی وہ اسے ادھر سے ادھر کرنے کی ہرگز قائل نہیں تھیں۔ اسی لیے صفیہ بیگم کو اچنبھا ہوا اور انہوں نے پوچھ ڈالا۔ اچنبھا تو انہیں اور بھی بہت سی باتوں پر ہو رہا تھا۔

”جی میں نے رکھوایا ہے یہ لاؤنج تقریباً“ گھر کے ہر حصے سے جڑا ہوا ہے تو امی یہاں پر براجمان مجھ پر نظر رکھ سکتی ہیں اور میں ان پر۔“ تانیہ نے معصومیت

سے نظریں پھیلاتے ہوئے جواب دیا۔

"خالہ آپ رہیں گی نا کچھ دن یہاں پر؟ امی کے ساتھ ساتھ آپ کے گھٹنوں کی بھی روز مالش کیا کروں گی۔ میرے ہاتھوں میں جادو ہے، آپ دوڑنے لگیں گی، سچ ہے نا امی۔" تانیہ نے محبت اور اشتیاق سے کہا تھا اور ساتھ ہی رقیہ بیگم سے تائید چاہی تھی۔

"جادو ہے.... اس کے ہاتھوں میں.... جادو ہے...." انہوں نے ٹھہر ٹھہر کر جواب دیا تھا اور حیران صفیہ بیگم بس مسکرا کر رہ گئی تھیں۔

"السلام علیکم! خواتینوں اور صرف خوا.... تینوں...." حماد نے گھر میں داخل ہوتے ہوئے خوش اخلاقی سے سلام کیا تھا۔

"یہ امی کی دوائیں اور یہ سیب۔" اس نے شاپر تانیہ کو تھماتے ہوئے بتایا۔

"خالہ آپ ٹھیک ہیں؟" حماد نے ان کے پاس بیٹھتے ہوئے پوچھا اور ہاتھ بڑھا کر اپنی ماں کا ہاتھ محبت سے تھام کر سہلانے لگا۔

"اللہ کا شکر ہے بیٹا۔ بس جوڑوں کے درد نے کہیں کا نہیں چھوڑا اسی وجہ سے تو اتنے دنوں سے آپا کی خبر لینے بھی نہ آسکی۔ آج واجد کے ساتھ ضد کر کے آئی۔ دل بہت بے چین ہو رہا تھا۔ آپا سے ملنے کے لیے شام مجھے چھوڑ آنا۔" انہوں نے تفصیل سے جواب دیا اور اپنا اگلا پروگرام بھی بتا دیا۔

"ارے نہیں خالہ.... کچھ دن رہیں ہمارے پاس، امی کا دل بھی بہل جائے گا۔" حماد نے جھٹ نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا اور ساتھ ہی رقیہ کو بھی اپنا ہمنوا بنایا۔

"کیوں امی ٹھیک کہا نا، دونوں بیٹھ کر اپنی اپنی بہوؤں کی خوب برائیاں کیجیے گا اور ان کو سیدھا رکھنے کی ترکیبیں سوچیے گا۔" حماد شرارتی ہوا۔

"نا.... نا.... میری باؤں (بہو) نئیں.... میری بیٹی.... بڑی اچھی...." انہوں نے اٹک اٹک کر نفی میں سر ہلاتے ہوئے جواب دیا اور تانیہ نے جھٹ حماد کو ٹھینگا دکھایا جو ابھی تک کھڑی ان کی باتیں سن رہی تھی۔

"میں کھانا یہیں پر لگا دیتی ہوں یا امی کے کمرے میں جا کر کھانا ہے؟" تانیہ نے پوچھا۔

حماد نے سوالیہ نظروں سے اپنی امی کی طرف دیکھا اور انہوں نے سر کی مدد سے یہیں پر کھانے کا اشارہ کیا۔ جسے تانیہ سمجھ کر کچن کی جانب بڑھ گئی۔

اور صفیہ کو یوں ہی فرح کی ہدایت یاد آگئی۔ ان کے ہاں کھانا ہر حال میں ڈائننگ ٹیبل پر کھایا جاتا تھا۔ صفیہ بیگم جس روز طبیعت کے پیش نظر ڈائننگ روم نہ جا پاتیں۔ انہیں ان کے کمرے میں کھانا پہنچا دیا جاتا اور وہ تنہا چند لقمے ہی کھا پاتیں۔

"تانیہ میری امیدوں سے بڑھ کر اچھی اور سمجھ دار نکلی ہے۔ امی کو جس طرح اس نے سنبھالا ہے۔ مجھے حیران کر دیا ہے، ابھی ہماری شادی کو چند دن ہی ہوئے تھے جب امی پر یہ اٹیک ہوا چاہے معمولی سا ہی، میرا تو خیال تھا کہ بہت مشکل ہو جائے گی۔ گھر کا نظام تو بگڑے گا ہی امی کو سنبھالنا بھی شاید آسان نہ ہو، لیکن امی نے جس طرح گھر کا نظام بنا رکھا تھا جو چیز جس جگہ پر تھی وہیں پر رہی، کوئی بے ترتیبی نہیں آئی اور یہ بھی مجھ سے زیادہ تانیہ کا ہاتھ ہے، امی کو صحت مندی کی جانب لانے میں۔

ڈاکٹر نے کہا تھا کہ امی اپنی ول پاور استعمال نہیں کر رہی ہیں۔ جیسے وہ چاہ نہیں رہیں کہ اس بیماری کے خلاف لڑیں، تب میرا دل ڈر گیا تھا میں جانتا تھا کہ امی سو فیصد میری شادی پر خوش نہیں۔ بس میری ضد مان گئی ہیں، لیکن وہ اپنی اس ناخوشی کا بدلہ خود کو صحت مند نہ ہو کر لیں گی، میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا۔ میں بے حد پریشان ہو گیا تھا اور یہ پریشانی پچھتاوا بن کر اس رشتے کو خراب کر ڈالتی۔ اس سے پہلے ہی تانیہ نے آگے بڑھ کر سب کچھ سنبھال لیا اور میرے سر سے یہ بوجھ بھی اتار ڈالا کہ امی اس شادی پر پوری طرح خوش نہیں، خیر میں تو اب بھی امی کو آفر کرتا ہوں، اگر وہ

چاہیں تو میں ایک اور بہو لے آتا ہوں جہاں کہیں گی وہیں جھٹ شادی کرلوں گا' لیکن امی پہلی بہو سے ہی اتنی ڈر گئی ہیں۔ دوسری لانے کی بات پر ناراض ہونے لگتی ہیں۔" آنکھوں میں اتری نمی کو صاف کرتے ہوئے آخر میں حماد نے بات کا رخ بدل کر بوجھل ماحول کو ہلکا پھلکا کرنے کی کوشش کرتے ہوئے شرارتی مسکراہٹ سے کہا۔

"نئیں.... صاف.... یاں.... صفیہ.... تانی آ.... چھی.... اچھی۔" رقیہ نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے صفیہ بیگم سے کہا اور ساتھ ہی حماد کو گھورا۔

"نہ جانے کون سا جادو کیا ہے تانی نے آپ پر جو ذرا اس کے خلاف بات سن لیں' جیلس ہونے لگا ہوں اب تو میں.... میں ذرا فریش ہو آؤں' کھانا بھی یہیں کھاتے ہیں اور خوب ساری باتیں بھی کریں گے۔" حماد نے اٹھتے ہوئے کہا اور اپنے کمرے کی جانب بڑھ گیا۔

"شادی کی رات حماد نے مجھے بتایا تھا کہ انہوں نے مجھے ایک شادی کی تقریب میں دیکھا اور بس وہیں پسند کرلیا تھا۔ انہیں میرا شوخ و چنچل انداز بھا گیا تھا اور ان کے گھر میں جو ہر وقت سونا پن جھلکتا تھا میرا جیسا وجود ہی آکر اسے ختم کرسکتا تھا۔ یہ بھی انہوں نے بتایا کہ امی میری لاپروا اور شوخ طبیعت سے خائف تھیں' نہ جانے ایسی بہو آکر گھر کا کیا حشر نشر کر ڈالے اور پھر جب حماد بے حد پریشان تھے کہ امی ٹھیک نہیں ہونا چاہ رہیں' تب میں سمجھ گئی کہ امی کا دل بیٹے کی ضد پر ٹوٹ گیا ہے اور اب مجھے ہی اس ٹوٹے دل کو جوڑنا ہے۔

میں کمر کس کے میدان میں اُتر آئی۔ لیکن مجھے پتا چلا کہ امی تو اندر سے موم ہیں۔ میری محبت اور خلوص کی انہوں نے پذیرائی کی۔ تب ہی تو اتنی جلدی ٹھیک ہوگئیں۔ میں جان بوجھ کر ان کے سامنے چیزیں بے ترتیب کر ڈالتی۔ مجبوراً" انہیں بولنا پڑتا۔ پہلے وہ سر کے اشارے یا ہاتھوں کے اشارے سے سمجھانے لگیں کہ یہ ٹیڑھی ہوئی میز یا کرسی ٹھیک کرکے رکھوں' انہیں الجھن ہورہی ہے اور ان کی الجھن ہی میں سلجھن تھی۔ میں کچھ کئی۔ کبھی مٹر چھیلنے بیٹھ جانا اور چند دانے نکال کر چھوڑ دینا کہ آخر کار انہوں نے خود ہی بائیں ہاتھ سے نکالنے شروع کردیئے مجبوراً"۔

دراصل میں نکالتی کم اور کھاتی زیادہ تھی۔ میں جانتی تھی۔ ان کی کفایت شعار طبیعت کو یہ سب نہیں بھائے گا۔ ٹی وی میں اونچی آواز میں گانا لگا کر خود کچن چلی جاتی اور ریموٹ قدرے فاصلے پر رکھ جاتی مجبوراً" وہ خود کو کسی نہ کسی طرح سے بٹھا کر ریموٹ پکڑ کر ٹی وی آف کر ڈالتیں یا پھر جب میں.... ریموٹ اپنے ساتھ لے جاتی تو انہیں مجبوراً" مجھے آواز۔ دینی پڑتی بس یہ چھوٹی چھوٹی سی شرارتیں ہی اصل میں ورزشیں تھیں جو میں نے امی کو کروائیں اور ساتھ ہی میں نے دوستوں کی طرح ان کا خیال رکھا اور بیٹوں کی طرح انہیں سنبھالنے کی کوشش کی اور انہوں نے زمانہ دیکھا ہے۔ جلد ہی وہ جان گئیں کہ بظاہر کھلنڈری' لاپروا یا شاید بدسلیقہ نظر آنے والی تانیہ اندر سے ایسی نہیں ہے۔ میں ان کے بیٹے کی چاہ بن کر اس گھر میں رہنا نہیں چاہتی۔ بلکہ ان کی چاہ بھی بن کر رہنا چاہتی ہوں' کیونکہ میں نے جان لیا تھا کہ حماد کا شادی کا فیصلہ اگر کسی وقت پچھتاوے میں بدلنے لگا تو آگے کی زندگی ہماری ناآسودہ اور خزاں رسیدہ ہوجائے گی اور میں تو ہمیشہ ہمیشہ اس گھر میں رقصِ بہاراں کی آرزو مند اور دعاگو ہوں۔" تانیہ نے دھوپ میں صفیہ خالہ کی ٹانگوں کی مالش کرتے ہوئے بتایا۔

وہ باتونی تھی۔ یہ تو وہ جان گئی تھیں' لیکن اسے اچھی باتیں کرنا اور اپنی کھلکھلاہٹ میں دوسروں کو بھی ہنسانا پسند تھا۔ وہ اب جان گئی تھیں اور انہیں آپا رقیہ کی زندگی پر رشک محسوس ہوا تھا کہ اپنی زندگی میں اب وہ تنہائی اور سردی کی شام جیسی اداسی محسوس کرتی تھیں۔ دونوں بہنیں آگے پیچھے بیوہ ہوئی تھیں۔ اس غم کو انہوں نے مل کر جھیلا تھا۔ لیکن اب صفیہ بیگم کو لگ رہا تھا کہ ان کی بہن کا غم بہت ہلکا ہوگیا ہے اور وہ دعاگو تھیں کہ یہ رقص بہاراں ہمیشہ ان کے آنگن میں (جاری رہے۔

☆

امت العزیز

گلابی کاغذ

"جان سے پیاری الماس۔
تمہیں ایک دن نہ دیکھوں تو لگتا ہے جیسے وہ دن طلوع ہی نہ ہوا ہو۔ تم اندھیری رات میں چٹکی شفاف چاندنی جیسی ہو۔ تمہیں پانا میری زندگی کی اولین خواہش بن چکی ہے۔ مگر کبھی کبھی میں سوچتا ہوں کہ ہمارا ملن کیونکر ممکن ہوگا۔ اگرچہ حالات ناموافق ہیں مگر میں اتنا جانتا ہوں کہ اگر عزائم پختہ ہوں تو مشکل کا کوئی پہاڑ بھی ذرے سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتا۔ میں تم سے پوچھنا چاہتا ہوں۔ کیا تم میرا ساتھ دے سکو گی؟
فقط تمہارا۔"

"امی" عقب سے اس کی پندرہ سالہ بیٹی لائبہ نے پکارا۔

وہ بری طرح اچھل پڑی۔ اور بری طرح بوکھلاتے ہوئے جلدی سے اس نے وہ کاغذ الماری میں تہہ کیے کپڑوں کے نیچے چھپایا اور پلٹی۔ اسی اثناء میں وہ اپنی کیفیت پر قابو پا چکی تھی سو بیٹی کو لتاڑنا ضروری سمجھا۔

"کتنی بار سمجھایا ہے تمہیں کہ کمرے میں دستک دے کر داخل ہوتے ہیں مگر تم ہو کہ سنتی ہی نہیں ہو۔"

"ایسی کیا آفت آن پڑی ہے۔" وہ بیزار ہو کر بولی۔

"جی آپ نے صحیح سمجھا۔ مگر فرق صرف یہ ہے کہ آفت مجھے نہیں پڑی۔ بلکہ دادی محترمہ کے کمرے میں بہ نفس نفیس بذات خود تشریف فرما ہے وہ آفت۔" لائبہ نے منہ بناتے ہوئے بتایا۔

"کیا مطلب؟" الماس چونکی "کون آفت؟ کس کی بات کر رہی ہو؟"

"وہی دادی کی چہیتی لاڈلی بھانجی صاحبہ روبینہ عرف روبی۔" لائبہ چبا چبا کر بولی۔ وہ روبی سے از حد چڑتی تھی کیونکہ اس کی آمد پر سروری بیگم گھر میں عجیب سی ایمرجنسی نافذ کروا دیتی تھیں۔

"اف اللہ۔ یہ آج کیسے آگئی۔ اب تمہاری دادی مجھے تو پکڑ کر کچن میں کھڑا کر دیں گی۔ ابھی تو میری کمر کا درد ٹھیک طرح سے گیا بھی نہ تھا کہ۔"

"شاباش ہے الماس۔" ابھی الماس کی بات مکمل بھی نہ ہونے پائی تھی کہ دادی کمرے کے فریم میں نمودار ہو کر غضبناکی سے بولنے لگیں۔ "میں نے کوئی پون گھنٹے پہلے تمہاری اس نکمی بیٹی سے کہا تھا کہ تم تو کمرے میں سو رہی ہو تو یہ جا کر کوئی شربت ہی بنا لائے مگر مجال ہے جو اس لڑکی نے میری بات پر کان دھرا ہو بجائے باورچی خانے میں جانے کے یہ آگئی تمہارے کمرے میں اور نجانے یہاں کیا کھسر پھسر کر رہی ہے۔"

"وہ اماں۔ دراصل میں آ ہی رہی تھی۔ وہ۔" مگر بات مکمل کرنے کی حسرت اس بار بھی دل میں رہ گئی۔

"اب تم مجھے اپنی کام چوری کی صفائیاں دینے کے بجائے جا کر کچن کی خبر لو۔ روبی کب سے آئی بیٹھی ہے۔ کچھ احساس ہے تمہیں کہ مہمانوں کی کیسے آؤ بھگت کی جاتی ہے۔ ارے میں اپنے وقت میں بیس، تیس مہمانوں کا یوں انتظام کر لیتی تھی۔" وہ ہاتھ نچا کر بولیں۔

"جی، بڑی دادی نے بتایا تھا ایک دفعہ کہ آپ اپنی زبان سے مہمانوں کا ایسا انتظام کرتی تھی کہ وہ کانوں کو

ہاتھ لگاتے ہوئے جاتے تھے کبھی واپس نہ آنے کا ارادہ لے کر۔" لائبہ سے ماں کا سفید پڑتا چہرہ دیکھا نہ گیا۔

"اوئی اللہ۔" وہ دو فٹ اوپر اچھلیں "یہ تربیت کر رہی ہو تم لڑکی کی، آج آنے دو اس کے باپ کو اچھی طرح خبر لے گا تمہاری اور تم جاؤ جا کر سب سے پہلے فالسے کا شربت تیار کر کے اندر بھجواؤ اس کے بعد

کھانے میں قیمہ بھرے کریلے اور سبزی کا پلاؤ بنا لینا بیچاری بچی شوق سے کھاتی ہے۔" پہلے الماس کو دھمکا کر پھر حکم صادر فرما کر وہ چلتی بنیں۔ الماس کی آنکھوں سے ٹپاٹپ آنسو بہنے لگے۔

"تم آخر آپ انہیں جواب کیوں نہیں دیتی ہیں؟ آپ کیوں 1960 کی بیچاری و مظلوم لاچار سی بہو بنی رہتی ہیں اور ابو کو دادی اور پھپھوؤں کی زیادتیاں کیوں دکھائی نہیں دیتیں۔ کیوں؟ کیوں؟" وہ پیر پٹختے ہوئے احتجاجاً چلائی۔

"تم نہیں سمجھو گی۔ اب جاؤ تم اپنے کمرے میں آرام کرو اور ہاں سدرہ اور اصغر کا ہوم ورک بھی دیکھ لینا تم۔ آج تو مجھے وقت ملے گا نہیں۔"

الماس اپنی آنکھیں مٹکا کر کمرے سے نکل گئی۔ لائبہ ہنوز غصیلے تاثرات سمیت وہیں کھڑی رہ گئی۔

✡ ✡ ✡
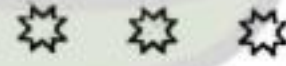
"رشک چمن، غنچہ دہن۔

میں کیا بتاؤں۔ میں خود نہیں جانتا کہ میں تمہیں اتنا چاہنے کیوں لگا ہوں۔ بس اتنا جان لو کہ تم میری زندگی ہو اور اگر تم مجھے نہ ملیں تو میں اپنی زندگی کا خاتمہ کرنے میں ایک لمحے کی تاخیر بھی نہ کروں گا۔ اب تمہارا جو جواب ہو مجھے لکھو۔

تمہارے جواب کا شدت سے منتظر۔"

الماس کے چہرے پر عبارت پڑھ کر سوچ کی پرچھائیاں سی پڑ گئیں۔ اس نے ایک ٹھنڈی سانس لے کر کاغذ تہہ کر کے الماری میں رکھ کر الماری لاک کر دی۔

"کیا بات ہے؟ آج چائے نہیں ملے گی کیا؟" مختار صاحب کوئی موٹی سی کتاب پکڑے کمرے میں سنجیدہ تاثرات سمیت داخل ہوئے۔

"جی بس۔ تیار ہے لاتی ہوں۔" وہ بے دلی سے کہہ کر کمرے سے نکلنے لگی۔ تب ہی ان کی دوسری بات نے اس کے قدم جکڑ دیے۔

"اماں بتا رہی تھیں کہ آج لائبہ نے ان سے تمہارے سامنے بہت بدتمیزی کی اور تم نے اسے ڈانٹا تک نہیں۔"

وہ پلٹی۔ اور مکمل سنجیدگی سے سوال کیا۔

"آپ کو لگتا ہے کہ میں نے ایسا کیا ہو گا۔"

"الٹی بحث مت کرو۔ جو پوچھا ہے اس کا جواب دو۔" وہ حسب عادت چڑ گئے۔

"بات بحث کی نہیں آپ کے اعتماد کی ہے۔ جو آپ نے مجھ پر کبھی نہیں کیا۔ تب پھر کیا فائدہ اپنی صفائی میں کچھ کہنے کا؟" وہ کہہ کر کمرے سے نکل گئی۔ مختار گہری سوچ میں گم ہو چکے تھے۔

✡ ✡ ✡

الماس کی وہی روٹین اور گھر کے وہی حالات تھے۔ نئی بات یہ ہوئی تھی کہ الماس اب خود کو اچھی بیوی، بہو اور بھابھی ثابت کرتے کرتے تھک چکی تھی۔ اور سچ تو یہ تھا کہ وہ واقعی مثالی عورت تھی ہر لحاظ سے مکمل مگر یہ بات اس کے سسرال والوں نے کبھی تسلیم نہ کی تھی۔ نہ ہی آئندہ ایسا امکان تھا۔ اسے کبھی کبھی لگتا جیسے وہ شادی کر کے کسی دار الامتحان میں لائی گئی تھی کہ شادی کی پہلی رات ہی مختار نے اسے صاف صاف جتا دیا تھا کہ اسے سروری بیگم سمیت ان کی چار عدد بہنوں کے دل بھی جیتنے ہوں گے اور اس نے "شوہر" کے اس حکم پر سر جھکا دیا تھا۔

یہ الگ بات کہ اس کے بعد اس کا جھکا سر دوبارہ کبھی نہ اٹھ سکا۔ مگر اب وہ لا متناہی و لا حاصل ذمہ داریاں نبھاتے نبھاتے تھک چکی تھی۔ اس کی گھٹن زدہ زندگی کوئی روزن، کوئی روشنی کا در تلاش کر رہی تھی۔ گو کہ وہ جانتی تھی کہ وہ نوجوانی کی سرحد پر کھڑے بچوں کی ماں ہے۔ مگر کیا جوان ہوتے بچوں کی ادھیڑ عمر ماں کا دل ارمانوں سے خالی ہوا کرتا ہے۔ کیا اس کے سینے میں کوئی خواہش کوئی امنگ انگڑائی نہیں لیا کرتی؟ اور اس کے نیم مردہ تن کے شور مچاتے من نے اسے آج کل اپنے سوالوں سے زچ کر رکھا تھا۔ اور وہ نادان اپنے سوالوں کے جواب "دل کا [illegible]" میں کھوج

رہی تھی۔ یا کھوجنا چاہ رہی تھی۔

☼ ☼ ☼

”میری زندگی کا حاصل!
میں تمہیں بتا نہیں سکتا کہ تمہارے اقرار نے میرے اندر کیسی طاقت سی بھر دی ہے۔ تم نے مجھے اپنانے کا مژدہ جان فزا سنا کر مجھے ہفت اقلیم کی دولت سے نواز دیا ہے الماس۔ تم میرا یقین رکھو۔ اپنے ملن کی گھڑیاں اب زیادہ دور نہیں۔ بس تم حوصلہ رکھنا۔
فقط۔ صرف اور صرف تمہارا۔“
مہکتے کاغذ پر درج سطریں پڑھ کر الماس کے سوکھے لبوں پر مسراہٹ سی جگمگانے لگی۔ اسے لگا کہ چھٹی کے ان دو دنوں میں جھیلی گئی اذیت اور کی گئی مشقت دونوں جیسے اس کے وجود سے کہیں دور چلی گئی ہوں۔ ہر ویک اینڈ پر اس کی نندیں اکٹھا ہوتی تھیں۔ گھر کا جو حال ہوتا سو ہوتا کام کر کر کے الماس کا برا حال ہو جاتا۔ اس کا ہاتھ بٹانا وہ سب حرام تصور کرتی تھیں اور اسے حرف ستائش سے نوازنا بھی۔

اس نے مسکراتے ہوئے کاغذ تہہ کر کے اس کی جگہ پر رکھا اور خود سونے کی تیاری کرنے لگی۔ مختار کو ابھی کمرے میں نہیں آنا تھا‘ یہ ان کی روزانہ کی روٹین تھی۔ وہ سروری بیگم کے پیر دباتے دباتے الماس کی نا اہلیوں اور اپنی نافرمانیوں کی نت نئی داستانیں سن کر ہی روز کمرے میں آتے تھے۔ سو وہ آرام سے لیٹ گئی۔

☼ ☼ ☼

دوسری صبح معمول کے مطابق اس کی آنکھ نہ کھلی۔
گھبرا کر جس دم مختار جاگے‘ اچھا خاصا دن نکل آیا تھا۔ مگر آفس جانے کا وقت بہرحال باقی تھا۔ وہ اپنے پہلو میں سوئی ہوئی اپنی نصف بہتر کو کچھ سخت سست سنا کر جگانا ہی چاہتے تھے کہ ان کی نظر الماس کے سرخ چہرے اور مدہم چلتی سانسوں پر ٹھہری۔ ماتھا چھو کر دیکھا۔ تپ رہا تھا۔ کمرے سے باہر نکلے تو سروری بیگم کو صبح کا ناشتا نا حال نہ ملنے پر واویلا مچاتے پایا۔
”اماں! الماس کی طبیعت ٹھیک نہیں۔ آپ فکر مت کریں۔ میں بنا دیتا ہوں آپ کے لیے چائے‘ آپ اپنے کمرے میں جائیں آرام سے بیٹھیں۔“ انہوں نے نرمی سے کہا۔
”ہاں خود بنا دو مگر اپنی جوان جہان بیٹی کو زحمت مت دینا۔ پتا نہیں کیسی تربیت دے رکھی ہے اسے تمہاری بیوی نے۔۔۔“ انہوں نے کمرے میں جاتے جاتے کہنا یا جتانا ضروری سمجھا۔
انہوں نے ان سنی کر کے چائے بنائی۔ دروازہ ناک کر کے لائبہ کو جگا کر الماس کی طبیعت کی خرابی کا بتایا۔ بھائیوں کو ناشتہ دینے اور دن بھر الماس کا خیال رکھنے اور گھر کا خیال کرنے کی تاکید کی۔ چائے اور بسکٹ لے کر کمرے میں آئے۔ الماس کو جگا کر زبردستی چائے بسکٹ کھلانے لگے۔
نجانے کیا ہوا جو الماس پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔
”ارے بھئی ہمت کرو۔ اتنی سی بیماری پر اتنا سارا رونے کی کوئی تک بنتی ہے بھلا۔“ وہ کچھ چڑ سے گئے۔
”شاباش‘ لو یہ ٹیبلٹ بھی کھالو اور آرام کرو۔ گھر کی فکر مت کرنا۔ لائبہ ہے نا! اماں ٹھیک کہتی ہیں تم نے اسے کچھ زیادہ ہی ڈھیل دے رکھی ہے اس پر ذمہ داریاں ڈالو گی تو وہ نباہنا سیکھے گی۔“
وہ میکانکی انداز میں کہہ کر آفس کے لیے تیار ہونے چل دیے۔ الماس نے تکیے پر سر رکھ کر دوبارہ آنکھیں موند لیں۔

☼ ☼ ☼

”تم نے اپنی بیماری کی خبر سنا کر میرا روم روم مضطرب کر دیا ہے۔ شاید یہ وہی مقام عشق ہے کہ جہاں تکلیف میں تم ہو اور تڑپتا میں ہوں۔ بس میرا اب اور امتحان مت لو‘ جلدی سے اپنی صحت یابی کی خوش خبری سنا کر بدلے میں مجھ سے اپنا مقدمہ میرے گھر والوں کے سامنے جیت جانے کی خوشخبری سنو۔

فقط صرف اور صرف تمہارا۔"
الماس کے کانپتے ہوئے ہاتھوں میں خط لرز رہا تھا' آنسو تھے کہ تھمنے کا نام نہ لے رہے تھے۔
"کیوں' آخر کیوں؟" روتے روتے اس کی ہچکیاں سی بندھ گئیں۔
"امی!" لائبہ جو دوپہر کے وقت الماس کے لیے دلیہ بنا کر اسے کھلانے لائی تھی سامنے کا منظر دیکھ کر دہل گئی۔
کیا ہوا امی۔ آپ کیوں اس طرح رو رہی ہیں۔" وہ ٹرے سامنے ٹیبل پر رکھ کر سراسیمگی سے پوچھنے لگی۔
"تم۔ لائبہ! یہاں سے جاؤ۔" وہ اسے دیکھ کر ہمیشہ کی طرح گڑبڑا کر صفحہ غیر ارادی طور پر اپنے عقب میں چھپانے لگی۔
"کیا چھپا رہی ہیں آپ؟ کس کا خط ہے؟" لائبہ نے عاجزانہ لہجے میں پوچھا۔ "دکھائیں مجھے۔" وہ الماس کے ہاتھ سے صفحہ لینے کی کوشش کرنے لگی۔ جو الماس نے مزید چھپانے کی سعی ترک کر کے بنا مزاحمت کے اسے تھما دیا اور خود چہرہ "چھپا کر" بری طرح رونے لگی۔
"امی۔ یہ۔ یہ سب۔ یہ سب کیا ہے؟۔" خط پڑھ کر نوجوان بیٹی نے اپنی ماں سے بے حد تاسف' رنج و غصے کی ملی جلی کیفیت میں گھر کر پوچھا۔
"کیا ہے یہ سب۔" جواب نہ ملنے پر وہ ہسٹریائی انداز میں چلا اٹھی۔ الماس کے رونے میں کچھ اور شدت در آئی تھی۔

☆ ☆ ☆

"آداب۔
تم سوچ رہے ہو گے کہ آج مجھے' تمہیں اس طرح مخاطب کرنے کی ضرورت کیوں پیش آگئی مگر ذرا ٹھہرو۔ میں کچھ بھی کہنے سے قبل تمہیں ہمارا وہ گلابی ماضی یاد دلانا چاہتی ہوں' جو تم یکسر فراموش کر چکے ہو۔
تمہیں یاد ہے' تم نے پہلی بار مجھے میرے بھائی جان کی شادی میں دیکھا اور دیکھتے ہی — دل ہار بیٹھے۔ وہ وقت بھی یاد کرو جب تم میری صرف ایک جھلک دیکھنے کی خاطر کڑی دھوپ' دھواں دھار بارش یا لہو رگوں میں منجمد کر دینے والے جاڑے سے بے نیاز' بلاناغہ میرے گھر کے چکر کاٹا کرتے تھے۔ پھر کتنے جتنوں بعد تم نے مجھ تک رسائی حاصل کی تھی۔ تم مجھے حاصل کرنا اپنی زندگی کی سب سے بڑی خواہش اور خوش نصیبی بتایا کرتے تھے۔
سچ کہوں تو میں تمہاری دیوانگی کے سامنے ہار گئی تھی۔ تمہاری محبت اپنی جگہ مگر مجھے اپنی ناموس اور گھر والوں کی عزت کا بھی از حد خیال تھا۔ سو تمہیں سیدھے سبھاؤ سے رشتہ لانے کے لیے کہا۔ تم لے بھی آئے۔ میرے گھر والوں کو بظاہر کوئی خامی نہ دکھائی دی۔ یوں ہم ایک ہو گئے۔
میں جو ہزار ہا خوش کن سپنے اپنی آنکھوں میں سجائے تمہارے ساتھ کی آرزو لیے اس گھر میں چلی آئی تھی۔ بہت جلد مجھ پر منکشف ہو گیا کہ زندگی اتنی بھی حسین و دلکش نہیں جتنی سپنوں میں لگا کرتی ہے۔
تم نے تو شادی کی پہلی رات ہی مجھے جتا دیا تھا کہ چوں کہ یہ شادی تم نے اپنی خالہ زاد روبی سے منگنی توڑ کر اور اپنی ماں و چار عدد بہنوں کی ناراضی مول لے کر کی ہے' سو تمہیں اب ساری زندگی ان کے سامنے نہ سر اٹھانا ہے' نہ ان کی دل آزاری کرنی ہے اور مجھے نہ صرف تمہاری اماں بلکہ چار عدد بہنوں کا دل بھی جیتنا ہے۔
اور میں نے بھی تمہاری نصیحت یا فرمائش گرہ سے باندھ لی اور پھر وقت نے دیکھا کہ میں نے صرف تمہاری محبت کے صدقے کن کن اذیتوں کا' ذلتوں کا' مشقتوں کا سامنا کیا۔ مگر پھر بھی تمہارے گھر والے میری شکایت تم سے لگانے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہ دیتے تھے۔ سچ کہوں تو حیرت مجھے ان کے رویے پر نہیں تمہاری کھوکھلی محبت پر ہوتی تھی۔ جو شادی کے محض ایک سال بعد ہی روایتی مرد کی روایتی سوچ کے بوجھ تلے دب کر اپنی موت آپ مر گئی تھی اور شاید میں

بھی۔ میں نے اپنی زندگی کے سولہ سال کسی بھیانک خواب کی طرح گزارے ہیں۔ تمہاری کبھی کبھار مجھ پر دی گئی توجہ اور التفات میرا غم غلط نہ کرسکتے تھے۔

تم نے شادی کے کچھ عرصے بعد ہی اپنی اماں اور بہنوں کے ذہن سے سوچنا اور ان ہی کی آنکھوں سے دیکھنا شروع کردیا اور یہ نہ دیکھ سکے کہ تمہاری بے اعتنائی مجھے کیسے اندر سے مارے ڈال رہی ہے۔ میں دل ہی دل میں تم سے خفا ہوتی چلی گئی اور اس خفگی کا کبھی اظہار نہ کیا۔ آج بھی نہ کرتی۔

مگر یہ بات تو ٹھیک ہی ہے نا کہ اگر محبت کی شادی کرنا کوئی جرم تھا (جس بات کا احساس قدم قدم پر مجھے تمہارے گھر والوں نے دلایا) تو تم ہی نے تو مجھے اس جرم پر اکسایا تھا۔ منگنی تم نے اپنی مرضی سے اپنی کزن سے توڑی۔ میں نے تمہیں ایسا کرنے کو نہیں کہا تھا۔ بغاوت تم نے اپنی خواہش کو پورا کرنے کے لیے اپنے گھر والوں سے کی۔ میں نے تمہیں ایسا کرنے کو نہیں کہا تھا۔ تم منگنی شدہ تھے، تمہیں مجھ سے محبت کرنے سے پہلے یہ بات معلوم تھی۔ مجھے نہیں تو اب بتاؤ میرا قصور کہاں نکلتا ہے۔ مجھے تو بے قصور ہی اتنی سزا بھگتنا پڑی۔ میں تمہاری پسندیدہ تھی۔ سونے کی بھی ہوتی تب بھی تمہاری اماں اور بہنوں نے مجھے ناپسند ہی کرنا تھا مگر میرا تم سے سوال یہ ہے مختار۔ تم مجھے اس گھر میں لاکر کیوں بھول گئے؟

میری زندگی کی کتاب سے تم نے وہ گلابی کاغذ کیوں پھاڑ ڈالے جو میرے لیے او کسیجن کا درجہ رکھتے تھے۔

میں تم سے یہ سوالات اب بھی نہ کرتی جو لائبہ کے ہاتھ تمہارے خط نہ لگتے۔ اس نے مجھ سے بڑی حیرت آمیز رنجیدگی سے پوچھا تھا مختار کہ۔

"یہ بابا کی کیسی محبت تھی جو آپ کے لیے سائبان تک نہ بن سکی۔"

اس کے یہ الفاظ میرے مردہ احساسات کو جھنجھوڑ گئے ہیں مختار اور میں تم سے اب جواب چاہتی ہوں۔ فقط! ابھی جسے تم زندگی کہا کرتے تھے۔"

تین صفحات پر مشتمل یہ خط مختار کو عرق ندامت میں سر تاپا ڈبو گیا تھا۔

اس کی آنکھوں میں ایک ایک کرکے ماضی کے تمام واقعات گھومنے لگے۔ الماس سے اس نے محبت کی تھی بے حد و بے حساب محبت۔ اس کے لیے بچپن کی منگنی توڑی، خاندان والوں کی ناراضی، گھر والوں کی ملامت، سب کچھ برداشت کیا۔ مگر پھر نجانے کیا ہوا۔ اٹھتے بیٹھتے سروری بیگم کے جتانے اور بہنوں کے طنز و طعنوں نے اسے ایک عجیب سے احساس جرم میں، شرمندگی میں مبتلا کردیا۔ اور ایسی صورت میں وہی ہوا جو ہو سکتا تھا۔ وہ خود بھی ایک مثالی بیٹا اور مثالی بھائی بننے کے چکر میں سخت سے سخت ترین شوہر بنتا گیا اور الماس سے بھی یہی امید کرنے لگا کہ وہ اس کے گھر والوں کو کوئی شکایت نہ ہونے دے۔ اور ایسی صورت حال میں ان کے مابین رشتے نے اپنی خوب صورتی کھودی۔ اور اسے احساس تک نہ ہوا۔

"نہیں الماس تم ٹھیک ہی کہتی ہو تم میری زندگی کا حاصل ہو مگر میں تمہیں حاصل کرکے بھول ہی گیا۔ اور شاید بھولا ہی رہتا جو تم آج مجھے اس طرح احساس نہ دلاتیں۔ مگر میرا یقین کرو الماس آج کے بعد تمہارا یہ محبوب تمہاری زندگی کی بے رنگ کتاب کو پھر سے گلابی کاغذوں سے بھردے گا۔ پہلے ہی دیر ہو چکی ہے مگر اب مزید دیر نہیں کرے گا کہ اپنی غلطی کو سدھارنے کا موقع زندگی میں شاذ و نادر ہی دستیاب ہوتا ہے۔

آج بھی تمہارا صرف اور صرف تمہارا مختار۔"

مگر اسے اب لکھنا نہیں تھا رو برو الماس کو حال دل سنانا تھا۔

نمرہ احمد

نمل

فارس غازی انٹیلی جنس کے اعلا عہدے پر فائز ہے۔ وہ اپنے سوتیلے بھائی وارث غازی اور اپنی بیوی کے قتل کے الزام میں چار سال سے جیل میں قید ہے۔ سعدی یوسف اس کا بھانجا ہے جو اس سے جیل میں ہر ہفتے ملنے آتا ہے۔

سعدی یوسف تین بہن بھائی ہیں، ان کے والد کا انتقال ہو چکا ہے۔ حنین اور اسامہ، سعدی سے چھوٹے ہیں۔ ان کی والدہ ایک چھوٹا سا ریسٹورنٹ چلاتی ہیں۔ زمر، سعدی کی پھپھو ہے۔ وہ چار سال قبل فائرنگ کے ایک واقعہ میں زخمی ہو جاتی ہے۔ فائرنگ کا الزام فارس غازی پر ہے۔ فارس غازی کو شک تھا کہ اس کی بیوی اس کے بھائی کے ساتھ انوالو ہے۔ اس نے جب فائرنگ کی تو زمر اس کی بیوی کے ساتھ تھی۔ فائرنگ کے نتیجہ میں بیوی مر جاتی ہے اور زمر شدید زخمی ہو جاتی ہے۔ ایک انگریز عورت اپنا گردہ دے کر اس کی جان بچاتی ہے۔ یقین ہے کہ اس کا ماموں بے گناہ ہے۔ اسے پھنسایا گیا ہے۔ اس لیے وہ اسے بچانے کی کوشش کرتا ہے، جس کی بنا پر زمر اپنے بھتیجے سعدی یوسف سے بدظن ہو جاتی ہے۔ بدظن
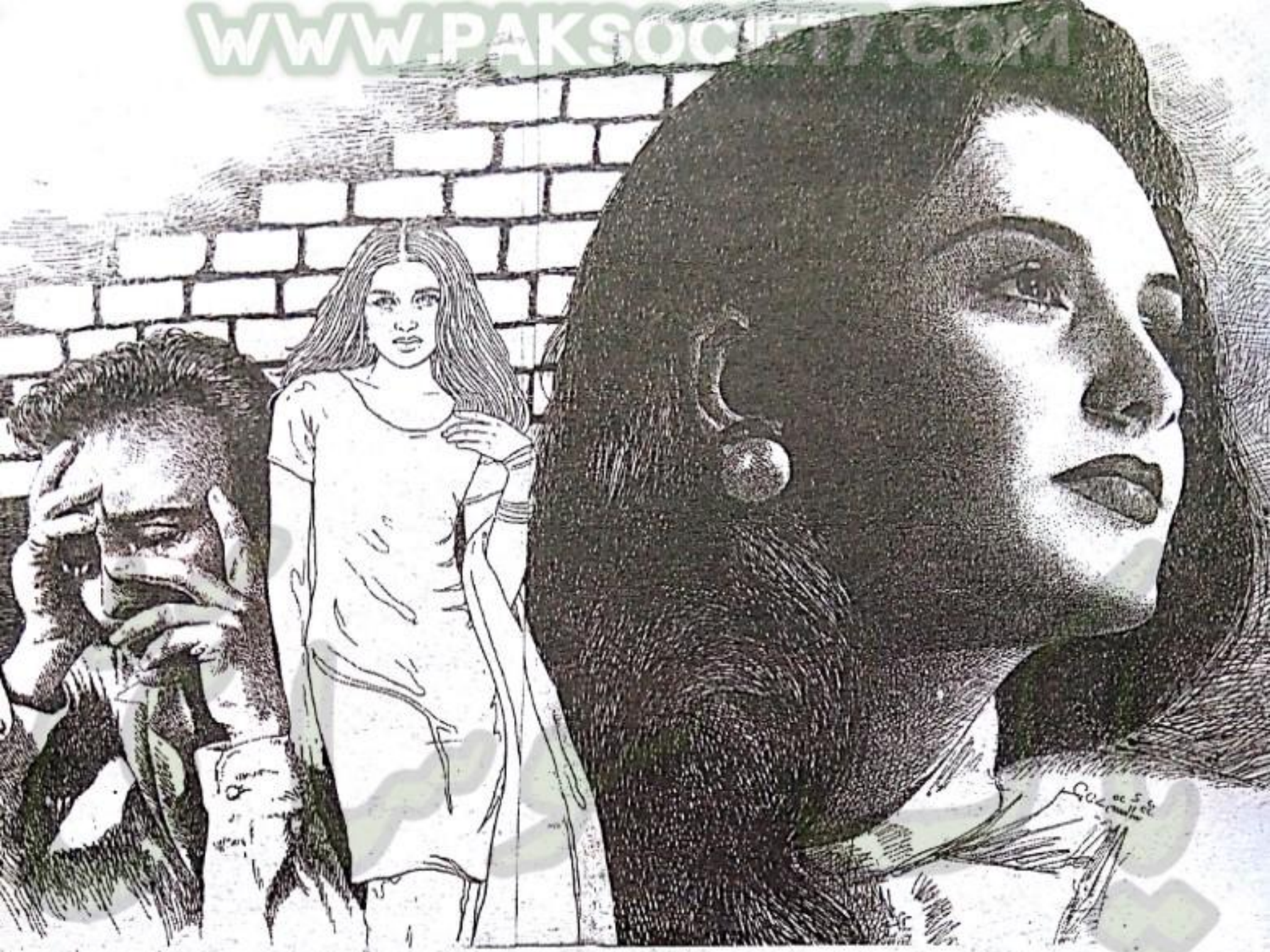
مکمل ناول

ہونے کی ایک اور بڑی وجہ یہ ہے کہ زمر جب موت و زندگی کی کشمکش میں ہوتی ہے تو سعدی اس کے پاس نہیں ہوتا۔ وہ اپنی پڑھائی اور امتحان میں مصروف ہوتا ہے۔

جواہرات کے دو بیٹے ہیں۔ ہاشم کاردار اور نوشیرواں۔

ہاشم کاردار بہت بڑا وکیل ہے۔ ہاشم اور اس کی بیوی شہرین کے درمیان علیحدگی ہو چکی ہے۔ ہاشم کی ایک بیٹی سونیا ہے۔ جس سے وہ بہت محبت کرتا ہے۔

فارس غازی، ہاشم کی پھپھو کا بیٹا ہے۔ جیل جانے سے پہلے وہ ہاشم کے گھر میں جس میں اس کا بھی حصہ ہے، رہائش پذیر تھا۔ سعدی کی کوششوں سے فارس رہا ہو جاتا ہے۔

والد کے کہنے پر زمر سعدی کی سالگرہ پر اس کے لیے پھول اور ہاشم کی بیٹی سونیا کی سالگرہ کارڈ لے کر جاتی ہے۔ سعدی، ہاشم کی بیوی سے ہاشم کے لیپ ٹاپ کا پاس ورڈ مانگتا ہے۔ شہرین اپنے دیور نوشیرواں سے، جو اپنی بھابھی میں دلچسپی رکھتا ہے، بہانے سے پاس ورڈ حاصل کر کے سعدی کو سونیا کی سالگرہ میں دے دیتی ہے۔

پاس ورڈ ملنے کے بعد سعدی، ہاشم کے کمرے میں جا کر اس کے لیپ ٹاپ پہ فلیش ڈرائیو لگا کر ڈیٹا کاپی کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔

چیف سیکریٹری آفیسر خاور، ہاشم کو اس کے کمرے کی فوٹیج دکھاتا ہے۔ جس میں سعدی کمرے میں جاتے ہوئے نظر آتا ہے، ہاشم، خاور کے ساتھ بھاگتا ہوا کمرے میں پہنچتا ہے، لیکن سعدی اس سے پہلے ہی وہاں سے نکلنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔

ہاشم کو پتا چل جاتا ہے کہ سعدی اس کے کمرے میں لیپ ٹاپ سے ڈیٹا کاپی کرنے آیا تھا اور شہرین نے نوشیرواں کو استعمال کر کے پاس ورڈ سعدی کو دیا تھا۔ دوسری جانب بڑے ابا زمر کو یہ بتا دیتے ہیں کہ زمر کو کسی یورپین خاتون نے نہیں بلکہ سعدی نے گردہ دیا تھا۔ یہ سن کر زمر کو بے حد دکھ ہوتا ہے۔

نوشیرواں ایک بار پھر ڈرگز لینے لگتا ہے اس بات پر جواہرات فکر مند ہے۔

بعد میں سعدی لیپ ٹاپ پہ فائلز کھولنے کی کوشش کرتا ہے لیکن فائلز ڈیمج ہو جاتی ہیں۔

سعدی حنین کو بتاتا ہے کہ وہ گیم کے ہائی اسکورز کی فہرست میں پہلے نمبر پر نہیں ہے حنین حیران ہو کر اپنی گیم والی سائٹ کھول کر دیکھتی ہے تو پہلے نمبر "دو آنس اپور آفٹر" لکھا ہوتا ہے۔ وہ علیشا ہے ورجینیا سے۔ حنین کی علیشا سے دوستی ہو جاتی ہے۔

اب کہانی ماضی میں آگے بڑھ رہی ہے۔ فارس ' زمر سے لاء کی کچھ کلاسز لیتا ہے۔ ندرت اس سے شادی کا پوچھتی ہیں۔ وہ لاپروائی سے زمر کا نام لے لیتا ہے۔ ندرت خوش ہو کر ابا سے بات کرتی ہیں۔ ان کی ساس فارس کو اجڈ اور بدتمیز سمجھتی ہیں اور اس کے مقابلے میں فہد سے زمر کی بات طے کر دیتی ہیں۔ وارث غازی' ہاشم کے خلاف منی لانڈرنگ کیس کے پر کام کر رہا ہے۔ اس کے پاس مکمل ثبوت ہیں۔ اس کا باس فاطمی' ہاشم کو خبردار کر دیتا ہے۔ ہاشم' خاور کی ڈیوٹی لگاتا ہے کہ وہ وارث کے پاس موجود تمام شواہد ضایع کرے۔ وارث کے ہاسٹل کے کمرے میں خاور اپنا کام کر رہا ہے۔ جب وارث ریڈ سگنلز ملنے پر اپنے کمرے میں جاتا ہے۔ پھر کوئی راستہ نہ ہونے کی صورت میں بہت مجبور ہو کر ہاشم' خاور کو وارث کو مار دینے کی اجازت دے دیتا ہے۔ دوسری صورت میں وارث' فارس کو وہ سارے شواہد میل کر دیتا۔ وارث کے قتل کا الزام ہاشم' فارس پہ ڈلواتا ہے۔

زرتاشہ کو قتل اور زمر کو زخمی کرنا بھی فارس کو وارث کے قتل کے الزام میں پھنسانے کی ہاشم اور خاور کی منصوبہ بندی ہوتی ہے۔ وہ دونوں کامیاب ٹھہرتے ہیں۔ زرتاشہ مر جاتی ہے۔ زمر زخمی حالت میں فارس کے خلاف بیان دیتی ہے۔ فارس جیل چلا جاتا ہے۔ سعدی' زمر کو سمجھاتا ہے کہ فارس ایسا نہیں کر سکتا۔ اسے غلط فہمی ہوئی ہے۔ زمر کہتی ہے کہ وہ جھوٹ نہیں بولتی اور اپنے بیان پر قائم رہتی ہے۔ نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ دونوں ایک دوسرے سے ناراض ہو جاتے ہیں۔ زمر کی ناراضی کی ایک وجہ یہ بھی ہوتی ہے کہ وارث کے قتل کے وقت بھی اس کی شادی لیٹ ہو جاتی ہے اور وہ اپنی شادی روک کر فارس کے لیے مقدمہ لڑتی ہے۔ اب وہی شخص اپنے اس قتل کو چھپانے کے لیے اسے مارنا چاہتا ہے۔ وہ بظاہر اتفاقاً" بچ جاتی ہے' مگر اس کے دونوں گردے ضائع ہو جاتے ہیں۔ اور اس حادثے کی صورت اس کی شادی ٹوٹ جاتی ہے۔

حنین کی نیٹ فرینڈ علیشا دراصل اورنگ زیب کی بیٹی ہے جسے وہ اور ہاشم تسلیم نہیں کرتے۔ وہ باقاعدہ منصوبہ بندی کر کے حنین سے دوستی کرتی ہے اور پڑھائی کے لیے کاردار سے پیسے کے لیے غیر قانونی پاکستان آتی ہے۔ مگر ہاشم اس سے بہت برے طریقے سے پیش آتا ہے اور کوئی مدد نہیں کرتا۔ زرتاشہ اور زمر کے قتل کے وقت فارس اور حنین' وارث کیس کی ایلی بائی کے سلسلے میں علیشا کے پاس ہی ہوتے ہیں' مگر علیشا ہاشم کی وجہ سے کھل کر ان کی مدد کرنے سے قاصر ہے۔

زمر فیصلہ کر چکی تھی کہ وہ فارس کے خلاف بیان دے گی۔ گھر میں اس فیصلے سے کوئی بھی خوش نہیں' جس کی بنا پر زمر کو دکھ ہوتا ہے۔

جواہرات' زمر سے ملنے آتی ہے اور اس سے کہتی ہے کہ فارس کے خلاف بیان دے۔ وہ زمر کے ساتھ ہے' اسی وقت زمر کا منگیتر اس کو دیکھنے آتا ہے۔ اس کی ہونے والی ساس یہ رشتہ ختم کرنا چاہتی ہے۔ جواہرات اس کے منگیتر کو اپنی گاڑی میں بٹھالیتی ہے اور اسے آسٹریلیا بھجوانے کی آفر کرتی ہے۔

سعدی' فارس سے ملنے جاتا ہے تو وہ کہتا ہے ہاشم اس قسم کا آدمی ہے جو قتل بھی کر سکتا ہے اور وہ فارس سے مخلص نہیں ہے۔

سعدی کو پتا چلتا ہے کہ اسے اسکالر شپ نہیں ملا تھا۔ زمر نے اپنا پلاٹ بیچ کر اس کو باہر پڑھنے کے لیے رقم دی تھی۔ اسے بہت دکھ ہوتا ہے۔
زمر کو کوئی گردہ دینے والا نہیں ملتا تو سعدی اسے اپنا گردہ دے دیتا ہے۔ وہ یہ بات زمر کو نہیں بتاتا۔ زمر بدگمان ہو جاتی ہے کہ سعدی اس کو اس حال میں چھوڑ کر اپنا امتحان دینے ملک سے باہر چلا گیا۔
سعدی' علیشا کو راضی کر لیتا ہے کہ وہ یہ کہے گی کہ وہ اپنا گردہ زمر کو دے رہی ہے' کیونکہ وہ جانتا ہے کہ اگر زمر کو پتا چل گیا کہ گردہ سعدی نے دیا ہے تو وہ کبھی سعدی سے گردہ لینے پر رضامند نہیں ہو گی۔
ہاشم حنین کو بتا دیتا ہے کہ علیشا نے اورنگ زیب کاردار تک پہنچنے کے لیے حنین کو ذریعہ بنایا ہے۔ حنین اس بات پر علیشا سے ناراض ہو جاتی ہے۔

ہاشم' علیشا کو دھمکی دیتا ہے کہ وہ اس کی ماں کا ایکسیڈنٹ کروا چکا ہے اور وہ اسپتال میں ہے۔ وہ علیشا کو بھی مروا سکتا ہے۔ وہ یہ بھی بتاتا ہے کہ وہ اور اس کی ماں بھی امریکن شہری ہیں۔
جواہرات' زمر کو بتاتی ہے کہ زمر کا منگیتر حماد شادی کر رہا ہے۔
فارس کہتا ہے کہ وہ ایک بار زمر سے مل کر اس کو بتانا چاہتا ہے کہ وہ بے گناہ ہے۔ اسے پھنسایا جا رہا ہے۔ وہ ہاشم پر بھی شبہ ظاہر کرتا ہے' لیکن زمر اس سے نہیں ملتی۔
ہاشم کو پتا چل جاتا ہے کہ سعدی اس کے کمپیوٹر سے ڈیٹا چرا کر لے جا چکا ہے۔ وہ جواہرات سے کہتا ہے کہ زمر کی شادی فارس سے کرانے میں خطرہ ہے' کہیں وہ جان نہ جائے کہ فارس بے گناہ ہے' لیکن وہ مطمئن ہے۔ جواہرات' زمر کو بتاتی ہے کہ فارس نے اس کے لیے رشتہ بھجوایا تھا' جسے انکار کر دیا گیا تھا۔ زمر کو یقین ہو جاتا ہے کہ فارس نے اسی بات کا بدلہ لیا ہے۔ زمر' جواہرات کے اکسانے پر صرف فارس سے بدلہ لینے کے لیے اس سے شادی پر رضامند ہو جاتی ہے۔

ڈیڑھ ماہ قبل ایک واقعہ ہوا تھا جس سے سعدی کو پتا چلا کہ ہاشم مجرم ہے۔
ہوا کچھ یوں تھا کہ نوشیرواں نے ایک ڈراما کیا تھا کہ وہ کوریا میں ہے اور اغوا ہو چکا ہے۔ تاوان نہ دیا گیا تو وہ لوگ اس کو مار دیں گے۔
ہاشم' حنین اور سعدی کو آدھی رات کو گھر بلاتا ہے اور ساری سچویشن بتا کر اس سے پوچھتا ہے' کیا اس میں علیشا کا ہاتھ ہو سکتا ہے۔
وہ حنین سے کہتا ہے کہ تم اس کے بارے میں پتا کرو۔ حنین کمپیوٹر سنبھال لیتی ہے۔ سعدی اس کے ساتھ بیٹھا ہوتا ہے۔ تب ہی ہاشم آکر اپنا سیف کھولتا ہے تو سعدی کی نظر پڑتی ہے۔ اس کو جو کچھ نظر آتا ہے۔ اس سے اس کے ہوش اڑ جاتے ہیں۔
اس میں وارث کی بیٹیوں کی تصویر ہوتی ہے۔ جو وارث ہمیشہ اپنے ساتھ رکھتا تھا۔ وہ ہاشم کے سیف کے کوڈ آئینے میں دیکھ لیتا ہے اور کمرے سے اس کے جانے کے بعد سیف کھولتا ہے۔ اس سے ایک لفافہ ملتا ہے' جس میں اس ریسٹورنٹ میں فائرنگ کے فوراً" بعد کی تصویر ہوتی ہے' جس میں زمر خون میں لت پت نظر آتی ہے اور ایک فلیش ڈرائیو بھی ملتی ہے۔
تب اسے پتا چلتا ہے کہ ہاشم مخلص نہیں تھا۔ یہ قتل اسی نے کرایا تھا۔
حنین' نوشیرواں کی پول کھول دیتی ہے' وہ کہتی ہے کہ نوشیروا پاکستان میں ہی ہے اور اس نے پیسے اینٹھنے کے لیے اغوا کا ڈراما رچایا۔
سعدی وہ فلیش سنتا ہے تو سن رہ جاتا ہے۔ وہ فارس کی آواز کی ریکارڈنگ ہوتی ہے۔ جس میں وہ زمر کو دھمکی دیتا ہے۔
سعدی بار بار سنتا ہے تو اسے اندازہ ہو جاتا ہے کہ یہ جعلی ہے۔ وہ فارس کے وکیل کو فارغ کر دیتا ہے۔ جو ہاشم کا آدمی تھا۔
سعدی' زمر کے پاس ایک بار پھر جاتا ہے اور اسے قائل کرنے کی کوشش کرتا ہے کہ فارس بے گناہ ہے۔ وہ کہتا ہے اس میں کوئی تیسرا آدمی بھی ملوث ہو سکتا ہے۔

"مثلاً "کون؟" زمر نے پوچھا۔
"مثلاً ... مثلاً" ہاشم کار دار .... "سعدی نے ہمت کر کے کہہ ڈالا۔ زمر سن سی ہو گئی۔
زمر کو ہاشم کار دار کے ملوث ہونے پر یقین نہیں آتا سعدی، زمر سے کسی اچھے وکیل کے بارے میں پوچھتا ہے تو وہ ریحان خلجی کا نام لیتی ہے۔ سعدی فارس کا وکیل بدل دیتا ہے۔
حنین، علیشا کو فون کرتی ہے تو پتا چلتا ہے کہ وہ جیل میں ہے کیونکہ اس نے چوری کی کوشش کی تھی۔
ہاشم کو پتا چل جاتا ہے کہ سعدی نے وہ آڈیو حاصل کر لی ہے جس میں فارس کا جعلی فون ٹیپ ہے لیکن وہ مطمئن ہے کہ جج تو ان کا ہے۔
ہاشم کی بیوی شہرین ایک کلب میں جوا کھیلتی ہے اس کی سی سی ٹی وی فوٹیج ان کے کیمروں میں ہے۔ اسے غائب کرانے کے لیے سعدی کی مدد لیتی ہے۔
ریحان خلجی عدالت میں زمر کو لاجواب کر دیتا ہے۔ یہ بات فارس کو اچھی نہیں لگتی۔
فارس جیل سے نکلنا چاہتا ہے لیکن اس کا ساتھی غلطی سے زمر کو اس میں استعمال کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ زمر کا غصہ فارس کے خلاف مزید بڑھ جاتا ہے۔
زمر، فارس سے ملتی ہے تو فارس کہتا ہے کہ ایک بار وہ اس کے کیس کو خود دیکھے۔ فارس کہتا کہ وہ زمر سے معافی نہیں مانگے گا۔
جیل سے علیشا، حنین کو خط لکھتی ہے وہ حنین سے کہتی ہے تم میں اور مجھ میں ذہانت کے علاوہ ایک اور چیز مشترک ہے ہے ہماری برائی کی طرف مائل ہونے والی فطرت۔ اس لیے کسی کی کمزوری کو شکار مت کرنا۔ گناہ مت کرنا ورنہ کفارے دیتے عمر بیت جائے گی۔
حنین کو اپنا ماضی یاد آجاتا ہے، جب اس نے کسی کی کمزوری سے فائدہ اٹھایا تھا اور وہ شخص صدمہ سے دنیا سے رخصت ہو گیا تھا۔ وہ کفارہ کے لیے آگے پڑھنے سے انکار کر دیتی ہے۔ وہ سعدی کو یہ ساری بات بتاتی ہے تو سعدی کو شدید صدمہ ہوتا ہے۔
اورنگ زیب، نوشیرواں کو عاق کرنا چاہتے ہیں۔ یہ جان کر جواہرات غصہ سے پاگل ہو جاتی ہے۔ وہ اورنگ زیب کو قتل کر دیتی ہے اور ڈاکٹر سے مل کر اسے بلیک میل کر کے ______ پوسٹ مارٹم رپورٹ بھی اپنی مرضی کی حاصل کر لیتی ہے۔

تیرہویں قسط

من خشت بہ ملکہ داد!
(میں نے پیش کیا ملکہ کو ایک ہیرا!)
وہ سو رہا ہوتے ہیں
جو پھینکتے ہیں گوٹ!
مگر وہ قسمت ہوتی ہے
جو شطرنج کھیلتی ہے!
اور تم بہت دیر سے جان پاتے ہو
کہ وہ کون تھا جو آغاز سے ہی

کھیل رہا تھا دونوں کوئین کے ساتھ!"
ذکیہ بیگم دل تھام کر رہ گئیں۔ لب کھل گئے اور آنکھوں میں بے یقینی پھیلی۔
"تم سارہ؟ تم ادھر تھیں؟ مگر۔ کیوں؟" سہارے کے لیے بیڈ کا کنارہ تھاما۔ وہ بھی آہستگی سے بیٹھی۔ آنسو ٹپ ٹپ گر رہے تھے۔
"اس نے مجھے وہاں بلایا تھا۔" سر جھکائے انگلی سے ہتھیلی مسلتی، وہ بتانے لگی۔

ذرا دیر کے لیے ہم ایک ماہ قبل 'اکیس مئی کی صبح تک پیچھے چلتے ہیں' جب سعدی ہاشم کاردار کے آفس میں بیٹھا تھا۔ تو چند میل دور' اپنے آفس میں بیٹھی سارہ انٹر کام اٹھائے کہہ رہی تھی۔

"ماریہ! میں انسٹی ٹیوٹ جا رہی ہوں کلاس لینے' آپ یوں کرو' سعدی کو کہو کہ جو پریز ٹینشن اس نے....."

"ڈاکٹر سارہ' سعدی آج نہیں آیا۔" دوسری طرف سے اس کو عجلت میں ٹوکا گیا تو سارہ ذرا دیر کو رکی۔

"نہیں آیا؟" ابرو بھینچے۔ آنکھوں میں غصہ در آیا۔ موبائل اٹھا کر کال ملائی۔

ہاشم کے آفس کے باہر حلیمہ بیٹھی کام کر رہی تھی جب ٹوکری میں رکھا سعدی کا موبائل بجنے لگا اس نے نگاہ اٹھا کر دیکھا۔ "بلاکڈ نمبر کالنگ" اور واپس کام کرنے لگی۔

سارہ نے فون رکھا تو چہرے پہ شدید ناراضی تھی۔ کلاس لینے کے بعد وہ باہر نکلی تو دوبارہ سے اس کو کال ملائی۔ اب کے اس نے اٹھالیا۔

"جی؟" وہ خود بھی اکتایا ہوا لگ رہا تھا۔

"مسٹر سعدی یوسف! آپ آج آفس نہیں آئے۔" دانت پہ دانت جما کر تحمل سے پوچھا۔

"مجھے۔ کچھ کام تھا۔" ہاشم کے آفس سے باہر سڑک پہ وہ گاڑی دوڑاتا گھر کی طرف جا رہا تھا۔

"آج پانچ بجے سے پہلے آکر اپنا ٹرمینیشن لیٹر وصول کر لینا' سعدی! کیونکہ میں مزید تمہاری بے قاعدگیاں برداشت نہیں کروں گی۔ آج نہیں آسکو تو کل آنے کی زحمت نہ کرنا' ہم لیٹر بھجوا دیں گے خدا حافظ۔" سختی سے بولی۔

"میں گھر جا کر آپ کو دوسرے نمبر سے کال کرتا ہوں' یہ فون بگ ہو رہا ہوگا۔" اس نے ایسے عجلت میں کہا جیسے سارہ کی بات کی کوئی اہمیت ہی نہیں۔ اف!

شام کو وہ گھر پہ تھی جب اس کا موبائل بجا۔ "ندرت بھابھی کالنگ۔"

"جی بھابھی؟"

"بھابھی کا بیٹا بول رہا ہوں' وہ بھی خوب صورت والا۔" وہ صبح کی نسبت ہشاش بشاش لگ رہا تھا۔ سارہ کے چہرے پر خفگی ابھری۔

"ٹرمینیشن لیٹر پوسٹ کر دیں گے ہم۔ آپ کو آفس آنے کی ضرورت نہیں ہے۔"

"میں نے اپنی باس کو نہیں' سارہ خالہ کو فون کیا ہے۔ ضروری بات کرنی ہے۔ اس کے بعد بے شک مجھے نوکری سے نکال دیجئے گا۔" وہ سنجیدہ ہوا تو سارہ کے چہرے کی خفگی کم ہوئی۔ اگر وہ پروجیکٹ ڈائریکٹر تھی' پروسس ڈیزائن میں پی ایچ ڈی تھی' تو وہ بھی سعدی تھا!

"بولو۔"

"شام کو میں ساری فیملی کو اپنے ریسٹورنٹ میں اکٹھا کر رہا ہوں' آپ بھی آئیں گی کیونکہ مجھے سب کو کچھ بتانا ہے۔"

"میں نہیں آسکتی۔ جو بتانا ہے' ابھی بتا دو۔"

"آپ کے شوہر کے قاتل سے ملا میں آج۔ اس

سے اعتراف بھی کروالیا۔ ثبوت بھی ہے میرے پاس۔ مجھے پتا ہے آپ کو بدلہ لینے میں کوئی دلچسپی نہیں ہے' مگر کم از کم تو یہ آپ جاننا چاہیں گی کہ آپ کو اپنے بچوں کو کس سے محفوظ رکھنا ہے۔"

اور سارہ دھواں دھواں ہوتے چہرے کے ساتھ کھڑی سنتی گئی۔ پھر اس نے وہی کیا جو سعدی نے کہا مگر ایک چیز پہ وہ راضی نہیں ہوئی۔

"میں کسی فیملی ڈنر کا حصہ نہیں بنوں گی۔"

"اوکے' آپ ہمارے گھر کے قریب جو پارک ہے' وہاں آئیں۔ ہم بیٹھ کر بات کرتے ہیں' اگر میں آپ کو راضی نہ کرسکا تو ٹھیک ہے' آپ وہیں سے گھر چلی جائیے گا اور میں ریسٹورنٹ۔"

وہ اتنے پہ راضی ہوگئی۔ صرف اتنے پہ۔

شام ڈھل چکی اور اندھیرا پھیل گیا تھا جب اس نے پارک میں بنچ پہ بیٹھے کلائی کی گھڑی دیکھی' اور پھر سعدی کو کال کرنے کے لیے فون نکالا۔ مگر اس کی تاکید یاد آگئی۔ اس کا فون ممکنہ طور پر بگ ہو رہا ہوگا۔ (گو کہ ایسا نہیں تھا مگر وہ احتیاط کر رہا تھا) سو اس نے صرف پیغام بھیجا۔ "کدھر ہو؟"

جواب ذرا دیر سے موصول ہوا۔ "اسٹریٹ نمبر فورٹین میں رائٹ لین میں جو زیر تعمیر گھر ہیں' ان میں سبز گیٹ والے گھر کے اندر جائیں' میں آرہا ہوں۔ ریسٹورنٹ نہیں آسکتیں تو اتنا تو کرنا پڑے گا۔"

اب یہ سب سارہ کی برداشت سے باہر ہوتا جا رہا تھا' مگر وہ سعدی تھا۔ اس کو میلوڈرامہ کی عادت تھی' یقیناً کوئی وجہ تھی' جب ہی وہ کہہ رہا تھا۔ وہ پیدل چلتی چند گلیاں عبور کر کے اس گھر کے اندر چلی آئی۔ رات کا وقت' سنسان گلی' مہیب تاریکی۔ بجلی گئی ہوئی تھی۔ وہ اس پراسرار منظر نامے سے نہ ڈری نہ گھبرائی۔ بس اس گھر کے پورچ میں بار بار گھڑی دیکھتی' ٹہلتی رہی۔ وہ عمر اور تجربے کے اس حصے میں تھی جہاں انسان جنات اور بھوت پریت سے نہیں ڈرتا۔ صرف انسانوں سے ڈرتا ہے۔

گیٹ پہ آہٹ ہوئی تو وہ مڑی۔ جھنجلا کر کہنے لگی۔

"سعدی اتنا ڈرامہ کرنے کی۔" مگر وہ "ششش" منہ پہ انگلی رکھتا تیزی سے قریب آیا۔ سارہ رک گئی۔ وہ بار بار گردن موڑ کر پیچھے دیکھتا تھا۔

"آپ یوں کریں' ریسٹورنٹ جائیں' میں۔"

"سعدی! میں نے بتایا ہے میں ادھر نہیں جاؤں گی۔ تمہیں مجھے کچھ بتانا ہے تو بتاؤ ورنہ میں جا رہی ہوں۔"

"ششش' آہستہ۔" اس نے پھر گردن موڑی۔ پھر ذرا خفگی سے اسے دیکھا۔ "میرے پیچھے کوئی لگا ہوا ہے۔ میرا خیال ہے اس کے پاس گن ہے۔ (سارہ کا منہ کھلا) نہیں وہ' مجھے کچھ نہیں کہے گا' وہ میرا دوست ہے' مگر آپ کو نقصان پہنچا سکتا ہے۔ آپ یوں کریں' ریسٹورنٹ جائیں' اور یہ۔" اس نے چابیوں کا گچھا نکالا۔ (علیشا کی کی چین سے اس نے چھ انچ کا ایک سلور پین بھی نتھی کر رکھا تھا۔) اور اسے سارہ کے ہاتھ میں تھمایا۔

"یہ جا کر زمر کو دیجئے گا۔ میرے پاس اس کی کوئی کاپی نہیں ہے۔ پلیز' اسے مت کھوئیے گا' بس زمر کو دے دیں' اور کہنا سعدی آرہا ہے۔ پھر بے شک گھر چلی جائیے گا' میں بعد میں وضاحت کردوں گا۔"

"سعدی! یہ کیا ہو رہا ہے؟ تم۔" وہ پریشان ہونے لگی۔

"ڈاکٹر سارہ جو میں کہہ رہا ہوں' وہ کریں۔ جائیں۔ جلدی۔" سارہ نے اثبات میں سر ہلایا اور جانے کے لیے مڑی۔ ساتھ ہی پاؤچ کھول کر اندر کی پین رکھی' تب ہی پاؤچ میں رکھا موبائل زور سے چیخا۔ کوئی کال آرہی تھی۔ اندھیرے سناٹے میں آواز گونجی۔ باہر گلی میں شیرو کو لگا کہ سعدی اپنا فون سائلنٹ کرنا بھول گیا ہے۔ مگر وہ سارہ کا فون تھا۔

"او ڈیم!" سعدی نے تیزی سے اس کا فون جھپٹا اور اسے سائلنٹ کیا۔ اور ذرا فکر مندی سے گیٹ کی طرف دیکھا۔

"وہ ادھر ہی آجائے گا۔ اوپر سیڑھیوں سے جائیں' ساتھ والے گھر کی چھت پھلانگ لیں' اور سنیں' وہ

مجھے کچھ نہیں کہے گا بس جو بھی ہو جائے آپ کو سامنے نہیں آنا' چاہے کچھ بھی ہو جائے۔ اب جائیں۔" کندھے سے پکڑ کر تقریباً" اس نے سارہ کو دھکیل دیا۔ اس وقت بھی صرف سارہ کی فکر تھی۔ شیرو نے دیکھ لیا تو سمجھ جائے گا کہ وہ سارہ کو سب بتا چکا ہے' اور پھر سارہ کو وہ نقصان پہنچائیں گے۔

سارہ کے مختل حواس کام کرنے لگے۔ وہ تیزی سے سیڑھیوں تک آئی۔ سینڈل اتار کر ہاتھ میں پکڑی اور زینے پھلانگ گئی۔ مڑ کر دیکھا تو سعدی اس کی طرف دیکھ رہا تھا اور تب ہی گیٹ کھلنے کی آواز آئی۔ سارہ اوپر آگئی۔

اوپری چھت خالی تھی سریے' ستون' آدھی دیواریں۔ وہ اندھیرے میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھتی' سنبھل سنبھل کر قدم رکھتی' ذرا آگے آئی' تب ہی اس نے وہ آواز سنی۔ نیچے سعدی سے کوئی بات کر رہا تھا۔ وہ اسے پہچانتی تھی۔ فارس کی آواز۔ نہیں۔ نوشیرواں؟ اس کی آواز فارس سے ملتی تھی۔

سارہ واپس مڑی اور سیڑھیوں کے آغاز تک آئی۔ ذرا سی گردن نکال کر جھانکا۔ وہ نوشیرواں تھا اور وہ سعدی پہ پستول تانے ہوئے تھا۔ ایک لمحے کے لیے نظروں کے سامنے وارث کی پنکھے سے لٹکتی لاش گھوم گئی۔ وہ دم سادھے' سن سی کھڑی رہی۔ اس نے چند الفاظ سنے۔ وارث کو ان ہی لوگوں نے مارا ہے۔ وارث کو ہاشم نے مارا ہے۔ اس کی نگاہیں نوشیرواں کے پستول تانے ہاتھ پہ تھیں' اور ذہن۔ ذہن سن سا تھا مگر نہیں۔ اسے ان الفاظ کی فی الحال کوئی سمجھ نہ تھی۔ بس اسے سعدی کی فکر تھی۔ اندھے کو بھی نظر آرہا تھا کہ وہ گولی چلا دے گا۔ اور سعدی اس کو ٹھنڈا کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

وہ کیا کرے؟ اس نے ادھر ادھر نگاہ دوڑائی۔ کوئی پتھر' جسے وہ شیرو کے سر پہ مار سکے مگر اس نے دیکھا اس کے ہاتھ لرز رہے تھے۔ نہیں' وہ عورت تھی' کمزور تھی۔ وہ اکیلی کچھ نہیں کر سکتی تھی۔ پھر کس کو بلائے؟ فارس؟ نہیں۔ پولیس۔ ہاں۔ پولیس۔ سائرن سنتے ہی وہ بھاگ جائے گا۔

ڈاکٹر سارہ غازی نے اگلا فیصلہ لمحوں میں کیا تھا' اور لمحوں میں ہی وہ ننگے پیر چلتی ساتھ والے گھر کی چھت تک آئی۔ دونوں چھتیں ملی ہوئی تھیں مگر وہ ایسی جگہ نہ تھی کہ وہ پھلانگ سکے۔ اس نے کونے میں (نوشیرواں سے حتی الامکان دور) کھڑے ہو کر موبائل پہ پولیس کو کال کی۔ (اس کا نمبر پرائیویٹ تھا' کال پکڑی نہ کی جا سکتی تھی۔) مدھم سرگوشی میں جلدی جلدی ان کو سمجھایا کہ اس پتے پہ ایک شخص فائرنگ کر رہا ہے' اور وہ جلدی پہنچیں۔ انہوں نے پتے کی تصدیق کی اور اسے تسلی دی کہ ایک موبائل اس علاقے میں گشت کر رہی ہے' وہ جلد پہنچ جائیں گے۔

"آپ کون ہیں اور کدھر سے بول رہی ہیں؟"

"میں۔ پڑوس سے بول رہی ہوں۔"

"اوکے آپ اس شخص سے دور رہیں۔ کہیں چھپ جائیں' پولیس کے آنے تک باہر نہ نکلیے گا۔" اس نے پوری بات سنے بغیر فون کاٹا اور بلی کی چال چلتی واپس آئی' سیڑھیوں کے آغاز پر رکی سامنے کا منظر دیکھ کر اس کی آنکھیں جو پریشانی اور فکرمندی سے سکڑی تھیں' حیرت اور وحشت سے پھیلتی گئیں۔

سعدی گرا پڑا تھا' اور وہ کراہ رہا تھا۔ اندھیرے میں خون کا رنگ دکھائی نہ دیتا تھا مگر اس کی سفید قمیص درمیان سے سیاہ ہوتی جا رہی تھی۔ سارہ نے چیخ روکنے کو منہ پہ ہاتھ رکھا۔ اس کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ پھر اس کی آنکھوں کے سامنے' نوشیرواں نے اسے دو گولیاں مزید ماریں۔ گولی کی آواز سنائی نہ دیتی تھی' ایک کلک ہوتا تھا اور زمین پہ گرا لڑکا کراہتا تھا۔ پھر وہ اسے جوتے سے ٹھوکریں مارنے لگا۔ وہ اسے مارتا جا رہا تھا اور اوپر سیڑھیوں کے آغاز پہ ملک کی پہلی پی ایچ ڈی ان پراسیس ڈیزائن' نسکام کی زمین سے فضا اور فضا میں مار کر دینے والا میزائل بنانے والی سائنس دان اور تھرکول کی پراجیکٹ ڈائریکٹر ڈاکٹر سارہ غازی کپکپا رہی تھی۔ اس کا دل لرز رہا تھا اور رنگ خوف سے سفید پڑ رہا تھا۔ اس نے کتنی دفعہ کمزور ہاتھوں سے

پتھر اٹھایا' مگر اس میں اتنی ہمت نہ تھی کہ وہ اسے کھینچ کر دے مارے۔ ہر ٹھوکر کے بعد وہ جیسے جانے کو مڑتا' پھر رک کر سعدی کو مارتا۔

وہ بس لمحے گن رہی تھی۔ ادھر وہ نکلے اور ادھر سارہ 'سعدی کو فوراً" اٹھا کر اسپتال لے جائے۔ وہ جانے کے لیے مڑا مگر جاتے جاتے اس نے پوری قوت سے سعدی کے منہ پر جوتا مارا تھا۔ سارہ کی آنکھوں میں ایک دم بہت سا پانی اترا۔ اس نے پتھر اٹھایا اور اسے ہوا میں بلند کرتے ہوئے لبوں سے ہلکی سی سسکاری نکلی۔ کتنی مشکل سے چیخیں' آنسو' بددعا' سب کو روکے بیٹھی تھی' یہ وہی جانتی تھی۔ اور یہ کراہ نوشیرواں تک بھی پہنچی تھی' جب وہ ایک دم گھوما۔ سارہ فوراً" دیوار کی اوٹ میں ہو گئی۔

"اے۔ کون ہے ادھر؟" وہ احتیاط سے قدم بڑھا رہا تھا۔ سارہ گہرے گہرے سانس لیتی' دیوار سے کمر ٹکائے کھڑی رہی۔ پھر اسے گولیوں کے کلک اور ان کے سیڑھیوں اور دیوار سے ٹکرانے کی آواز سنائی دی۔ گولیوں کے بارے میں باتیں سننا' اور ان کو فلموں اور ویڈیو گیمز میں دیکھنا اور بات ہوتی ہے' مگر ان کو خود پہ برستے دیکھنا۔ یہ زندگی کے تکلیف دہ تجربات میں سے ایک ہے۔ سارہ نے آنکھیں بند کر لیں' اس کا سارا وجود کانپ رہا تھا۔

پھر خاموشی ہو گئی۔ اس نے چند لمحے انتظار کیا' پھر اوٹ سے نکلی۔ نوشیرواں جاتے جاتے اسی پل واپس مڑا۔ اور اندھیرے میں سارہ کا ہیولا سا فوراً" اوٹ میں ہو گیا۔ اسے لگ رہا تھا وہ ابھی آئے گا اور اسے بھی گولیوں سے بھون دے گا مگر ایسا نہیں ہوا۔ وہ گیٹ عبور کر کے باہر نکل گیا۔

وہ دوڑ کر نیچے آئی۔ سعدی زمین پہ گرا کراہ رہا تھا۔ اس کی آنکھیں بند تھیں۔

"سعدی!" اس نے جھنجھوڑا۔ اس کا چہرہ تھپتھپایا۔ سعدی نے غنودہ سی آنکھیں کھولیں۔ اسے دیکھ کر ان میں کوئی احساس نہ جاگا۔ بس وہی غنودہ' صدماتی' بے یقین سی کیفیت۔

"میں نے پولیس کو کال کر دی تھی۔ وہ آتے ہی ہوں گے۔ تم بالکل ٹھیک ہو جاؤ گے۔" وہ اس کے زخم پہ ہاتھ رکھتے کہہ رہی تھی۔ خون بہے جا رہا تھا۔ سارہ کا لباس لہولہان ہو رہا تھا۔ دور پس منظر میں مدھم سے سائرن سنائی دے رہے تھے۔

سعدی کی نیم جان آنکھیں اس کی آنکھوں پہ جا ٹھہریں۔ اس نے لب کھولے۔

"ڈاکٹر.... سارہ....." کسی رشتے کا حوالہ دیے بغیر اس نے سرگوشی میں.... حلق سے بمشکل الفاظ باہر نکالے۔

"رن.... فار....." اس کے لبوں سے خون بہنے لگا تھا' مگر سارہ کا پورا وجود سُن ہو گیا۔ اسے معلوم تھا وہ کیا کہنا چاہ رہا ہے۔ "رن فار یور لائف (اپنی زندگی کے لیے بھاگو)" ساتھ ہی آنکھوں سے اشارہ کیا۔ جانے کا۔ نکل بھاگنے کا۔ یہ وہ سعدی نہیں تھا جس نے کچھ دیر پہلے بہت اعتماد سے کہا تھا کہ وہ میرا دوست ہے' مجھے کچھ نہیں کہے گا۔ یہ وہ سعدی تھا جس کے یقین کے چہرے پہ ابھی وہ جوتے مار کر گیا تھا۔

سائرن اب قریب ہوتے سنائی دے رہے تھے۔ بجلی آ گئی تھی۔ گلی روشن ہو گئی تھی۔

سارہ ایک دم اٹھی اور باہر بھاگی۔ گیٹ پورا کھول دیا۔ پھولی سانس' تیز دھڑکن' اور بے جان ہوتے وجود کے ساتھ وہ تیز تیز دوڑ رہی تھی۔ نگاہوں میں ایک ہی منظر تھا۔ وارث کی پنکھے سے جھولتی لاش۔ وہ راستے میں دو جگہ گری۔ گھٹنے رگڑے گئے' ہتھیلیاں چھل گئیں' مگر وہ پھر سے اٹھ کر دوڑنے لگی۔ سائرن اب اسی گلی سے سنائی دے رہے تھے۔ لوگوں کی آوازیں بھی۔ ان کو سعدی مل گیا تھا۔ وہ مزید تیز دوڑتی گئی۔ یہاں تک کہ پارک کے قریب کھڑی اپنی کار تک پہنچ گئی۔ اندر بیٹھ کر' تیز تیز سانس لیتے' اس نے خود کو نارمل کرنا چاہا۔

موبائل اگلی نشست پہ ڈالا اور سیٹ کی پشت سے سر ٹکا کر آنکھیں موند لیں۔ اسٹیئرنگ پہ ہاتھ رکھے تو وہ بری طرح کپکپا رہے تھے۔ دل بند ہونے کو تھا۔

اور یہ تب تھا جب اس نے ایک جھٹکے سے آنکھیں کھولیں' اور اسے احساس ہوا کہ اس کا پاؤچ اس کے ہاتھ میں نہیں ہے۔

سارہ نے وحشیانہ انداز میں کپڑے جھاڑے' سیٹ پہ چیزیں الٹ پلٹ کیں۔ گاڑی سے نکل کر دیکھا۔ پاؤچ ندارد۔ سعدی کی چابیاں' سعدی کا پین۔ اس نے کھو دیا تھا' مگر اس وقت سعدی زیادہ اہم تھا۔

آخر وہ صرف ایک پین ہی تو تھا!

اس نے لرزتے ہاتھوں سے کار اسٹارٹ کی اسے واپس اسی گلی میں جانا تھا اور ایک فاصلہ رکھ کر پولیس کی موبائل کا تعاقب کرنا تھا۔ وہ سعدی کو جب تک اسپتال پہنچتا نہیں دیکھ لے گی' اسے چین نہیں آئے گا۔

''پھر میں نے ان کا تعاقب کیا۔ جب وہ اسے اسپتال لے گئے تو میں واپس آگئی۔ ان کے ریسٹورنٹ کال کر کے ملازم کو میں نے ہی بتایا کہ وہ کس اسپتال میں ہے۔ اس سے زیادہ میں کچھ نہیں کر سکتی تھی۔ گھر آکر میں کمرے میں بند ہو گئی۔ کپڑے بدلے۔ صبح کار کی سروس بھی کروائی۔ سارے نشان مٹا دیے۔ اسی صبح میں نے دو جمع دو کر لیے تھے اور مجھے معلوم ہو گیا تھا کہ وارث کو بھی ان ہی لوگوں نے مارا ہے۔'' اپنے کمرے میں بستر پہ بیٹھی سارہ' جھکے چہرے اور آنسوؤں کے ساتھ بتا رہی تھی اور ذکیہ بیگم حق دق سنے جا رہی تھیں۔

''مگر وہ کون تھا؟ جس نے گولی چلائی؟''

سارہ نے نفی میں سر ہلایا۔ ''میں نہیں بتا سکتی۔ ان لوگوں نے وارث کو بھی مارا' وہ میرے بچوں کو بھی مار دیں گے امی۔ اگر میں نے زمر کو بتایا تو وہ کہے گی کہ گواہی دو۔ میں گواہی نہیں دے سکتی۔ میری آنکھوں کے سامنے اس نے جیسے سعدی کو مارا ہے' وہ منظر مجھے نہیں بھولتا۔''

''مگر تم ان کو اتنا تو بتا دو کہ یہ کس نے کیا ہے؟''

''میں نے بتایا تو زمر کو پتا چل جائے گا کہ میں ہی وہ گواہ ہوں جس کو وہ لوگ ڈھونڈ رہے ہیں۔ ان کو پتا ہے کہ وہاں کوئی تھا' مجھے حنین نے بتایا ہے۔ زمر کہے گی کہ گواہی دو۔ وہ میری جگہ ہوتی تو دے دیتی گواہی۔ اس کے پاس کھونے کے لیے کچھ نہیں ہے۔ میرے پاس ہے' میری بیٹیاں ہیں۔ امی جب کوئی مر جائے تو واپس نہیں آتا۔ وہ لوگ کس طرح اسے اسپتال سے لے گئے۔ انہوں نے اس کو مار کر لاش بھی غائب کر دی ہو گی۔ وہ اسی طرح ہمارے ساتھ بھی کریں گے۔'' وہ نفی میں سر ہلاتی' روتے ہوئے کہہ رہی تھی۔ ذکیہ بیگم کا دل بھر آیا۔ انہوں نے اس کا شانہ تھپکا۔

''مگر زمر کہتی ہے وہ زندہ ہے۔''

''امی! زمر نے نہیں دیکھا تھا اسے سعدی کو قتل کرتے' میں نے دیکھا تھا اور اسے اسپتال میں نے پہنچایا تھا۔ آپ مجھے بزدل سمجھتی ہیں تو سمجھیں' مگر وہ میں ہوں جس نے اس کی جان بچائی تھی۔ مگر وہ پھر بھی اسے لے گئے۔ جتنی بے رحمی سے اس کو وہ مار رہا تھا اس کے بعد وہ اسے کیسے چھوڑ سکتے ہیں؟ امی سعدی مر چکا ہے کیونکہ اس نے وارث کے قاتلوں کو کنفرنٹ کیا تھا۔ میں اگر سعدی کے قاتل کو کنفرنٹ کروں گی تو ہم سب بھی مریں گے۔'' وہ ایک دم وحشیانہ انداز میں چلائی تھی۔ ''مجھے اپنی پروا نہیں ہے مگر میری بیٹیاں ہیں دو! اور یہ...... اور یہ لوگ جو سوشل میڈیا پہ سعدی کے نام سے تحریک چلا رہے ہیں' امی ان میں سے کسی کو عدالت آنا پڑے تو کوئی بھی نہیں آئے گا۔ ہر کوئی زمر نہیں ہوتا۔''

''اور وہ جو چیزیں سعدی نے تمہیں دی تھیں؟ وہ نہیں ملیں؟''

''نہیں' میں بعد میں دوبارہ اس علاقے میں گئی تھی۔ ہر وہ جگہ دیکھی جہاں سے گزری تھی۔ مگر میرا پاؤچ نہیں تھا۔ اس میں میری ایک رنگ تھی' پیسے تھے اور سعدی کی چابیاں بھی۔ پھر سعدی کی گمشدگی کے کوئی چار دن بعد میں اس زیر تعمیر مکان میں گئی۔ وہاں اوپر چھت پہ' جہاں میں نے چھپ کر پولیس کو فون کیا تھا وہاں اب بجری کا ڈھیر پڑا تھا۔ میں نے بجری ہٹائی تو ایک کونے میں جہاں اس رات سیمنٹ کچی

تھی‘ اب پک کر سخت ہو چکی تھی‘ اس میں میرے پاؤچ کے دو موتی اٹکے تھے۔“

ذکیہ بیگم کی آنکھوں میں حیرت ابھری۔

”مطلب؟“

”میں نے وہیں رکھا ہوگا پاؤچ‘ سیمنٹ کچی تھی‘ وہ اس سے چپک گیا۔ بعد میں کسی نے اسے کھینچ کر اتارا تو موتی اندر ہی اٹکے رہ گئے۔ یہ پولیس کا کام نہیں ہو سکتا تھا‘ کسی مزدور نے کیا ہوگا اور پھر اس جگہ بجری ڈال دی۔ پاؤچ میں میرے پیسے تھے‘ ہیرے کی انگوٹھی تھی اور وہ کی چین تھی۔ پھر میں اس گھر کے ٹھیکے دار سے ملی‘ اسے بتایا کہ میں ایک وکیل ہوں اور ادھر میرا پرس گرا تھا۔ اس نے کہا کہ دس ہزار دوں تو پرس واپس لا دے گا۔ میں نے دے دیے۔“

”پھر؟“ ذکیہ بیگم دھیان سے سن رہی تھیں۔

”تین دن بعد میں دوبارہ گئی تو اس نے کہا کہ کسی مزدور نے اٹھایا تھا پرس اور اس نے وہ مجھے واپس کر دیا۔ اندر پیسے اور انگوٹھی ویسے ہی رکھی تھی۔ مگر سعدی کی کی چین نہیں تھی۔“

”مگر وہ کہاں گئی؟“

”مجھے نہیں پتا‘ مگر کیا فرق پڑتا ہے امی؟ جب سعدی نہیں رہا تو کیا فائدہ کسی دوسری چیز کا؟“ وہ گھٹنوں میں سر دیے کتنی دیر روتی رہی۔ پھر اس نے چہرہ اٹھایا۔ آنسو پونچھے۔

”کچھ دن میں‘ میں جاؤں گی ان سے ملنے۔ مگر ابھی نہیں۔ مجھے سنبھلنے میں کچھ وقت لگے گا۔“ مگر ذکیہ بیگم جانتی تھیں کہ چونکہ اس نے اپنے دل کا بوجھ ہلکا کر دیا ہے تو اب وہ جلد سنبھل جائے گی۔ وہ افسوس سے اسے دیکھے گئیں۔

نہ وہ بہادر تھی نہ بزدل۔
وہ ایک ماں تھی۔

☆ ☆ ☆

میرے ہونے کی خود کوئی توجیہہ کر
مجھ کو لگنے لگا ہے کہ بے سود ہوں!

رات گہری ہو رہی تھی۔ رمضان کے باعث بتیاں روشن تھیں۔ بڑے ابا لاؤنج میں وہیل چیئر پہ بیٹھے تھے اور صداقت ان کے پیر کے ناخن کاٹ رہا تھا۔

تب ہی دروازہ کھلا تو ابا نے گردن موڑ کر دیکھا۔ زمر اندر داخل ہو رہی تھی۔ فارس پیچھے تھا۔ دونوں کے چہروں پہ ایک ہم آہنگ سا اطمینان بکھرا تھا۔ نیاز بیگ کو گرفتار ہوئے دو گھنٹے ہی تو ہوئے تھے۔

”میں اپنے پرائیویٹ نمبر سے لوکل چینلز کو کال کرنے جا رہا ہوں‘ صبح تک شہزا ملک کیس کے ملزم کے پکڑے جانے کی خبر عام ہوگی۔ اے ایس پی کو اتنی شہرت اور ہائپ ملے گی کہ پھر وہ نیاز بیگ کو باہر نہیں آنے دے گا۔“

”اوکے۔“ زمر نے سر ہلایا۔

اور بڑے ابا نے صرف دور سے دیکھا کہ وہ دونوں سرگوشی میں بات کر رہے تھے۔ کوئی اطمینان سا تھا جو ان کے رگ و پے میں اتر تا گیا۔

صداقت فوراً۔ اٹھا۔ استری کے اسٹینڈ سے فارس کی قمیص اٹھا لایا۔

”فارس بھائی‘ یہ جل گئی۔“ قمیص سامنے کی۔ شرمندگی سے سر بھی جھکایا۔

زمر نے چونک کر قمیص کو دیکھا‘ اس کی تیوری چڑھی‘ پھر ذرا تھمی‘ ’فوراً‘ ہی فارس کو دیکھا۔ (یہ ابھی صداقت کو ڈانٹے تو سہی! میں اس کو.....)

”وہ بلیک والی پریس کر دو پھر۔“ فارس نے بس ایک نظر اس قمیص کو دیکھا‘ اور سیڑھیوں کی طرف بڑھ گیا۔ زمر کے لب ذرا کھل گئے۔ قدرے تعجب سے اس نے فارس کو جاتے دیکھا۔

”اس نے کچھ بھی نہیں کہا؟“

صداقت نے بہت تسلی آمیز انداز میں ہاتھ جھاڑے۔ ”پچھلے ہفتے بھی ایک جلائی تھی‘ تب بھی کچھ نہیں کہا تھا۔“

زمر کھول کر اس کی طرف مڑی۔ اگلے دس منٹ تک صداقت نے سر جھکا کر اس کی صلواتیں سنیں جن میں مسلسل ”صداقت آپ کا دھیان کہاں ہوتا

ہے؟ آپ یہ اور آپ وہ۔" کی تکرار تھی۔ اور اوپر چڑھتے فارس نے سر جھٹکا تھا۔ (ملازم آپ ہے' اور شوہر تم ہے! یہ عورت کبھی سیدھی نہیں ہوگی)

چند منٹ بعد' زمر کے کمرے کی بتی بجھی تھی اور وہ بستر پہ لیٹی تھی۔ (فارس کمرے میں نہیں تھا۔) کھلی آنکھوں سے چھت کو دیکھتے' اس کے سامنے ایک منظر فلم کی طرح چل رہا تھا۔ چار سال پہلے۔۔۔ آفس میں بیٹھی زمر اور سامنے بیٹھے بصیرت صاحب' وہ اس سے پوچھ رہے تھے۔

"فارس غازی کی گاڑی سے پولیس نے وہ رسّی ری کور کی ہے' جس کے ذریعے وارث غازی کا گلا گھونٹا گیا تھا۔"

"جی' فارس آیا تھا میرے پاس' اس نے کہا کہ اسے سیٹ اپ کیا گیا ہے۔" وہ فائل پہ لکھتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

"زمر صاحبہ' یہ فارس کیسا آدمی ہے؟ مطلب کہ ایک ایوریج مجرم تو ایسے ثبوت گاڑی میں چھوڑ سکتا ہے' ہم روز ایسے بیسیوں کیسز دیکھتے ہیں مگر ایک کرمنلی اسمارٹ آدمی ایسا نہیں کر سکتا۔"

زمر پین لبوں پہ رکھے کچھ دیر سوچ گئی۔ "سچ بتاؤں تو میں اس کو نہیں جانتی۔ کچھ مہینے مجھ سے پڑھا ہے اس نے' پھر بس کبھی سرِ راہ ملاقات ہو گئی تو ہو گئی۔ کم گو ہے' ہاں اگر بولے تو نپی تلی بات کرتا ہے۔ سمجھ دار لگتا ہے مجھے' ذرا غصے کا تیز ہے' مگر۔۔۔ کرمنلی اسمارٹ ہے یا نہیں' ایسی باتیں تو کسی کے ساتھ رہ کر ہی پتا چل سکتی ہیں۔ اس لیے میں کچھ کہہ نہیں سکتی۔ ویسے ایک ایجنسی میں اچھی پوسٹ پہ ہے' ایسے ہی تو نہیں گیا ہو گا نا۔"

"میڈم ایجنسیز میں تو ہر طرح کے لوگ ہوتے ہیں' فزیکل فٹنس بھی میٹر کرتی ہے' شخصیت بھی میٹر کرتی ہے' سب بہترین اور اسمارٹ نہیں ہوتے۔"

یہ زمر اور زرتاشہ کو گولی لگنے سے پہلے کی گفتگو تھی جو آج رات ویسے ہی اس کی سماعتوں میں گونجنے لگی۔ (میں ایک مہینے سے اس کے ساتھ رہ رہی ہوں۔

سعدی کو کھوئے ایک مہینہ ہو گیا اور یہ۔۔۔) اس نے گردن موڑ کر ٹیرس کی طرف دیکھا جہاں وہ بیٹھا تھا۔ (اس نے مجھے مایوس نہیں کیا۔ کتنی احتیاط سے ہر شے کا۔ ایک ایک چیز کا خیال رکھا۔ تو پھر یہ اپنے بھائی کو مار کر ثبوت گاڑی میں کیوں چھوڑے گا؟ پہلے تو تم اس کو نہیں جانتی تھیں' مگر اب جاننے لگی ہو' تو کیا ہے جو تمہیں کھٹکنے لگا ہے زمر؟) وہ سوچتی رہی۔

فارس اور زمر کے کمرے اور ندرت اور حنین کے کمرے کا ٹیرس مشترکہ تھا۔ وہاں ایک کین کا صوفہ بچھا تھا۔ فارس اس پہ بیٹھا تھا اور پاؤں لمبے کر کے ریلنگ پہ رکھے تھے۔ سامنے ہاشم کے کمرے کی بالکونی پہ نگاہیں جمائے وہ کچھ سوچے جا رہا تھا۔

"آپ ادھر کیوں بیٹھے ہیں؟" حنہ ساتھ آکر بیٹھی تو وہ چونکا۔ پھر ٹیک لگائے رکھے' بس گردن موڑ کر اسے دیکھا۔ وہ موبائل ہاتھ میں لیے' کھلے بالوں میں ہیئر بینڈ لگائے' ساتھ آ بیٹھی تھی۔

"یونہی۔"

"پھپھو نے کمرے سے نکال دیا؟" حنہ نے آنکھیں اس پہ جمائے' سنجیدگی سے پوچھا۔ فارس نے "اف" کہہ کر چہرہ واپس سامنے کر لیا۔

"یہ ہاں والا "اف" تھا یا "میری ذاتیات میں مداخلت نہ کرو" والا اف تھا؟"

"ایسا کچھ نہیں ہے۔ وہ سو رہی ہے۔ مجھے نیند نہیں آ رہی تھی۔"

"مجھے بھی نہیں آ رہی۔" اس نے ایک مایوس نگاہ سیل فون پہ ڈالی۔ (ہاشم کو کتنی دیر ہوئی' ٹیکسٹ کیا تھا' مگر کوئی جواب نہیں۔ سامنے اس کے کمرے کی بتی بھی بجھی تھی۔ گھر میں نہیں تھا شاید) اور گھٹنے ملائے ٹیک لگائے پیچھے ہو کر بیٹھی رہی۔

"سعدی اس وقت کیا کر رہا ہو گا حنین؟" وہ دور آسمان کو دیکھ رہا تھا۔ چہرے سے تھکا تھکا لگتا تھا۔ حنہ کی آنکھوں میں اداسی بھر گئی۔ اس نے اپنا سر فارس کے کندھے پہ رکھ دیا۔

"میں یہ نہیں سوچنا چاہتی۔ میرا دم گھٹتا ہے۔ وہ

کہیں کسی جگہ محبوس ہوں گے اور ان کے مجرم آزاد گھوم رہے ہیں۔"

"اونہوں۔" فارس نے گردن دائیں بائیں ہلائی۔ "اب ان میں سے کوئی آزاد نہیں گھومے گا۔ جب تک میں زندہ ہوں، نہیں!"

"مجھے نہیں آتا اب کسی بات پہ یقین!"

اس نے بازو حنہ کے کندھوں کے گرد حمائل کر اس کے بال تھپکے اور نگاہیں دور آسمان پہ جمائے کہنے لگا۔ "حنہ! کیا ہم لوگ تمہارے کچھ نہیں ہیں؟ کیا سعدی کے جانے سے تم ہم سے بھی الگ تھلگ رہا کرو گی؟"

وہ شرمندہ ہو گئی۔ "ایسی بات نہیں ہے۔"

"پھر تم زمر سے ایسے بات کیوں کرتی ہو؟"

"آئی رئیلی ہیٹ ہر۔" خفگی سے قصر کو دیکھتی، وہ کہہ رہی تھی۔

"اونہوں۔ تم اس سے نفرت نہیں کرتیں۔ تم اس سے ناراض ہو۔"

حنین ناراضی سے منہ میں کچھ بڑبڑائی۔

"تم سارا وقت کمرے میں کیوں بند رہتی ہو؟ ہمارے ساتھ کیوں نہیں بیٹھتیں؟" وہ نرمی سے پوچھ رہا تھا۔

"میں ایک ناکام انسان ہوں۔ میرے اندر بہت سارا شر ہے۔ میں جب بھی کسی چیز میں ہاتھ ڈالوں گی، اسے بگاڑ دوں گی۔"

"مگر تم وہ تو کر سکتی ہو جو زمر نے تمہیں کہا ہے۔ یہ انتقام اور انصاف کا واحد طریقہ ہے۔"

"میں ان کے حکم کی غلام نہیں ہوں آپ کی طرح۔" اس نے خفگی سے فارس کے کندھے سے سر ہٹایا اور آگے ہو کر بیٹھی۔ "بھائی کہتا تھا انتقام کے لیے چیونٹیاں بن کر کام کرنا پڑتا ہے۔ ایک فیملی بن کر۔ ایسے نہیں ماموں کہ وہ جب چاہیں، مجھے آرڈر دے کر چلی جائیں۔ میری فیلنگز کا خیال رکھے بغیر۔ وہ کون ہوتی ہیں مجھے آرڈر کرنے والی؟" وہ چند لمحے خاموشی سے اسے دیکھتا رہا۔

"تمہارے بھائی نے تمہیں یہ نہیں بتایا کہ چیونٹیوں کی ایک ملکہ بھی ہوتی ہے؟"

ایک ثانیے کو ساری فضا ساکن ہو گئی۔ حنین بالکل ٹھہر گئی۔ وہ گردن تلے اب بازوؤں کا تکیہ بنائے نیم دراز، پرسکون سا اسے دیکھ رہا تھا۔ ایک پل کو حنہ کا دل نرم موم ہونے لگا، مگر پھر اس نے گردن اکڑائی۔ (سامنے ہاشم کے کمرے کی بتی جلی تھی)

"وہ میری ملکہ نہیں ہو سکتیں۔ کبھی بھی نہیں۔ آپ مانیں ان کا حکم۔"

"تمہیں لگتا ہے میں اس کے حکم پہ چلتا ہوں؟"

"کیا میں دیکھ نہیں رہی؟ آپ وہی کر رہے ہیں جو وہ حکم دے کر چلی جاتی ہیں۔"

وہ ہولے سے ہنس دیا۔ حنہ کو اس کا ہنسنا اچھا لگا۔ کتنے عرصے بعد اس نے فارس کو ہنستے دیکھا تھا۔

"یہ جو تمہاری پھپھو جیسی عورتیں ہوتی ہیں نا، ان کو بہت تکنیک سے قابو کرنا پڑتا ہے اور میں وہی کر رہا ہوں۔"

حنہ نے مشکوک نظروں سے اسے دیکھا۔

"مطلب؟"

"مطلب کہ پہلے انہیں یہ یقین دلایا جاتا ہے کہ وہ ایک ملکہ ہیں، ہر فیصلہ ان ہی کا مانا جائے گا اور آپ صرف ان کی مدد کے لیے ہیں۔ پھر جب وہ آپ کی عادی ہو جائیں تو کنٹرول ان کے ہاتھ سے آہستہ آہستہ لے لیا جاتا ہے۔" وہ تکان سے مسکرایا۔

حنہ کے اندر کی ددھیالی محبت جاگنے لگی اور وہ خفگی سے اس کو سخت سنانے لگی تھی مگر تب ہی موبائل وائبریٹ ہوا۔ (آہ) وہ اسے شب بخیر کہتی اٹھ گئی، پھر جاتے جاتے مڑی۔ "مجھے موبائل لینا ہے، میرا اپنا فون۔ آپ لا دیں گے؟ مگر پیسے امی دیں گی۔"

"ہاں، ایک فون خریدنے سے میں تو غریب ہو جاؤں گا۔"

"نہیں، پلیز! صبح امی آپ کو پیسے دے دیں گی، آپ لے لینا، ورنہ وہ ناراض ہوں گی۔"

"اپنی امی سے کہو، اتنا۔۔۔" وہ رک گیا۔ سر جھٹکا۔

"اچھا صبح بات کرتے ہیں۔"
"شب بخیر ماموں۔" ہلکا سا مسکرا کر کہا تو وہ جواب دے کر پھر سے سامنے دیکھنے لگا۔

☆ ☆ ☆

وہ جس کو بھلانے میں کئی سال لگے تھے
اک لمحۂ غفلت میں در آیا وہی لمحہ!

حنہ کمرے میں آئی۔ امی کروٹ کے بل لیٹی تھیں۔ وہ فوراً" اپنے بستر پہ آئی اور موبائل کھولا۔ "ہاشم" اس کی آنکھیں جگمگا اٹھیں۔ سارے دن کی تھکن اتر گئی۔
"کہاں تھے آپ سارا دن؟"
"لڑکی! میں مصروف ہوتا ہوں۔" مسکراتی اسمائلی۔ "تم سناؤ کیا کیا آج؟"
"کچھ نہیں۔ بھائی یاد آتا رہا۔ ابھی ماموں کے ساتھ ٹیرس پہ بیٹھی تھی۔" وہ کروٹ کے بل لیٹی' اندھیرے میں چمکتی اسکرین کو دیکھتی' لکھتی جا رہی تھی۔
"ہوں۔ کیا باتیں ہو رہی تھیں ماموں سے؟" ہاشم اپنے کمرے میں ٹائی ڈھیلی کرتے ہوئے' ایک ہاتھ سے موبائل پہ ٹائپ کرتا جا رہا تھا۔ وہ دو' تین لوگوں کو ایک ہی وقت میں جواب دے رہا تھا۔
"وہ چاہتے ہیں ہمیں زمر کے کہنے پہ بھائی کا لیپ ٹاپ کھول دوں۔ مگر مجھ سے اب یہ کام نہیں ہوتے۔ جب بھائی کے کہنے پہ نہیں کیا تو زمر کے لیے کیوں کروں؟"
"سعدی نے کیا کہا تھا؟"
"ان کی کچھ فائلز کرپٹ ہو گئی تھیں۔ مجھے کہا کہ کھول دو' میں نے نہیں کھول کر دیں۔ دل ہی نہیں کرتا تھا۔ پتا نہیں' صحیح کیا یا غلط۔"
ہاشم نے "اکس اوکے" لکھ کر سینڈ کیا' کوٹ اتارا' گردن کی پشت کو ہاتھ سے دبا کر جیسے پٹھوں کو سکون پہنچایا۔ موبائل بستر پہ رکھا اور باتھ روم تک آیا۔ ٹب میں نل کھولا۔ پانی کی دھار گرنے لگی۔ اس نے ہاتھ سالٹس کا جار اٹھایا ہی تھا کہ یک دم رکا۔ ساری دنیا ساکت ہو گئی۔ پانی' جار' سب چھوڑ کر وہ تیزی سے واپس آیا اور فون اٹھایا۔
"کون سی فائلز کرپٹ ہو گئی تھیں؟" حنہ کے اگلے چار پانچ پیغام پڑھے بغیر ٹیکسٹ کیا۔ اس کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔
"بھائی کی کوئی آفس فائلز تھیں۔"
"وہ جو یو ایس بی میں تھیں؟" اس نے روشنی میں تیر چلایا۔ سامنے کی بات تھی۔
"جی۔۔۔! آپ کو کیسے پتا؟"
"ارے وہ سعدی نے تمہیں دیں؟ میں کب سے انہیں ڈھونڈ رہا تھا۔ وہ میں نے دی تھیں سعدی کو' مجھ سے کھل نہیں رہی تھیں' اب کہاں ہے وہ فلیش؟"
ادھر اس کے قدموں تلے سے زمین نکل رہی تھی۔
"میرے پاس ہے۔ سامان میں ہی پڑی ہے کہیں۔"
"تم مجھے ابھی لا کے دے سکتی ہو؟ بس دو منٹ کے لیے آؤ اور مجھے بالکونی میں پکڑا کر چلی جاؤ۔"
"ماموں ٹیرس پہ بیٹھے ہیں' مجھے شوٹ نہ کر دیں۔"
یہ لکھتے کے ساتھ ہی اس کا دل خراب ہوا۔ (اگر ماموں کو پتا چلا کہ میں ہاشم بھائی سے اس وقت بات کر رہی ہوں تو وہ کیا سوچیں گے؟)
"اچھا۔" ہاشم رکا۔ "مجھے وہ کل ہی چاہئیں' صبح دے جاؤ گی فلیش؟"
"او کے۔"
"تم نے اسے کھول کر دیکھا؟ فائلز ری کور کیں یا نہیں؟"
"نہیں۔ میں نے ہاتھ ہی نہیں لگایا۔ صبح لا دوں گی۔" وہ لکھتی جا رہی تھی۔ جب۔۔۔
"حنین۔۔۔ کس سے بات کر رہی ہو؟" امی نے اس طرف کروٹ لی' موبائل کی روشنی دیکھی تو اسے پکارا۔ حنین کا سانس رک گیا۔
"وہ۔۔۔ گیم کھیل رہی ہوں۔" ساتھ ہی جلدی جلدی "مجھے جانا ہے' بائے" لکھ کر وائی فائی آف کیا۔

"یہ ٹائم ہے فون استعمال کرنے کا؟ رکھو اور سو جاؤ۔ سحری کے لیے پھر اٹھتے وقت موت پڑتی ہے تم سب کو۔ اب نہ دیکھوں میں تمہارے ہاتھ میں موبائل۔" سختی سے اسے ڈپٹا تو وہ جلدی جلدی سارے میسج مٹاتی، فون بند کر کے چت لیٹ گئی۔ آنکھیں زور سے میچ لیں۔ "اف۔"

اگلی صبح آفس جانے سے پہلے، ہاشم سوٹ میں ملبوس، مکمل تیار، اپنی بالکونی کی سیڑھیاں اتر کر انیکسی تک آیا۔ (تسلی کر لی کہ فارس کی کار نہیں کھڑی۔) اور دروازہ کھٹکھٹایا۔ صداقت نے کھولا تو اندر کا منظر بھی کھلتا چلا گیا۔ زمر پرس میں کاغذ اڑستی، تیار سی، دروازے کی طرف آرہی تھی۔ پیچھے ندرت میز سے برتن اٹھا رہی تھیں۔ بڑے ابا بھی سامنے بیٹھے نظر آئے۔ اسے دیکھ کر سب رک گئے۔ وہ ہشاش بشاش سا مسکرایا۔

"گڈ مارننگ۔ صبح صبح آپ کو تنگ کیا۔ حنین کے پاس میری ایک فلیش تھی، وہ لینے آیا تھا۔" ندرت نے اسے اندر بلایا اور خود حنہ کو بلانے اوپر گئیں۔

"کون سی فلیش؟" زمر نے اچنبھے سے اسے دیکھا۔

"میں نے سعدی کو کچھ فائلز دی تھیں کھولنے کے لیے، مجھ سے کھل نہیں رہی تھیں۔ اس نے کہا کھول دے گا، مگر وہ کرپٹ ہو گئیں شاید۔"

تب ہی حنین اوپر سے آتی دکھائی دی۔ نیند اسا چہرہ جس پہ دو چھینٹے مارے تھے۔ آنکھوں میں اسے دیکھ کر نراہٹ آگئی۔

"ہاشم بھائی!"

"حنین بچے! میری فائلز دی تھیں سعدی نے تمہیں۔" کن اکھیوں سے دیکھا۔ زمر آنکھیں سیکڑ کر اس کو دیکھ رہی تھی۔

"جی میں لاتی ہوں۔" وہ تہ خانے کی طرف جانے لگی۔

مگر زمر نے اسے اشارہ کیا کہ ذرا تھمے۔ پھر ہاشم کی طرف مڑی۔

"کیا کلر تھا اس فلیش ڈرائیو کا؟"

"سوری؟" ہاشم نے نا سمجھی سے اسے دیکھا۔

"مطلب، کس رنگ کا کور تھا اس یو ایس بی کا؟ حنہ کیسے ڈھونڈے گی اتنی ساری فلیش ڈرائیوز میں اگر اسے کلر ہی نہ پتا ہو تو؟" بڑے رسان سے بتایا۔ ہاشم کا دل چاہا، زمر کی گردن مروڑ دے مگر اس کے کچھ کہنے سے پہلے ہی حنہ بول اٹھی۔

"وہ بلیک کلر کی ہے۔ پھپھو، مجھے پتا ہے وہ کون سی ہے، میں ابھی لاتی ہوں۔" ساتھ ہی خفگی سے زمر کو دیکھا جو ایک دم کلس کر رہ گئی تھی۔ وہ حنین کو روکنا چاہتی تھی مگر حنین اگلے ہی منٹ ایک سیاہ یو ایس بی لے آئی اور اسے ہاشم کی طرف بڑھایا۔

"یہ لیں۔" ہاشم مسکرا کر شکریہ کہتا، زمر پہ جتاتی نظر ڈال کر باہر نکل گیا۔

اپنے کمرے میں واپس آکر اس نے جلدی سے اسے لیپ ٹاپ میں لگایا۔ اندر ایک ہی فولڈر تھا اور وہ لاکڈ تھا۔ لمبی لمبی اصطلاحات، نمبرز۔ اس کو کھولنے کی ضرورت نہ تھی۔ اس نے یو ایس بی نکالی اور نیچے کچن میں آیا۔ کیبنٹ سے سل کا پتھر نکالا۔ اور اسے زور زور سے فلیش پہ مارا یہاں تک کہ وہ بالکل پچک کر رہ گئی۔ پھر اس نے اسے کوڑے دان میں پھینکا اور ہاتھ دھو کر واپس اوپر چلا آیا۔

ہر ثبوت مٹ گیا تھا۔ اب آج سے ایک نئے دن کا آغاز ہوگا۔ معصوم لڑکی، اسے اس لڑکی سے ہمدردی ہوئی۔

✡ ✡ ✡

سزا کے طور پہ ہم کو ملا قفس جالب
بہت تھا شوق ہمیں آشیاں بنانے کا

ان سب سے دور، اسپتال کے اس کمرے کی ساری بتیاں روشن تھیں۔ وہ بستر پہ لیٹا تھا اور میری اس کے بازوؤں کے اسٹریپ کھول رہی تھی۔

"مجھے دہرانے کی ضرورت نہیں ہے مگر تم جانتے ہو اگر تم باتھ روم سے پانچ منٹ کے اندر نہ نکلے تو مجھے باہر کھڑے گارڈ کو بلانا پڑے گا۔" وہ اٹھ کر بیٹھا، پاؤں

زمین پہ رکھے' (آہ) تکلیف ہوئی۔ آنکھیں کرب سے بھینچیں۔ میری نے سہارا دینے کو اس کو شانے سے تھامنا چاہا' اس نے جھٹکے سے بازو چھڑایا اور آگے بڑھ گیا۔ لڑکھڑاتے قدموں سے چلتا وہ باتھ روم تک آیا۔

دیوار کا سہارا لیتے وہ (آہ) درد سے لب بھینچتا' سنک تک آیا۔ بیسن کو دونوں ہاتھوں سے تھامے اس نے چہرہ اٹھا کر آئینے میں دیکھا۔

ہونٹوں کا زخم بھر چکا تھا۔ چہرے کے نیل رنگ بدل چکے تھے مگر گال اور پیشانی کا زخم ویسا ہی تھا۔ گردن کی چوٹیں کم نظر آرہی تھیں۔

"میں نے کبھی ایسے مارا تھا تمہیں نوشیرواں۔ جو تم نے میرے ساتھ یہ کیا؟" نل کھولا اور پانی دونوں ہاتھوں میں بھر کر چہرے پہ انڈیلا۔ "وہ لڑکی جس کے منگیتر نے تمہیں یونیورسٹی میں پیٹا تھا' کبھی اس کو تو پلٹ کر مارنے کی ہمت نہیں ہوئی تمہیں۔ یہ انتقام نہیں تھا نوشیرواں' یہ حسد تھا۔"

سرخ آنکھوں سے آئینے میں دیکھتے وہ بڑبڑایا۔ "میں بھی کچھ نہیں بھولا۔ تم میں سے ہر ایک کو حساب دینا ہوگا۔" چہرے سے پانی کی بوندیں ٹپک رہی تھیں اور وہ سوچ رہا تھا۔ ان دنوں وہ سارا دن سوچتا رہتا تھا۔ بس ایک دفعہ میں یہاں سے نکل جاؤں۔ ایک نظر اپنی زخمی ٹانگ پہ ڈالی' دوسری پیٹ پہ۔ جہاں قمیص کے اندر پٹی بندھی تھی۔ یہ دونوں زخم روز روز بہتر ہو رہے تھے۔ صرف یہ کندھے والا بار بار خراب ہو جاتا۔

"میں کہاں ہوں؟ اپنے گھر سے کتنی دور؟" اس کا دماغ بھٹکنے لگا' یک دم وہ چونکا۔ گردن گھمائی۔ کمرے میں تو کوئی کھڑکی نہ تھی مگر شاور کے اوپر ایک ننھا سا روشن دان تھا۔ ایک فٹ اونچا' دو فٹ چوڑا۔ پیچھے شیشہ تھا اور آگے سلاخیں۔ شیشے کے اوپر سیاہ پینٹ کر کے باہر کے منظر کو دھندلا کر دیا گیا تھا۔ ویسے بھی اس روشن دان سے آدمی کیا' بازو بھی نہ گزر سکتا۔ اس لیے روز اس کو دیکھ کر وہ مایوس ہو جاتا تھا' مگر آج..... بہتر ہوتی صحت نے ذہنی حالت بھی بہتر کر دی تھی۔ سعدی نے ادھر ادھر نظر دوڑائی۔ صابن' شیمپو' ٹشو پیپر..... اس کے علاوہ کچھ نہ تھا اس باتھ روم میں۔

مگر اس نے زندگی سے یہ سیکھا تھا کچھ نہ ہو' تب بھی کچھ نہ کچھ تو ضرور ہوتا ہے۔

وہ تولیے کے اسٹینڈ تک آیا۔ تولیہ اتارا اور اسٹیل کا راڈ باہر کو کھینچا۔ ذرا سا زور' اور راڈ ہاتھ میں آگیا۔ اب وہ شاور تک آیا۔ گردن اٹھا کر اونچائی جانچی۔ اتنی اونچی نہیں تھی چھت۔ سلیپرز سے پیر نکالے اور ایک ہاتھ سے شاور کی ٹلی پکڑے اس نے نچلے نل پہ پیر رکھا۔ (آہ) زخم گویا ادھڑنے لگے۔ درد سے دانت سختی سے جمائے۔ کراہ روکی۔ اوپر چڑھا۔ دوسرا پیر گرم پانی کے نل پہ رکھا اور ہاتھ لمبا کیا۔ راڈ روشن دان کی سلاخوں کو چھونے لگا۔ سلاخوں کے پیچھے شیشے کا پٹ بند تھا اور اس کے کنڈے میں تالا سا لگا تھا۔ تالا نہیں توڑ سکتا تھا وہ' مگر.....

پوری قوت سے اس نے راڈ کا سرا شیشہ میں مارا۔ ایک' دو' تین.....

دروازہ زور زور سے دھڑ دھڑایا جانے لگا۔ میری کی غصے سے بھری آواز۔ پھر گارڈز کی دھاڑ۔ وہ کچھ سنے' سوچے بغیر' بار بار راڈ شیشے پہ مار رہا تھا۔ کندھے کا زخم ادھڑنے لگا تھا۔ درد بڑھ گیا۔ وہ مزید ضربیں لگاتا گیا۔ قوت پوری نہ لگا سکنے کے باعث ضرب زور کی نہ لگتی' اور کوشش بے اثر رہتی۔ کندھے سے خون رسنے لگا۔

اور تب ہی چھناکا ہوا۔ شیشے میں درمیان سے سوراخ۔ سعدی نے راڈ پھینکا۔ ایک ہاتھ دیوار پہ رکھے' دوسرے سے کانچ کے ٹکڑے نکالے۔ ذرا سا روزن بنا۔

دروازے کا تالا ٹوٹا۔ دو آدمی اندر داخل ہوئے۔ وہ غصے میں اسے گالیاں دے رہے تھے۔

سعدی نے ایک نظر باہر چلچلاتی دھوپ کے منظر پہ ڈالی۔ وہ عمارت کی غالباً "سب سے اوپر کی منزل پہ تھا" اس لیے..... یہاں سے گویا پورا شہر نظر آتا تھا..... پھر اس کا دل ڈوبنے لگا۔ آنکھوں میں وحشت اور حیرت اتر آئی۔

نیچے ایک گارڈ نے وہی راڈ اس کی ران کے زخم پہ ماری۔ اس کے منہ سے دبی دبی سی چیخ نکلی۔ وہ گرنے لگا تب ہی دوسرے نے کھینچ کر اسے نیچے اتارا۔ ہاتھ میں کانچ لگنے سے خون بہہ رہا تھا اور کندھے سے خون ہنوز رس رہا تھا۔ وہ نیم تنیم سے گارڈز اسے گھسیٹتے ہوئے واپس لائے اور بیڈ پہ پٹخا، پھر سے اس کے بازو باندھنے لگے اور اس دوران وہ بستر پہ گرا، درد سے کراہتے ہوئے اونچا اونچا پوچھ رہا تھا۔

"میں کہاں ہوں؟ یہ کون سا شہر ہے؟ کوئی مجھے کچھ بتاتا کیوں نہیں ہے؟" کرب کی شدت سے اس نے آنکھیں بند کرلیں۔ میری نے ان گارڈز کو ڈاکٹر کو لانے بھیج دیا اور خود اس کے سرہانے آکھڑی ہوئی۔

"میں نے کہا تھا تمہیں کہ دیر مت لگانا۔" سختی سے وہ بولی تھی۔ سعدی نے گیلی آنکھیں کھول کر اسے دیکھا۔

"یہ کون سا شہر ہے؟ یہ میرا شہر نہیں ہے۔ مجھے پتا ہے۔"

"یہ پوچھو کہ یہ کون سا ملک ہے۔"

اور اس کے الفاظ پہ سعدی ذوالفقار یوسف خان کا پورا وجود سن ہو گیا۔ یک ٹک وہ میری کو دیکھے گیا۔

"بھاگنے کی کوشش بے کار ہے سعدی! کیونکہ یہ انڈیا ہے اور یہاں تم بغیر پاسپورٹ کے لائے گئے ہو۔ جس دن تم اس قید سے نکلو گے، تم ایک پاکستانی جاسوس کی طرح انڈیا کی گلیوں میں یونہی چھپتے پھرو گے اور وہ جلد یا بدیر تمہیں ڈھونڈ کر... خیر، تجھے بتانے کی ضرورت نہیں کہ بھارت میں ایک غیر قانونی طور پہ آئے ہوئے پاکستانی وہ بھی جونسکام کا سائنس دان ہو، اس کے ساتھ کیا ہو سکتا ہے۔ اس لیے دوبارہ یہ کوشش مت کرنا۔ یہ قید، بھارتیوں کی قید سے بہتر ہے۔" درشتی سے کہتی وہ واپس کاؤچ پہ جا بیٹھی اور سعدی بالکل سن سا رہ گیا۔

☼ ☼ ☼

تم سے پہلے وہ جو اک شخص یہاں تخت نشین تھا
اس کو بھی اپنے خدا ہونے پر اتنا ہی یقین تھا

ہاشم کے آفس کے اندر ماحول میں وہی تناؤ تھا جو "دی سعدی یوسف" کے ذکر پہ چھا جاتا تھا۔ ہاشم کی کرسی خالی تھی، کوٹ اس پہ لٹکا تھا، اور خود وہ آستین موڑے، ادھر ادھر ٹہل رہا تھا۔ میز کے سامنے کرسی پہ شیرو بیٹھا ہاتھوں میں ڈیکوریال گھما رہا تھا۔ خاور قریب میں ہاتھ باندھے کھڑا کہہ رہا تھا۔

"زیادہ بڑا مسئلہ نہیں ہے۔ نیاز بیگ نے اے ایس پی کی کزن کے ساتھ زیادتی کی ہے۔ اے ایس پی اس کو چھوڑنے پہ راضی نہیں، اور وہ اسے بلیک میل کر رہا ہے کہ وہ سعدی کے خاندان کو ساری حقیقت بتادے گا۔"

ہاشم ٹہلتے ٹہلتے رکا، غصے سے خاور کو دیکھا۔

"سارے شہر میں ایک یہی کرائے کا آدمی ملا تھا تمہیں، جو اے ایس پی کا دشمن نکلے؟"

"اسے ایس پی نے پیش کیا تھا سر۔ اس رات وقت کم تھا، اسے نہیں معلوم تھا کہ وہ اس کی کزن کا مجرم نکلے گا۔ اب معاملہ اس کے خاندان کا ہے۔"

"اور اگر جو اس نیاز بیگ نے کچھ بک دیا تو؟"

"وہ ہمیں جانتا ہے، نہ اے ایس پی کو ہمارا پتا ہے۔ میں درمیان والے فرد سے کہہ رہا ہوں کہ اے ایس پی سے کہے، نیاز بیگ پہ ہلکا ہاتھ رکھے مگر سرِ ہائی پروفائل کیس ہے۔ وہ لڑکی سعدی یوسف جیسے خاندان کی نہیں تھی۔ اس کا خاندان بارسوخ ہے۔ مگر بالفرض وہ کچھ بول بھی دیتا ہے تو بھی ہمارا ذکر نہیں آئے گا۔"

"رکو...!" وہ چونکا۔ "اس میں فارس یا زمر کا ہاتھ تو نہیں؟"

"ان کا کیا تعلق ہو سکتا ہے۔" خاور کو تعجب ہوا۔ "یہ کوئی الزام نہیں ہے۔ نیاز بیگ ہسپتال جا کر اس لڑکی کا کام تمام کرنا چاہتا تھا۔ پولیس نے اسے رنگے ہاتھوں پکڑا ہے۔ اور یہ کیس سعدی والے واقعے سے بھی پہلے کا ہے۔"

"اگر اس میں ان دونوں کا ہاتھ نہیں ہے تو وہ ایک مہینے سے کر کیا رہے ہیں؟ میں نہیں مان سکتا کہ وہ ہاتھ

پہ ہاتھ دھرے بیٹھے ہیں۔" ہاشم نفی میں سر ہلا رہا تھا۔

"سر! میں ان پہ نظر رکھے ہوئے ہوں۔ وہ اس کے لیے بھاگ دوڑ کر رہے ہیں۔ مگر وہ سعدی کو ڈھونڈ رہے ہیں' اس کے حملہ آوروں کو نہیں۔ وہ روز مختلف ہسپتالوں' مردہ خانوں' سعدی کے جاننے والے دوستوں اور ہر اس جگہ جاتے ہیں جہاں سے اس کا کوئی سراغ مل سکے۔ وہ واقعی فارغ نہیں بیٹھے' مگر وہ ہم تک نہیں پہنچ سکتے۔" خاور جو کہہ رہا تھا وہ درست تھا۔ وہ ان پہ ہلکی پھلکی نظر رکھے ہوئے تھا مگر اس کو یہ نہیں معلوم تھا کہ اس کی تلاش کی تگ و دو میں' وہ درحقیقت کیا کر رہے تھے۔

"میرا دل نہیں مانتا کیا ان کو کسی سے بدلہ نہیں لینا؟ یہ ان کا طریقہ نہیں ہے۔"

"سر! ان کے خیال میں سعدی زندہ ہے' ان کا کہنا ہے ایک دفعہ وہ مل جائے' پھر ہم ہر ایک کو دیکھ لیں گے۔"

نوشیرواں نے بےزاری سے سر جھٹکا (ہونہہ)

"سر! آپ کہیں تو میں باقاعدہ ان کا چوبیس گھنٹے تعاقب کروایا کروں؟ ان کے فونز بگ کر لیتے ہیں' یوں ان کی ہر حرکت پہ نظر رہے گی۔"

"ابھی نہیں۔ ذرا ٹھہر کر دیکھو۔ ان کو شک نہیں ہونا چاہیے کہ سعدی کے واقعے میں کوئی ہائی پروفائل شخص ملوث ہے۔" وہ ہے کو ذہن سے جھٹک کر وہ واپس کرسی پہ آ بیٹھا۔ خاور نے بھی سامنے والی کرسی کھینچی۔ شیرو اب موبائل پہ بٹن دبا رہا تھا۔ (زندگی سے کبھی سعدی نکلے گا بھی یا نہیں؟)

"اے ایس پی نیاز بیگ کو سنبھال لے گا' فکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ مگر سر' وہ ڈاکٹر مزید رقم مانگ رہا ہے۔"

ہاشم کے ابرو بھنچے۔ چہرے پہ ناگواری پھیلی "کیا مطلب مزید رقم مانگ رہا ہے؟ اس کو اتنا کچھ دیا ہے اور کیا چاہیے اس کو؟"

"اسے اپنے پرائیوٹ ہسپتال کی بلڈنگ مکمل کرنی ہے' بس آخری ٹچز ہیں' دو تین ماہ میں ہسپتال کا افتتاح کرنا چاہتا ہے۔ اس کو اندازہ ہے کہ اے ایس پی کسی بڑے آدمی کے لیے کام کر رہا ہے' اس لیے وہ بھی بلیک میلنگ پہ اتر آیا ہے۔"

"اف!" ہاشم نے پیشانی مسلی' پھر شیرو پہ نگاہ پڑی جو ٹھک ٹھک ٹائپ کیے جا رہا تھا۔

"دیکھ رہے ہو' کس مصیبت میں ڈال دیا ہے تم نے مجھے۔"

شیرو نے بگڑ کر سر اٹھایا۔ "مصیبت کو ہسپتال میں ہی ختم کر دینا چاہیے تھا آپ کو۔ خوامخواہ اسے بچایا۔"

خاور نے تائیدی انداز میں گہری سانس لی "نوشیرواں صاحب ٹھیک کہہ رہے ہیں۔"

ہاشم نے ہاتھ جھلایا "بکومت' ہر وقت دوسروں کا خون بہانے کی بات مت کیا کرو۔"

خاور چند لمحے کے لیے بالکل چپ ہو گیا' پھر وہ آہستہ مگر مضبوط آواز میں بولا۔ "میرے تین بیٹے تھے سر' جب ایجنسی والوں نے مجھ پہ الزام لگایا ان جرائم کا جو میں نے نہیں کیے تھے اور میں نے ان کو ماننے سے انکار کر دیا تو اس بریگیڈیر نے اپنے آدمی بھیجے اور میرے بڑے دونوں بیٹوں کو سر بازار گولیوں سے بھون دیا۔ تب ایک گیارہ سال کا تھا اور دوسرا نو سال کا۔ وہ میری ساری زندگی کی کمائی تھی مگر ان کو مارتے وقت کسی نے رحم نہیں کھایا' سو یو نو واٹ سر' مجھے اب کسی دوسرے کی فیملی ٹوٹنے سے فرق نہیں پڑتا۔ سعدی یوسف کہتا ہے' فارس غازی بے گناہ تھا۔ میں بھی بے گناہ تھا سر۔ تب آپ نے اور آپ کے والد نے مجھے سپورٹ کیا اور مجھے اپنایا۔ میری آپ کے خاندان سے وفاداری غیر مشروط ہے' اس لیے میں ہمیشہ درست مشورہ دیتا رہوں گا۔"

ہاشم ذرا ڈھیلا پڑا' پھر اثبات میں سر ہلایا۔ "تھینک یو خاور!" شیرو بھی چہرہ اٹھا کر اسے دیکھنے لگا تھا جس کے تاثرات سخت تھے۔

"بہرحال' میں ایک پائی نہیں دے رہا اس ڈاکٹر کو۔ اے ایس پی سے کہو' اپنے بندوں کو خود سنبھالے ورنہ ہم سنبھالنے پہ آئے تو دوسرے طریقے سے بات کریں

گے۔"

"خاور نے اثبات میں سر ہلایا اور اٹھ گیا۔ ہاشم نے پیچھے کو ٹیک لگائی اور ٹھوڑی مسلتے ہوئے کچھ سوچنے لگا۔"

نوشیرواں ہنوز ٹائپ کر رہا تھا۔ یکدم ٹھٹکا اس کی آنکھیں چمکیں 'اسکرین پہ اس کے "کیا ہم مل سکتے ہیں؟" کے جواب میں شہرین کا پیغام بالآخر آگیا تھا۔

"ویک اینڈ پہ ملتے ہیں۔"

وہ مسکرا کر جواب ٹائپ کرنے لگا۔

✡ ✡ ✡

عجیب خواہش ہے میرے دل میں 'کبھی تو میری صدا کو سن کر
نظر جھکائے تو خوف کھائے 'نظر اٹھائے تو کچھ نہ پائے

رمضان کا دوسرا عشرہ چل رہا تھا۔ انیکسی کے برآمدے کے آگے سبزہ زار پہ شام پھیل رہی تھی۔ ادھر لان چیئرز رکھی تھیں اور صداقت افطار کے برتن لگا رہا تھا۔ دوپہر میں بارش کے باعث موسم خوش گوار تھا۔ عموماً" افطاری سب اندر کرتے تھے مگر آج مہمان تھے جن کے باعث یہاں گھاس پہ اہتمام تھا۔

سارہ 'ذکیہ بیگم 'امل اور نور۔ ان کے آنے سے پژمردہ سی انیکسی کھل سی اٹھی تھی۔ امل 'نور' حنہ اور سیم برآمدے میں نظر آرہے تھے جبکہ سبزہ زار پہ رکھی کرسیوں پہ ذکیہ بیگم 'ندرت سے باتیں کرتی دکھائی دے رہی تھیں اور زمر کے قریب بیٹھی سارہ بالکل چپ تھی۔ اس نے سرخ لان کا جوڑا پہن رکھا تھا اور سرخ دوپٹہ سر پہ تھا' آنکھیں ویران سی تھیں۔

"دراصل میں تھر میں پھنس گئی تھی۔ کچھ کام بہت گڑبڑ ہوگئے تھے۔ مشینری وغیرہ کا مسئلہ تھا' جلدی آنہیں سکتی تھی۔ پچھلے ہفتے واپس آئی ہوں۔" ذرا دیر بعد اس نے پھر سے زمر کو وضاحت دی۔

"اٹس اوکے سارہ! آپ فون کرتی رہتی تھیں 'یہی بہت ہے۔"

تب ہی زمر نے دیکھا کہ ہاشم چلا آرہا ہے۔ سارہ کی اس طرف پشت تھی' اس نے نہیں دیکھا۔ وہ غالباً" ابھی آفس سے لوٹا تھا' سارہ کو دیکھتے ہی ادھر آگیا۔

"گڈ ایوننگ لیڈیز۔" مسکرا کر مخاطب کیا تو سارہ ایک دم چونک کر مڑی۔

ہاشم پیچھے کھڑا تھا۔ ذکیہ بیگم فوراً" اٹھیں۔ وہ ان سے اپنا تعارف کروا رہا تھا۔ سارہ کی رنگت زرد پڑتی گئی۔ پیشانی کی رگیں ابھرنے لگیں۔

"آئیں 'ہاشم بیٹھیں۔" ندرت نے اسے کرسی پیش کی۔

"نہیں رکوں گا نہیں' ڈاکٹر سارہ کو دیکھا تو چلا آیا۔ بہت عرصے سے آپ سے اور آپ کے بچوں سے ملاقات نہیں ہوئی۔ کیسی ہیں آپ؟" سارہ بمشکل کھڑی ہو پائی۔ نظریں ہاشم کے چہرے پہ جا رکیں 'تو اندر کوئی لاوا سا پکنے لگا۔ وارث کی پنکھے سے جھولتی لاش.... پورچ میں گرا اسعدی.... سرخ پانی....

"میں ٹھیک ہوں۔" وہ سامنے آبیٹھا تو سارہ واپس بیٹھی۔ ساتھ ہی پرس میں ہاتھ ڈالا' اندر ایک ننھا سا چاقو رکھا تھا۔

"بچے کہاں ہیں آپ کے؟" اس نے ادھر ادھر دیکھا۔ زمر نے حنہ کو آواز دی۔ سارہ زمر کو روکنا چاہتی تھی مگر الفاظ گلے میں اٹک گئے۔ حنین 'امل اور نور کو لیے باہر نکلی تو ہاشم کو دیکھا' چہرہ کھل اٹھا۔

"السلام علیکم!" حنہ نے مسکرا کر سلام کیا۔ اس نے بھی اتنے ہی مسکرا کر وعلیکم السلام کہا۔ نگاہیں ملیں تو ان میں کوئی راز چھپانے کا خاموش معاہدہ تھا۔ (اب حنہ کے پاس اس کا ذاتی سیل تھا' جو فارس اگلے دن لے آیا تھا۔ اس پہ پاس ورڈ لگا تھا اور اب اسے ہاشم کے پیغامات مٹانے کی ضرورت نہ پڑتی۔ روز ہی بات ہو جاتی تھی۔)

"کتنے پیارے بچے ہیں آپ کے۔" اس نے ہاتھ بڑھایا تو امل اور نور شرماتی' مسکراتی' اس اسمارٹ اور ہینڈسم بندے کے قریب آئیں۔ سارہ نے پرس کے اندر چاقو پہ گرفت مضبوط کی۔ اس کا تنفس تیز ہو رہا تھا' سرخ ہوتی آنکھیں ہاشم پہ جمی تھیں۔ وہ باری باری ان بچیوں کو پیار کر رہا تھا۔ ان سے اسکول اور پڑھائی کا

پوچھ رہا تھا۔

تب ہی ذکیہ بیگم نے اس کی دلی کیفیت سے یکسر بے خبر ندرت سے پوچھا۔ "سعدی کا کچھ پتا چلا؟"

سارہ کی نگاہیں ہاشم پہ جمی رہیں۔ اس نے امل کا نرم چھوٹا ہاتھ تھام رکھا تھا اور مسکرا کر اس کی بات سن رہا تھا۔ سعدی کے ذکر پہ اس کے کان پر جوں تک نہیں رینگی۔

سارہ نے چاقو چھوڑ دیا۔ پرس پرے رکھ دیا.... پھر چہرہ ندرت کی طرف موڑا۔

"اللہ غارت کرے ان لوگوں کو جنہوں نے سعدی کے ساتھ یہ کیا۔ اس کو گولیاں ماریں' اس کو مارا' پھر اسپتال سے غائب کر دیا۔"

امل کچھ بولے جا رہی تھی اور ہاشم مسلسل مسکراتے ہوئے اس کو سن رہا تھا۔ اسے اب بھی کوئی فرق نہیں پڑا تھا۔

"ندرت آپا! آپ دیکھنا' اس شخص نے جو آپ کے بچے کے ساتھ کیا ہے' اللہ اس کی اپنی اولاد کو بھی ایسے ہی تڑپا تڑپا کر مارے گا' اس کی اپنی آنکھوں کے سامنے تو اسے پتا چلے گا کہ کسی کے بچے کا خون بہانا کتنا دردناک ہوتا ہے۔"

اور سارہ کو کن انکھیوں سے نظر آیا تھا کہ ہاشم کاردار کے چہرے کی رنگت ایک دم متغیر ہوئی تھی۔ مسکراہٹ پھیکی پڑی۔

"ایسے نہیں کہتے سارہ' بچے سب کے سانجھے ہوتے ہیں۔" ذکیہ بیگم نے ٹوکا تھا۔

ہاشم امل کی بات ختم ہوتے ہی بمشکل چہرے کو نارمل رکھے اٹھ گیا۔

"اچھا لگا آپ لوگوں سے مل کر۔" ایک برہم سی نگاہ سارہ پہ ڈال کر (جو ذکیہ بیگم کی طرف متوجہ تھی) وہ زمرے سے نہ رکنے پہ معذرت کرتا' آگے بڑھ گیا۔ خاموش بیٹھی حنین کا دل بجھ گیا۔

سارہ بہتر نظر آ رہی تھی' جیسے دل کی کوئی بھڑاس نکلی تھی۔

گھر آتے ہی ہاشم نے موبائل پہ ایک نمبر ملایا۔

"ہاں فرید.... ! ایسا کرو اورنگ زیب کاردار کے نام کی مسجد اور مدرسے میں عید تک افطاری میری طرف سے بھجوایا کرو' پورے اہتمام سے بھجوانا' میری بیٹی کے نام سے' ہاں صدقے کے طور پہ۔ نہیں بیمار نہیں ہے' بس ویسے ہی۔ یو نو۔" کال بند کر کے اسے کافی سکون ملا۔ یہ ٹھیک ہے! ایسے سارے کھاتے کلیئر رہتے ہیں۔ کاروبار بھی چلاؤ اور اللہ کو بھی خوش رکھو۔ گڈ۔

☆ ☆ ☆

میری صدا ہوا میں بہت دور تک گئی
پر میں بلا رہا تھا جسے بے خبر رہا

ویک اینڈ کی شام آن پہنچی اور نوشیرواں کلب کے لاؤنج میں ایک کاؤچ پہ بیٹھا' بار بار گھڑی دیکھ رہا تھا۔ اس نے بلیک ڈریس شرٹ کی آستین ذرا موڑ کر رکھی تھی اور نیچے خاکی جینز تھی۔ بال کٹوا کر ان کی ڈیوڈ بیکھم سپائیکس بنائے' وہ کافی فریش اور اچھا لگ رہا تھا۔

"ہیلو شیرو!" وہ سامنے سے چلتی آ رہی تھی۔ اسے دیکھ کر ہاتھ ہلایا۔ سفید ٹائٹس پہ ایک کندھے کے بغیر والی شرٹ اور گلے میں سکوں کی مالا۔ کہنی پہ ٹکا برانڈڈ بیگ۔ شہرین مسکرا کر اس کے ساتھ صوفے پہ آ بیٹھی۔ ٹانگ پہ ٹانگ چڑھائی۔ پرس درمیان میں رکھا۔

"سوری مجھے دیر ہو گئی۔ اتنا ٹریفک تھا آج۔ پھر ماں کو ایک فنکشن پہ جانا تھا۔ انہوں نے مجھے بھی دیر کروا دی۔ تم کیسے ہو۔"

وہ مسکراتے ہوئے ساتھ بیٹھا۔ "اچھا ہوں۔ لاہور کا ٹرپ کیسا رہا؟"

"بس تھک گئی۔ ایک فنڈ ریزر تھا اور ایک سیمینار۔ تم سناؤ۔ گرمی زیادہ ہو گئی ہے نا آج کل؟"

چند فقروں کے بعد باتیں جیسے ختم ہو گئیں۔ خاموشی چھا گئی۔ قریب سے گزرتی کسی لڑکی نے شیرو کو ہاتھ ہلایا تو اس نے بھی مسکرا کر ہاتھ ہلایا۔ یہاں

سب ان کو جانتے تھے۔ پھر شیرو کی طرف گردن موڑی۔ "سعدی کا کچھ پتا چلا؟"

اور بس۔ مانو سارا موڈ ہی غارت ہو گیا۔

"نہیں۔" اس کے ابرو بھینچ گئے۔

"ویسے تمہیں کیا لگتا ہے؟ اسے کسی نے قید کر رکھا ہو گا یا مار دیا ہو گا؟ تم نے دیکھا' اس کے پیج کے بیس ہزار Likes ہو چکے ہیں۔ اوہ' بے چارہ۔ چچ چچ۔" افسوس سے سر جھٹکا۔

نوشیرواں کے لیے مزید ضبط کرنا مشکل تھا۔ وہ گویا کھول کر اس کی طرف گھوما۔

"سعدی' سعدی' سعدی۔ جب بھی ہم ملتے ہیں' اس سعدی کے علاوہ کوئی بات نہیں ہوتی آپ کے پاس۔ وہ مر کر بھی ہمارے بیچ میں کیوں ہے؟ بھول جائیں سعدی کو۔ مر گیا سعدی۔ جہنم رسید ہو گیا سعدی۔ اتنی مشکل سے جان چھڑائی ہے اس سے مگر آپ پھر اس کو درمیان میں لے آتی ہیں۔"

وہ غصے سے تیز تیز بولتا جا رہا تھا۔ ارد گرد کے چند لوگوں نے گردنیں ان کے کاؤچ کی طرف موڑیں۔ شہرین ہکابکا سی اسے دیکھے گئی۔ (اتنی مشکل سے جان چھڑائی اس سے.... جان چھڑائی....!)

"وہ تمہارا دوست تھا اس لیے...." وہ اٹکی۔

"نہیں تھا وہ میرا دوست۔ زہر لگتا تھا مجھے.... میں خوش ہوں کہ وہ نہیں رہا۔ بات ختم۔ کیا اب ہم کوئی اور بات کر سکتے ہیں؟" درشتی سے کہتا وہ پیچھے کو ہوا۔ نظر ایک لڑکے پہ پڑی جو پورا گھوم کر اسے دیکھ رہا تھا۔

"اے۔ کام کرو اپنا۔ میرا منہ کیا دیکھ رہے ہو؟" اس کو بھی جھاڑا۔ وہ فوراً "کھسک لیا۔ پھر ان ہی برہم تاثرات سے شہرین کو دیکھا جو ہنوز دم بخود تھی۔

"میں آپ سے سعدی کے بارے میں بات کرنے تو نہیں آتا پھر آپ ہمیشہ مجھے یوں ہرٹ کیوں کرتی ہیں؟" ذرا دیر بعد ٹھنڈی سانس لے کر بولا تو غصہ ذرا کم تھا۔ شہرین نے جھرجھری لیتے ہوئے سامنے دیکھا۔

"اوکے! آئی ایم سوری۔ تم لوگ اچانک اس کے دشمن بن گئے ہو' میری معلومات اپ ڈیٹڈ نہیں تھیں۔ پہلے ہاشم نے اس کو اپنی پارٹی پہ بے عزت کیا۔" (سونیا کی سالگرہ یاد آئی۔) "اور اب تم کہہ رہے ہو کہ.... خیر...." گہری سانس لی اور اس کو دیکھا تو چہرے پہ قدرے رُکھائی تھی۔ گھڑی سامنے کی۔

"کیوں بلایا تھا تم نے؟ کوئی کام تھا؟ مجھے جانا ہے ماں کو پک کرنے۔"

"آپ کو کہیں نہیں جانا' آپ صرف میری بات کا بُرا مان گئی ہیں۔" وہ ذرا ناراض ہوا۔

"کیا نہیں ماننا چاہیے؟"

"شہری! کیا ہم کبھی اپنی بات نہیں کر سکتے؟ کسی تیسرے فرد کو درمیان میں لائے بغیر؟"

شہری نے چونک کر اسے دیکھا۔ وہ سنجیدہ نظر آ رہا تھا۔

"ہمارے درمیان کون سی اپنی بات ہوتی ہے؟"

"آپ کو معلوم ہے' میں کیا کہہ رہا ہوں۔" وہ ذرا آگے ہوا۔ چہرے پہ بے بسی تھی۔ "کیا ہم کبھی کبھی یوں مل نہیں سکتے؟ بات نہیں کر سکتے؟ میں آپ کو پسند کرتا ہوں اور آپ یہ بات جانتی ہیں۔"

شہرین کی آنکھوں میں ایک دم بے حد حیرت چمکی۔

"شیرو! میں تمہاری بہت پروا کرتی ہوں' تم جانتے ہو۔ مگر.... تم میرے شوہر کے چھوٹے بھائی ہو۔"

"سابقہ شوہر کے۔"

"....اور میری بیٹی کے انکل ہو۔ پھر تم مجھ سے عمر میں گیارہ' بارہ سال چھوٹے ہو۔ تمہیں مجھ سے ایسی بات نہیں کہنی چاہیے۔" نرمی سے اسے ٹوکتی' وہ پرس اٹھانے لگی۔

شیرو کی آنکھوں میں بے بسی کے ساتھ دکھ بھی ابھرا۔ "یہ باتیں بے معنی ہیں۔"

"اوکے شیرو! بہت ہو گیا۔" اب کے شہرین کی نگاہوں میں سختی اتری۔ "جو تم کہہ رہے ہو وہ بے معنی ہے۔ ہم رشتے دار ہیں اور اچھے دوست بھی۔ مگر اس سے آگے کا مت سوچنا۔ مجھے بہت بُرا لگا ہے تمہارا یوں کہنا۔" ڈپٹ کر بولتی وہ پرس اٹھائے کھڑی ہوئی اور

باہر کی طرف بڑھی۔ نوشیرواں پیچھے لپکا۔
"پھر مجھے بار بار استعمال کیوں کیا؟" وہ غصے اور بے بسی سے بولتا اس کی تیز رفتاری کا ساتھ دینے کی کوشش کر رہا تھا۔ "میری نرمی کا فائدہ کیوں اٹھایا؟"
"میں تمہیں صرف ایک اچھا دوست سمجھتی ہوں۔ مجھے نہیں پتا، باقی تمہارا ذہن کیا کیا گھڑ کر تمہیں دکھاتا رہا۔" وہ تیز قدموں سے چلتی باہر جا رہی تھی۔
"اگر میری جگہ سعدی یہ بات کہتا تو مان لیتیں آپ؟"
"تم دونوں ہی میرے لیے بچے ہو اور وہ ایسی بات کبھی نہ کہتا۔ میرا احترام کرتا تھا وہ۔" وہ باہر نکل گئی۔ کھلے لان میں اب وہ آگے جا رہی تھی۔ نوشیرواں رک گیا۔ بے بسی اور دکھ سے اسے جاتے دیکھا۔
"اس کو اتنا اچھا سمجھتی تھیں تو میرے سامنے اس کو اتنا برا کیوں کہا؟ آپ کو اندازہ بھی نہیں کہ میں نے۔۔۔ میں نے کیا کیا آپ کے لیے۔۔۔" وہ پیچھے سے چلایا تھا۔ شہرین کے قدم رکے۔ وہ گھومی۔ ہاتھ کا چھجا ماتھے پہ بنا کر دھوپ کے باعث، پتلیاں سکیڑ کر اسے دیکھا۔ وہ گلابی چہرے کے ساتھ، آنکھوں میں پانی لیے غصے اور صدمے سے اسے دیکھ رہا تھا۔
"گیٹ اے لائف، شیرو!" وہ واپس پلٹ کر آگے بڑھ گئی، اس خیال کو ذہن سے جھٹکتی جو نوشیرواں کے الفاظ اور انداز اسے بتا رہے تھے۔ کچھ عجیب سا تھا اس کے سرخ بھبھوکا چہرے پہ اس وقت۔ وہ کسی اعتراف سے چند لمحوں کی دوری پہ تھا۔

☆ ☆ ☆

دیکھتا ہوں سب شکلیں، سن رہا ہوں سب باتیں

سب حساب ان کا، میں ایک دن چکا دوں گا

فوڈلی ایور آفٹر پہ گاہکوں کا معمولی رش تھا۔ ندرت کاؤنٹر کے ساتھ رکھی میز پہ کچھ بلز وغیرہ دیکھ رہی تھیں۔ ان کا خول جو سارہ اور بچیوں کے آجانے سے ذرا چٹخا تھا، پھر سے واپس پتھر بن گیا تھا۔ قریب سے جنید ٹرے اٹھائے گزر رہا تھا۔ تب ہی راستے میں اچانک سے گل خان آکھڑا ہوا۔
"کیا ہے؟" جنید نے بدقت کوفت چھپائی۔ (سعدی کا لاڈلا۔ ایک مہینہ پشاور میں گزار کر یہ واپس آگیا تھا۔)
"جنید بھائی! یہ تم سعدی بھائی کی پھپھو کے لیے لے جا رہے ہو نا؟" ٹرے میں کافی کے مگ کی طرف اس نے اشارہ کیا۔ "یہ ہمیں دے دو، ہم لے جائے گا۔ دے دو بھائی!" جنید نے ایک بے بس نگاہ ندرت پہ ڈالی جو بے نیاز بیٹھی کام کر رہی تھیں اور ٹرے اسے تھمائی۔ "خود منہ نہ لگانا۔"
"ایسا کوئی مفت خورہ سمجھ رکھا ہے تم نے ہمیں بھائی؟ لاحول ولا قوۃ" بگڑ کر کہتا ٹرے اٹھائے سیڑھیاں چڑھتا گیا۔ جب اوپر دروازے تک پہنچا تو نیچے جھانکا۔ جنید ادھر ادھر ہو گیا تھا۔ اس نے جلدی سے مگ سے گھونٹ بھرا۔ (آہ، اس ریسٹورنٹ کی لذیذ کافی) اور ہونٹ صاف کرتے، سنجیدہ چہرہ بناتے دروازہ کھٹکھٹا کر کھولا۔ سامنے منظر سا کھلتا گیا۔
اوپر والا کمرہ اتنا ہی کھلا تھا جتنا نیچے ریسٹورنٹ تھا مگر فرش خالی تھا۔ دو دیواریں شیشے کی تھیں جن کے پار اندھیرے میں جگمگاتے شہر کی بتیاں دکھائی دے رہی تھیں۔ ایک بڑی میز پہ کاغذ اور فائلز بکھری تھیں۔ فارس پشت کیے کھڑا ایک فائل کے صفحے پلٹ رہا تھا۔ ساتھ ہی کرسی پہ، ٹانگ پہ ٹانگ جمائے، قلم انگلیوں میں گھماتی زمر بیٹھی، نفی میں سر ہلاتی کہہ رہی تھی۔
"اب سرمد شاہ کو دیکھنے کا وقت ہے، میرا خیال ہے۔۔۔" آہٹ پہ گردن گھمائی تو گل خان کو آتے دیکھ کر نرمی سے مسکرائی۔ ہاتھ بڑھا کر مگ اٹھایا۔
"ارے گل خان! تم اتنا عرصہ کہاں تھے؟" وہ سعدی کی گمشدگی کے دنوں میں آجاتا تھا، پھر درمیان میں مہینہ بھر نہ آیا تھا۔ فارس نے پلٹ کر بس ایک نظر ڈالی۔
"باجی ام پشور گیا ہوا تھا۔ امارا بابا کا چچازاد بھائی مر گیا تھا۔" ہاتھ جھلا کر کہتا وہ کرسی کھینچ کر سامنے بیٹھا۔ وہ

بارہ تیرہ سال کا، پھولے سیب سے گالوں اور بھورے بالوں والا پٹھان لڑکا تھا۔ شلوار قمیص پہنتا اور پائنچے ٹخنوں سے اوپر رکھتا۔ سر پہ پشاوری ٹوپی تھی۔

زمر جو بغور کافی کے مگ کو دیکھ رہی تھی' اس بات پہ نظریں اٹھائیں۔ "بہت افسوس ہوا۔ ویسے یہ کافی بہت ٹیسٹی ہے' ہے نا؟" کپ لبوں سے لگاتے مسکرا کر پوچھا۔ گل خان نے بے اختیار تھوک نگلا۔ اور ادھر ادھر دیکھا۔ پھر بات بدلنے کی غرض سے جلدی سے بولا۔

"باجی! تم ادھر کیا کر رہی ہو؟"

"نیچے کسٹمرز ہوتے ہیں' اور مجھے کام کرنے کے لیے جگہ چاہیے تھی۔ اوپر والا ہال ویسے بھی رینوویشن کے لیے بند پڑا تھا' سو بھابھی نے مجھے دے دیا۔"

"اچھا۔" اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ "سچ باجی' اس دن ام حیات آباد میں اپنے چاچے کی دکان پہ بیٹھا تھا' تو ہمیں یاد آیا۔ جب سعدی بھائی کھویا تھا اور تم ادھر سارے ملازموں سے پوچھ رہی تھی کہ بھائی کا کسی سے جھگڑا تھا یا دشمنی تو نہیں تھی' تو واللہ باجی' اس دن یاد آیا۔ ایک دفعہ بھائی کا ادھر ہلکا سا جھگڑا ہوا تھا۔" ریسٹورنٹ کے باہر کی سمت اشارہ کیا۔

وہ جو دیوار پہ لگی تصویریں دیکھتے' کچھ سوچ رہا تھا' چونک کر گل خان کو دیکھنے لگا جو زمر کے سامنے بیٹھا بتا رہا تھا۔ زمر نے ٹانگ سے ٹانگ ہٹائی اور سیدھی ہو کر بیٹھی۔ آنکھیں سکیڑیں۔

"کس سے ہوا تھا جھگڑا؟"

"ایک آدمی تھا' اس کی مہنگی سی ڈبہ گاڑی تھی' بوت مہنگی والی۔ پتا ہے اس کی گاڑی کی....."

"جھگڑا کس بات پہ ہوا تھا؟" فارس نے ٹوکا۔

"ہمارے اوپر ہوا تھا!" اس پٹھان ہیلن آف ٹرائے نے فخر سے سینے پہ ہاتھ مارا۔

"وہ ہم کو کچلنے والا تھا مگر ابھی ہماری زندگی باقی تھی' ہم بچ گیا۔ وہ نکلا اور ہمیں انگریزی میں ڈانٹا۔ تب ہی سعدی بھائی نکل کر آیا اور اس کو بھی انگریزی میں کوئی لمبی سی بات کہی۔ پھر وہ کار میں بیٹھا اور چلا گیا۔"

"اور جھگڑا کب ہوا؟ مطلب دونوں نے ایک دوسرے پہ ہاتھ اٹھایا؟ گالیاں دیں؟" وہ پوچھ رہی تھی۔ گل خان کو اپنی روداد ایک دم ہلکی لگنے لگی۔ ذرا ڈھیلا پڑا۔

"نہیں' ایسا کچھ نہیں ہوا مگر جو اس نے انگریزی میں بولا....."

"تمہیں انگریزی آتی ہے؟" فارس نے پھر ٹوکا....

گل خان کی غیرت اور حمیت پہ گویا تازیانہ پڑا۔ تلملا کر گھوما۔

"گل خان پانچویں فیل سہی' مگر جھگڑے والا لہجہ خوب سمجھتا ہے۔" غصے سے کان سرخ ہوئے تھے۔

"اچھا یہ بتاؤ۔" زمر نے بچے کی عزت رکھنی چاہی۔ "وہ کون تھا؟ کیسا لگتا تھا؟"

گل خان نے ایک "ہونہہ" والی نظر فارس پہ ڈالی' فلمی اداکارہ کی طرح سر جھٹکا اور باجی کی طرف متوجہ ہوا۔ (یہ ملکہ کی آن بان والی باجی اسے بہت اچھی لگتی تھی اور اس کا شوہر اتنا ہی برا۔ ہونہہ) "اب اتنا شکل نہیں یاد مگر ایسے لش پش کپڑے تھے' بال اوپر کھڑے تھے' اور ہونٹوں سے نیچے یہ چھوٹی سی داڑھی تھی۔"

"فرنچ کٹ؟"

"ہاں وہی۔ اور.... باجی اس کا گاڑی بوت مہنگا تھا۔ کوئی چار پانچ کروڑ کا ہوگا۔" زمر نے گہری سانس لی۔ بچہ اب لمبی چھوڑ رہا تھا۔

"تمہارا مطلب ہے چار پانچ لاکھ؟"

"نہیں باجی' چار پانچ لاکھ کا تو تین چار گاڑیاں گل خان بھی خرید لے' اس کا گاڑی کروڑوں کا تھا۔ سعدی بھائی نے خود بتایا تھا۔" اس نے ذرا بے بسی سے زور دیا۔ زمر اب اس کو جانے کا کہنے لگی تھی کہ فارس ایک دم چونکا۔

"ایک منٹ.... کار کا رنگ کیا تھا؟"

"سفید!" اس کی آنکھیں چمکیں۔ فارس اور زمر نے ایک دوسرے کو دیکھا۔

"تو شیرواں کی رولز رائس!" ایک دم ذہن میں جھماکا ہوا۔

مگر جب جنید کو بلایا تو اس نے عام سے انداز میں سارا قصہ دہرایا۔

"فارس بھائی، کوئی جھگڑا وغیرہ نہیں ہوا تھا۔ یہ بچہ انتہائی بدتمیز اور شرارتی ہے۔ اس کی گاڑی کے پیچھے آنے لگا تھا۔ غلطی اس شخص کی نہیں تھی۔ سعدی بھائی باہر گئے اور جا کر اس سے صرف بات کی۔ میں ذرا دور تھا، سنا نہیں مگر آدمی غصے میں لگتا تھا، ظاہر ہے، بچہ مرتے مرتے بچا تھا۔ سعدی بھائی نے بس ٹھنڈے طریقے سے اسے دو چار باتیں کہیں، وہ پلٹ کر چلا گیا۔ جواب میں کچھ بھی کہے بغیر۔ میں نے بعد میں پوچھا کہ یہ کون تھا۔ سعدی بھائی نے کہا میرا پرانا دوست ہے۔"

"ٹھیک ہے۔ کوئی ایسی بات نہیں ہے، میں دیکھ لوں گا۔" فارس نے بے تاثر سے انداز میں ان دونوں کو جانے کا اشارہ کیا۔ گل خان نے ایک پُر امید نگاہ زمر پہ ڈالی جو کچھ سوچ رہی تھی، اور پھر دوسری (شدید کینہ توز اور رقابت سے بھری) نظر فارس پہ ڈالی اور پھر بے دلی سے اٹھ کر باہر نکل گیا۔ ریسٹورنٹ کے باہر اپنے پھولوں کے اسٹال کے ساتھ آ کر وہ کھڑا ہوا تو سخت کبیدہ خاطر لگ رہا تھا۔

"ہمارا بات کا تو کوئی اہمیت ہی نہیں ہے، سارا بات باجی اسی فارس بھائی کا سنتی ہے، ہر روز شام کو ادھر آجاتا ہے، ہونہہ!" غصے سے منہ ہی منہ میں بڑبڑایا۔ پھر احتیاط سے لباس کی اندرونی جیب میں ہاتھ ڈال کر کچھ نکالا تو چہرے پہ غصے کے ساتھ ساتھ دکھ بھی تھا۔

"وہ شکل کا اچھا ہے تو کیا ہوا، گل خان بھی کسی سے کم نہیں۔ اب جب تک یہ باجی کے پاس رہے گا، ہم بھی یہ ہیرے والا چابی باجی کو نہیں دے گا۔" مٹھی کھول کر دیکھی تو اس میں سیاہ مصنوعی ہیرے والی کی چین تھی جس پہ Ants Everafter لکھا تھا اور اس میں چابیوں کے ساتھ ایک سلور پین بھی نتھی تھا۔ گل خان نے چند لمحے افسوس سے سعدی کے کی چین کو دیکھا اور پھر اسے احتیاط سے واپس اندرونی جیب میں رکھ کر جیب کی زپ بند کر دی۔ ایک کینہ توز نظر اوپر ریسٹورنٹ پہ ڈالی اور پھر سر جھٹک کر اسٹال کی طرف متوجہ ہو گیا۔

اس کے جانے کے بعد چند لمحے وہ دونوں خاموش بیٹھے رہے تھے۔

"سونیا کی سالگرہ والے دن بھی شیرو نے سعدی سے تلخ کلامی کی تھی، میں درمیان میں آیا تو وہ ٹھنڈا پڑ گیا۔"

"خیر، وہ اس کا دوست تھا۔ دوستوں میں ایسی باتیں ہو جاتی ہیں۔" وہ کہنے کے ساتھ فون پہ نمبر ملا رہی تھی۔ فارس خاموش ہو گیا، مگر وہ کچھ سوچ رہا تھا۔

"نوشیرواں! میں زمر بات کر رہی ہوں.... " گہری سانس لی۔ "میں اب ڈی اے نہیں ہوں۔ آپ مجھے صرف مسز زمر کہہ سکتے ہیں۔ اچھا آپ گھر پہ ہیں؟ اوکے، میں تراویح کے بعد گھر آجاؤں گی، مجھے آپ سے ملنا ہے۔" اور موبائل کان سے ہٹایا۔ فارس سینے پہ بازو لپیٹے میز کے کنارے سے ٹیک لگائے کھڑا اسے دیکھ رہا تھا۔

"وہ سعدی کا دوست ہے، میں اس پہ شک نہیں کر رہی مگر ہو سکتا ہے وہ سعدی کے مزید دوستوں کے بارے میں کچھ جانتا ہو۔ وہ لڑکی جو سعدی کے ساتھ تھی مبینہ طور پہ شاید وہ اس کو جانتا ہو۔ وہ کچھ تو چھپا رہا ہے۔"

"ویسے وہ الٹی کھوپڑی کا بگڑا ہوا بچہ ہے، اس کا دماغ اتنی دور تک نہیں جایا کرتا۔ پھر بھی آپ اس سے یہ بات کلیئر کر لیجیے گا۔" اس نے عادتاً "اسٹکی نوٹس کا پیڈ اٹھایا قلم سے اس پہ لکھا.... "گل خان، ڈبہ گاڑی، نوشیرواں۔" اردو میں یہ الفاظ لکھ کر اس نے میز کے کونے پہ چپکا دیے تاکہ زمر کو یاد رہیں اور خود مڑ کر دیوار کی طرف چلا گیا۔

"ہم اے ایس پی کی بات کر رہے تھے۔ فارس، اب ہمیں اس کو کارنر کرنا چاہیے۔"

"نہیں، پہلے ڈاکٹر بخاری۔" اس کا انداز قطعی تھا۔

"وہ سرجن جس نے سعدی کا آپریشن کیا تھا؟"

"وہ اس رات ڈیوٹی پہ نہیں تھا، سعدی کو اسپتال

لانے کے بعد وہ اچانک سے آیا اور ٹیک اوور کر لیا۔ اسی نے وارڈ بوائز بھیجے اور اسی نے سعدی کو اسپتال سے نکلوایا ہے۔ وہ راہداری جس کی اصلی فوٹیج نکال کر ایک ہی کلپ بار بار دہرایا گیا ہے' میں نے اس ملحقہ دو راہداریوں کی فوٹیجز چیک کی ہیں۔ وہ لوگ باری باری وہاں مڑے ہیں۔ ایک اے ایس پی' اور دوسرا وہ ڈاکٹر۔ یعنی اے ایس پی نے ڈاکٹر کے ساتھ اس کاریڈور میں باتیں کی تھیں اور بعد میں وہ فوٹیج مٹا دی تاکہ پتا نہ چل سکے کہ ان دونوں نے مل کر یہ کام کروایا ہے' اس لیے پہلے 'ڈاکٹر!'

"تم نے کہا تھا کہ ہر چیز میری مرضی سے ہوگی۔"

"سب آپ کی مرضی سے ہو رہا ہے۔"

"کیا واقعی؟"

"آپ کو سعدی واپس چاہیے یا نہیں؟" وہ چپ ہو گئی۔

"ٹھیک ہے' پہلے ڈاکٹر سہی!" قلم انگلیوں میں گھماتی وہ خشک لہجے میں بولی۔ کام اپنی جگہ 'گریز اور اعراض اپنی جگہ۔ "اگر مجھے ——— اس کے لیے تمہاری مخلصی کا یقین نہ ہوتا تو میں کبھی بھی تمہاری بات نہ مانتی' اور ——" قلم گھماتی انگلیاں تھمیں۔ نگاہیں میز کنارے چپکے نوٹ پہ جا ٹھہری تھیں جو فارس نے ابھی لگایا تھا۔

"گل خان' ڈبہ گاڑی' نوشیرواں۔" اس نے ان الفاظ کو پڑھا ایک دفعہ' دو دفعہ..... شاید دس دفعہ' نگاہ اٹھا کے فارس کو دیکھا' پھر ان الفاظ کو۔ پھر نوٹ اتار کر مٹھی میں دبایا۔ پرس اٹھایا' اور ایک عجیب سی نظر اس پہ ڈالتی دروازے کی طرف بڑھ گئی۔ فارس نے اچنبھے سے اسے جاتے دیکھا۔

(اب اسے کیا ہوا؟ پھر تو نہیں دماغ الٹ گیا؟)

✡ ✡ ✡

کیا روز تماشا کہ نیا خواب' نیا غم
مرنے کی جو ٹھانی ہے تو اک بار میں مر بھی

قصر کا ردار میں ڈنر ٹیبل خوب صورتی سے سجی تھی۔ سب کھانا کھا رہے تھے جب زمر کا فون آیا تھا۔ نوشیرواں نے موبائل بند کیا تو ہاشم اور جواہرات اسی کو دیکھ رہے تھے۔

"زمر تم سے کیوں ملنا چاہتی ہے؟"

"پتا نہیں۔" شہرین کے صبح والے برتاؤ کے بعد وہ جو بدقت سنبھلا ہوا لگ رہا تھا' اس کال پہ رنگ سفید پڑ گیا تھا۔ نگاہیں جھکالیں۔ ہاشم نے نیپکن موڑ کر میز پہ ڈالا اکتاہٹ اور بے زاری سے۔ جواہرات نے باری باری دونوں کو دیکھا۔

"ہاشم! کیا ہو رہا ہے؟" سنگین نظروں سے اسے دیکھ کر پوچھا تو ہاشم کرسی دھکیل کر اٹھا۔ "میرے کمرے میں آئیں۔" ساتھ ہی ڈیوٹی پہ کھڑی فیونا کو جانے کا اشارہ کیا۔ وہ فوراً" پلٹ گئی۔

"ہاشم! تم....."

"میرے کمرے میں آئیں ممی۔" ایک ملامتی نظر نوشیرواں پہ ڈال کر وہ آگے بڑھ گیا۔ نوشیرواں بے زاری اور تلملاہٹ سے اٹھا تھا۔

پندرہ منٹ بعد ہاشم کے بند دروازے کے پیچھے کا منظر قطعاً" خوش گوار نظر نہیں آرہا تھا۔ نوشیرواں بیڈ کے کنارے' بے زاری سے سر جھکائے بیٹھا تھا۔ ہاشم کاؤچ پہ ٹانگ پہ ٹانگ جمائے' صوفے کی پشت پہ بازو پھیلائے براجمان تھا اور جواہرات..... وہ جلے پیر کی شیرنی کی طرح آگے پیچھے چکر کاٹ رہی تھی۔ اس کی رنگت سفید اور سرخ کے درمیان بدلتی رہتی اور آنکھوں میں صدمہ' بے یقینی' غصہ سب کچھ تھا۔

"تم....!" رک کر نوشیرواں کو گھورا اور تین انگلیوں سے اس کی ٹھوڑی پکڑ کر زور سے جھٹکا دیا۔ شیرو نے (اونہوں) منہ پرے ہٹایا۔ "تم انتہائی احسان فراموش انسان ہو۔ اس نے جان بچائی تھی تمہاری اور تم نے اس کو مار دیا؟ اور تم؟" پلٹ کر شعلہ بار نظر ہاشم پہ ڈالی۔ "اگر وہ مر رہا تھا تو کیا ضرورت تھی اس کو اتنے تردد سے وہاں سے نکالنے کی؟" وہ اتنی دیر سے بول بول کر اب ہانپنے لگی تھی۔

"اس کو مرنے دیتا اور شیرو کو قاتل بنا دیتا؟ کیا یہ

اتنے بڑے گلٹ کے ساتھ ساری زندگی گزار سکتا تھا؟" وہ بھی برہم ہوا۔ (شیرو کچھ بڑبڑایا۔)

"اور مجھے بتانے کا کب ارادہ تھا؟ تھا بھی یا نہیں؟"

"اوکے ممی! بہت سن لیا میں نے۔ اب بس کریں۔ بیٹھیں اور سوچیں کہ اب کیا کرنا ہے۔ زمر شیرو سے کیوں ملنا چاہتی ہے؟"

"تم مجھے بتاؤ گے کہ اب کیا کرنا ہے؟" وہ غرائی تھی۔ "اس گھر کی' اس امپائر کی ملکہ میں ہوں' یہ فیصلے میں کرتی ہوں کہ کون کیا کرے گا۔ سمجھے تم!" ہاشم گہری سانس لے کر رہ گیا۔

"یہ سنبھال رہے ہو تم چیزیں کہ ابھی ڈیڑھ ماہ نہیں ہوا اسے کھوئے اور زمر کو اس پہ شک ہو گیا ہے۔" ملامتی نظران دونوں پہ ڈالی۔ اس کو کسی پل سکون نہیں آرہا تھا۔

"شیرو پہ کوئی شک نہیں کر سکتا۔ یہ اس وقت دبئی میں تھا' اس کے پاسپورٹ پہ مہر ہے۔"

"اس گھر کے ملازموں کی آنکھوں پہ تو مہر نہیں تھی۔ کس کس نے دیکھا تمہیں اس روز گھر پہ؟ بولو شیرو!" اس کے سر پہ کھڑی غرائی تو وہ جلدی جلدی کہنے لگا۔

"فیونا نے... اور..." رکا... ذرا سوچا۔ "میں رات کمرے میں بند رہا۔ فیونا آئی تھی پھر صبح میں' ہاشم بھائی اور آپ آفس کے لیے جلد نکل گئے تھے۔ گیٹ کے دونوں گارڈز نے دیکھا اور ہاں' ڈائننگ ہال میں..."

"فہرست مت بتاؤ' مجھے معلوم ہے اس صبح ڈیوٹی پہ کون کون تھا۔ فیونا قابل بھروسا ہے مگر اس کے علاوہ' سب کو میں فائر کر کے دوسرے شہروں میں اچھی نوکریاں دلوادوں گی۔ اگلے ماہ سے ہم نیا اسٹاف رکھ رہے ہیں۔" وہ رکی۔ "فارس نے تو نہیں دیکھا تمہیں؟"

اور ایک دم نوشیرواں سیدھا ہوا۔ اسے یاد آیا۔

"زمر... ڈی اے... اس نے دیکھا تھا مجھے۔" سفید پڑتے چہرے کے ساتھ شیرو نے دونوں کو دیکھا۔ "ہاشم بھائی' ان کی شادی کی صبح ان کے گھر سے جب نکلے تو میں ادھر بالکونی میں کھڑا تھا۔ وہ باہر نکلی تو اس نے مجھے دیکھا تھا اور..." اسے سب سمجھ میں آنے لگا۔ "اس دن جب میں نے اسے بتایا کہ میں اس کی شادی سے پہلے ہی دبئی جا چکا تھا تو وہ..." اور پوری بات سن کر ہاشم کا دماغ گھوم گیا۔

"یہ بات زور دے کر کہنے کی کیا ضرورت تھی؟ میرے خدایا! نوشیرواں میں تمہارا کیا کروں۔" موبائل اٹھاتے ہوئے وہ کھڑا ہوا۔ "میں زمر کے پاس تمہارے ساتھ جاؤں گا اور بات سنبھال لوں گا' اگر..."

"بالکل نہیں..." جواہرات سلگتی نظروں سے اسے گھورتی اس کے سامنے آکھڑی ہوئی۔

"اس کو بے بی سٹ کرنا چھوڑ دو ہاشم... اس کو اپنے مسئلے خود حل کرنے دو۔ وہ اکیلا جائے گا اور وہ خود زمر کو کنوینس کرے گا' وہ ایک کاردار ہے' اگر وہ سعدی کو گولی مار سکتا ہے تو وہ کچھ بھی کر سکتا ہے۔"

ہاشم شدید بے چینی کا شکار ہوا۔ "مگر ممی... زمر کو شک..."

"نوشیرواں کو اب عادت ڈالنی ہے ہاشم' اپنے بگڑے کام خود سنبھالنے کی۔" وہ اس کی طرف آئی اور ان ہی شعلہ بار نظروں سے اسے دیکھا۔ "زندگی میں پہلی اور آخری دفعہ تم سے پوچھ رہی ہوں۔ کیا تم اپنے مسئلے خود سنبھال سکتے ہو؟"

"جی۔" شیرو نے اثبات میں سر ہلایا۔

"اوکے اور ایک دفعہ پھر۔" باری باری دونوں کو گھورا۔ "لعنت ہے تم دونوں پہ!"

زمر کار کھڑی کر کے گھاس پہ اتری ہی تھی کہ "مسز زمر!" کی آواز آئی۔ وہ جو کسی اور دھیان میں تھی' پلٹی۔ نوشیرواں چلا آرہا تھا۔ جینز کی جیبوں میں ہاتھ تھے اور چہرے پر دوستانہ مسکراہٹ تھی۔

"او نوشیرواں۔" اسے اس سے بات کرنی تھی۔ ذہن اتنا الجھا ہوا تھا کہ فراموش کر گئی۔ وہ قدم قدم چلتا قریب آیا۔ سبزہ زار تاریک تھا' انیکسی کے برآمدے کی

بتیاں جل رہی تھیں۔ وہ بالکل سامنے آیا تو چہرہ روشنی میں آیا۔

"مجھے آپ سے بات کرنی تھی۔ دراصل۔" وہ رکا۔ زمر ٹھہر کر سننے لگی۔

"میں نے اس دن آپ سے جھوٹ بولا تھا کہ میں آپ کی شادی کی رات دبئی گیا تھا۔" اس کے چہرے پہ معذرت خواہانہ تاثر تھا۔ "میں آپ کی شادی کے وقت ادھر ہی تھا' ان فیکٹ اگلی صبح بھی ادھر ہی تھا۔ جب بھائی آفس گیا' تب میں اپنا سامان پیک کر کے نکلا تھا۔"

"مجھے معلوم ہے مگر آپ نے مجھ سے جھوٹ کیوں بولا؟" اس نے پتلیاں سکیڑ کر غور سے شیرو کو دیکھا۔

"کیونکہ آپ نے مجھے بالکونی میں دیکھ لیا تھا' اسموکنگ کرتے ہوئے۔" نگاہیں پشیمانی سے جھکائیں۔ "میں سگریٹ نہیں پی رہا تھا۔ وہ ڈرگز تھیں۔"

اوہ!" اس کی آنکھیں تعجب سے پھیلیں۔ "آپ ڈرگز استعمال کرتے ہو؟"

"پلیز' ممی یا بھائی کو مت بتایئے گا۔ بھائی مجھے جان سے مار دے گا۔ اسی لیے میں نے آپ سے جھوٹ بولا۔ آپ ممی کو بتا دیں گی' مجھے یہی ڈر تھا۔

"آپ اپنی بالکونی میں اسموکنگ کر رہے تھے' اور آپ کے گھر والوں کو نہیں پتا۔؟"

"پہلے پتا تھا جب میں ڈرگز لیتا تھا' پھر سعدی نے بہت مشکل سے میری عادت چھڑائی' ممی اور بھائی کو نہیں پتا کہ میں پھر سے لینے لگ گیا ہوں۔ صرف سعدی کو پتا تھا۔ ظاہر ہے دوستوں سے کوئی بات نہیں چھپتی۔ میں اسی لیے اس کے آخری دنوں میں اسے بھی اوائیڈ کر رہا تھا' میں شرمندہ تھا۔ مگر اب۔ آئی سوئیر' میں چھوڑنے کی کوشش کر رہا ہوں' بس آپ کسی کو کچھ مت بتایئے گا۔"

زمر چند لمحے غور سے اسے دیکھتی رہی۔ "آپ کا سعدی سے جھگڑا کیوں ہوا تھا۔ اس کے ریسٹورنٹ کے باہر' اور پھر یہاں پارٹی میں؟"

جھگڑا؟" نوشیرواں کی آنکھوں میں حیرت اتری۔ (اور دل کانپ کر رہ گیا۔) "میرا تو اس سے کوئی جھگڑا نہیں ہوا۔ ہاں بس اس نے مجھے جھڑکا تھا' ڈرگز کی وجہ سے' اور میں اس کو اوائیڈ کر رہا تھا مگر مجھے پتا ہے وہ میرا بھلا ہی چاہتا تھا۔"

"او کے' تھینک یو نوشیرواں۔" اس نے سر ہلایا الوداعی انداز میں اور عجلت میں گھر کی طرف بڑھ گئی۔ اس کے ذہن میں فی الحال کچھ اور چل رہا تھا۔ نوشیرواں نے مسکراتے ہوئے اسے واپس جاتے دیکھا اور پلٹ گیا۔ جیبوں میں رکھے ہاتھ پسینے میں بھیگ چکے تھے اور دل ہنوز زور سے دھڑک رہا تھا۔ حلق خشک تھا' مگر جواہرات کے دیے اعتماد (اور ہاشم کی آدھے گھنٹے کی Witness Preperation) نے واقعی ثابت کر دیا تھا کہ وہ ایک کاروار ہے۔ آخری قہقہہ اسی کا ہو گا۔

☼ ☼ ☼

میں اپنی جفاؤں پہ نادم نہیں ہوتا
میں اپنی وفاؤں کی تجارت نہیں کرتا

زمر اندر آئی تو ابا وہیں بیٹھے تھے لاؤنج میں۔ صداقت اور سیم ٹی وی کے آگے جڑ کر بیٹھے' کوئی دکان رمضان کی نشریات دیکھ کر ڈھیروں ثواب کما رہے تھے۔ وہ سلام دعا کیے بغیر سیدھی اوپر چلی گئی۔ ابا نے فکرمندی سے اسے دیکھا تھا۔

کمرے میں آ کر اس نے چیزیں گویا پھینکیں اور فارس کی لکھی چٹ لیے ڈریسنگ ٹیبل تک آئی۔ مختلف خانے کھولے۔ آگے پیچھے ہاتھ مارا۔ بے حد آرگنائزڈ زمر کو وہ ڈبی ڈھونڈنے میں تین منٹ لگے اس نے سیاہ مخملیں ڈبی کھولی' کسی زمانے میں اس ڈبی میں اس کو وہ لونگ ملی تھی' اور لونگ کے ساتھ ایک چٹ بھی تھی۔ زمر نے وہ چٹ نکالی اور پھر پرچیاں کھول کر سامنے کیں۔ الفاظ مختلف تھے مگر دونوں اردو میں لکھی گئی تھیں۔ لکھائی نہ اچھی تھی نہ بری' مگر وہ ایک تھی۔ "کاف" کی آنکھ' ل یا ن کی گولائی' بالکل ایک سی

تھی۔ وہ وہیں زمین پہ بیٹھتی چلی گئی۔ حق دق۔ متحیر۔ شل۔ بار بار ان الفاظ کا موازنہ کیا۔ بالکل ایک سے۔

پھر سنگھار میز پر ہتھیلیاں رکھ کر وہ کھڑی ہوئی تو آئینے میں عکس نظر آیا۔ گھنگریالے بال کھلے تھے' چہرہ زرد تھا۔ آنکھوں میں عجیب سی حیرت اور صدمہ تھا اور ناک۔ ناک میں لونگ دمک رہی تھی۔ وہ ننھا خشت (ہیرا) اس وقت زمر یوسف کی پوری زندگی کو تہہ وبالا کر رہا تھا۔

پھر ان بھوری آنکھوں میں غصہ ابھرا۔ اس نے نوچ کر وہ لونگ اتاری۔ کسی مکروہ شے کی طرح ڈبی میں ڈال کر بند کی۔ پھر باہر نکلی۔

ساتھ والے کمرے کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ حنہ نے فوراً" ہی کھول دیا۔ اس کو دیکھا تو ذرا دیر کو ٹھہری۔ اس کی آنکھوں میں سرخ لکیریں ابھری ہوئی تھیں' لب بھینچے ہوئے تھے اور۔ ناک میں لونگ نہیں تھی۔ حنین کی الجھی ہوئی نگاہیں اس کے ہاتھ پہ جا رکیں۔ زمر نے ہتھیلی سیدھی پھیلا رکھی تھی۔ "میری نوز رنگ' حنین!"

"جی؟"

"میں نے کہا حنین یوسف! کہ مجھے میری نوز رنگ واپس چاہیے۔" چبا چبا کر الفاظ ادا کیے۔ حنین کی ٹانگوں سے جان نکل گئی۔ اس نے پہلی دفعہ زمر کو اپنے ساتھ اتنے کٹیلے اور سرد لہجے میں بات کرتے دیکھا تھا۔ اور جیسے زمر کو دو جمع دو چار کرنے میں چند منٹ لگے تھے' حنہ کو بھی تھوڑی ہی دیر لگی۔ وہ خشک لبوں پہ زبان پھیرتی پلٹی' اور الماری کھولی۔ آگے پیچھے ہاتھ مارا۔ پھر ڈریسنگ ٹیبل تک آئی۔ اس کے ایک ایک خانے کو چیک کیا۔ زرتاشہ کی ساری چیزیں الٹ پلٹ کر دیں۔ کچھ البمز۔ کچھ سی ڈیز۔ بے حد ڈس آرگنائزڈ حنین کو نتھ کی ڈبی ڈھونڈنے میں کچھ دیر لگ گئی اور پھر اس نے جھکی نظروں کے ساتھ ڈبی اس کی طرف بڑھائی۔ زمر نے اسے جھپٹا اور ملامتی نظروں سے اسے گھورتی' مڑ گئی۔

فارس اور ندرت اکٹھے واپس آئے تو رات مزید تاریک ہو چکی تھی۔ وہ لاؤنج میں کھڑا' بڑے ابا سے رسمی کلمات کہہ رہا تھا جب حنہ آہستہ سے اس کے قریب آئی۔ جب وہ متوجہ نہ ہوا تو اس کی کہنی ہلائی۔ وہ چونک کر مڑا۔

"کیا؟"

حنین نے ابرو سے اوپر کمرے کی طرف اشارہ کیا۔

"انہیں کیسے پتا چلا؟"

کیا؟" فارس کو اچنبھا ہوا۔

اوہ۔" (تو ابھی ان کی پیشی نہیں ہوئی تھی۔)

"پھپھو کو دیکھ لیں' وہ آتے کے ساتھ ہی کمرے میں بند ہو گئی ہیں۔" دھیرے سے کہا مگر ندرت نے سن لیا۔ ابا نے بھی۔ سیم نے بھی گردن موڑی۔ لاؤنج میں ایک دم خاموشی چھا گئی۔ فارس نے محسوس کیا سب اسی کو دیکھ رہے ہیں۔ وہ کسی سے بھی نگاہ ملائے بغیر سیڑھیاں چڑھتا اوپر چلا گیا۔

کمرے کا دروازہ کھولا تو وہ بیڈ کے کنارے بیٹھی تھی۔ رخ موڑے۔ وہ اندر آیا۔ کوٹ اتارا۔ اسے ٹکایا۔ سرسری سی نظر اس کے سر کی پشت پہ ڈالی۔ کمرے میں خاموشی تھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ ہوا کیا ہے۔ اور اب اس کی نگاہ اپنے صوفے پہ پڑی۔

اس کے سرہانے سیاہ مخملیں ڈبی رکھی تھی۔ فارس نے چونک کر اسے دیکھا جو اب اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ اور اس کے سامنے' سینے پہ بازو لپیٹے' چبھتی نظروں اسے دیکھ رہی تھی۔

زمر کی آنکھوں میں دکھ کے ساتھ ملامت بھی ابھری۔ "تم کب مجھے دھوکا دینا چھوڑو گے' فارس؟"

"میں نے کوئی دھوکا نہیں دیا۔" وہ بھی سامنے آکھڑا ہوا اور۔ لہجہ برہم ہوا۔ "اسٹوڈنٹس ٹیچرز کو گفٹس دیتے ہیں۔ میں نے بھی دے دیا۔ پہننا یا نہ پہننا آپ کا فیصلہ تھا۔"

"تم نے اپنا نام نہیں لکھا تھا اور۔"

"آپ میری لکھائی پہچان سکتی تھیں۔"

"اگر تمہیں بھول گیا ہے تو یاد کروادوں' قانون کی کتابیں انگریزی میں ہوتی ہیں۔ میں نے تمہاری

انگریزی لکھائی دیکھی تھی صرف۔ پھر تم نے نام کیوں نہیں لکھا؟" اس کی آواز بلند ہو رہی تھی۔

"اوکے فائن!" وہ بھی اونچا بولا تھا۔ "نہیں لکھا' ٹھیک ہے۔ نہیں لکھا تو کیا کریں گی آپ؟"

زمر کی آنکھوں میں پانی سا بھر آیا۔

"تم اتنے سال میرا مذاق اڑاتے رہے' تمہیں بالکل کوئی لحاظ نہیں آیا۔ میں تمہاری ٹیچر تھی!" بولی وہ غصے سے تھی' مگر آواز بھیگی ہوئی تھی اور ان بھوری آنکھوں میں آنسو دیکھنا۔ فارس نے سر جھٹکا۔

"جب آپ کو گولی مار سکتا ہوں تو کچھ بھی کر سکتا ہوں' میں تو ہوں ہی برا۔ اس لیے میری طرف سے.... پھینک دیں اسے یا آگ میں ڈال دیں۔ مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ لیکن اگر آپ کا یہ خیال ہے کہ میں معذرت کروں گا' تو یہ میں نہیں کرنے لگا۔ بلکہ میں تھک چکا ہوں آپ کو وضاحتیں دے دے کر۔ اس لیے میرا دماغ خراب کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اس وقت آپ میری ٹیچر تھیں' مجھے جیل بھیجنے والی گواہ نہیں تھیں!" وہ واپس مڑا' چابی اٹھائی اور دروازے کی طرف بڑھا' تب دیکھا' ذرا سی درز کھلی تھی۔ وہ دروازہ پورا بند کرنا بھول گیا تھا۔ یا اللہ۔ اس کا دماغ سنسنا اٹھا۔ ساری آوازیں نیچے گئی ہوں گی!

مڑ کر ایک نگاہ زمر پہ ڈالی' جو خاموش کھڑی' آنکھوں میں پانی اور ڈھیروں غصہ لیے اسے دیکھ رہی تھی اور پھر باہر نکلا۔ زور سے دروازہ بند کیا۔

نیچے لاؤنج میں سناٹا تھا۔ حنین' ندرت' ابا' سیم سب اوپر ہی دیکھ رہے تھے۔ وہ سنجیدہ چہرے کے ساتھ لب بھینچے تیزی سے زینے اترتا گیا۔ ندرت اٹھیں۔

"فارس! کہاں جا رہے ہو؟"

"کام سے جا رہا ہوں۔ آجاؤں گا۔" ہاتھ جھلا کر ان کو اشارہ کرتا وہ باہر نکل گیا۔

"حنین' جاؤ اس کو روکو۔ اسے کہو مت جائے۔"

مگر حنین وہیں بیٹھی رہی۔

"امی! خیر ہے' بیٹھ جائیں' وہ آجائیں گے۔" اس نے بظاہر خود کو بے فکر ظاہر کیا البتہ بار بار پریشان نگاہ اوپر اٹھتی تھی۔ (اسے پتا تھا فارس' ابا سے شرمندہ ہے کہ انہوں نے اسے ان کی بیٹی کے ساتھ اس طرح بات کرتے سنا ہو گا۔)

☼ ☼ ☼

بہت اندر تک جلا دیتی ہیں
وہ شکایتیں جو کبھی بیاں نہیں ہوتیں

ندرت چند لمحے چوکھٹ میں کھڑی رہیں' پھر واپس آئیں۔ سیڑھیوں کے پاس ٹھہر کر گردن اونچی کی۔

"زمر.... زمر!" ان کی آواز میں کچھ ایسا تھا کہ حنین چونکی۔ ابا بھی چونکے۔ سعدی کے جانے کے بعد پہلی دفعہ ان کی اتنی بلند آواز سنی تھی۔ اور آنکھوں میں غصہ۔

زمر کمرے سے باہر آئی اور اوپر ریلنگ کنارے رکی۔ گیلی آنکھیں رگڑ لی تھیں۔

"جی؟" وہ پرسکون نظر آنے کی کوشش کر رہی تھی۔

"تم نے فارس کو کیا کہا ہے؟ وہ کیوں چلا گیا ہے؟" اوپر کھڑی زمر کی آنکھوں میں ذرا تعجب سا ابھرا۔ الفاظ یہ نہیں' انداز یہ۔

"میں نے اسے کچھ نہیں کہا۔" (ابھی تو کچھ کہنا شروع بھی نہیں کیا تھا۔)

"ہم نے خود سنا ہے' تم دونوں جھگڑ رہے تھے۔" وہ پریشان تھیں اور غصے میں تھیں۔ "تم اس کے ساتھ ایسا سلوک کیوں کر رہی ہو؟ یہ شادی تمہاری مرضی کے بغیر تو نہیں ہوئی تھی۔"

حنین نے چہرہ موڑا۔ کچن کے دروازے پہ کھڑا صداقت بنا پلک جھپکے' ادھر دیکھ رہا تھا۔

"اے!" اس نے صداقت کو متوجہ کیا۔ وہ چونکا۔ کھلا منہ بند کیا۔

"جاؤ اپنے کوارٹر میں۔ ادھر کیا کھڑے ہو؟" ڈپٹ کر بولی تو وہ شرمندہ سا فوراً" باہر کھسک گیا۔

ادھر زمر آواز نیچی کیے کہہ رہی تھی۔ "ایسا کچھ نہیں ہے' بھابھی میں نے اسے کچھ نہیں کہا۔ وہ خود گیا

ہے۔“

”سعدی بھی ایسے ہی گیا تھا اور پھر واپس نہیں آیا۔ اب فارس بھی واپس نہیں آئے گا۔ تم نے اسے مجبور کیا ہے گھر چھوڑنے پہ۔ سعدی بھی تمہاری وجہ سے گیا تھا۔“ ان کی آنکھوں میں آنسو تھے اور آواز غصے سے بلند ہو رہی تھی۔

”میری وجہ سے؟“ زمر دم بخود رہ گئی۔

”ہاں۔ تم اس روز سعدی سے لڑی تھیں۔ میں نے خود سنا تھا۔ تم اس کو ڈانٹ رہی تھیں۔ اس کے بعد وہ گھر سے چلا گیا اور واپس نہیں آیا۔“

حنین کو لگا، کسی نے اس کے منہ پہ بیلچہ دے مارا ہو۔ وہ ہکا بکا سی کھڑی ہوئی۔ ”نہیں امی، پھپھو تو میرے لیے... میری سائیڈ لے رہی تھیں۔“ اس نے وحشت سے زمر کو دیکھا جو ریلنگ پہ ہاتھ رکھے سن سی کھڑی تھی۔

”سعدی میری وجہ سے نہیں گیا بھابھی۔“

”تم نے فارس کو گھر سے نکالا ہے جیسے تمہاری امی نے مجھے نکالا تھا، تم لوگوں نے ساری زندگی ہمارے ساتھ یہی کیا ہے، اب تم فارس کے ساتھ وہی کر رہی ہو۔“ دکھ سے ان کی آواز پھٹ رہی تھی۔

”ندرت!“ ابا نے برہمی سے ٹوکا۔

”میری امی کے بارے میں کچھ مت کہیے اور سعدی میری وجہ سے نہیں گیا۔“ وہ بدقت بول پائی۔ اس کی آنکھیں گلابی پڑنے لگی تھیں۔ ”میں اس سے نہیں لڑی تھی، صرف ذرا سا خفا...“

”تمہیں کیا حق تھا اس سے خفا ہونے کا؟“ وہ ایک دم زور سے چلائیں۔ حنین ڈر کر دو قدم پیچھے ہٹی۔ ”وہ میرا بیٹا تھا۔ تمہارا بیٹا نہیں تھا۔ یہ میرے بچے ہیں، ان کو صرف میں ڈانٹ سکتی ہوں، تم اپنے سارے حق اپنے بچوں کے لیے رکھو۔“

”ندرت! بس کر دو!“ ابا بلند آواز میں سختی سے بولے اور ندرت چپ ہو گئیں۔ کیونکہ کہنے کے بعد ان کو احساس ہوا تھا کہ ان کا آخری فقرہ... ان کا آخری فقرہ مناسب نہ تھا۔ اور اس آخری فقرے نے زمر کا دل ہی توڑ دیا۔

اس کا ریلنگ پہ جما ہاتھ نیچے گر گیا۔ وہ چہرہ جھکائے قدم قدم زینے اترتی گئی۔ لاؤنج میں وحشت ناک سا سناٹا چھا گیا۔ زمر کسی کو بھی دیکھے بغیر بیرونی دروازے کی طرف بڑھی۔ حنین کی نظریں اس کے قدموں پہ جا ٹھہریں۔ وہ ننگے پیر تھی۔ پھر وہ اسی طرح باہر نکل گئی مگر حنین میں کھڑکی کا پردہ سرکا کر دیکھنے کی ہمت بھی نہیں تھی۔

دروازہ بند ہوا تو ندرت چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی سیڑھیاں چڑھتی گئیں۔ وہ شاید رو بھی رہی تھیں۔

ابا فکر مندی سے بند دروازے کو دیکھ رہے تھے پھر سیم اٹھا اور باہر گیا۔ چند لمحے بعد وہ واپس آگیا۔ ”پھپھو باہر نہیں ہیں۔ کہاں چلی گئیں؟“

حنین نے پریشانی سے فارس کا نمبر ملایا۔ اس نے کال کاٹ دی۔ ایک بار، دوسری بار۔ پھر اس نے غصے سے ٹیکسٹ بھیجا۔

”امی اور پھپھو کی لڑائی ہوئی ہے اور امی نے پھپھو کو گھر سے نکال دیا ہے۔“ اور پھر گہری سانس لے کر بیٹھ گئی۔ حسب توقع فون فوراً بجا۔

”کیا ہوا؟“ وہ واقعی تشویش سے بولا تھا۔ آواز سے لگتا تھا ڈرائیو کر رہا ہے۔

”وہی جو لکھا تھا۔ امی نے پھپھو کو بہت سنائیں اور وہ گھر سے چلی گئیں۔“

”قصور کس کا تھا؟“ چند لمحوں کی خاموشی کے بعد اس نے پوچھا۔

”آپ کا!“ اور پھر امی کے سارے الفاظ دہرا دیے۔

تھوڑی دیر گزری اور گاڑی کی آواز آئی تو بڑے ابا کے چہرے پہ چھائی تفکر کی لکیریں کم ہوئیں۔ دروازہ کھلا اور وہ اندر داخل ہوا تو فکر مند لگ رہا تھا۔

”آپ کہاں چلے گئے تھے؟“

”یونہی۔ باہر۔“ اس نے ابا سے نگاہیں چرائیں مگر ابا کو اس کا غصے سے ان کی بیٹی پہ چلانا یاد نہیں تھا، ان کو صرف زمر کی فکر تھی۔

"جاؤ، زمر کو دیکھو وہ کہاں چلی گئی۔"

"گاڑی تو کھڑی ہے اس کی۔ تمہاری امی کہاں ہیں؟" ساتھ ہی اوپر دیکھا۔

"امی ٹھیک ہیں، ان کی فکر مت کریں۔ بس پھپھو کو لے آئیں۔ ان کو کھونا ایسے ہے جیسے ہم سعدی بھائی کو دوسری دفعہ کھو دیں گے۔" حنین ایک دم اداس ہو گئی تھی۔

"میں دیکھتا ہوں، تم جاؤ اپنی امی کے پاس بیٹھو۔" وہ الٹے قدموں مڑ گیا۔

باہر سبزہ زار سنسان پڑا تھا۔ وہ قصر کے فرنٹ تک آیا۔ ملازموں کی آگے پیچھے آمد و رفت کچھ غیر معمولی لگ رہی تھی۔

زمر کہیں بھی نہیں تھی۔ وہ گیٹ کے قریب آیا تو اوپری کیبن سے گارڈ نے پکارا۔

"سر! مسز غازی اس طرف گئی ہیں۔" اس نے چونک کر گردن اٹھائی۔ گارڈ اشارہ کر کے بتا رہا تھا۔ وہ باہر گئی تھی۔ باہر سڑک تاریک تھی۔

"فلیش لائٹ دو۔" اس نے ہاتھ بڑھایا۔ گارڈ نے لائٹ اس کی طرف اچھالی۔

"لے جائیں سر! بھلے ہمیشہ کے لیے لے جائیں۔" دل برداشتہ سا کہتا گارڈ واپس بیٹھ گیا۔

فارس نے لائٹ تھامی اور گیٹ سے باہر آیا۔ وہ سڑک پہاڑی کو کاٹ کر بنائی گئی تھی۔ دور دور اونچے محلات تھے، کہیں کئی کئی کنال کی جگہ خالی تھی۔ وہاں جنگل اگ گئے تھے۔ وہ جوگرز پتھروں پہ رکھتا، سڑک کنارے اوپر چڑھنے لگا جہاں اونچے درخت تھے۔ ساتھ ہی فکرمندی سے اسے پکارتا روشنی پھینک رہا تھا۔

"زمر!" آواز رات کے اندھیرے میں گم ہو جاتی، کبھی لوٹ کر سنائی دیتی۔ وہ اوپر چڑھتا آیا۔ ٹارچ والا ہاتھ مسلسل ہل رہا تھا۔ پھر روشنی ایک جگہ تھمی۔ درختوں کے بیچ اسے وہ نظر آئی تھی۔ زمین پہ ننگے پاؤں اکڑوں بیٹھی۔ ٹھوڑی گھٹنوں پہ رکھے۔

فارس نے گہری سانس خارج کی اور چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتا اس تک آیا۔ پتوں اور سوکھی ٹہنیوں کے جوگرز تلے کچلنے کی کرچ کرچ نے خاموشی کو توڑا۔ وہ اس کے قریب آ رکا۔

"آپ ادھر کیوں بیٹھی ہیں؟ گھر چلیں۔"

وہ نہیں ہلی۔ گردن بھی نہیں اٹھائی۔

"زمر، ہم سارے مسئلے گھر جا کر سلجھا سکتے ہیں۔ اٹھیں۔" جب اس نے جواب نہیں دیا تو فارس نے ٹارچ زمین پہ رکھی اور اس کے سامنے درخت سے ٹیک لگا کر خود بھی اکڑوں بیٹھ گیا۔

"آپا نے جو بھی کہا دل سے نہیں کہا۔ وہ آپ کو ہرٹ کر کے خود بھی ہرٹ ہیں۔ مجھے پتا ہے۔ ان سے ناراض مت ہوں۔"

"میں کسی سے ناراض نہیں ہوں۔ سعدی سے بھی نہیں تھی۔" وہ دھیرے سے بولی تو آواز رندھی ہوئی تھی۔ ٹارچ پتوں پہ پڑی تھی۔ روشنی مخالف سمت کے درختوں پہ پڑ رہی تھی۔ زمر کا چہرہ اندھیرے میں تھا۔

"ان کو پتا ہے، آپ سعدی سے خفا نہیں تھیں۔ نہ ان کو یہ بات اذیت دے رہی ہے۔" زمر نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔

"سعدی میری وجہ سے نہیں گیا۔ میں نے اسے نہیں بھیجا۔ میں چار سال اس سے ناراض بھی نہیں تھی۔ مجھے یہ لگتا تھا کہ بچے اب مجھ سے محبت نہیں کرتے، اس لیے میں پیچھے ہٹ گئی تھی مگر میں غلط تھی۔ اور مجھے اس کے لیے بہت دکھ ہے۔" آنسو ٹپ ٹپ آنکھوں سے گر رہے تھے۔ کون سی لونگ، کہاں کا خشت، دونوں کو بھول گیا تھا۔

رات کا سناٹا اور جنگل کے اونچے درخت خاموشی سے سن رہے تھے۔ سامنے تنے سے ٹیک لگائے فارس نے دکھ سے اسے دیکھا۔

"سب کو پتا ہے یہ بات۔"

"میرے پاس کوئی امید نہیں ہے، سوائے ان بچوں کے۔ مگر نہیں۔۔۔" اس نے نفی میں سر ہلایا۔ "یہ میرے بچے نہیں ہیں۔ میرا تو کوئی بھی نہیں ہے۔ اگر

سعدی کو ہم واپس لے آئیں، سب کچھ ٹھیک ہو جائے تو سب سیٹل ہو سکتے ہیں، سوائے میرے۔ میرا کیا ہو گا؟" آنسو برابر گرتے جا رہے تھے۔

"وہ واقعی آپ کے بچے نہیں ہیں۔ وہ آپ کے بھتیجے ہیں، اور یہ ایک مختلف رشتہ ہوتا ہے۔ اس کے اپنے حق ہوتے ہیں اور وہ آپ سے کوئی نہیں چھین سکتا۔" زمر نے جواب نہیں دیا۔ جھکے چہرے پہ لڑھکتے آنسو اندھیرے میں بھی ایسے دکھائی دے رہے تھے۔ ہلکی سی ہوا چل رہی تھی، جس سے اس کے گھنگھریالے کھلے بال بار بار اڑ کر چہرے پہ آ رہے تھے۔

"مجھے دوبارہ کبھی وہ خوشی نہیں مل سکتی جو کبھی میرے پاس تھی۔"

"زمر، روئیں مت۔ آپ کو روتے دیکھ کر مجھے افسوس ہوتا ہے۔ آپ پہ یہ سوٹ نہیں کرتا۔ آپ مضبوط اچھی لگتی ہیں۔ اور مغرور بھی... اور اکھڑ بھی۔" اس نے چہرہ اٹھایا۔ گیلی آنکھوں میں تعجب در آیا۔ وہ اس کے آنسوؤں کو دیکھتے ہوئے کہنے لگا۔ "اور بدتمیز بھی... اور روڈ... اور Bossy اور... بے مروت بھی، اور..." وہ نرمی سے ایک ایک لفظ گنواتا جا رہا تھا۔ چند لمحے وہ اس کو دیکھتی رہی، پھر دھیرے سے مسکرائی اور ہتھیلی کی پشت سے آنسو صاف کیے۔

"میں ایسی نہیں ہوں۔" گردن اکڑا کر بھیگی آنکھوں سے مسکرا کر بولی۔ "میں کنٹرولڈ، ٹھنڈے اور شائستہ مزاج کی ہوں۔"

"آپ کی ڈکشنری میں شائستگی کی تعریف کیا ہے؟" وہ بھی ذرا سا مسکرایا۔ زمر ہاتھ سے آنسو پونچھتی ہلکا سا ہنس دی۔

"عورتوں کو ایسا ہی ہونا چاہیے جیسی میں ہوں۔" پھر مسکراہٹ آہستہ آہستہ سمٹی۔ چند لمحے پہلے کی تلخی نے دل کو دوبارہ سے کسک دی۔ اس نے گردن موڑ کر دور تک پھیلے درختوں کو دیکھا۔ کہیں دور کبھی کسی گاڑی کی زن سے گزرنے کی آواز سنائی دیتی۔ پھر سناٹا چھا جاتا۔

"کیا وہ مجھ سے بہت اتنی خفا تھیں؟" وہ پھر سے آزردہ ہوئی۔

"اونہوں! انہیں آپ پہ غصہ نہیں ہے۔ ان کو الزام دینے کے لیے کوئی چاہیے۔ ہم سب کو چاہیے ہوتا ہے۔ وجہ یہ گھر ہے۔ ان کی اس گھر سے اچھی یادیں وابستہ نہیں ہیں۔"

"مطلب؟" وہ ٹھہر کر اسے دیکھنے لگی۔ اندھیرے میں سامنے بیٹھے فارس کا چہرہ مدھم سا دکھائی دیتا تھا، مگر اس پہ آنچ سی تھی۔

"ابھی گھر چلیں۔ پھر کسی وقت ان سے پوچھ لیجیے گا۔"

"نہیں، بتاؤ میں سن رہی ہوں۔" وہ دھیان سے اسے دیکھ رہی تھی۔

فارس نے گہری سانس لی۔ "یہ میری امی کا گھر ہے، اور..." کہتے کے ساتھ ٹارچ اٹھائی کہ اسے بند کر دے، تب ہی روشنی زمر پہ گری تو وہ چونکا۔ ٹارچ اس کے اوپر ڈالی۔ زمر نے آنکھیں چندھیا کر چہرہ پرے ہٹایا۔ وہ اس کے قدموں میں دیکھ رہا تھا۔ کپڑوں پہ مٹی۔ کانٹے اور...

"پاؤں کو کیا ہوا ہے آپ کے؟" چونک کر اس کے چہرے کو دیکھا۔ "آپ گری ہیں؟" زمر نے سر جھکا۔

"شاید۔"

اس نے روشنی اس کے پاؤں پہ ڈالی۔ انگوٹھا خون میں ڈوبا تھا۔ وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

"گھر چلیں۔"

"تم میرے ساتھ زبردستی نہیں کر سکتے، تمہیں پتا ہے۔" ہمیشہ کے برعکس وہ غصے یا تلخی سے نہیں بولی تھی، بس تھکن سی تھی آواز میں۔

"اچھا، میں آتا ہوں۔" جانے لگا، پھر رکا۔ "میرے آنے تک ادھر سے ہلیے گا نہیں، ورنہ میں قسم کھا کر کہتا ہوں، آپ ابھی مجھے جانتی نہیں ہیں۔" تنبیہہ کرتا وہ نیچے اتر گیا۔ ٹارچ بجھا دی تھی۔ گیٹ تک دوبارہ آیا تو گارڈ کا کیبن خالی تھا۔ کیبن کی سیڑھی کے آس پاس دیکھا۔ مدھم مدھم سی آوازیں آئیں۔ فوراً

قریبی درخت کی اوٹ میں ہوا۔ پھر ٹہنیوں کے درمیان سے جھانکا۔ گارڈ کی پشت تھی اور اس کے سامنے فیونا کھڑی کہہ رہی تھی۔

"مجھے واقعی نہیں معلوم کہ وہ سارے اسٹاف کو کیوں نکال رہے ہیں، مگر اکبر! تم بے فکر رہو۔ میں اپنے اسٹاف کی ہیڈ ہی نہیں، خیر خواہ بھی ہوں۔ میں مسز کاردار سے کہہ دوں گی کہ تم لوگ جاؤ گے تو میں بھی جاؤں گی۔"

"اور وہ تمہیں ایک بہتر پیکج دے دیں گے اور تم ٹھہر جاؤ گی۔ اگر تمہاری جگہ میری اینجیو ہوتی، تو وہ ہم سب کے لیے لڑتی۔" وہ مایوس لگ رہا تھا۔

"میرا قصور نہیں ہے اس میں۔ یہ سب مسز زمر نے کیا ہے۔ انہی کا فون آیا تھا اور اس کے بعد مسز کاردار نے یہ حکم جاری کیا۔"

وہ اوٹ سے نکلا اور آواز دی۔ "اکبر!" گارڈ فوراً گھوما۔ فیونا بھی چونکی۔ وہ چلتا ہوا ان تک آیا۔

"میری بیوی کو چوٹ لگی ہے، کچھ لا دو پٹی وغیرہ کے لیے۔" فیونا کو مخاطب کیا تو وہ فوراً" تابع داری سے آگے ہوئی۔

"اکبر! اپنے کیبن سے ایڈ باکس لے آؤ۔ سر چوٹ زیادہ ہے؟ میں ڈاکٹر کو فون کروں؟ یا پھر میں ان کی پٹی کر دوں؟"

"اونہوں۔ میں کرلوں گا۔" اکبر باکس لے آیا تو فارس فیونا پہ ایک گہری نظر ڈالتا، چیزیں لیے پلٹ گیا۔

☆ ☆ ☆

بے خیالی میں کبھی انگلیاں جل جائیں گی
راکھ گزرے ہوئے لمحوں کی کریدا نہ کرو

اوپر آیا تو زمر ویسے ہی بیٹھی تھی۔ وہ اس کے سامنے بیٹھا۔ ایک گھٹنا موڑے، دوسرا پاؤں زمین پہ رکھے۔

"اور کہاں چوٹ آئی ہے؟" آئس پیک نکال کر اسے دیا جسے اس نے خاموشی سے تھام لیا اور آستین اوپر کر کے کہنی پہ رکھا۔ فارس نے ٹارچ اسے تھمائی۔

"یہ اس اینگل پہ رکھیں۔" اور جب روشنی اس کے انگوٹھے پہ پڑنے لگی تو وہ ٹیلے وائپ سے اس کے پیر کا خون صاف کرنے لگا۔ زمر اس کے جھکے سر کو دیکھے گئی۔

"ندرت بھابھی کو اس گھر سے کیا مسئلہ تھا؟" ان دونوں کو معلوم تھا وہ کیا سننے کے لیے بیٹھی ہے۔ وہ سر جھکائے، زخم صاف کرتے، کہنے لگا۔

"یہ میری امی کا گھر ہے اور میری امی ان کی سوتیلی ماں تھیں۔" اس نے آہستہ سے وہ نوکیلی سی چیز اس کے ماس سے نکالی جس نے انگوٹھے کو کاٹا تھا۔ زمر کے لبوں سے "سس" نکلی۔ فارس نے رک کر اسے دیکھا۔

"ہلکا سا زخم ہے، ٹھیک ہو جائے گا۔ کل ٹیٹنس کا انجیکشن لگوا لیجئے گا۔"

"مجھے کوئی درد نہیں ہو رہا۔" اس نے شانے اچکائے۔ پھر رکی۔ سرسری انداز میں پوچھا۔

"تمہارے ابو اور تمہاری امی اور ان کی پہلی بیوی کے.... میرا مطلب ہے.... کیسے تعلقات تھے ان سب کے؟ ویسے مجھے پتا ہے مگر صرف ان کی سائیڈ کی اسٹوری۔ تمہاری سائیڈ کی نہیں معلوم۔"

اور یہ پہلی دفعہ تھا جب زمر نے بغیر کسی غصے یا عداوت کے اس کی طرف کی کہانی سننی چاہی۔ اس کے انگوٹھے پہ دوا لگاتے ہاتھ رکے۔ لمحے بھر کو ذہن کہیں دور جا پہنچا۔

"یہ گھر میری امی کا ہے۔ شادی سے پہلے وہ اپنے بھائی اور اورنگ زیب کاردار کے ساتھ ان کے گھر میں رہتی تھیں۔ تب یہ جگہ اتنی ڈیویلپڈ اور ایلیٹ نہیں تھی۔ ابو نے ان سے محبت کی شادی کی تھی۔ پہلی بیوی کے ہوتے ہوئے بھی۔ مگر اتنے گٹس نہیں تھے ان میں کہ اپنی بیوی کو ساتھ لے جاتے۔ ندرت آپا اور وارث کی امی نے بہت ہنگامہ کیا شادی پہ۔ سوچتہ نہیں کس نے طے کیا مگر امی ادھر انیکسی میں رہنے لگیں۔ ابو یہیں آجاتے، کبھی رہتے، کبھی چلے جاتے۔ وہاں ان کے بچے تھے۔ یہاں صرف بیوی۔

سر جھکائے، آہستہ آہستہ مرہم اس کے انگوٹھے پہ لگاتے وہ ٹھہر ٹھہر کر بول رہا تھا۔ اس کو اتنا بولنے کی عادت نہیں تھی۔ زمر کے لیے وہ ایک کم گو، پراسرار سا شخص تھا۔ کیا سوچتا ہے' کیا چاہتا ہے' وہ کبھی نہیں کہتا تھا۔ آج کہہ رہا تھا' اور وہ بالکل یک ٹک محو ہو کر سن رہی تھی۔

"میں آٹھ سال کا تھا جب ندرت اور وارث کی امی کا انتقال ہوا۔ ابو مجھے اور امی کو پھر اپنے گھر لے گئے۔ ندرت آپا تب اٹھارہ سال کی تھیں' اور وارث بارہ کا۔ ہم لوگ چھ ماہ رہے ادھر۔۔۔" بولتے بولتے وہ چپ ہو گیا۔ پھر پیکٹ سے پٹی نکالی اور اس کے انگوٹھے کے گرد لپیٹنے لگا۔ جنگل کے اونچے درختوں میں خاموشی چھا گئی۔

"پھر؟" وہ بے چینی سے بولی۔ اپنی ساری انا' اکڑ اور بے نیازی چند لمحے کے لیے پس پشت ڈالے۔

"پھر کیا؟" وہ سر جھکائے سفید پٹی لپیٹ رہا تھا۔

"ندرت بھابھی لوگوں کا رویّہ کیسا تھا تم لوگوں کے ساتھ؟" اس نے ندرت بھابھی کے ذکر کو ذرا نمایاں کیا۔ وہ یہ سوال صرف ان ہی کی وجہ سے تو کر رہی تھی۔

فارس نے گہری سانس لی۔ "وہ مجھ سے نفرت کرتے تھے اور میری ماں سے بھی۔ ہم سے بات بھی نہیں کرتے تھے۔ امی بھی کوئی بہت صابر شاکر خاتون نہیں تھیں' ماموں جیسا غصہ تھا ان میں بھی' مجھ میں بھی' خیر بہت جھگڑے ہوا کرتے تھے آپا اور امی کے۔ وارث لڑتا نہیں تھا مگر جہاں میں آکر بیٹھتا' وہ اٹھ جاتا۔ اگر بول رہا ہوتا تو مجھے دیکھ کر چپ ہو جاتا۔ ہم چھ ماہ وہاں رہے۔ بد ترین دن تھے وہ۔۔۔"

"پھر واپس کیوں چلی گئیں تمہاری امی؟" اس نے نرمی سے پوچھا۔ پتا نہیں کیوں' اس مہیب تاریک جنگل میں اس کے ساتھ بیٹھے' اسے چار سال پہلے کی دو گولیاں' وہ فون کال' سب بھولنے لگا تھا۔ اسے لگ رہا تھا' وہ فارس غازی سے پہلی دفعہ مل رہی ہے۔

"امی نہیں گئی تھیں۔ میں گیا تھا۔" سر جھکائے' فارس نے پٹی کے اوپر شفاف ٹیپ لگا کر اسے پکا کیا۔ پھر پیچھے ہٹا۔ زمر نے بھی پیر ذرا پیچھے کھینچ لیا۔ واپس درخت سے ٹیک لگا کر اکڑوں بیٹھا' اور دائیں جانب درختوں کو دیکھتے ہوئے کہنے لگا۔

"میں اپ سیٹ تھا ایک دن' تنگ آگیا تھا ادھر سے تو بھاگ گیا۔ مذاق نہیں کر رہا۔ سچ میں۔ ڈھائی گھنٹہ بھاگتا رہا۔ پھر یہاں پہنچ گیا۔ واپس۔"

"تمہیں گھر کا راستہ آتا تھا؟ اتنی سی عمر میں؟" اس کو تعجب ہوا۔ فارس نے گردن اس کی طرف موڑی' اداسی سے مسکرایا۔

"مجھے تو بہت کچھ آتا ہے۔ آپ مجھے جانتی ہی کتنا ہیں؟"

وہ کچھ نہیں بولی۔ بس پرسوچ نظروں سے اسے دیکھے گئی۔

"میں ادھر آیا تو اورنگ زیب ماموں کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ وہ گھر پہ نہیں تھے۔ مسز کاردار تھیں۔ یہ لوگ تب بھی امیر تھے مگر اتنے امیر نہیں ہوتے تھے۔ ان کا گھر بھی تب مختلف تھا۔ یہ عالیشان قصر تو بعد میں ڈھا کر کھڑا کیا تھا۔ خیر مسز جواہرات گھر پہ تھیں۔ وہ مجھے اندر لے آئیں' میرے لیے کمرہ تیار کروایا' میرے پیروں کی مرہم پٹی کی۔ بہت خیال سے دو دن مجھے اپنے گھر رکھا۔ تیسرے دن میرے ماں باپ کو بلایا' اور کہا اپنے بچے کو لے جاؤ۔ یہ سارے کاردارز امریکی کھوپڑی والے ہیں' مہمان بس دو دن اچھا' پھر مچھلی بن جاتا ہے۔"

وہ دھیرے سے مسکرائی۔ وہ بھی شاید مسکرایا تھا مگر اب پھر سے گردن موڑے اندھیرے درختوں کو دیکھ رہا تھا۔ "امی اور میں واپس ادھر ہی آگئے' اور ابو اپنے بچوں کے ساتھ رہے۔ اگلے سال ندرت آپا کی شادی ہو گئی۔ وارث کو ابو نے پڑھنے لاہور بھیج دیا' ذکیہ خالہ کے گھر۔ وہ وارث اور ندرت کی امی کی سگی بہن ہیں۔ یونو' سارہ کی امی۔ وارث وہیں پڑھتا رہا' اور ابو میرے اور امی کے پاس واپس آگئے۔"

ہوا تاریک درختوں کے پتوں کے بیچ سرسراتی ہوئی

گزر رہی تھی۔ اس کی گھنگھریالی لٹیں چہرے پہ آرہی تھیں، جن کو وہ بار بار کان کے پیچھے اڑستی تھی۔ نگاہیں فارس کے چہرے پہ ٹکی تھیں۔ اس نے اب سر درخت کے تنے سے لگا رکھا تھا، اور آنکھوں میں بے پناہ تھکن تھی، کرب تھا۔

"میں دس سال کا تھا جب سعدی پیدا ہوا۔"

(میں آٹھ سال کی تھی) اس نے صرف سوچا۔ بولی نہیں۔ وہ کبھی کبھی تو بولتا تھا، اسے لگا اگر بولے گی تو اس کی یکسوئی ٹوٹ جائے گی۔

"اور میں تیرہ سال کا تھا جب ندرت آپا ناراض ہو کر ہمارے گھر آگئیں۔ ان کا آپ کی امی سے جھگڑا ہوا تھا۔ سعدی کو بھی وہیں چھوڑ دیا، غصے میں، کہ خود پالیں۔ اور ابو چونکہ دوسرا گھر بیچ چکے تھے، اس لیے ان کے پاس یہاں آنے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ یہ وہ واحد عرصہ تھا جو آپا نے اس گھر میں گزارا، اور تب بھی حالات ایسے ہی تھے، جیسے آج ہیں۔ سعدی ان سے چھن چکا تھا، اور وہ بہت کرب اور تکلیف میں تھیں۔ تین ماہ بعد ابو کا انتقال ہو گیا اور ندرت آپا کی ساری زندگی گویا ہوا میں معلق ہو کر رہ گئی۔ وارث کی چھٹیاں تھیں، وہ بھی ادھر آگیا۔ اب ہمارے جھگڑوں کی ساری وجوہات ختم ہو چکی تھیں۔ سعدی نہیں تھا، تو پتا نہیں کیوں آپا کا رویّہ مجھ سے بدلنے لگا۔ انہوں نے مجھے ایک چھوٹے بھائی کے طور پہ قبول کر لیا۔ وہ لوگ اب بھی مجھ سے زیادہ بات نہیں کرتے تھے، مگر برا بھی نہیں کہتے تھے۔ پھر آپا کی صلح ہو گئی تو وہ چلی گئیں اور وارث بھی... میں اور امی ادھر ہی ہوتے۔"

وہ پوری توجہ سے سن رہی تھی۔

"میں اٹھارہ سال کا تھا جب امی فوت ہوئیں۔ تب آپا آئیں اور مجھے اپنے ساتھ اپنے گھر لے گئیں۔ اس صلح کے بعد ہی آپ کے بھائی نے ان کو الگ گھر لے دیا تھا۔ میں کافی عرصہ ان کے گھر رہا۔ حنہ تب ایک سال کی تھی۔ مگر اس کے بعد آپا اور وارث نے ہمیشہ میرا خیال رکھا، ہم لوگوں نے ایک دوسرے کو سمجھنا شروع کر دیا اور ہمارے سارے اختلافات پتا نہیں کہاں غائب ہو گئے۔ بلکہ... وارث اور میں تو بہت اچھے دوست بن گئے تھے..." وہ یاد کر کے، کہتا جا رہا تھا۔

"پھر بھی تم نے اسے قتل کر دیا!"

خوب صورت رات کا فسوں چھناکے سے ٹوٹا۔ وہ کہہ کر ایک دم چپ ہو گئی۔ فارس نے چونک کر اسے دیکھا، پھر آنکھیں میچ کر جیسے بہت سارا ضبط کیا اور جب آنکھیں کھولیں تو زمر نے دیکھا، اس کے تاثرات اب سخت ہو چکے تھے۔ وہ ہاتھ جھاڑتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا۔ پیکٹ اٹھا لیا۔ (یہ عورت کسی دن واقعی میرے ہاتھوں ایک قتل کروائے گی!)

"سحری کا وقت شروع ہونے والا ہے، گھر چلیں، سب پریشان ہوں گے آپ کے لیے۔" وہ اس کی طرف سے رخ موڑ گیا۔ وہ بھی اٹھ کھڑی ہوئی تو وہ آگے چلنے لگا۔ زمر کو اندر ہی اندر اس موقعے پہ وارث کی موت کا افسوس کرنے پہ افسوس ہوا۔

وہ دونوں خاموشی سے گیٹ تک آئے تو اس نے پیکٹ اوپر کیبن تک اچھالا جسے گارڈ نے پھرتی سے کیچ کیا۔ پھر ایک نظر ساتھ چلتی زمر پہ ڈالی جو کسی اور خیال میں گم تھی۔

"مسز کاردار نے اسٹاف نکال دیا سارا۔" غور سے اسے دیکھا۔ اس نے ہلکے سے شانے اچکائے۔

"ان کی مرضی۔" وہ اس سے لاعلم تھی۔ فارس نے فینو نا کی باتوں کو ذہن سے جھٹکا۔

"آپ نے نوشیرواں سے بات کی؟" اب وہ دونوں سرسری انداز میں بات کرتے سبزہ زار سے گزر رہے تھے۔

"ہوں۔" وہ بتاتی گئی۔

"آپ نے یقین کر لیا؟"

"نہیں، وہ اب بھی جھوٹ بول رہا ہے۔ وہ ضرور کچھ جانتا ہے اور اسے چھپا رہا ہے۔"

"میں بات کرتا ہوں۔"

"نہیں، فی الحال اس کو کھلا چھوڑ دو، اگر وہ کانشس ہو گیا تو کچھ نہیں بتائے گا۔"

جب وہ دونوں اندر آئے تو حنہ، سیم اور ابا ویسے ہی
لاؤنج میں بیٹھے تھے۔ ان کو پر سکون اور نارمل سا آتے
دیکھ کر ان سب کی بھی سانس بحال ہو گئی۔ پھر کسی نے
کسی سے کچھ نہیں پوچھا۔ صداقت کو حنہ نے بلا لیا،
وہ آ کر سحری تیار کرنے لگا۔ زمر دہی کا پیکٹ اور چمچ لیے،
اوپر کمرے میں چلی گئی۔ ندرت نے بھی سحری کمرے
میں ہی کی۔ باقی سب نیچے خاموشی سے لاؤنج میں بیٹھے
رہے۔

جب فجر اتر آئی، اور سورج طلوع ہو کر تپتا سنہرا
ہو گیا اور سب اپنے کمروں سے نکلے، تیار ہو کر ایک
نئے دن کے آغاز کے لیے تو زمر باہر آئی اور ندرت کو
سلام کیا۔ انہوں نے جواب بھی دیا اور یہ بھی پوچھا کہ
وہ ابھی ریسٹورنٹ جائے گی یا بعد میں۔ زمر نے بھی
اتنے ہی نارمل انداز میں بتایا کہ وہ پہلے کورٹ جائے گی،
ایک کلائنٹ کی سماعت ہے اور پھر ریسٹورنٹ آئے
گی۔ اور یہ سب کہتے ہوئے سب نے دیکھا کہ اس
نے وائٹ گولڈ کی نتھ پہن رکھی ہے مگر کسی نے نہیں
پوچھا کہ وہ لونگ کہاں گئی۔

اور جیسے کہ عموماً "رشتے داروں میں ہوتا ہے" لڑائی
کے بعد معافی تو کوئی نہیں مانگتا مگر موڈ اچھا کر کے یہ بتایا
جاتا ہے کہ ہمارے گلے شکوے ڈھل گئے ہیں، سو ان
کے گھر کا ماحول بھی نارمل ہو گیا۔ البتہ اسی صبح، زمر کے
نکلنے سے پہلے حنین نے سعدی کا لیپ ٹاپ لا کر اس
کے سامنے رکھا۔

"یہ میں نے کھول دیا ہے۔ اب کوئی پاس ورڈ نہیں
ہے اس پہ۔ آپ دیکھ لیں۔ کوئی اور بھی کام ہو تو بتایئے
گا۔" نگاہیں جھکائے وہ پلٹ گئی۔ زمر نے بھی کچھ نہیں
کہا۔

مگر اس واقعے کے بعد اتنا ضرور ہوا کہ ندرت جو
بالکل چپ ہو گئی تھیں، وہ نارمل ہونے لگیں۔ سیم،
حنہ کو ڈانٹ ڈپٹ، گھر کے کام، سب کچھ انہوں نے
نارمل انداز میں پہلے کی طرح کرنا شروع کر دیا۔ سعدی
کے لیے دعا اور یاد ویسی ہی تھی مگر انہوں نے سمجھوتا کر
لیا تھا۔ حنین نے بھی اس کے بعد زمر کو سنانا بند کر دیا
اور زمر نے فارس سے تلخ باتیں کہنی چھوڑ دیں۔

بالآخر سعدی یوسف کے گھر والوں نے یہ جان لیا
تھا کہ ایک دوسرے کو الزام دینے سے کچھ حاصل
نہیں ہوتا، بلکہ جو پاس ہے، وہ بھی چلا جائے گا۔

☼ ☼ ☼

دو چار نہیں مجھ کو، فقط ایک دکھا دو
وہ شخص جو اندر سے بھی باہر کی طرح ہو

سعدی نے آنکھیں کھولیں تو دھند سی تھی۔ اس
نے پلکیں جھپکیں۔ منظر ذرا واضح ہوا۔ وہ آہستہ سے
کہنی کے بل اٹھ بیٹھا اور آس پاس دیکھا۔

پچھلے چند دن سے وہ اس کمرے میں جاگا کرتا تھا۔
نیند کی حالت میں اسے شفٹ کیا گیا تھا، کہاں؟ کچھ
معلوم نہیں۔ رمضان کتنا گزر چکا تھا، سحری کب ہے
اور افطار کب، اس کمرے میں کچھ خبر نہ ہو پاتی تھی۔

وہ ایک سادہ بیڈ روم تھا۔ دیواریں مٹیالے رنگ میں
رنگی تھیں۔ دروازے سفید تھے۔ ایک سنگل بیڈ تھا
جس پہ وہ لیٹا تھا۔ ساتھ ملحقہ باتھ روم۔ اور کچھ نہیں،
سوائے سائیڈ ٹیبل پہ رکھے اس کے قرآن اور جائے
نماز کے، یا پھر ایک کاؤچ کے جس پہ دن کا اکثر حصہ
میری اینجیو آ کر بیٹھ جاتی تھی۔

اس وقت وہ وہاں نہیں تھی بلکہ دروازہ کھول کر
ڈاکٹر مایا اندر آ رہی تھی۔ اس کے ساتھ ایک میل
نرس بھی تھا۔ سعدی نے نظر اٹھا کر دیکھا، کھلے
دروازے کے پار گارڈز کھڑے تھے، آگے شاید ٹی وی
لاؤنج تھا۔ اتنا ہی نظر آیا اور پھر دروازہ بند ہو گیا۔

مایا بیڈ کے قریب اسٹول پہ بیٹھی۔ اس کے لمبے بال
کھلے تھے جنہیں وہ کانوں کے پیچھے اڑس رہی تھی۔
نیلی جینز پہ لمبا سفید اوور آل پہن رکھا تھا۔ کم عمر
چہرے پہ معصوم سا تاثر تھا۔ وہ خاموشی سے بیٹھا رہا۔
مایا نگاہیں سعدی کے زخموں پہ جھکائے، نرس کو پٹی کی
ہدایت دیتی رہی۔ اس کے زخم مندمل ہونے کے
قریب تھے۔

نرس چلا گیا تو وہ اٹھی، گولیاں اور پانی کا گلاس بھر کر

اسے دیا۔ نگاہیں اٹھا کر اس کا چہرہ دیکھا۔ اس کی شفاف آنکھوں میں اس لڑکے کے لیے اپنائیت بھری ہمدردی تھی۔

"پی لو۔ تم روزہ نہیں رکھ سکتے' دوا دینی پڑتی ہے۔ یہ مسٹر کاردار کا حکم نہیں ہے' میرا ہے۔"

اس نے گلاس تھاما اور دوا پانی سے نگل لی۔

وہ اسٹول پہ بیٹھ کر یونہی اس کا چہرہ دیکھنے لگی۔

"تمہاری فیملی میں کون کون ہے؟"

سعدی نے چونک کر اسے دیکھا۔ وہ اپنی شفاف آنکھوں میں ڈھیروں ترحم لیے' اسے دیکھ رہی تھی۔

"بہن بھائی' امی اور بھی کچھ لوگ۔"

"کیا ان کو معلوم ہے کہ تم کس کے پاس ہو؟"

"نہیں۔" وہ ہولے سے بولا۔ سر جھکا دیا۔

"میں اپنے باپ کی وجہ سے مجبور ہوں۔ وہ مقروض ہیں ہاشم کاردار کے۔ اور میں اس نوکری پہ مجبور ہوں' ورنہ....." اس کی آواز سرگوشی میں بدلی۔ تب ہی دروازہ ایک دم کھلا۔ مایا کرنٹ کھا کر پیچھے ہوئی۔ سعدی نے بھی چونک کر دیکھا۔

میری اندر داخل ہو رہی تھی اور..... اسے کچھ کھٹکا تھا۔

"تم ابھی تک کیوں بیٹھی ہو؟"

مایا' ذرا گھبرا کر اٹھی۔ صاف ظاہر تھا وہ میری کے رعب میں تھی۔

"میں اس سے طبیعت پوچھ رہی تھی۔" وہ ڈر گئی تھی۔

میری نے گھوم کر اسے دیکھا۔ "تمہیں اس سے مخاطب ہونے کی اجازت نہیں ہے۔ باہر جاؤ۔" مایا فوراً" ہی باہر نکل گئی تو میری اس کے قریب آئی۔ سلگتی نظروں سے اسے گھورا۔

"یہ کیا پوچھ رہی تھی؟"

"یہی کہ میری فیملی میں کون کون ہے؟"

میری چند لمحے بے بسی بھرے غصے سے اسے دیکھتی رہی' پھر اس نے زوردار تھپڑ سعدی کے منہ پہ مارا۔ اس کا پورا دماغ گھوم گیا' دنیا چکرا گئی۔ دوسری طرف کو گرنے لگا اور ابھی سنبھل بھی نہ پایا تھا کہ وہ جھکی اور اسے گردن سے دبوچ کر سامنے کیا۔

"میں زندگی میں تمہیں پہلی اور آخری نصیحت کر رہی ہوں' سعدی یوسف خان! مایا اچھی ہے' بہت اچھی۔ لیکن اگر تم نے اس کو استعمال کرنے کی کوشش کی تو تمہارا بہت بُرا حال ہوگا۔ ہاشم تمہاری جان لے لے گا۔" جھٹکے سے اس کی گردن چھوڑی۔ سعدی کا سر چکرا کر رہ گیا تھا۔

"میں نے کچھ نہیں کہا اسے۔" (اگر کسی مرد نے مارا ہوتا تو وہ وضاحت نہ دیتا مگر وہ میری تھی۔) لیکن میری سنے بغیر ہی تیزی سے باہر مایا کے پیچھے لپکی تھی۔

☆ ☆ ☆

وہ مجھ کو قتل کر کے کہتے ہیں
مانتا ہی نہ تھا یہ' کیا کیجئے؟

انیکسی دھوپ میں جھلس رہی تھی جب وہ کسی کام سے گھر آیا اور سیدھا اوپر اپنے کمرے کا دروازہ کھولا تو دیکھا۔ کھڑکیاں کھلی تھیں' روشنی اندر آ رہی تھی۔ زمر اسٹڈی ٹیبل پہ بیٹھی' مٹھی گال تلے رکھے کچھ سوچے جا رہی تھی۔ سامنے سعدی کا لیپ ٹاپ کھلا پڑا تھا۔

وہ رات والے لباس میں تھی' بال بھی گول مول بندھے تھے۔ صبح سے باہر نکلی نہیں تھی۔ پیر کا انگوٹھا اس روز سے آج تک پٹی میں بند تھا۔ وہ اسے نظرانداز کرتا الماری کی طرف بڑھ گیا۔

"کیا تم نے میری پکچرز لی تھیں؟" اس کے سوال پہ وہ رکا اور پلٹا تو چہرہ سامنے آیا' اس پہ تعجب تھا۔ زمر پشت کیے بیٹھی رہی۔

"کیا؟"

"جب میں اس ریسٹورنٹ میں زخمی پڑی تھی' اور تمہاری بیوی بھی' تو کیا تم نے اس منظر کی پکچرز لی تھیں؟" بڑے ٹھنڈے انداز میں پوچھا۔ مڑی بھی نہیں۔

فارس کے ابرو تن گئے' آنکھوں میں سختی در آئی۔

"آپ جواب میں کیا سننا چاہتی ہیں؟ کیا بات آپ

کو خوش کرے گی؟ بتائیے میں کہہ دیتا ہوں۔"

زمر نے جواب نہیں دیا۔ چپ بیٹھی رہی۔ وہ بھی پلٹ گیا۔ الماری سے چند کاغذات نکالے اور پٹ زور سے مار کر بند کیا۔ پھر تیزی سے باہر نکل گیا۔

وہ پھر سے اسکرین پہ وہی تصویریں نکال کر دیکھنے لگی، جو سعدی کے لیپ ٹاپ میں تھیں۔ (یہ وہی تصاویر تھیں جو سعدی نے ہاشم کے لاکر سے نکالی تھیں اس رات جب شیرو نے اپنے اغوا کا ناٹک رچایا تھا۔) سعدی کے سامان، اس کے ٹیبلیٹ اور اب اس کے لیپ ٹاپ میں سوائے ان تصاویر کے کچھ بھی ایسا نہ ملا تھا جو اس کے کسی دشمن کی خبر کر سکتا۔

بالآخر زمر نے موبائل اٹھایا اور احمر کے نام میسج لکھا۔ "احمر شفیع! کیا ہم مل سکتے ہیں؟"

جواب چند لمحے بعد آ گیا تھا۔

"پہلے بولیے، پلیز!" ساتھ ہی زبان نکالتا اسمائیلی!

وہ ہلکا سا مسکرائی۔ "ایک گھنٹے میں ریسٹورنٹ پہنچ جائیے اس سے پہلے کہ میں اپنا ارادہ بدل دوں۔" اور موبائل پرے ڈال دیا۔

آدھے گھنٹے بعد زمر تیار ہو کر، بال کیچو میں باندھے، پرس کہنی پہ ٹکائے باہر نکلی تو پرسکون لگ رہی تھی۔ کار کی طرف بڑھتے اس نے دیکھا، سامنے سبزہ زار پہ، مسز کاردار کے کمرے کے عقبی برآمدے میں جواہرات اور ندرت بیٹھی تھیں۔ (کافی دن سے جواہرات سے ملاقات نہیں ہوئی، سو اب ادھر جا بیٹھی تھیں۔) جواہرات نے مسکرا کر ہاتھ ہلایا۔ زمر نے مسکرا کر سر کو خم دیا اور کار میں بیٹھی۔ پھر ان کی نظروں کے سامنے کار زن سے آگے گزر گئی تو جواہرات نے ندرت کی طرف چہرہ موڑا۔

"ایسا لگتا ہے زمر، فارس کے ساتھ خوش نہیں ہے۔"

ندرت جو اسی طرف دیکھ رہی تھیں، چونک کر جواہرات کو دیکھا۔

"نہیں، وہ دونوں ٹھیک ہیں۔" ذرا سنبھل کر بولیں۔

"میں اس لیے کہہ رہی ہوں کیونکہ مجھے ان دونوں کی فکر ہے۔ نئے شادی شدہ جوڑے ایسے ایک دوسرے سے کٹے کٹے نہیں رہتے جیسے یہ دونوں رہتے ہیں۔"

"سعدی کی وجہ سے... ایسا ہے!" وہ بس اتنا کہہ پائیں۔ آنکھوں میں ڈھیروں تکان اتری۔

"میرا نہیں خیال کہ صرف سعدی کی وجہ سے ایسا ہے۔ اگر سعدی آ گیا تو کیا یہ دونوں ایک دم سے ٹھیک ہو جائیں گے، اونہوں۔"

ندرت خاموش رہیں۔

"یقیناً" یہ باتیں آپ کے ذہن میں بھی گھوم رہی ہوں گی ندرت! مگر ظاہر ہے آپ یہ فارس سے کہہ نہیں سکتیں کیونکہ آپ اس کے گھر میں رہ رہی ہیں۔" مسکراتے ہوئے نرمی سے وہ کہہ رہی تھی۔ "مگر کبھی کبھی انسان کو اپنے چھوٹوں کو ٹوک دینا چاہیے۔ اس میں ان ہی کا فائدہ ہے۔"

ندرت نے ایک گہری سانس اندر اتاری۔ "نہیں مسز کاردار، میاں بیوی کے معاملے میں ہمیں نہیں بولنا چاہیے، ایک دوسرے کو الزام دینے سے صرف گھر کا ماحول خراب ہوتا ہے اور پھر یہ گھر تو میرے ابو اور بھائی کا ہے۔ میرا اپنا ہی ہوا، اس لیے مجھے سب کا سوچنا چاہیے۔" اپنے ازلی گھریلو اور سادہ انداز میں وہ کہتی گئیں۔ جواہرات کو بات پسند نہیں آئی مگر خاموش رہی۔

وہ اٹھیں تو فیونا آئی۔ ایک ننھا سا باکس اور خط کا لفافہ سامنے کیا۔

"کوئی ڈرائیور تھا، آپ کے لیے دے گیا ہے۔ کہہ رہا تھا، اوپر نام لکھا ہے۔" کہہ کر وہ پلٹ گئی۔

جواہرات نے باکس کھولا۔ اندر میرون مخمل پہ ایک ہیروں سے جھلملاتا بریسلیٹ رکھا تھا۔ اس نے دو انگلیوں میں بریسلیٹ نکال کر دیکھا۔ پھر کارڈ کھولا۔ اس پہ فارسی میں لکھا تھا۔

من خشت بہ ملکہ داد!
چہ خشت را ملکہ مغرور!

ہارون عبید۔"
(میں نے پیش کیا ملکہ کو ایک ہیرا! کیونکہ ہیرے ملکہ کو مزید مغرور بناتے ہیں)
"ہارون عبید اور اس کی ایرانی ماں کا فارسی ٹچ!" وہ اس کارڈ کو دیکھ کر بے نیازی سے مسکرائی۔
"سو اتنے سال بعد ہارون عبید اسی شہر میں واپس آ ہی گئے۔" کوئی عجیب سا احساس تھا جو اس خوب صورت اور سنگ دل ملکہ کو اپنی لپیٹ میں لے رہا تھا اور یہ احساس یقیناً "ناخوشگوار" نہیں تھا۔
"من خشت بہ ملکہ داد!" اس نے مسکراتے ہوئے دہرایا۔

☼ ☼ ☼

تیرا بھولا ہوا پیمانِ وفا
مر رہیں گے اگر اب یاد آیا

ریسٹورنٹ پہ افطار ہونے کی تیاریاں زور و شور سے جاری تھیں۔ ملازموں کی بھاگ دوڑ لگی تھی۔ ایسے میں اوپری پورشن لاک کر کے، زمر نیچے آ بیٹھی تھی اور اس وقت اس کے سامنے ہنستا مسکراتا احمر بیٹھا تھا۔
"جی مسز زمر! کیسے یاد کیا آپ نے مجھے؟"
وہ ٹانگ پہ ٹانگ جمائے، گھنگھریالی لٹ انگلی پہ لپیٹتے بولی۔ "مجھے آپ کی سروسز درکار ہیں۔"
"یعنی آپ مجھے ہائر کرنا چاہتی ہیں؟ گڈ۔" ذرا سا مسکرایا۔
"پہلے مجھے آپ کی ماہرانہ رائے چاہیے، خالص غیر جانبدار رائے۔"
"شیور! ویسے میری کنسلٹنسی فیس پانچ ہزار روپے ہے مگر چونکہ آپ غازی کی وائف ہیں تو آپ سے میں..." ذرا سوچنے کی اداکاری کی۔ "پانچ ہزار ہی لوں گا۔" شرارت سے مسکرایا۔
زمر نے پرس سے ایک گلابی نوٹ نکال کر سامنے رکھا۔ "ایک غیر جانبدار، اور سمجھ دار انسان کی حیثیت سے آپ..."
"میم! جب آپ اتنی عزت کرتی ہیں تو مجھے لگتا ہے، ابھی بے عزتی ہونے والی ہے۔" اس نے نوٹ والٹ میں رکھتے ہوئے کہا۔
"احمر شفیع! میں سنجیدہ ہوں!" اور وہ واقعی سنجیدہ تھی۔ صرف ایک لمحہ لگا احمر کو سیدھا ہونے میں۔
"پوچھیے۔" اب کے وہ سنجیدہ نظر آ رہا تھا۔
"آپ sensible (سمجھ دار) اور ذہین انسان ہیں، کرمنل بھی رہ چکے ہیں اور پیدائشی فراڈ بھی ہیں، مطلب کہ تجربہ کار ہیں، اس لیے اپنی پوری ایمانداری سے بتائیے، آپ کی رائے میں، کیا فارس غازی نے اپنے بھائی اور بیوی کو قتل کیا تھا؟"
"ایمان داری سے بتاؤں؟"
زمر نے اثبات میں گردن ہلائی۔
"جی، میرے خیال میں، اس نے بالکل یہ دونوں قتل کیے تھے۔"
زمر ذرا سا مسکرائی۔ "واؤ۔ میرا خیال تھا، صاحبی السجن بہترین دوست ہوتے ہیں۔"
"مسز زمر، آپ نے مجھ سے میری دیانت دارانہ رائے مانگی، میں نے دے دی۔ غازی کو خود بھی علم ہے کہ مجھے اس کی بے گناہی کا یقین نہیں۔" وہ اب مکمل سنجیدہ تھا۔ پروفیشنل۔
"آپ کو کیوں یقین نہیں؟ آپ تو اس کے دوست ہیں۔"
"دوست ہوں، اندھا نہیں ہوں۔ غازی کے خلاف جتنے ثبوت ہیں، وہ اتنے ٹھوس ہیں، اتنی مضبوط گواہیاں ہیں، کہ ایسا ممکن نہیں کہ کوئی اس حد تک جائے آپ کو پھنسانے کے لیے۔ اگر اس کا کوئی سرعام کھلے عام دشمن ہوتا تو میں پھر بھی مان لیتا مگر فی الحال میرے خیال میں، اس نے یہ قتل کیے تھے۔ ہاں آپ کے برعکس میں اسے مارجن دے سکتا ہوں۔ اس کی بیوی اور بھائی اس کو دھوکا دے رہے تھے، اس کے پاس اور کوئی راستہ نہیں تھا۔"
"میرے خیال میں بھی ایسا ہی ہے۔ اس نے واقعی وہ قتل کیے تھے اور مجھ پہ گولی چلائی تھی۔" چند لمحوں کی خاموشی چھائی رہی۔

"مسز زمر' آپ نے یقیناً" مجھ سے اب اگلا سوال پوچھنا ہے کیونکہ صرف ایک سوال کے لیے تو آپ مجھے بلائیں گی نہیں۔ سو یاد رکھیے۔ اس کے پانچ ہزار الگ سے ہیں۔"

"شیور!" اس نے دوسرا گلابی نوٹ نکالا اور سامنے رکھا' پھر سعدی کے لیپ ٹاپ کو قریب کیا' چند بٹن دبائے اور پھر بولی۔ "مجھے یہ چند تصاویر ملی ہیں' اور ساتھ میں اس کال کی آڈیو جو فارس نے مجھے کی تھی۔ یہ دونوں ایک ہی وقت میں کاپی کی گئی ہیں' آج سے ڈیڑھ سال پہلے۔ یہ تصویریں مجھے اور زرتاشہ کو گولی مار دینے کے بعد کی ہیں۔" زمر نے لیپ ٹاپ کا رخ اس کی طرف موڑا۔ احمر سنجیدگی سے اسکرین کی طرف متوجہ ہوا مگر تصاویر دیکھ کر... اس کے لب کھل گئے۔ آنکھیں صدمے اور تعجب سے پھیلیں۔

پھر اس نے خود ہی اسکرین فولڈ کر دی۔ زمر بظاہر نارمل اور پر سکون' اس کو دیکھ رہی تھی۔

"آئی ایم سو' سوری!"

"میں غلط ہو سکتی ہوں اپنی جانب داری کی وجہ سے مگر آپ بتائیے۔" وہ ٹھہری۔ "آپ کے خیال میں' کیا فارس یہ پکچرز لے سکتا ہے؟"

احمر کا سر نفی میں ہلا۔ "کبھی نہیں۔"

"کیوں؟"

" وہ murderer (قاتل) ہو سکتا ہے ' monster(شیطان) نہیں اور یہ تصویریں..." اس نے نفی میں سر ہلایا۔ "اونہوں۔ دیکھیں' آنر کلنگ ہوتی ہی ان دو لوگوں کو اپنی زندگی سے مٹانے کے لیے ہے' یہ ہاٹ بلڈڈ مرڈر ہوتا ہے مگر ایسی تصویریں... یہ تو کولڈ بلڈڈ مرڈر پہ لی جاتی ہیں جن میں آپ کی اپنے شکار کے ساتھ کوئی جذباتی وابستگی نہیں ہوتی۔ نہ محبت' نہ نفرت۔ وہ آپ کے لیے صرف آپ کی مہارت کا ثبوت ہوتا ہے۔ آپ سمجھ رہی ہیں نا کہ میں کیا کہہ رہا ہوں؟"

زمر نے اثبات میں سر ہلایا۔ "بالکل' کیونکہ میرا بھی یہی خیال ہے۔ میں فارس کے بارے میں ہر بات پہ یقین کر سکتی ہوں مگر... وہ اس حد تک نہیں جا سکتا۔ وہ یہ نہیں کر سکتا۔" اس نے ٹی میں بندھے انگوٹھے کو جوتے سے مسلا۔ میز کی چمکتی سطح میں اپنا عکس نظر آیا تو وائٹ گولڈ کی نتھ چمکی مگر اس نتھے "خشت" (ہیرے) والی لونگ جیسی چمک اس میں نہ تھی۔

احمر چند لمحے کے لیے خاموش ہو گیا۔ ریسٹورنٹ میں لوگوں کی چہل پہل سے وہ دونوں کٹ چکے تھے۔

"مسز زمر! آپ کو کچھ اور بھی چاہیے شاید مجھ سے؟"

زمر نے ہلکی سی گردن ہلائی۔ "مجھے ایک قابل اعتماد انویسٹی گیٹو چاہیے اور مجھے پتا ہے کہ آپ اپنے کام میں مہارت رکھتے ہیں۔ میں چاہتی ہوں' آپ مجھے پتا کر کے دیں کہ یہ تصویریں ہوٹل کے کس کمرے سے لی گئی ہیں' کس نے لیں۔ اور سعدی کو یہ کہاں سے ملیں؟ مجھے لگتا ہے وہاں کوئی اور بھی تھا۔ یہ فارس نہیں ہے' تو پھر کون ہے؟ ہو سکتا ہے اسی شخص کا سعدی کی گمشدگی میں ہاتھ ہو۔ فارس کے دشمن ہیں' اور سعدی کو اسی کے دشمنوں نے غائب کروایا ہے۔"

"شیور...! میں پتا لگانے کی کوشش کرتا ہوں اور آپ کو کہنے کی ضرورت نہیں۔ یہ میرے اور آپ کے درمیان رہے گا۔"

"فارس..." زمر کچھ کہتے کہتے چپ ہو گئی۔

احمر نے غور سے اسے دیکھا۔ "جی؟"

"آپ کا کبھی کسی غصہ ور آدمی سے واسطہ پڑا ہے احمر؟"

"جی۔ میرے ابو۔ بہت غصہ ور تھے۔ اسی لیے تو میں اتنا سوئیٹ ہوں۔"

"غصہ ور آدمی پتا ہے کیسا ہوتا ہے؟ اسے جلد غصہ چڑھتا ہے پھر وہ نہیں دیکھتا کہ آگے کون ہے' بس اسے رگید دیتا ہے' پھر غصہ ٹھنڈا ہوتا ہے تو معافی مانگتا ہے' دوبارہ کبھی غصہ نہ کرنے کا وعدہ کرتا ہے اور کچھ دن بعد پھر وہی حرکت کرتا ہے۔ مگر فارس... وہ ایک طرف ایک غصیلا انسان مشہور ہے مگر... کوئی چیز ایڈاپ

نہیں ہوتی اس کے پرسنالٹی اسکیچ میں، کچھ غلط ہے۔ وہ جیل میں کیسا تھا؟"

"وہ اپنا سارا وقت... مطلب زیادہ وقت... لڑائی جھگڑوں میں گزارتا تھا، یونو... پھڈے، گروہ بندیاں اور وہ دوسروں کے لیے ہی لڑتا تھا۔ اگر اتنا وقت وہ اپنے پریزن رائٹس حاصل کرنے کے لیے لگاتا تو آج جیل جنت بن چکی ہوتی۔ ویسے میں ایک تحریک شروع کرنا چاہتا ہوں، قیدیوں کے پریزن رائٹس کے حوالے سے اور..."

"تھینک یو احمر!" وہ ذرا تکان سے مسکرائی۔ "تو آپ میرے لیے کام کریں گے؟"

"بالکل، مگر کچھ وقت لگے گا اور... میم، میں پندرہ ہزار فی گھنٹہ لوں گا۔ میرے علاوہ آپ کسی سے یہ کام کروا بھی نہیں سکتیں!"

"اس کو دوسرے لفظوں میں بلیک میلنگ کہتے ہیں۔"

"نہیں، اس کو ایک ایکسپرٹ ہائر کرنے کی فیس کہتے ہیں۔ آپ کو اندازہ ہے کہ ہارون عبید مجھے کتنا پے کر رہے ہیں؟"

"کون ہارون عبید؟"

احمر کا منہ بنا۔ "آپ اتنے مشہور سیاستدان کو نہیں جانتیں، میں نہیں مان سکتا۔"

"اچھا وہ ہارون عبید! انہوں نے تو ایک اسکینڈل کے بعد فارن منسٹری سے استعفیٰ دے دیا تھا۔ اب کہاں سے آ گئے؟"

"آہ، ہمارے سیاستدان! یہ کچھ عرصہ Hibernite کرتے ہیں پھر دوبارہ میدان میں آجاتے ہیں اور اپنا امیج درست کرنے کے لیے ان کو ہمارے جیسے کنسلٹس کی ضرورت ہوتی ہے۔ اب دیکھیے گا، تین ماہ کی میڈیا کمپین کے بعد میں ان کو کیسے مشہور کرتا ہوں۔" زمر نے ہاتھ اٹھا کر اس کی چلتی زبان کو روکا۔

"میں قائل ہو گئی آپ کی فیس کے لیے۔ مگر میرا کام ہونا چاہیے۔"

"شیور!" وہ مسکراتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا۔ بالآخر زمر یوسف کو کچھ سکون ملا تھا۔

☼ ☼ ☼

بجھ گئی شمع حرم، باب کلیسا نہ کھلا
کھل گئے زخم کے لب، تیرا دریچہ نہ کھلا

جب زمر گھر آئی تو کمرے میں وہ صوفے پہ ٹانگ پہ ٹانگ جمائے بیٹھا، گھٹنے پہ رکھے لیپ ٹاپ پہ کام کر رہا تھا۔ آہٹ بھی نظر انداز کرتا کام کرتا رہا۔

"کل میں جاؤں گی ڈاکٹر توقیر سے ملنے۔ جیسا کہ ہم نے ڈیسائیڈ کیا تھا۔" وہ پرس اور فائلز سائیڈ ٹیبل پہ رکھ رہی تھی۔

"اونہوں۔ ابھی کچھ دن ٹھہر جائیں۔" زمر نے تعجب سے اسے دیکھا۔

"فارس! نیاز بیگ والے واقعے کو آٹھ دن گزر چکے ہیں، اب مزید کتنا انتظار کریں گے؟ اگر تب تک سعدی نہ رہا تو؟"

"وہ لوگ اسے نہیں ماریں گے، اگر مارنا ہوتا تو اوٹی میں مار دیتے۔ یہ آپ نے ہی کہا تھا۔" وہ ٹائپ کر رہا تھا۔

"مگر جو مقصد انہیں اس سے چاہیے، وہ پورا ہو گیا تو وہ اسے زندہ کیوں رکھیں گے۔"

"وہ ایک سائنس دان ہے، ایک حساس ادارے کا سائنس دان۔ وہ اس سے ہر ممکن کام لیں گے۔ اور چند دن کی ہی تو بات کر رہا ہوں میں۔ آگے آپ کا ہی فیصلہ ہوگا۔"

وہ تیکھی نظروں سے اسے دیکھنے لگی۔ "میرا نہیں خیال کہ اب فیصلے میں کر رہی ہوں۔ فی الحال تو تم ڈیسائیڈ کر رہے ہو کہ کیا کرنا ہے اور کیا نہیں؟" فارس نے ایک نظر اٹھا کر اسے دیکھا۔

"پتا نہیں آپ کیا بولے جا رہی ہیں۔ میں اس لیے کہہ رہا تھا کہ ڈاکٹر توقیر دبئی میں ہے۔ ذرا دونوں میاں

بیوی آجائیں‘ پھر ہم ان کو دیکھ لیں گے۔"

"دونوں میاں بیوی؟ اس کی بیوی کا کیا ذکر؟"

اور فارس غازی کی ٹائپ کرتی انگلیاں تھمیں‘ ایک دم رک کر اس نے زمر کو دیکھا۔

"میرا مطلب تھا‘ ہم دونوں۔"

"نہیں‘ تمہارا یہ مطلب نہیں تھا۔" وہ سامنے کھڑی‘ چبھتی ہوئی نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔ "تم نے اس کی بیوی کا ذکر کیوں کیا؟"

"زمر‘ میں سارے دن کا تھکا ہوا آیا ہوں‘ کیا اس وقت میرا دماغ خراب کرنا ضروری ہے؟" ایک دم غصے سے اکتا کر اٹھا اور لیپ ٹاپ اٹھائے باہر نکل گیا۔ وہ آنکھیں سکیڑ کر اسے جاتے دیکھتی رہی۔ پھر مڑی تو دیکھا‘ صوفے پہ اس کا والٹ پڑا تھا۔

زمر نے چند لمحے کے لیے سوچا‘ پھر والٹ اٹھایا۔ اندر جھانکا‘ اس میں پیسے تھے۔ چند ایک وزٹنگ کارڈز اور اے ٹی ایم کارڈ۔ اس نے وہی نکالا۔ اوپر جلی حروف میں لکھا تھا۔ Faris Taheer Ghazi

"فارس طہیر غازی؟" وہ بڑبڑائی۔ "مجھے تو اس کا پورا نام بھی نہیں معلوم۔" کارڈ واپس رکھ کر اس نے والٹ وہیں ڈال دیا۔ پھر وہ بیڈ پہ بیٹھی اور سینڈل اتارتے ہوئے سوچنے لگی۔

(مجھے اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ ایک قاتل ہے‘ اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ وہ سعدی کے ساتھ مخلص ہے مگر اس کے علاوہ میں کیا جانتی ہوں فارس کے بارے میں؟ ایک کم گو‘ غصہ ور اور پراسرار شخص مگر اس سے ہٹ کر... فارس غازی کون ہے؟) وہ سوچ میں گم بیٹھی رہی۔

پھر ایک دم وہ اٹھی۔ نیچے آئی تو فارس نہیں تھا۔ بیرونی برآمدے سے آوازیں آرہی تھیں‘ وہ ندرت کے ساتھ باہر بیٹھا تھا۔ زمر دبے قدموں سے چلتی بیسمنٹ کی سیڑھیاں اترنے لگی۔ نیچے تہہ خانہ تاریک پڑا تھا۔ اس نے ایک ہی بتی جلائی‘ تو وہ وسیع کمرہ نیم روشن ہو گیا۔

وہاں کونے میں ایک چھوٹے سے کمرے کا دروازہ تھا‘ جیسے کوئی اسٹور وغیرہ ہو۔ فارس نے اس کو شادی کی پہلی رات بتا دیا تھا کہ بیسمنٹ کی چابی وہ اس کو نہیں دے رہا‘ ادھر زرتاشہ کی چیزیں پڑی ہیں۔ پھر جب حنہ لوگ ادھر آکر رہنے لگے تو سامان رکھنے کے لیے اس نے بیسمنٹ کھول دی مگر یہ کمرہ...! زمر اس کے بند دروازے کے سامنے آکر ٹھہری... اس کی چابی اب بھی اس نے کسی کو نہیں دی تھی۔ کیا رکھتا تھا وہ اس میں؟ اکثر وہ اسے بیسمنٹ سے اوپر آتے دیکھتی تھی۔ بار بار اسے اس کمرے میں جانے کی کیا ضرورت پڑتی تھی؟ زمر نے اس کمرے کا لاک گھمایا‘ وہ مقفل تھا۔ ذرا دھکا دیا۔ بے سود۔

"آپ ادھر کیا کر رہی ہیں؟"

آواز تھی کہ صور‘ وہ کرنٹ کھا کر پلٹی۔

نیم تاریکی میں وہ سیڑھیاں اترتا دکھائی دے رہا تھا۔ چہرے پہ سختی تھی اور آنکھوں میں برہمی۔ تہہ خانے میں اس رات عجیب سی پراسراریت بکھری تھی۔ زمر دو قدم پیچھے ہٹی۔ کمر دیوار سے جا لگی۔ وہ قدم قدم چلتا اس طرف آرہا تھا۔

"میں..." زمر نے تھوک نگلا۔ سابق ڈسٹرکٹ پراسیکیوٹر کے سارے الفاظ اس نیم تاریک کمرے میں کھو گئے تھے۔ "میں... سعدی کی چیزیں دیکھنے آئی تھی۔"

وہ اس کے عین سامنے آرکا‘ چبھتی نظریں اس کی آنکھوں پہ گاڑیں۔

"سعدی کی چیزیں یا میری؟" ایک قدم مزید قریب آیا۔

اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا‘ مگر بظاہر گردن اکڑا کر بولی۔ "میں جو بھی کروں‘ تم سے مطلب؟" اور سر جھٹک کر برابر سے گزرنے لگی کہ فارس نے اسے دونوں کہنیوں سے پکڑ کر ایک جھٹکے سے واپس دیوار سے لگایا۔

"میں نے آپ کو منع کیا تھا ادھر آنے سے۔" چبا چبا کر‘ اس کو گھورتے وہ بولا تو زمر کی رنگت زرد پڑنے لگی۔ "منع کیا تھا یا نہیں؟"

"کیا تھا۔" اس کے الفاظ اٹکے۔ جنگل کی وہ رات اور اس کا سحر غائب ہو گیا' وہ پھر سے اس ریسٹورنٹ میں تھی اور وہ اسے کال پہ کہہ رہا تھا' وہ بدصورت اور خوفناک باتیں جو اسے کبھی نہیں بھولتی تھیں۔ ایک اس دن اسے فارس سے ڈر لگا تھا اور ایک آج رات اسے ڈر لگ رہا تھا۔

"تو پھر شرافت کی زبان آپ کے اس اُلٹے دماغ کو کیوں سمجھ نہیں آتی' ہاں؟" غصے سے بولا تو زمر کی اس جمی آنکھوں میں گویا سانس رکنے کی کیفیت سمونے لگی۔ مگر وہ کمزور نہیں پڑنا چاہتی تھی۔

"ہاں ٹھیک ہے' میں دیکھنے آئی تھی تمہاری چیزیں پھر کیا کر لو گے تم؟ میں..... تم سے نہیں ڈرتی!"

"اچھا؟ بند کر کے چلا جاؤں آپ کو اسی کمرے میں دو چار دن کے لیے؟ ڈرتی تو نہیں ہیں نا آپ!" اسے کہنیوں سے پکڑ کے جھٹکا سا دیا۔

"مجھے مس ہینڈل مت کرو۔" بدقت اس نے اپنے بازو چھڑانے چاہے مگر بے سود۔

"میری بات کان کھول کر سنیں زمر بی بی!" بگڑ' تپش نظروں سے اسے دیکھتے' وہ چبا چبا کر بولا۔ "میں جتنا آپ کا لحاظ کرتا ہوں' اتنی آپ بڑھتی جاتی ہیں۔ کسی دن مجھ سے واقعی اپنا قتل کروا کر رہیں گی' اس لیے آئندہ اگر میں نے کبھی آپ کو اپنی چیزوں کے قریب بھی بھٹکتے دیکھ لیا نا تو دیکھیے گا کہ کیا حال کرتا ہوں آپ کا۔ ابھی جانتی نہیں ہیں آپ مجھے۔" جھٹکے سے اسے چھوڑا اور وہ ایک لمحے کے لیے بھی نہ رکی' تیزی سے بھاگتی ہوئی سیڑھیاں چڑھتی گئی۔ ابا اور سیم کے کمرے سے ملحقہ اسٹڈی روم میں آکر اس نے دروازہ مقفل کر لیا۔ پھر گہرے گہرے سانس لیتی دروازے سے پشت ٹکائے آنکھیں بند کیے کتنی ہی دیر کھڑی رہی۔

"تمہیں اس سے شادی ہی نہیں کرنی چاہیے تھی زمر' اب بھگتو!" عادت کے برخلاف اس نے خود کو ملامت کیا۔ کتنی ہی دیر پھر وہ ادھر ہی کھڑی رہی۔ یہ تو طے تھا کل صبح تک وہ واپس کمرے میں نہیں جائے گی۔

آج دوسری دفعہ اسے فارس سے ڈر لگا تھا۔

☼ ☼ ☼

زبان پہ مہر لگی ہے تو کیا' کہ رکھ دی ہے
ہر ایک حلقۂ زنجیر میں زباں میں نے

سعدی یوسف کا وہ کمرہ بجن خاموش پڑا تھا۔ دفعتاً" باتھ روم کا دروازہ کھلا اور وہ باہر آتا دکھائی دیا۔ وہ قدرے لڑکھڑا کر چل رہا تھا۔ بیڈ کا سہارا لیا' اور بیٹھا۔ پھر بند دروازے کو دیکھا۔ چند لمحے سوچا اور جھک کر سائیڈ ٹیبل کا دراز کھولا۔ اندر ایک پیچ رکھا تھا جو اس نے سنک کے نیچے سے اتارا تھا۔ اس نے یہ پیچ بالکل خشک کر کے ادھر رکھا تھا۔ اب چند دن بعد وہ اسے نکال کر دیکھ رہا تھا۔

پیچ پہ زنگ لگ چکا تھا۔ سعدی مسکرایا۔ اس نے اپنی گردن کو چھوا جہاں ہلکا ہلکا سا پسینہ مسلسل آیا رہتا تھا۔ اس کا شک ٹھیک تھا۔ ہوا نم تھی۔ کچھ زیادہ ہی نم۔ وہ یقیناً" کسی ایسے شہر میں تھا جو سمندر سے قریب تھا۔

(اور ہاشم کو لگتا ہے کہ میں بھاگنے کی کوشش نہیں کروں گا تو یہ اس کی بھول ہے۔)

پیچ رکھ کر اس نے ٹیک لگائی اور سائیڈ ٹیبل سے قرآن اٹھا لیا۔ چہرے کے زخم اب تقریباً" مندمل ہو چکے تھے۔ البتہ وہ پہلے سے کمزور لگتا تھا۔

آج کون سا روزہ ہے' کچھ نہیں معلوم۔ وہ کتنے سپارے پڑھے گا' کوئی حساب نہیں' کبھی دل چاہتا تو پڑھتا جاتا' کبھی اتنا بے زار اور اداس ہوتا کہ دو' دو دن قرآن نہ کھولتا۔

(سب اس وقت کیا کر رہے ہوں گے؟ امی چھوٹے باغیچے والے گھر میں افطاری بنا رہی ہوں گی' کبھی ماموں اور پھپھو بھی آجایا کرتے ہوں گے' اور ابا تو اب امی اور حنہ کے ساتھ رہتے ہوں گے.....) اس نے بھٹکتے ذہن کو قرآن کے صفحات پہ مرکوز کرنا چاہا۔

"میں پناہ مانگتا ہوں اللہ کی' دھتکارے ہوئے شیطان سے۔" تعوذ پڑھ کر اس نے النمل وہیں سے

کھولی جہاں سے اس روز چھوڑی تھی۔
"اور بے شک ہم نے دیا داؤد اور سلیمان کو علم)"

سعدی کے ابرو ستائشی انداز میں اٹھے۔ (گھر والوں کی یاد محو ہونے لگی۔) واہ اللہ تعالیٰ! اس طرح کی آیات اور یہ شاہانہ انداز' دی کنگ آف آل کنگز جب تو۔ فرماتا ہے۔ "ہم نے یہ کیا" تو مجھے بہت اچھا لگتا ہے۔ بہت فخر محسوس ہوتا ہے۔ میں بتوں کو پوجنے والوں' انسانوں کو خدا کا بیٹا ماننے والوں اور قبروں کو سجدہ کرنے والوں کے سامنے گردن اٹھا کر فخر سے کہہ سکتا ہوں کہ دیکھو' میرا رب تو یہ ہے! بادشاہوں کا بادشاہ! میرے اور اس کے درمیان کوئی تیسرا نہیں ہے۔" نرمی سے مسکراتے' سر جھکائے وہ کہہ رہا تھا۔ (اور اللہ کی باتیں تو ختم نہیں ہوتیں' سو سعدی نے آیات کے الفاظ پہ توجہ دی۔)

"ہم نے دیا داؤد اور سلیمان کو علم! اور ان دونوں نے کہا' سب تعریف اللہ کے لیے ہے' جس نے فضیلت دی ہم کو' بہت سے مومن بندوں کے اوپر۔"
اس نے رک کر ذرا سوچا۔ "کتنی امیزنگ بات ہے اللہ تعالیٰ۔ اکثر ہماری فیملیز میں کئی بچوں میں سے ایک یا دو بہت لائق نکلتے ہیں' ماں باپ اپنی تربیت پہ اتراتے ہیں اور وہ بچے اپنی ذہانت پہ۔ مگر آپ کہتے ہیں کہ جیسے داؤد علیہ السلام کے 19 انیس بیٹوں میں سے صرف ایک سلیمان علیہ السلام کو آپ نے خاص علم عطا کیا تھا' ویسے ہی ہر ایک کو' مجھے بھی' علم آپ نے ہی دیا۔ عمل بھی آپ دیتے ہیں' اگر ماں باپ دیتے تو ساری اولاد کو دے دیتے مگر باقی اولاد کو بھی آپ نے ضرور کچھ اور عطا کیا ہوتا ہے۔ پتا ہے اللہ تعالیٰ' لوگ مجھ سے اکثر پوچھتے ہیں' سعدی تمہیں اتنا اچھا قرآن کس نے سکھایا؟ میں کہتا ہوں' مجھے میرے رب نے سکھایا ہے۔ آپ اسی سے علم کے لیے دعا کریں' وہ آپ کو مجھ سے بھی اچھا قرآن سکھائے گا۔"

قید خانے کا وہ کمرہ اس تپتی دوپہر میں بھی کھلے پہاڑی مقام کی طرح ٹھنڈا ہو گیا تھا۔ سعدی اردگرد سب کچھ بھلائے' بس ان الفاظ کو پڑھ رہا تھا۔

"اور وارث ہوئے سلیمان' داؤد کے۔ اور کہا (سلیمان نے) کہ اے لوگو' ہم سکھائے گئے ہیں' پرندوں کی بولیاں' اور ہمیں عطا کی گئی ہے ہر چیز! بے شک یہ وہ فضل ہے جو روشن (نمایاں) ہے۔"
گھنگھریالے بالوں والے لڑکے کی مسکراہٹ ٹھہری ہوئی۔

"اور فلمی اداکاروں' سیاسی لیڈرز اور ایسے تمام لوگ جن کی وجہ شہرت وہ کام ہیں جو اللہ کو نہیں پسند' ان سب کی پرستش کرنے والے پرستاروں کے سامنے میں گردن اٹھا کر کہہ سکتا ہوں کہ دیکھو! میرے آباء تو یہ لوگ ہیں۔ جو انبیاء ہیں۔ جو اتنی شان سے بات کرتے ہیں۔ انہیں اللہ نے کیا کیا نہیں عطا کیا اور انہوں نے اپنا علم روک کر نہیں رکھا' بخل نہیں کیا۔ نعمتوں کا اعتراف کیا اور یہی شکر ہوتا ہے۔ اور ہم لوگ۔" اس کی مسکراہٹ اداسی میں بدلی۔ "ہمیں تو ذرا سا ہنر آجائے' ہم کسی کو بتاتے نہیں کہ کہیں وہ ہم سے اچھا نہ کرلے۔ ہم اتنے تنگ دل کیوں ہیں' اللہ تعالیٰ؟"

کمرے میں اس وقت سکینت ہی سکینت اتری تھی۔ ٹھنڈی میٹھی سی چھایا۔ وہ سر جھکائے' آگے پڑھنے لگا۔

"اور اکٹھے کیے گئے سلیمان کے لیے ان کے لشکر' جنوں میں سے' اور انسانوں میں سے' اور پرندوں میں سے تو وہ پورے ضبط میں رکھے گئے تھے۔"

سعدی نے آنکھیں بند کر کے یاد کرنا چاہا۔

"اللہ تعالیٰ! ضبط کے لیے جو لفظ آپ نے استعمال کیا "وزع" اس کا اصل لغوی مطلب کیا تھا بھلا؟"
کچھ دماغ آج کل سست رہتا تھا' سو ذرا دیر سے یاد آیا۔

"ہاں! فوج کو ترتیب وار حصوں میں رکھنا۔ ایک دوسرا مطلب بھی تھا۔" ذرا ذہن پہ زور دیا۔ "شاید۔۔۔ روکنا اور منع کرنا۔ سو بات یہ ہے اللہ تعالیٰ۔" آنکھیں کھول کر وہ ذرا سکون سے اپنی بات سمجھانے لگا۔ "کہ جنوں اور پرندوں کو تو رہنے دیں' صرف انسانوں پہ حکمرانی

کرنے کے لیے 'اپنا راج قائم رکھنے کے لیے' بھلے وہ گھر کا ہو یا کسی ادارے کا' یا پورے ملک کا' ڈسپلن سب سے زیادہ ضروری ہے اور اس ڈسپلن کو بھی ڈسپلن کرنا چاہیے۔ نہ زیادہ روک ٹوک ہو' نہ کم۔۔۔ خیر پھر کیا ہوا؟" بہتیری بار پڑھی سورۃ ہر دفعہ نئی لگتی' سو دلچسپی سے اگلی آیت کی طرف آیا۔

"یہاں تک کہ وہ (سلیمان علیہ السلام) جب آئے چیونٹیوں کی ایک وادی تک۔" (وہ ہلکا سا مسکرایا۔ یہ چیونٹیاں اسے کتنی پسند تھیں۔) "تو کہنے لگی' ایک (ملکہ) چیونٹی' یاایھاالنمل (اے چیونٹیو) اپنے گھروں میں داخل ہو جاؤ' یہ نہ ہو کہ بے خبری میں سلیمان اور اس کے لشکری تمہیں روند ڈالیں!"

"ارے واہ۔۔۔! آج کی آیات اتنی Regal شاہانہ آ رہی ہیں اللہ تعالیٰ' میں تو خود کو ایک قیدی محسوس ہی نہیں کر رہا۔ پہلے آپ' پھر سلیمان علیہ السلام' پھر چیونٹی! ہر کسی کی اپنی شان ہے۔" اس نے کھلے دل سے سراہا۔ "اب یہ چیونٹی۔۔۔ نہ ڈری' نہ گھبرائی' نہ بھاگی' اس نے پہلے باقی سب کا سوچا۔ وہ ملکہ تھی' اس نے اپنی جماعت کی خیر خواہی چاہی' مگر وہ ذہین بھی تھی' اس کو معاملہ ڈیل کرنا آتا تھا۔ شور نہیں مچایا' پورے وقار اور بردباری اور تحمل سے چیونٹیوں کو مخاطب کر کے اندر جانے کا کہا اور پھر بڑے لوگوں کی بڑی باتیں ہوتی ہیں۔ اس نے بھی چھوٹی حرکت نہیں کی' بڑا دل رکھا۔ اچھا گمان کیا کہ اگر بالفرض سلیمان کا لشکر تمہیں روند بھی دے تو بے خبری میں ایسا ہو گا۔ آپ سے اونچے اور بڑے لوگ عادتاً" آپ کو روند کر نکل جاتے ہیں' اپنی حفاظت آپ کو خود کرنی ہوتی ہے۔ اللہ پتا ہے کیا' میری ٹیچر کہتی تھیں' نمل ذہین مونث کی سورۃ ہے۔ اس میں ایک چیونٹی ہے' جو چیونٹی ہو کر بھی ملکہ ہے اور اس میں ایک ملکہ ہے' ملکہ بلقیس (ملکہ سبا)۔۔۔ وہ ملکہ ہو کر بھی ایک چیونٹی ہی ہے۔ دیکھا جائے تو ساری عورتیں ایسی ہی ہوتی ہیں۔ وہ کسی کے لیے ملکہ اور کسی کے لیے چیونٹی ہوتی ہیں۔"

اس ٹھنڈی چھایا والے کمرے میں بیٹھا وہ لڑکا' اداسی سے مسکراتے ہوئے بولے جا رہا تھا جب دروازہ کھلا۔ سعدی نے چونک کر سر اٹھایا۔ مایا اندر داخل ہوئی تو اس کی آنکھوں میں بے پناہ حزن تھا۔ وہ اس کے کندھے کے قریب آ کھڑی ہوئی۔ قرآن اس کے ہاتھ سے لے کر سائیڈ ٹیبل پہ دھرا۔ آنکھیں بند کیں' اپنے جسم پہ صلیب کا نشان بنایا۔

"خداوند یسوع مسیح' مجھے معاف کرنا۔" پھر آنکھیں کھولیں اور اس کی متعجب نظروں سے نگاہیں ملائے بغیر ایک انجکشن اس کے بازو میں پیوست کیا۔ وہ ابھی سوال بھی نہیں کر سکا تھا کہ سوئی چبھی اور پھر۔۔۔ ایک دم ساری دنیا ساکن ہوتی گئی۔ منظر دھندلاتا' پھر واضح ہوتا' پھر دھندلاتا' وہ ہل بھی نہ سکا۔ اس کا جسم سن ہو چکا تھا۔ مایا نے اسے لٹایا' کروٹ کے بل' یوں کہ اس کا چہرہ دروازے کی طرف تھا اور دونوں بازو اسی سمت گرے ہوئے تھے۔ چہرہ حیرت زدہ اور ساکن تھا' جیسے وہ بت بن گیا ہو' مگر آنکھیں سب دیکھ رہی تھیں۔

مایا سر جھکائے باہر نکلی اور کھلے دروازے سے۔۔۔ سعدی کی بے جان آنکھوں نے دیکھا کہ ایک تھری پیس نفیس سوٹ میں ملبوس' وجیہہ اور اسمارٹ سا آدمی اندر داخل ہوا ہے۔ اس کے بال جیل لگا کر پیچھے سیٹ تھے' کلائی کی گھڑی' چمکتے بوٹ۔ وہ سب دیکھ سکتا تھا۔ کسی نے کرسی لا کر رکھی اور وہ سعدی کے قریب بیٹھا' ٹانگ پہ ٹانگ جمائی۔ شاہانہ انداز میں کرسی کی پشت پہ بازو پھیلایا۔

"ہیلو اگین۔۔۔ سعدی!" ہاشم کی آواز بھاری ہو کر اس کی سماعتوں سے ٹکرا رہی تھی۔ وہ بنا پلک جھپکے نیم مردہ سا پڑا اسے دیکھے گیا۔

"کیسے ہو تم؟ اوہ! آئی ایم سوری۔ اس انجکشن کے لیے۔ چند گھنٹوں میں تم ٹھیک ہو جاؤ گے۔ میں تم سے ڈرتا نہیں ہوں' بس یہ نہیں چاہتا تھا کہ تم مجھ پہ حملہ کرو اور تمہارے زخم ادھڑیں۔ مجھے تمہاری فکر ہے بچے! اور میرا خیال ہے کہ تمہاری فکر صرف مجھے ہی ہے۔ تب ہی تو عید سے کچھ دن پہلے میں اسپیشل

تمہارے پاس آیا ہوں ‘ تمہارا عید کا تحفہ لے کر۔“

آواز پورے کمرے میں گونج رہی تھی۔ وہ ٹانگ پہ ٹانگ جمائے بیٹھا انگلی سے ٹھوڑی کو مسلتے کہہ رہا تھا۔

”کیا تم میرا شکریہ ادا نہیں کرنا چاہو گے؟ میں نے تمہاری جان بچائی کیونکہ میں ‘ سعدی....! میں تمہیں بہت پسند کرتا ہوں۔ اس لیے میں نے سوچا کہ ایک اتنے ذہین اور قابل سائنس دان کو ضائع کیوں ہونے دوں؟ دیکھو میں نے تمہیں ایک اچھی آفر دی تھی کہ میرے لیے کام کرو مگر تم نے جواب میں کیا کیا؟ تم نے میرے بھائی کو گالی دی مگر میں تمہارا ہر قصور معاف کر رہا ہوں۔ آج سے ہم نئی شروعات کریں گے۔“

سعدی اسی طرح ‘ بے جان ‘ مردہ سا ‘ خالی آنکھوں اور مفلوج بدن کے ساتھ اسے دیکھے گیا۔ وہ اب جیب سے ایک بڑا پیکٹ نکال رہا تھا۔

”مگر اس سے پہلے.... تمہارا عید کا تحفہ۔“ پیکٹ سے اس نے ایک انلارج فوٹوگراف نکالا۔ ”تمہیں معلوم ہے ‘ تمہاری فیملی شفٹ ہو گئی ہے ‘ گیس کرو (اندازہ لگاؤ) کدھر؟ میرے گھر کی انیکسی میں۔ تم نے کہا تھا کہ میں ان سے دور رہوں مگر وہ خود قریب آگئے ہیں۔“

سعدی کی مفلوج آنکھوں میں سرخی سی ابھرنے لگی۔ مگر وہ ہل نہیں سکتا تھا۔ ہاشم نے تصویر اس کے سامنے کی۔ (لان کا منظر ‘ سارہ اور ذکیہ خالہ کے ساتھ افطار کی میز پہ ہاشم ‘ ائل اور نور کو پیار کر رہا تھا۔ یہ تصویر اس دن اس کے حکم پر فنیو نا نے لی تھی۔)

”دیکھو! تمہاری باس بھی عرصے بعد تمہارے گھر آ گئی ‘ میں بھی کچھ دیر بیٹھا ان کے ساتھ۔ وہ سب یوں بات کر رہے تھے جیسے تم مر چکے ہو۔“

مفلوج پڑے سعدی کا دل مفلوج نہیں تھا اور وہ بری طرح ڈوبا تھا۔ (سارہ خالہ نے کسی کو نہیں بتایا؟)

ہاشم نے تصویر اچھال دی۔ وہ سعدی سے ٹکرا کر فرش پہ گری۔ اس نے دوسری تصویر سامنے کی۔ (رات کا منظر۔ انیکسی کے سامنے کھڑے بات کرتے شیرو اور زمر۔)

”معاف کرنا مگر کہیں یہ تمہاری ڈیئر زمر تو نہیں ہے جو اس وقت شیرو سے اتنے دوستانہ انداز میں بات کر رہی ہے؟ شیرو وہی ہے نا! جس نے تم پہ گولی چلائی تھی؟ مگر.... زمر اور فارس کو فکر نہیں ہے اس بات کی۔ ویسے بھی نیاز بیگ نامی کرائے کا غنڈا پکڑا جا چکا ہے اور اس نے تمہارے قتل کا اعتراف بھی کر لیا ہے۔ اب سب تمہیں رو کر چپ بھی ہو گئے ہیں۔ اوہ ہاں ‘ زمر کی جاب چلی گئی اور آج کل وہ بھی اپنی جاب کے لیے فارس کی طرح مصروف ہے۔“

وہ تصویر بھی بھیک کی طرح سامنے پھینکی۔ اور ایک اور تصویر نکالی۔ (انیکسی کے بیرونی زینے پہ خاموش اور اداس بیٹھی حنین۔)

”تمہاری بہن.... بس وہی اکیلی رہ گئی مگر فکر مت کرو ‘ مجھے اندازہ ہے کہ تمہاری بہن کو مجھ پہ سیکرٹ قسم کا کرش ہے ‘ سو.... ہم اچھے دوست بن گئے۔“ وہ کہہ رہا تھا ‘ اور سعدی کی آنکھوں میں سرخ خراشیں ابھر رہی تھیں۔ اس نے پورا زور لگا کر اٹھنے کی کوشش کی مگر جسم ہلنے سے قاصر تھا۔ کیا مرنا ایسا ہوتا ہے؟

”اب وہ بے چاری بچی مجھے دن رات میسج کرتی ہے اور تمہیں پتا ہے ‘ میں اب کیا کروں گا؟ کسی رات جب فارس گھر نہیں ہو گا ‘ تو میں اسے اپنے پاس بلاؤں گا۔ جو بھی بہانا کروں گا ‘ وہ معصوم بچی مان لے گی۔ تمہیں پتا ہے نا ‘ میرا کمرہ اس کے کتنے قریب ہے ‘ سو میں کوشش کروں گا کہ اس event کی بھی تصویریں لوں مگر.... تمہیں برا لگے گا ‘ اس لیے اگر تم چاہتے ہو کہ میں ایسا نہ کروں ‘ تو آج سے ہم نئی شروعات کریں گے۔ تمہارے گھر والے بھول چکے ہیں۔ کوئی ثبوت میں نے نہیں چھوڑا اپنے خلاف اور ہاں ‘ تمہاری بہن نے تو وہ فلیش بھی میرے حوالے کر دی جس میں میری فائلز تھیں۔ سو تم ان لوگوں کو بھول جاؤ ‘ سعدی۔ تمہاری فیملی اب میں ہوں ‘ اور میرا کاروبار اب تم ہو گے۔“

وہ اٹھا اور قدم قدم چلتا اس کے قریب آ کھڑا ہوا۔

”میں نے تمہیں اس لیے بچایا کیونکہ مجھے تم اچھے لگتے

ہو ‘لیکن تم پہ اتنی انویسٹمنٹ میں مفت میں نہیں کر رہا۔ اس لیے آج سے تم میرے لیے کام کرو گے اور اگر تم نے ایسا نہ کیا ‘ تو تمہاری بہن کے ساتھ کیا کر سکتا ہوں ـ ایکچوئلی مجھے واضح کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔" کہیں کوئی گھنٹی بجی تھی۔ سعدی کی مفلوج آنکھوں نے دیکھا ‘ وہ جیب سے سیل فون نکال رہا تھا۔ پھر مسکرایا۔

"نائس ٹائمنگ! پاکستان سے ہے اور وہ بھی تمہاری بہن کا۔ میں اس سے بات کرتا ہوں ‘ تب تک تم میری بات پہ غور کرو! پھر فون کان سے لگایا اور خوشگوار سے انداز میں بولا۔ "ہیلو حنین۔ کیسی ہو؟" اسپیکر آن کر دیا تھا۔ کمرے میں حنین کی آواز گونجی۔

"میں ٹھیک۔ آپ باہر گئے ہوئے ہیں؟"

"ہوں۔ میں انڈیا آیا ہوں ‘ ایک پرانے دوست سے ملنے۔"

مفلوج لیٹے سعدی کا تنفس تیز ہونے لگا۔ اس کی آنکھیں پانی سے بھرنے لگیں۔

"اچھا وہ۔۔۔ مجھے پوچھنا تھا۔۔۔" وہ عجلت میں لگ رہی تھی۔ "آپ نے وہ فلیش کھول لی؟"

"ارے ہاں ‘ وہ خاور نے کھول ہی لی۔ شکریہ ۔ تمہاری وجہ سے میرے اتنے قیمتی ڈاکومنٹس محفوظ رہے۔"

دوسری طرف خاموشی چھا گئی۔ "کون سے ڈاکومنٹس تھے اندر؟"

"میرے آفس کی فائلز تھیں۔"

وہ پھر چپ ہوئی۔ "آپ مجھے وہ فلیش واپس کر سکتے ہیں؟ وہ بھائی کی چیز تھی ‘ میں اسے بھائی کی یاد کے طور پہ رکھنا چاہتی ہوں۔"

"آں۔۔۔!" وہ رکا۔ "اچھا میں تمہیں پرنٹ شدہ ڈاکومنٹس بھیج دوں گا واپس آکر۔ یا پھر۔۔۔" ذرا رکا۔ "تم کسی دن آکر میرے کمرے سے لے جانا۔" اور کہتے ہوئے اس نے کروٹ لیے لڑکے کا چہرہ دیکھا۔ ایک آنسو اس کی ساکت آنکھ سے ٹپک کر تکیے میں جا گرا تھا۔

ہاشم باہر نکل گیا اور پیچھے کمرے میں قبر سی خاموشی چھا گئی۔

کیا مرنا ایسا ہوتا ہے؟

☆ ☆ ☆

وہ یہیں سے لوٹ جائیں جنہیں سر عزیز ہیں
ہم سر پھروں کے ساتھ کوئی سر پھرا چلے

اور ہزاروں میل دور ‘ اسلام آباد کے اس مضافاتی علاقے میں۔۔۔ قصر کی انیکسی کے بیسمنٹ میں کھڑی حنین نے ہاشم کی کال کاٹی تو اس کے چہرے پہ شدید ملال چھایا تھا۔

"تو اب آپ مجھ سے بھی جھوٹ بولنے لگ گئے ہیں ‘ ہاشم؟" وہ بڑبڑائی۔ "آپ نے وہ فلیش کھولی ہی نہیں ‘ یا پھینک دی یا کسی کو دے دی ‘ اگر کھولتے تو دیکھ لیتے کہ اس میں میرے دو کورین ڈرامے تھے جو میں نے اسی رات لاک کر کے آپ کے لیے تیار رکھے تھے کیونکہ میں آپ کو بتانے کی غلطی کر چکی تھی اور اب ناراض نہیں کر سکتی تھی۔ مگر آپ نے کیسے مجھ سے جھوٹ بول دیا؟"

سر جھٹکا اور پھر اپنے سامان سے اس نے علیشا کے نیکلس کے ساتھ رکھی سفید فلیش ڈرائیو نکالی جو سعدی نے اس کو دی تھی۔

"آپ کو تو اس ڈرائیو کا رنگ بھی نہیں پتا تھا تو یہ آپ کی کیسے ہوئی؟ اتنا جھوٹ؟" اس کا دل بری طرح دکھا۔ "محبت ایک طرف ‘ لیکن میں بھائی کی چیز آپ کو نہیں دے سکتی تھی۔" اس نے باکس بند کیا اور فلیش لیے اوپر زینے چڑھنے لگی۔

(آخر دیکھوں تو سہی ‘ اس میں اتنا کیا خاص ہے ‘ جو سعدی بھائی اور ہاشم دونوں اس کو حاصل کرنا چاہتے تھے؟)

کچھ دیر بعد وہ لیپ ٹاپ کھولے لاؤنج میں بیٹھی تھی ‘ فلیش لگا رکھی تھی اور وہ اس پروگرام کو سمجھنے کی کوشش کر رہی تھی جس کے ذریعے ان ڈاکومنٹس کو مقفل کیا گیا تھا۔ تب ہی زمر سیڑھیاں اتر کر نیچے آئی۔

"میں بیسمنٹ میں جارہی ہوں حنہ' فارس آئے تو اسے بتادینا کہ نیچے تہہ خانے میں جو اسٹور روم بنا ہے اس کا لاک تڑوایا ہے میں نے آج۔" اطلاع دے کر وہ نیچے چلی گئی۔ حنہ نے بے دھیانی سے اس کی بات سنی۔

ذرا دیر بعد ہی فارس گھر میں داخل ہوا تو اسے لیپ ٹاپ پہ کام کرتے دیکھا۔

"تمہارے ہاتھ میں کمپیوٹر؟ خیریت؟" دروازہ لاک کرتے اس نے ایک اچٹتی نگاہ گھر پہ ڈالی جو رات کی خاموشی میں ڈوبا ہوا تھا۔

"جی' اور پھپھو نیچے آپ کے اسٹور تک گئی ہیں۔ اس کا لاک تڑوایا تھا آج انہوں نے۔" وہ الجھی بیٹھی تھی' بے توجہی سے بتایا۔

اور فارس غازی کا دماغ ایک دم گھوم کر رہ گیا۔ پھر تیزی سے سیڑھیوں کی طرف لپکا۔

سبک رفتاری سے زینے پھلانگتا نیچے آیا تو وسیع تہہ خانہ تاریک پڑا تھا۔ کونے والے کمرے کا دروازہ بند تھا اور وہ اسی دروازے سے کمر ٹکائے' سینے پہ بازو لپیٹے کھڑی تھی۔ منتظر۔ وہ غصے سے سرخ چہرہ لیے جارحانہ انداز میں اس کی طرف بڑھا۔

"کس کی اجازت سے آپ نے اس کمرے کا لاک تڑوایا؟ منع کر کے گیا تھا میں کہ....." غضب ناک ہو کر اس کی آنکھوں میں دیکھا وہ غراتے ہوئے قریب آیا کہ دفعتاً" رکا۔

زمر بس ٹھنڈی آنکھوں سے اسے دیکھ رہی تھی۔

"اتنا کیوں ڈر گئے ہو؟ میں نے تو حنہ سے مذاق کیا تھا۔"

فارس نے بے ساختہ ہو کر دروازے کو دیکھا' وہ مقفل تھا۔ اس نے گہری سانس لی۔ وہ اس کو اکسا رہی تھی۔

"کیا چاہتی ہیں آپ؟"

"پلیز! اپنا غصہ مجھ پہ ضائع مت کرنا کیونکہ نہ میں تم سے ڈرتی ہوں اور نہ میں کبھی اس کمرے کا لاک تڑواؤں گی بلکہ تم مجھے خود یہ کمرہ کھول کر دکھاؤ گے۔" ٹھنڈے انداز میں وہ کہہ رہی تھی۔ "اور تم مجھے خود بتاؤ گے کہ تم اس میں کیا رکھتے ہو۔ تم سارا دن کیا کرتے ہو۔ تم چار سال سے کیا کرتے رہے ہو۔ تم ہمیشہ کہیں جارہے ہوتے ہو' کہیں سے آرہے ہوتے ہو۔ تم سے شادی سے پہلے میں نے اس ریسٹورنٹ میں آکر تم سے صرف سچ بولا تھا۔ دشمنی اپنی جگہ' دیانت داری اپنی جگہ' سو اب سچ بولنے کی باری تمہاری ہے۔" وہ کچھ دیر لب بھینچے' برہمی سے اسے دیکھتا رہا۔

"ڈرتا نہیں ہوں آپ سے۔ صرف اس لیے اپنی کچھ چیزیں الگ رکھتا ہوں کیونکہ اگر آپ دیکھیں گی تو میرے ساتھ کام نہیں کریں گی۔"

زمر دو قدم آگے آئی' تیکھی نظریں اس کی آنکھوں پہ گاڑیں۔ "فارس! جیسے ہم نے نیازبیگ کو گھیرا' ویسے ہی سرمد شاہ کو بھی گھیر لیں گے اور آہستہ آہستہ سعدی کے ہر ایک مجرم کو' مجھے کم از کم سعدی کے معاملے میں تم پہ اعتبار ہے لیکن میں صرف اتنا جاننا چاہتی ہوں کہ فارس طہیر غازی کون ہے؟ کم از کم مجھے معلوم ہونا چاہیے کہ میں؟" کس کے ساتھ کام کر رہی ہوں۔

فارس نے گہری سانس لی اور پھر جیب سے چابیوں کا گچھا نکالتا اس کمرے کے دروازے تک آیا۔ ایک چابی لاک میں گھمائی اور پھر.... دروازہ کھول دیا۔

(باقی آئندہ ماہ ان شاءاللہ)

عائشہ خان

دن بھر کی مشقت کے بعد بڑی مشکل سے دو گھڑی کمر سیدھی کرنے لیٹی تھی۔

چار بجے تو چائے بنانے کے لیے اٹھ گئی۔ باورچی خانے میں گئی تو پیچھے پیچھے ایک ہیولا نظر آیا۔ میں سمجھ گئی میری ساس ہوں گی۔ میرے کچن میں آتے ہی وہ پیچھے پیچھے آگئی تھیں۔

"کیا کر رہی ہو؟" ساس نے چبھتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔ صرف آواز ہی ہلکی تھی۔ ورنہ نظریں تو ایسی جیسے پوسٹ مارٹم کر رہی ہوں۔

میں نے جواب دیا۔ "چائے بنانے آئی تھی" وہ...

"اچھا" کہتے ہوئے واپس کمرے میں جا کر لیٹ گئیں۔

✡ ✡ ✡

یہ صرف آج ہی کی بات نہیں نو سال ہو گئے تھے میری شادی کو مگر آج تک میں اپنے گھر میں ایک کپ چائے بھی بنا کر نہیں پی سکتی تھی۔

اتنے سالوں میں میں نے کبھی ان سے سخت لہجے میں بات نہیں کی تھی، مگر اب ان کی روک ٹوک سے دل گھبرانے لگا تھا۔ شوہر سے کیا شکایت کرتی۔ ان کو اپنے کاموں سے فرصت نہیں تھی اور ویسے بھی وہ ٹھہرے فرماں بردار بیٹے...

تینوں بچوں کی آپریشن سے پیدائش ہونے کی وجہ سے جسمانی کمزوری بہت بڑھ گئی تھی۔ اوپر سے اس گھر میں میرا کسی کو احساس نہیں تھا۔ دو کنواری نندیں تھیں، جنہیں ماں نے چائے تک بنانا نہیں سکھائی تھی۔ گھر میں کھانا پکانے کا سارا کام میرے سپرد تھا۔

✡ ✡ ✡

آج چھوٹی نند شہلا کی شادی تھی۔ سارے گھر کا کام حسب معمول سدرہ کے ہی ذمے تھا۔ سارے گھر میں ہڑبونگ مچی تھی۔ سدرہ میری چپل، سدرہ میرے کپڑے، "مما بھوک لگی ہے" بیچ بیچ میں بچوں کی پکار، خیر! اللہ اللہ کر کے تمام کام انجام کو پہنچے۔

بارات آگئی کا شور اٹھا تو ساس بھی متوجہ ہو گئیں۔ آج تو وہ بہت خوش تھیں۔ بیٹی کے لیے اتنا اچھا کھاتے پیتے گھرانے سے رشتہ جو آگیا تھا۔ دولہا قد میں تھوڑا چھوٹا تھا لیکن یہ کوئی قابل اعتراض بات نہیں تھی، سو یہ رشتہ قبول کر لیا گیا تھا۔

نکاح ہوا، کھانا کھایا، رخصتی کے شور کے ساتھ ہی بزرگوں نے اپنی دعاؤں تلے شہلا کو رخصت کیا۔ رخصتی کے بعد سدرہ پورا گھر سمیٹتی پھر رہی تھی، جبکہ بچوں کو شوہر نے سلا دیا تھا۔ شکر! سدرہ نے سکھ کا سانس لیا۔

✡ ✡ ✡

شادی ختم ہو گئی، گھر کی لگی بندھی زندگی آہستہ آہستہ معمول پر آگئی۔

کل شہلا کے سسرال میں دعوت تھی۔ کھیر پکوائی کی رسم کی۔ ہم سب کو بھی مدعو کیا تھا، ہم سب بھی بھرپور شریک ہوئے۔

دعوت کے ایک ہفتے بعد ایک دن صبح ہی صبح شہلا اپنے شوہر کے ساتھ آگئی۔ اس کا شوہر فرخ اسے چھوڑ کر آفس چلا گیا تھا۔ شام واپسی میں شہلا کو لے جانے کا پروگرام تھا۔

☆ ☆ ☆

"سدرہ بیٹی!" اپنا نام سن کر میں رک گئی اور وہ بھی اتنی مٹھاس سے پکارنے پر۔

"جی امی!" میں نے جواب دیا۔

"بیٹی! شہلا ابھی دوپہر میں یہیں ہے اور فرخ میاں بھی شام کا کھانا یہیں کھائیں گے۔ تم بتاؤ کہ کیا پکائیں۔"

"امی جیسا آپ کہیں، میں وہی پکالوں گی، آپ بتا دیں۔"

"تو بیٹا ایسا کرو کباب بنالو، قورمہ اور کسٹرڈ بنالو، تافتان اور نان باہر سے منگوالیں گے اور ہاں سلاد اور رائتہ نائلہ بنالے گی۔"

"جی امی!" جواب دے کر میں کام میں جت گئی۔ جلدی جلدی ہاتھ چلا رہی تھی کہ شام سے پہلے تمام چیزیں تیار کرسکوں۔ سب تیاری مکمل کرنے کے بعد چائے کا پانی چڑھایا۔ چائے بنا کر سوچا کہ چلو نائلہ کے کمرے میں ہی لے جاتی ہوں۔ امی اور شہلا بھی وہیں تھیں۔

میں ٹھٹک کر دروازے پر ہی رک گئی۔ شہلا کے رونے کی آواز آرہی تھی۔

"امی... امی میری ساس ہر وقت میرے کھانے پینے پر نظر رکھتی ہیں۔ کل میری طبیعت ٹھیک نہیں تھی تو سوچا شربت بنا کر پی لیتی ہوں، تو میرے پیچھے پیچھے کچن میں آگئیں کہ کیا کررہی ہو۔"

امی کو ایک دم غصہ آگیا۔ "کیوں؟ انہیں کیا تکلیف تھی؟" بیٹی کے رونے سے وہ مشتعل ہوگئیں۔

"امی! آپ کو پتا ہے یہ سب کیوں ہوا... کیونکہ امی آپ نے بھی... آپ نے بھی سدرہ بھابھی کے ساتھ ہمیشہ ایسا ہی رویہ اختیار کیا ہے۔ امی! آپ کا بویا مجھے کاٹنا پڑ رہا ہے۔" شہلا سسکی تھی۔

یہ سن کر میرے ہاتھ لرز گئے۔ چائے کے کپ ٹکرانے کی آواز پر امی نے دروازے کی طرف دیکھا تو میں جلدی سے آگے بڑھی۔ امی نے شرمندگی سے نظریں جھکالیں۔ جو بوتے ہیں وہی کاٹنا پڑتا ہے۔ ہم کانٹے بوئیں گے تو گلاب تو نہ اگیں گے نا۔ ذرا سوچیے...

☆

امی سے جیب خرچ لے کر وہ انیکسی سے باہر نکلی تو فیصل جو ابھی دروازے میں کھڑا اسے آواز دے رہا تھا، اچانک غائب ہوا۔

جانے اس لڑکے کے ساتھ کیا مسئلہ ہے۔ حالانکہ وہ اس کا مسئلہ بخوبی سمجھتی تھی۔ بیگ پٹختے ہوئے وہیں سیڑھیوں پہ بیٹھ گئی۔ کل اس نے دھمکی بھی دی تھی کہ اگر تم وقت پہ تیار نہ ہوئے تو میں عمر کے ساتھ چلی جاؤں گی، پھر اس بدتمیز نے کیسا جی جان سے وعدہ کیا تھا کہ کل سے وہ ضرور وقت کی پابندی کرے گا۔ "اور اب آکر پھر غائب۔" اس نے لب بھینچ لیے ایسا وہ تب کرتی تھی جب بہت غصہ آرہا ہوتا تھا۔

عمر نے پہلے اپنی بائیک نکالی تھی، اب وہ اس پر سوار ہو رہا تھا۔ نہیں وہ ایک پل کے لیے رکا تھا۔ اس کی نگاہیں انیکسی سے باہر سیڑھیوں پہ بیٹھی زیب کی جانب اٹھی ہوئی تھی، ان میں سوال تھا۔

"میرے ساتھ چلو گی؟" زیبو نے منہ پھیر لیا۔ وہ فیصل کو صرف دھمکی دے سکتی تھی اس پر عمل درآمد مشکل تھا، بے حد مشکل۔ وہ اپنے اکلوتے دوست کو کیسے ناراض کر دیتی۔

اندر وہ لاؤنج میں کھڑا ابا اور اماں کا مکالمہ سن رہا تھا۔

"دو سو روپے دے جائیں۔" اماں کا مطالبہ۔

"کیوں، کس لیے؟" ابا حسب معمول اپنے ناپ

ناولٹ

سے لمبا شلوار سوٹ زیب تن کیے بٹوے میں رکھے
نوٹ گن رہے تھے۔ عینک کے اوپر سے ابرو اٹھا کر
استفسار کیا۔ پیشانی پر ایک ساتھ ان گنت بل پڑے
تھے۔

"ضرورت ہے تو مانگ رہی ہوں۔" اماں نے خفگی

بھرا جواب دیا مگر ابا مطمئن نہیں ہوئے تھے۔

"کیسی ضرورت؟ ہر چیز تو گھر میں موجود ہے سبزی، گوشت، انڈے، کپڑے لانڈری سے دھل کر آجاتے ہیں۔ کام والی کا ابھی مہینہ ختم نہیں ہوا، دودھ والے کو میں فارغ کر چکا ہوں پھر تم دو سو کا کیا کرو گی۔"

"عظمت صاحب کے گھر سے میلاد کا پیغام آیا تھا۔ سوچا کچھ فروٹ وغیرہ لے جاؤں گی۔ اب خالی ہاتھ جانا بھی تو اچھا نہیں لگتا۔" شوہر کے مزاج سے خوب واقف تھیں پائی پائی کا حساب رکھتے تھے۔ جب تک پوری وضاحت طلب نہیں کر لیتے ان کی جیب ڈھیلی ہونے والی نہیں تھی۔

"یہ اچھا دستور ہے! تم میلاد پہ جا رہی ہو یا بیٹے کا شگن کرنے۔ اب محلے میں بھی سوغاتیں بانٹتے پھریں گے' حد ہوتی ہے فضول خرچوں کی بھی۔" چار باتیں سنا کر سو سو کے دو نوٹ انہوں نے میز پر اماں کے سامنے رکھ ہی دیے تھے۔ بٹوہ واپس رکھتے ہوئے اب وہ واسکٹ پہن رہے تھے جو ان کے درمیانے قد پر لانگ کوٹ جیسی لگ رہی تھی۔ ظاہر ہے وہ کسی دراز قامت آدمی کی ہوگی۔

اماں منہ پھلائے ہوئے برتن سمیٹنے لگیں۔

"ابا! میری پاکٹ منی۔" خشک لبوں پہ زبان پھیرتے ہوئے اس نے ابا کے سامنے ہاتھ پھیلایا تھا۔ ابا نے پہلے تو حسب معمول اسے گھورا پھر سر ہلاتے ہوئے اس کی ہتھیلی پر پانچ کا سکہ رکھا اور چلے گئے۔

وہ منہ بسورتے ہوئے باہر نکلا' ابا کی "حسب معمول" والی گھوری کے سامنے وہ کچھ بول ہی نہیں پاتا تھا۔ ابا بھی ایسا حفظ ماتقدم کے طور پر کرتے تھے۔

اماں نے باہر نکلتے ہوئے فیصل کے بیگ میں زبردستی دو سیب ٹھونسے "لنچ ٹائم میں یاد سے کھا لینا۔"

"اگر مراقبہ ختم ہو چکا ہو تو اسکول چلیں۔" زیبو دور کھڑی دو منٹ سے اسے دیکھ رہی تھی' وہ جس رفتار سے چل رہا تھا ایسے تو وہ چھٹی کے بعد ہی اسکول جا سکتے تھے۔ اب پاس جا کر اس کے سر پہ چلانا ضروری ہو چکا تھا۔

"دیر کروا دی نا تم نے؟" اب وہ اسے گھور رہی تھی۔

"جانتی ہو! میں نے رات ہی اپنا یونیفارم' موزے' بیگ' کتابیں سب ریڈی کر لیا تھا۔ ٹائم سے بیس منٹ قبل انیکسی کے باہر کھڑا تھا۔ تمہیں آواز بھی دی تھی مگر جب تمہیں پھوپھو سے پاکٹ منی لیتے دیکھا تو مجھے یاد آیا کہ میں نے تو ابا سے پاکٹ منی لی ہی نہیں اور پھر دیر ہو گئی۔" وہ مزے سے بتا رہا تھا نہ زیبو اسے گھورتی رہی۔ راستہ بھر گھورتی رہی اور وہ سوچتا رہا۔

"ایسے بھی ہوتے ہیں کسی کے ابا! دل چاہتا ہے یہاں سے کہیں دور چلا جاؤں۔ عمر کو تایا ابا سے پچاس روپے ملتے تھے۔ زیبو بھی بیس روپے لیتی تھی اور اس کے پاس تھا پانچ کا سکہ۔

"کیا کرے گا وہ اس کا؟"

یہ نہیں تھا کہ اس کے والدین بے حد غریب تھے بلکہ ان کا شمار کھاتے پیتے گھرانے میں ہوتا تھا اس کے ابا کی چوک میں مشہور لانڈری کی دو منزلہ دکان تھی اور ان کے پاس کپڑوں کے علاوہ پردے' قالین اور بڑے بڑے میرج ہالز کی صفائی کے آرڈر آتے تھے۔

بس ان کے سر پہ کروڑ پتی کہلانے کا خبط سوار تھا۔ کچھ وہ فطرتاً "کنجوس" تھے۔ اتنے کنجوس کہ کبھی عید' شادی بیاہ اور کسی تہوار وغیرہ پر بھی انہوں نے اپنے لیے کوئی نیا سوٹ نہیں سلوایا تھا گاہکوں کے آئے ہوئے دھلائی کے سوٹ جو اسٹاک میں رکھے رہ جاتے اور جنہیں سال چھ مہینے تک کوئی لینے نہیں آتا تھا' نکال کر پہن لیتے تھے اسی لیے کبھی کوٹ لمبا تو قمیص چھوٹی تو کبھی سوٹ ان کے قد سے بڑے ہوتے تھے۔

اماں لاکھ سمجھاتیں کہ درزی سے اپنے ناپ کے کروا لو۔

مگر ان کی ایک ہی بات "میں اپنے متعلق کسی کمپلیکس کا شکار نہیں ہوں اور نہ ہی مجھے خود نمائی کا کوئی شوق ہے میں خود کو لوگوں کی نظر سے نہیں دیکھتا۔"

چلو جی' بات ہی ختم۔ حالانکہ یہ الگ بات کہ انہیں منفرد لگنے کا بھی خبط تھا۔ اب اماں لاکھ سر پیٹتی رہیں' ابا اپنی کرتے تھے۔

وہ ان کا اکلوتا بیٹا تھا دو بہنوں کا اکلوتا بھائی' مگر نہ تو وہ اماں کی آنکھ کا تارا تھا نہ ہی ابا کا راج دلارا' اور نہ بہنوں کا پیارا۔

ہر کسی کو اس کی فکر تھی کہ کہیں اکلوتے پن کی وجہ سے بگڑ نہ جائے سو بے جا لاڈ پیار تو دور کی بات' وہاں تو

پیار کا تصور ہی محال تھا۔ ہر کوئی ہر وقت اس پر اپنا رعب جمانے کو تیار نظر آتا تھا اور ابا تو غلطی سے بھی کبھی اس کی جانب پیار بھری نگاہ نہیں ڈالتے تھے۔

ایک عمر تھا اپنے ابا کا لاڈلا' فرماں بردار' سلجھا ہوا تمیز دار بچہ' جو کبھی کوئی فرمائش نہیں کرتا تھا کیونکہ اس کو ہر چیز بغیر مانگے ہی مل جاتی تھی مگر ابا کو یہ بات کون سمجھائے جنہیں نظر آتی تھی تو صرف اس کی فرماں برداری' وہ کتنا گھنا' میسنا تھا۔ اب وہ انہیں کیسے سمجھاتا' اماں بھی اس معاملے میں ابا کی ہم نوا تھیں۔

وہ ہر معاملے میں عمر کے ساتھ اس کا موازنہ کرتی تھیں۔

وہ گورا تھا تو ان کا بیٹا سانولا کیوں تھا؟ دونوں ہم عمر تھے' پھر عمر نے پہلے چلنا کیوں شروع کیا تھا؟ عمر نے اس سے پہلے ابا کہا تھا۔ تائی اماں اسے جو بھی کھلاتیں وہ بڑا سا منہ کھولے بس کھائے چلا جاتا اور اس کی اماں کو اسے ایک فیڈر پلانے میں ہزار ہا جتن کرنے پڑتے تھے۔

وہ رات کو آٹھ بجے اچھے بچوں کی طرح سو جاتا تھا اور یہ ساری رات بھاں بھاں کر کے سب کو جگائے رکھتا۔ ڈیڑھ سال کی عمر میں فیصل کو جسمانی اعضا کے نام آتے تھے مگر جب عمر نے اسی عمر میں کہا "مائی فادر نیم از کامران سکندر" تو اس کا چرچا ہفتے بھر تک ہوتا رہا تھا۔ ہر آئے گئے کے سامنے پوچھا جاتا۔

"عمر! واٹ از یور فادر نیم؟" اسکول میں بھی وہ پہلی پوزیشن لاتا تھا اور فیصل کبھی پانچویں تو کبھی ساتویں۔ عمر کو سب ہی پسند کرتے تھے اس سے ہر کسی کو شکایتیں ہی رہتیں۔ عمر کو ہمیشہ ہی اس کے سامنے ایک مثال کی طرح پیش کیا جاتا' اسے عمر سے چڑ تھی بے حد اور شدید۔

☆ ☆ ☆

حسب معمول وہ دیر سے آنے والوں کی قطار میں کھڑے تھے۔ زیبو کا اکتاہٹ کے مارے برا حال تھا۔ وہ فیصل کو جتنی مہذب گالیوں سے نواز سکتی تھی نواز چکی تھی۔

وہ سر جھکائے کان کھجاتا بس ہنسے جا رہا تھا۔

کیونکہ ابھی کچھ دیر قبل اس نے اسے دیکھا تھا' جس کی آواز سننے کی خاطر وہ روز دیر سے اسکول آتا تھا۔ وہ ان کے اسکول کی پریفیکٹ تھی۔

"انعم!" کتنا پیارا نام تھا اس کا۔

وہ زیبو کی دوست تھی اور فیصل نے آج کل اس کا ناطقہ بند کر رکھا تھا۔

"زیبو! تم رجسٹر میں اس کے نام کے آگے میرا نام لکھو گی۔"

ریاضی کے ٹیسٹ میں زیبو کے نمبر سب سے زیادہ آتے تھے اور انعم کی ہمیشہ سیکنڈ پوزیشن' اس کا اترا ہوا چہرہ جانے کیوں اسے رنجیدہ کرنے لگا تھا۔

"زیبو! تم انعم سے ایک نمبر کم نہیں لے سکتیں۔"

"اب کیا میں جان بوجھ کر مس ٹیک کروں۔" وہ ابرو چڑھاتی۔

"ایک غلطی سے کیا ہوتا ہے زیبو۔" وہ بڑی منت سے کہتا اور زیبو بھلا کب اس کا کہا ٹالتی تھی۔

اس نے محسوس کیا تھا کہ اکثر زیبو کی اوٹ میں چھپ کر وہ بھی اسے دیکھتی تھی اور جب کبھی وہ اس کی چوری پکڑ لیتا۔ تو نگاہوں کے تصادم پر کیسے جگنو چمکتے تھے اس کی آنکھوں میں' وہ دیر سے آتا تو وہ اس سے جرمانہ وصول نہیں کرتی تھی' اس کے اگر ٹیسٹ میں نمبر کم آتے تو وہ استاد سے شکایت نہیں کرتی تھی۔ زیبو سارا وقت اسے اپنی اور فیصل کی باتیں سناتی رہتی' جسے زیر لب مسکراتے ہوئے وہ بڑے غور سے سنا کرتی تھی۔ اسے معلوم تھا فیصل کو کون سا رنگ پسند ہے' کھانے میں کیا اچھا لگتا ہے۔ وہ جب پہلی بار زیبو کی برتھ ڈے پر ان کے گھر آئی تو اس نے ہلکا فیروزی رنگ کا سوٹ پہنا ہوا تھا۔ کلاس میں ہونے والی ون ڈش پارٹی پر وہ گھر سے بطور خاص کڑھی چاول بنا کر لائی تھی۔

زیبو سے اس نے وہ سنہری قلم جو انعم نے اسے

برتھ ڈے پہ تحفہ دیا تھا' مانگ کر لے لیا تھا۔

"فیصل یہ گفٹ ہے۔" وہ تلملائی ضرور تھی۔

"تو کیا ہوا۔" وہ بڑی مسرت سے اسے قمیص کے گریبان میں سجا کر گھومتا تھا' جیسے وہ کوئی اعزازی تمغہ ہو۔

☼ ☼ ☼

آج کا دن اس کی زندگی کا منحوس ترین دن تھا' اس نے ابا کے سامنے سر اٹھانے کی جرات کر لی تھی۔

اسکول میں چودہ اگست کا فنکشن تھا اسے سفید شلوار قمیص چاہیے تھی اور ابا دوکان سے کوئی سوٹ اٹھا کر لے آئے تھے۔

"اپنا ناپ دے دو' درزی سے کہہ کر چھوٹا کروا دوں گا۔"

"نہیں پہننے مجھے کسی کے اترے ہوئے کپڑے۔ آپ کی طرح نمونہ بننے کا کوئی شوق نہیں ہے' مجھے نئے کپڑے چاہئیں۔" ___ کے ٹی نما کھدر کے سوٹ کو دیکھ کر وہ جیسے چیخ پڑا تھا۔ عمر نے نیا کاٹن کا کڑھائی والا شلوار سوٹ بنوایا تھا اور اس کے ابا اسے کسی کا پرانا سوٹ پہننے کو کہہ رہے تھے۔

"اپنے ابا کو نمونہ کہہ رہے ہو؟" اماں اس کی اس درجہ بدتمیزی پر صدمے کے باعث حیران' ساکت سی کھڑی تھیں۔ ابا نے آگے بڑھ کر اسے ایک تھپڑ رسید کر دیا تھا۔

"یہ تربیت کر رہے ہیں اس کی اسکول والے! کل ہی اسے مولانا صاحب کے مدرسے میں داخل کرواتا ہوں۔" اور وہ کتنی ہی دیر سیڑھیوں پہ منہ پھلائے بیٹھا رہا تھا۔ رات میں سارہ باجی اور انجم آپا کو فون کر کے بلوایا گیا تھا۔ اماں نے رو رو کر آنکھیں سجا لیں۔

"فیصل نے ابا کو ایسا کہا۔" سارہ باجی بے یقینی سے بولیں۔

"اماں! فیصل خود سے ایسا نہیں کہہ سکتا' ضرور کسی نے ہمارے بچے پر کچھ کر دیا ہے' اسے باہر نہ نکلنے دیا کریں' سو طرح کی نظریں ہوتی ہیں لوگوں کی۔" انجم آپا نے افسوس سے ہاتھ ملتے ہوئے اپنے مفید مشورے سے بھی نوازا تھا اور پھر متفقہ فیصلے کے طور پر اسے اسکول سے خارج کروانے کا اعلان کر دیا گیا تھا۔ اسے کسی دینی مدرسے میں داخل کروانے کی باتیں ہو رہی تھیں۔

آپا نے ایک مدرسے کا پتا بھی بتا دیا تھا' جہاں دینی تعلیم کے ساتھ دنیاوی تعلیم بھی دی جاتی تھی۔

"اچھا ہے صبح سے نکلا شام کو گھر آیا کرے گا۔ اس کے آوارہ دوست چھوٹیں گے تو خود ہی تمیز آجائے گی۔"

حالانکہ اس کا کوئی دوست تھا ہی نہیں' اسے کہاں اجازت تھی دوستیاں گانٹھنے کی۔

اس کا دل چاہ رہا تھا اپنا گلا دبا دے یا خود کو سولی پر لٹکا دے۔ بھلا کوئی تک بنتی تھی۔ ایک سوٹ کی فرمائش ہی تو کی تھی اس نے اور ان سب کو اس کی تربیت کی فکر پڑ گئی تھی۔ اب بھلائی اس میں تھی کہ ابا سے معافی مانگ لی جائے ورنہ اسکول سے دستبرداری کا مطلب تھا انعم سے دستبرداری جو اسے کسی صورت منظور نہیں تھی۔

سو اس نے ابا سے معافی مانگ لی تھی اور وہی سوٹ پہننے کا اور کوئی فضول فرمائش نہ کرنے کا وعدہ بھی کر لیا تھا۔

وہ اگلے روز صبح چھ بجے اٹھا تھا آج پہلی بار دیر سے جانے کے بجائے وقت سے پہلے اسکول جا رہا تھا کیونکہ آج اسے پہلی صف میں بیٹھنا تھا۔ انعم ڈرامے میں پرفارم کرنے والی تھی اور وہ اسے سب سے زیادہ قریب سے دیکھنا چاہتا تھا۔ سات بجے آ کر وہ پہلی صف کی پہلی کرسی پر بیٹھ چکا تھا۔ ساتھ والی سیٹ اس نے زیبو کے لیے مختص کر لی تھی۔

اب وہ زیبو اور انعم کا انتظار کر رہا تھا۔ اس ایونٹ میں اس کی دلچسپی محض انعم کو ڈرامے میں پرفارم کرتا ہوا دیکھنے تک ہی محدود تھی لیکن ایک گھنٹہ وہاں بیٹھ کر انتظار کرنے کے بعد وہ اسے بنا دیکھے ہی اٹھ کر چلا آیا تھا' ڈھیلی ڈھالی کھٹی کے کھدر نما شلوار سوٹ میں اسے اپنی شخصیت ایسے لگ رہی تھی جیسے دو سال کے

بچے کو دس سال کے بچے کا سوٹ پہنا دیا ہو' بازو لمبے تھے تو اماں نے کف موڑ دیے تھے' گریبان میں دو گردنیں سما سکتی تھیں۔ قمیص کی لمبائی ٹخنوں سے دو انچ اوپر تھی اور شلوار تھی یا تہہ بند۔ وہ رو دینے کے قریب تھا۔

بے مقصد گلیوں میں گھومتا رہا اور جب واپس گھر آیا تو شام ہو چکی تھی اور ابا' تایا ابو' عمر سب اسے ڈھونڈنے نکلے ہوئے تھے۔ عمر نے ہی شکایت لگائی تھی کہ وہ آج اسکول نہیں آیا تھا۔

"اکلوتا بیٹا ہے تمہارا اور تمہیں اس کی کوئی فکر ہی نہیں ہے' کتنی بار کہا ہے' نظر رکھا کرو اس کی سرگرمیوں پر' یہی عمر ہے بننے کی اور بگڑنے کی۔" تایا' ابا پر برس رہے تھے اور ابا نے اسے دیکھتے ہی پیٹنا شروع کر دیا تھا۔ اس روز اسے عمر سے بے پناہ نفرت محسوس ہوئی تھی۔ ابا نے اس کا گھر سے نکلنا بند کر دیا تھا اور عمر مزے سے عقبی کھیل کے میدان میں اس کے ہی دوستوں کے ساتھ کرکٹ کھیلتا تھا۔ وہ کھڑکی میں کھڑا دیکھتا اور کڑھتا رہتا۔

زیبو اس کے لیے چائے لے کر آئی تھی' تب ہی عمر نے چھکا لگایا تھا۔

"گڈ شاٹ۔" اس نے تالی بجا دی اور فیصل نے اتنی زور سے کھڑکی بند کی کہ میز پر رکھا چائے کا کپ دھمک سے نیچے جا گرا اور اب وہ بغیر کسی معذرت کے کمرے سے جا چکا تھا۔ زیبو نے بند کھڑکی کو حسرت سے دیکھا ضرور مگر وہ بند کھڑکی اس نے دوبارہ نہیں کھولی تھی۔ فیصل کو منانا بھی باقی تھا۔

"میرے بیگ میں جو چاکلیٹ رکھی ہے کہہ دوں گی انعم نے دی تھی پھر تو مان ہی جائے گا۔" وہ انعم کا ایسا ہی دیوانہ تھا۔

☼ ☼ ☼

ان کے میٹرک کے امتحانات ہوئے تو اس نے کسی معروف موبائل کمپنی کے دفتر میں مارکیٹنگ کی جاب شروع کر دی تھی عمر کو تایا ابا نے نئی موٹر بائیک لے کر دی تھی حالانکہ بائیک اس کی جاب کی ضرورت تھی۔ اس نے ابا سے کہا تھا۔

مگر الٹا انہوں نے ڈانٹ ڈپٹ شروع کر دی تھی۔

"دیکھا! اس جیسی ناخلف اولاد ہوتی ہے' باپ کے ساتھ ہاتھ بٹانے کے بجائے دوسروں کو فائدہ دے رہا ہے اور عمر کو دیکھو باقاعدگی سے باپ کی دکان پر جاتا ہے بھائی صاحب کے بچے کتنے سلجھے ہوئے' فرمانبردار ہیں اور یہ! ایک انڈا وہ بھی گندا۔"

"تایا ابو عمر کو سیلری بھی دیتے ہیں۔" اس نے بھی جتا دیا تھا۔

"ہاں تو اسے اپنے بیٹے پہ بھروسہ ہے' وہ ساری رقم جا کر اپنی ماں کو ہی دیتا ہے' تمہاری طرح فضول خرچ نہیں ہے۔"

"تو آپ بائیک لے کر نہیں دیں گے۔" وہ فیصلہ کن انداز میں بولا۔

"نہیں۔" دو ٹوک انکار حاضر تھا' پھر اس نے مزید بحث نہیں کی تھی۔ وہ کسی اور نوکری کی تلاش میں مصروف ہو چکا تھا' زیبو اخبارات سے اشتہار کاٹ کاٹ کر ہر جگہ اس کی سی وی بھجوا دیتی تھی۔ مگر باوجود کوشش کے اسے کہیں نوکری نہیں ملی تھی۔

انہی دنوں میں زیبو نے بتایا کہ انعم پریشان ہے۔ اس کے ابو فوت ہو چکے تھے اور اس کی امی کپڑے سلائی کرتی تھیں۔ چھوٹا بھائی بے حد ضدی اور شرارتی تھا اور اس نے آج کل ضد پکڑی ہوئی تھی کہ کمپیوٹر لے کر دیں گے تو اسکول جاؤں گا' وہ آٹھویں جماعت کا طالب علم تھا۔

انعم گھر میں بچوں کو ٹیوشن پڑھاتی تھی۔ اس نے کمیٹی ڈال رکھی تھی اور اس کمیٹی کے پیسوں سے علی کو کمپیوٹر لے کر دیا تھا لیکن وہ کوچنگ سینٹر کی فیس نہیں دے سکتی تھی' علی کو کمپیوٹر سکھانا بھی ایک مسئلہ تھا۔ اور اس کے لیے فیصل نے جھٹ اپنی خدمات پیش کر دی تھیں۔ اب وہ روز ان کے گھر آنے جانے لگا تھا۔ اس کی امی اور بھائی کے علاوہ ان کے گھر میں ان کی دادی اماں تھیں' جو فیصل سے بڑی محبت سے ملتیں۔

ان کے گھریلو حالات ہی ایسے تھے کہ اس نے ٹیوشن فیس لینے سے صاف انکار کردیا تھا۔

"انعم! وہ میرا بھی بھائی ہے۔" اور انعم خاموش ہو گئی تھی۔ دن میں وہ ایک موبائل شاپ پہ سیلز مین کی جاب کرتا تھا۔

ابا اس پر بھی اسے سنانے سے باز نہیں آئے تھے۔ مگر آج کل اسے ابا کی کڑوی کسیلی باتیں بھی بُری نہیں لگتی تھیں۔ وہ ہر وقت یا تو گنگناتا رہتا یا پھر بلاوجہ مسکرائے جاتا تھا۔ دن نکلتے ہی اسے بس شام کا انتظار رہتا تھا جب وہ علی کو ٹیوشن پڑھانے جائے گا تو ایک نظر اسے بھی دیکھ سکے گا۔ وہ روز اس کے لیے چائے بنا کر لاتی تھی اور فیصل کا دل چاہتا تھا وہ اس مگ کو کسی قیمتی متاع کی طرح ہمیشہ کے لیے اپنے پاس رکھ لے، جس کے وجود پر اس کے محبوب کا لمس مہکتا تھا۔ اس کی دادی جب بھی گھر میں کچھ اچھا پکا ہوتا تو اسے کھانے پر بھی روک لیتی تھیں۔ دھیرے دھیرے وہ جیسے ان کے گھر کا اک فرد بنتا جا رہا تھا پھر اس نے امی اور پھوپھو سے بھی کہا تھا کہ وہ اپنے سوٹ انعم کی امی سے سلوا لیا کریں۔

اس طرح دونوں گھرانوں میں کچھ اور تعلق بڑھا تھا۔

اس کی امی کو وہ وضع دار سے لوگ پسند آئے تھے اور انعم بھی۔ امی اب اکثر گھر میں بھی انعم کے سلیقے اور مودب پن کی تعریف کرنے لگی تھیں۔

✡ ✡ ✡

وہ موبائل شاپ پہ تھا جب اس کا موبائل بجا، زیبو کا نمبر تھا۔

"فیصل! کہاں ہو تم؟ رزلٹ آگیا ہے جلدی سے پتا کر کے بتاؤ۔" وہ کچھ زیادہ ہی جلدی میں تھی اس نے "اچھا دیکھتا ہوں" کہہ کر فون بند کردیا تھا۔ اس کی جیب میں انعم کی رول نمبر سلپ بھی تھی جو اس نے کل دی تھی۔ حسب توقع زیبو کی بورڈ میں پہلی پوزیشن تھی اور انعم کی دوسری، وہ بھی فرسٹ ڈویژن میں پاس ہوا تھا۔

زیبو کو فون پہ رزلٹ بتانے کے بعد وہ بازار گیا تھا۔ وہاں سے انعم کے لیے ایک رسٹ واچ اور مٹھائی کا ڈبہ لیا۔ اس سے قبل اس نے رول نمبر سلپ کی نقل کروائی تھی۔ وہ ہمیشہ اس سلپ کو اپنے پاس رکھنا چاہتا تھا۔ وہ گھر میں داخل ہوا تو پہلا سامنا دادی سے ہوا تھا۔

"مبارک ہو دادی جان!" وہ بائیک سے اتر کر ان سے گلے ملا، موبائل شاپ سے ملنے والی تنخواہ سے اس نے قسطوں پر بائیک لے لی تھی۔

"انعم۔" انہوں نے وہیں سے آواز دی تھی۔ وہ کچن کے دروازے سے باہر نکلی۔ اس نے پیلے رنگ کا سوٹ پہن رکھا تھا جس میں اس کی چمپئی رنگت خوب دمک رہی تھی دادی نے دونوں کو ساتھ لگا کر دعائیں دیں۔

"مبارک ہو۔" اس نے آہستگی سے کہا تھا۔

وہ پہلے مسکرائی تھی اور پھر شکریہ ادا کرنے کے ساتھ اس کا منہ بھی میٹھا کروایا تھا۔

"آہا باجی! آج شام تو پارٹی ہوگی۔" علی دور سے ہی اچھلتا کودتا آیا تھا۔ اس کی امی نے فیصل کو اندر آنے کی دعوت دی تھی۔

"انعم نے پکوڑے بنائے ہیں۔ کھا کر جانا۔" اور وہ پکوڑے کھانے کی خاطر نہیں، انعم کو تحفہ دینے کے لیے رک گیا تھا۔ بعد میں جب وہ اسے دروازے تک چھوڑنے آئی تو فیصل نے اسے وہ تحفہ دیا تھا۔

"اس کی کیا ضرورت تھی۔" وہ ذرا سا ہچکچائی۔

"میں اپنی خوشی سے لایا ہوں۔ تو میری خوشی کی خاطر لے لو۔" اور وہ اس کی خوشی کی خاطر تو کچھ بھی کر سکتی تھی۔ اس نے ہاتھ آگے بڑھا دیا تھا۔ فیصل نے گھڑی اس کی کلائی میں سجا دی۔

"تمہیں پتا ہے! تم میرے لیے بہت خاص ہو۔" وہ اس کی آنکھوں میں دیکھ رہا تھا۔ انعم کے لب ہلے تھے۔ "تم بھی۔" مفہوم اس نے خود سے اخذ کرلیا تھا۔ اتنا واضح اقرار، یہ خود سپردگی۔ اس کا دل چاہ رہا تھا وہ ہواؤں میں لوٹنیاں لگائے، بھنگڑا ڈالے، آج بے حد خوشی کا دن تھا۔

یہ بات اس نے سب سے پہلے زیبو کو بتانی تھی اسی لیے وہ گھر جانے سے پہلے ان کے پورشن کی سمت چلا آیا تھا مگر لاؤنج میں بیٹھے عمر اور اس کے مقابل بیٹھی زیبو کو دیکھ کر اس کا موڈ بری طرح سے بگڑا تھا پھوپھو اس وقت نماز ادا کر رہی تھیں اور ظاہر ہے زیبو کو ہی اس کی خاطر مدارت کرنی تھی۔ لیکن وہ یہ بات کسی صورت نہیں سمجھ سکتا تھا۔

"زیبو! میرے ساتھ آؤ۔ کچھ بات کرنی ہے تم سے۔" اکھڑے موڈ کے ساتھ وہ اس کے سر پر آن کھڑا ہوا تھا۔

زیبو نے پہلے نماز ادا کرتی امی اور پھر عمر کو دیکھا تھا۔ عجیب مخمصے میں پھنس چکی تھی۔

"سنا نہیں تم نے!" وہ مزید برہم ہوا تو وہ عمر سے معذرت کرتی اٹھ گئی تھی۔

"کیوں بیٹھی تھیں تم اس الو پٹیچر کے ساتھ۔" اس کا غصہ کسی طور کم نہیں ہو رہا تھا۔

"وہ میری فرسٹ پوزیشن کے لیے وش کرنے آیا تھا اور یہ دیکھو اس نے مجھے بریسلٹ بھی دیا ہے۔"

زیبو نے اسے چڑانے کی خاطر وہ مخملیں کیس دکھایا تو فیصل نے بریسلٹ کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیے۔

"میرا بس چلے تو اس کے بھی اتنے ہی چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کر دوں۔" وہ غصے سے بالکل بے قابو ہو رہا تھا۔

بالکل آؤٹ آف کنٹرول تھا۔

جبکہ زیبو ہکا بکا بریسلٹ کو ٹکڑوں میں بٹا دیکھ رہی تھی۔

☼ ☼ ☼

انتہائی خراب موڈ کے ساتھ وہ اپنے پورشن کی سمت آیا تھا مگر امی کو دو چار شاپرز کے ساتھ لدا پھندا دیکھ کر چونک گیا۔ وہ شاید کہیں جانے کو تیار کھڑی تھیں۔ شاپرز کے ساتھ ایک عدد مٹھائی کا ڈبہ بھی تھا۔

"اچھا ہوا تم آگئے! ابھی میں تمہیں فون کرنے ہی والی تھی۔" اسے آتا دیکھ کر انہوں نے جیسے اطمینان کی سانس لی تھی۔

"کہاں کی تیاری ہے؟" وہ بدمزا سا ہوا۔

"انعم کے گھر جانا تھا۔" انہوں نے بتایا اور اس کی باچھیں کھل گئیں۔

"کچھ کپڑے سلوانے تھے اور انعم کو گفٹ بھی دینا تھا' اتنی شاندار کامیابی کے بعد مبارکباد کی مستحق تو ہے نا۔"

"گفٹ۔ انعم کو۔ یا خدا مقام حیرت۔" وہ کچھ سوچ کر آگے بڑھا۔

"دکھائیں تو کیا لیا ہے انعم کے لیے۔" اس نے اشتیاق اور دلچسپی سے تمام شاپرز کو دیکھا تھا۔ عالیہ بیگم نے ایک شاپر سے خوب صورت سا جوڑا نکالا۔

"بہت پیارا ہے اور پھر فیروزی رنگ تو اس کا فیورٹ بھی ہے۔" اس کی زبان سے بے ساختہ ہی نکلا تھا۔

"تمہیں کیسے پتا کہ فیروزی رنگ اس کا فیورٹ ہے۔" انجم باجی نے کمرے سے نکلتے ہوئے اس کے الفاظ پکڑ لیے اور اچھنبے سے بولیں۔

"آپ کب آئیں؟" اس نے سنبھل کر موضوع بدلا تھا۔

"کبھی ہمارے جوڑوں کی تو ایسے تعریف نہیں کی۔" وہ بال کی کھال اتارنے والوں میں سے تھیں۔ اتنی جلدی کیسے ٹل جاتیں۔ فیصل کا استفسار تو گویا سر سے ہو کر گزرا تھا ابھی تک ان کے چتون سیدھے نہیں ہوئے تھے۔

وہ شانے اچکا کر مسکرا دیا۔ ایک اور ریڈ سگنل۔ اب کی بار ان کا ماتھا ٹھنکا تھا۔

"لگتا ہے دال میں کچھ کالا ہے۔"

"ایسی کوئی بات نہیں۔" اس نے جانے کو پر تولے۔

"اچھا! پھر بھی بتا دو' تمہیں کیسی لگتی ہے؟۔" وہ پیچھے دروازے تک آئیں۔

"اچھی ہے اور پیاری بھی۔" اس نے کہہ ہی دیا۔ عالیہ بیگم اور انجم آپا دونوں مسکرا دیں۔ اس کے

لیے یہ بھی باعث حیرت تھا۔

"چلو! پھر جاتی ہوں امی کے ساتھ "تمہاری انعم کو بھی دیکھ آئیں گے۔" انجم نے جانے کس موڈ میں کہا تھا مگر وہ تو اب "تمہاری" کہنے پر ہی خوشی سے نہال ہو چکا تھا اور پھر امی نے اپنے محدود خرچے میں سے انعم کے لیے خریداری کی تھی۔ یہ کیا ہو رہا تھا؟ وہ سوچتا رہا اور ہنستا رہا۔

☼ ☼ ☼

"دیکھا آپ نے! کتنی چالاک تھیں ماں، بیٹی اور دادی تو سب سے آگے ہیں۔ گھر میں کوئی مرد بھی نہیں۔ اکیلی شتر بے مہار عورتیں۔ اور فیصل کیسے تعریف کر رہی تھیں۔ آپ کا بیٹا آپ سے پہلے مٹھائی لے کر ان کے گھر آگیا تھا۔ دادی اسے اپنا بیٹا تو بنا چکی ہیں۔ بس دو بول پڑھنے باقی ہیں وہ بھی کسی روز خود ہی پڑھالیں گی اور انعم، اس کی معصوم شکل پر نہ جائیں آپ، مجھے پوری گھنی، میسنی لگ رہی تھی۔ ابھی عمر ہی کیا ہے اس کی اور لے کر ہمارے اکلوتے معصوم بھائی کو پھانس لیا، کیسے تعریف کر رہا تھا اس کی اچھی ہے اور پیاری بھی۔" یہ تھا انجم کا بے لاگ تبصرہ۔ جو آتے ہوئے راستے میں وہ کر رہی تھی۔

عالیہ بیگم نے بے ساختہ دل تھام لیا۔ "ارے! کیا اول فول بک رہی ہو۔"

"آپ تو بہت بھولی ہیں دنیا کا آپ کو کیا پتا۔" اپنی بات کا اثر زائل ہوتا دیکھ کر اس نے خاصا برا منایا تھا۔

"غریب سے لوگ ہیں۔ لڑکی بھی چھوٹی عمر کی۔ ذرا دب کر رہیں گی۔" عالیہ بیگم کا اپنا موقف تھا۔

"اوہو اماں! تم کب سمجھو گی۔ لڑکی جتنی بھی چھوٹی عمر کی ہو، ہے تو فیصل کی ہم عمر اور تمہارا بیٹا مکمل طور پر ان کی گرفت میں ہے انگلیوں پر نچائیں گی اسے۔ آنکھ بند کر کے ان کی ہر آواز پر لبیک کہے گا پھر دیواروں سے سر پھوڑتی رہنا۔"

"تمہیں ضرور کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔ مجھے تو اچھے خاصے شریف، بے ضرر سے لوگ لگتے ہیں۔" عالیہ بیگم کسی طور اس کی باتوں سے متفق نہیں ہو رہی تھیں۔

☼ ☼ ☼

انعم کی دادی کی طبیعت اچانک خراب ہو گئی تھی۔ انعم نے فون پہ روتے ہوئے بتایا تو اگلے پانچ منٹ میں وہ ان کے گھر پہ موجود تھا۔ انہیں فوڈ پوائزن ہو گیا تھا۔ دو دن وہ اسپتال میں رہ کر گھر آئی تھیں لیکن یہ دو روز ان کی فیملی کے لیے بڑے کٹھن اور صبر آزما تھے اور فیصل نے ان دنوں ان کا بھرپور ساتھ دیا تھا۔ اسپتال کے بل میں تین ہزار کم تھے۔ اس نے وہ رقم انجم باجی سے ادھار لے کر دی تھی۔ انعم کی امی اس کی بے حد ممنون و مشکور تھیں۔

فیصل کے لاکھ انکار کے باوجود بھی انہوں نے یہ رقم جلد لوٹانے کا وعدہ کیا تھا۔ لیکن انجم کے ہاتھ تو اس بار باقاعدہ ثبوت لگ چکا تھا وہ رات ہی عالیہ بیگم کے پاس پہنچ چکی تھی۔

"دیکھا! آپ کا بیٹا کس طرح سے اپنی کمائی دونوں ہاتھوں سے ان پر لٹا رہا ہے اور وہ ماں بیٹی اینٹھ رہی ہیں۔ اب تو آپ کو میری بات پر یقین آگیا ہوگا کہ کس قدر مکار، چالاک ہیں وہ عورتیں۔"

اور عالیہ بیگم حیران پریشان رہ گئی تھیں۔

"اب کیا کروں! فیصل کا تو تمہیں پتا ہے۔ کتنا ضدی اور خود سر ہو چکا ہے وہ کبھی میری بات نہیں مانے گا۔"

"تو فیصل سے منوانے کی کیا ضرورت ہے ان سے منوائیں۔"

"کیا مطلب؟" انہوں نے نا سمجھی سے انجم کو دیکھا۔

"دادی اماں کی عیادت کو چلتے ہیں۔ باقی باتیں وہیں چل کر ہوں گی۔" انعم نے دروازہ کھولا تھا اور انہیں دیکھ کر بے حد خوش ہوئی تھی۔ اس کی معیت میں چلتی وہ ڈرائنگ روم میں آن بیٹھیں۔ دادی کی مزاج پرسی کے بعد انجم نے ہی بات کا آغاز کیا تھا۔

"دیکھیں آنٹی! بات یہ ہے کہ آپ کا اور ہمارا کوئی جوڑ نہیں اور نہ ہی کبھی ہمارا یہ خیال ہو سکتا ہے کہ ہم آپ سے کوئی رشتے داری بنائیں' اس لیے مناسب یہی ہو گا کہ آپ اپنی بیٹی کو سمجھائیں کہ وہ فیصل کے خواب دیکھنا چھوڑ دے اور آپ بھی فیصل کی اپنے گھر آمد پر ذرا پابندی لگائیں۔ آپ تو جانتی ہیں کہ ہم کس معاشرے میں رہتے ہیں۔ آپ کے گھر میں جوان لڑکی ہے اور یوں کسی لڑکے کو گھر میں گھسانے سے قبل آپ کو ان نزاکتوں کا خیال رکھنا چاہیے تھا۔ محلے میں آپ کی بیٹی کا کردار مشکوک ہو رہا ہے۔ ہمیں بھی آپ کی عزت کا خیال ہے۔ اس لیے آپ کو یہ سب بتا رہی ہوں۔"

ان کے کاندھے پر ہاتھ کا دباؤ بڑھاتے ہوئے وہ اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ عالیہ بیگم نے بھی لب بھینچتے ہوئے اس کی معیت میں بیرونی دروازے کی سمت قدم بڑھا دیے۔

جبکہ عفیفہ خاتون کے چہرے پر ایک رنگ آ رہا تھا ایک جا رہا تھا' باہر کھڑی انعم کی ٹانگیں کانپنے لگیں۔ وہ بمشکل تمام وہاں سے چل کر اپنے کمرے تک آئی تھی۔

"اتنی تذلیل! اتنی بے عزتی!" وہ تو اپنی ماں سے نظریں ملانے کے قابل نہیں رہی تھی۔

☼ ☼ ☼

شام میں وہ حسب معمول ان کے گھر آیا تھا۔ آتے ہوئے راستے سے اس نے دادی کے لیے تھوڑے سے پھل بھی لے لیے تھے مگر دادی تو اس سے ملی بھی نہیں تھیں۔ انعم جو اس وقت بطور خاص کچن کی کھڑکی میں ہوتی تھی' آج غائب تھی اور یہ عفیفہ آنٹی اس سے کیا کہہ رہی تھیں۔

"فیصل! تم آج کے بعد ہمارے گھر مت آنا۔"

"مگر کیوں آنٹی؟" وہ بھونچکا رہ گیا تھا۔

قریب کھڑے علی نے خاموشی سے دونوں کو دیکھا تھا۔

"یہ سوال جا کر اپنی امی اور باجی سے پوچھو اور بس' آج کے بعد ہمارے گھر کبھی مت آنا۔"

ان کا لہجہ قطعی' انداز حتمی تھا جیسے کچھ سننا نہ چاہتی ہوں۔ وہ خاموشی سے واپس چلا آیا اور آتے ہوئے وہ ایک نظر بھی اسے دیکھ نہیں پایا تھا۔ اسے امی سے کچھ پوچھنے کی ضرورت نہیں تھی' وہ جان چکا تھا۔ یہ ساری آگ انجم باجی کی لگائی ہوئی ہے۔

اس نے ایسے ہی اعتبار کیا۔ چار دن سے وہ کمرہ بند کیے پڑا تھا اور عالیہ بیگم کو اب ہول اٹھ رہے تھے۔ وہ ان سے بات بھی نہیں کر رہا تھا۔ کھانا بھی چھوڑ دیا تھا۔ بس قوت بخش مشروبات پہ گزارا کر رہا تھا۔

آخر وہ جا کر زیبو کو بلا لائی تھیں۔

"اب تم ہی ہو جو اس کا موڈ ٹھیک کر سکتی ہو۔ اسے سمجھاؤ کہ اس کی ماں غلط نہیں ہے۔ میں کبھی اس کا برا نہیں سوچ سکتی۔ جو کیا ہے' اس کی بہتری اور بھلائی کی خاطر کیا ہے۔"

زیبو بس سنتی رہی کہہ نہ سکی کہ اس سے زیادہ بُرا اور کیا ہو گا۔ اپنے بیٹے کا دل توڑ دیا۔ اس بھلی عورت کی عزت نفس مجروح کی۔ اک کومل سی لڑکی کے جذبات کو روند ڈالا۔ اس کے کردار پر انگلیاں اٹھائیں۔ اور زیادہ کیا بُرا ہو گا۔

یہ اکلوتے بیٹوں کی مائیں' ان کا عدم تحفظ کا ڈر نہ جانے کب جائے گا۔ زیبو کی تمام ترہمدردیاں فیصل کے ساتھ تھیں اور اسے انعم کا خیال بھی تھا اس کی عزت نفس' انا' نسوانی وقار کیسے نہ مجروح ہوا ہو گا۔

وہ لڑکی تو اب ہنسنا بھول جائے گی۔

اس کا دل چاہ رہا تھا خوب سارا روئے۔ محبتوں کا متلاشی وہ لڑکا' جو بچپن سے ہی اس قدر نا آسودہ تھا' اب تو بالکل ٹوٹ پھوٹ جائے گا۔

اور وہ بھلا کیسے سمیٹے گی اسے۔

وہ انعم کا قلم' اس کے دیے کارڈز اور تحائف تک چھین لیتا تھا اور اب پوری انعم سے دستبرداری بھلا کیونکر ممکن تھی۔ اس نے ایک کوشش کرنی چاہی۔

"مامی جان! آپ نے اچھا نہیں کیا' انعم اتنی پیاری

لائق اور سلجھی ہوئی لڑکی تھی اگر فیصل اس سے شادی کرلیتا تو کیا ہو جاتا۔ آپ تو ویسے بھی کسی غریب گھرانے کی لڑکی جو کم عمر بھی ہو کو بہو بنانا چاہتی تھیں پھر انعم تو بالکل آپ کے مجوزہ معیار پر پوری اترتی تھی۔"

"زیبو! تم بچی ہو ابھی۔ ان باتوں کو نہیں سمجھو گی۔"

✡ ✡ ✡

ایک ایک زینہ طے کرتے ہوئے اس کا دم گھٹ رہا تھا۔ کیسے سامنا کرے گی وہ اس ٹوٹے بکھرے انسان کا' کن لفظوں میں اس کے غم کا مداوا ممکن ہو سکے گا۔ کمرے کی حالت ابتر تھی۔ ہر چیز کو اس نے تہس نہس کر ڈالا تھا۔ اور خود ٹیرس پہ کھڑا سگریٹ پی رہا تھا۔ وہ خاموشی سے اس کے برابر آن کھڑی ہوئی۔

"تم نے بات کی انعم سے۔" وہ اسے دیکھتے ہی بے چینی سے بولا تھا۔ کل ہی اس نے زیبو سے کہا تھا کہ وہ انعم سے کہے کہ وہ بس ایک بار اس سے مل لے۔

"وہ نہیں مانی اور اس نے یہ بھی کہا ہے کہ مجھے بھول جاؤ۔"

زیبو کے لہجے میں شکست خوردگی تھی کہ لاکھ قائل کرنے کے باوجود بھی وہ اس سے منوا نہیں سکی تھی۔

وہ ایسے ساکت ہوا تھا جیسے اس کی سانس بند ہو چکی ہو۔ زیبو نے محبت سے اسے دیکھا۔

"فیصل! جو ہوا بھول جاؤ اور تم نے ابھی تک اپنے فارم سب مٹ نہیں کروائے دو روز بعد داخلے بند ہو جائیں گے۔" نارمل سے انداز میں وہ اسے اس کی کوتاہی کا احساس دلا رہی تھی۔ وہ بغیر کچھ کہے سنے اپنے کمرے میں بند ہو چکا تھا۔ زیبو نے اس وقت اسے اس کے حال پہ چھوڑنا ہی مناسب سمجھا تھا۔

دو روز بعد ان کے گھر میں خوب لمبی چوڑی جھڑپ ہوئی تھی۔ فیصل نے ایف ایس سی میں داخلہ لینے سے صاف انکار کر دیا تھا۔ ابا اس پر خوب برسے تھے امی الگ پریشان' سب نے سمجھا کر دیکھ لیا تھا مگر وہ ٹس سے مس نہیں ہوا تھا۔

وہ دن رات ایک ہی بات سوچتا تھا کہ کس طرح تمام گھر والوں کو اتنا ہی جذباتی دھچکا لگائے جیسا انہوں نے اس کو پہنچایا تھا۔

چند روز گزرے تھے اس کا سیل فون بار بار بجنے لگا تھا۔ ایک لڑکی تھی اسما نام کی نارووال سے چھ گاؤں چھوڑ کر کسی بارڈر کی رہنے والی تھی۔ وہ خاموش' تنہا' اداس رہ کر جب تنگ آجاتا تو اس سے باتیں کرنے لگتا تھا۔

✡ ✡ ✡

زیبو کا کالج کھل چکا تھا۔ شام سے پہلے وہ لان میں اپنی کتابیں لے کر بیٹھی تھی۔ فیصل نے اسے کھڑکی سے دیکھا تھا وہ اس کے داخلہ نہ لینے پر ناراض تھی۔ کچھ سوچ کر وہ نیچے لان میں اس کے پاس چلا آیا تھا۔

وہ ہنوز اپنی کتابوں میں مگن تھی۔

"زیبو یار! کچھ کھانے کو دے دو۔ کل سے بھوکا ہوں۔"

جاؤ بارڈر کے پاس والے گاؤں میں' کچھ نہ کچھ مل ہی جائے گا۔" اس کا لہجہ پرسکون تھا لیکن جملے میں چھپی طنز کی کاٹ وہ سمجھ چکا تھا۔ وہ اس کے اسماء سے بات کرنے پر بھی خفا تھی۔

"اچھی لڑکی ہے یار!"

"اور کل کو جب یہ اچھی لڑکی بھی چھوڑ جائے گی تو خودکشی کرلینا۔" غصے میں اس نے کتاب بند کر دی تھی۔

"تم نہیں جانتیں وہ کتنی بڑی مصیبت میں گرفتار ہے' اس کے گھر والے اس کی شادی کسی بڈھے چوہدری سے کروا رہے ہیں۔ وہی گھسی پٹی کہانی' پنچایت کا فیصلہ' وہ مجھ سے مدد مانگ رہی ہے۔" وہ اس کے لیے افسردہ ہو رہا تھا۔

"میں پاگل ہوں جو تمہاری ہمدردیوں میں گھلتی رہی ہوں اور تم ایک نمبر کے الو کھامڑ' اس نے کہانی سنائی اور تم نے اعتبار کرلیا۔" زیبو کا بس نہیں چل رہا

تھااس کے بال نوچ ڈالے۔مدرٹریسا کا بھائی۔

"میں کل اس سے ملنے جارہا ہوں۔ مجھے یقین ہے وہ جھوٹ نہیں بول رہی۔" وہ پر یقین تھا زیبو نے اسے گھور کر دیکھا۔

"بالفرض اگر یہ سچ بھی ہوا تو کیا کرو گے تم اس سے شادی کرلو گے۔"

"نہیں یار! جہاں دل تھا کبھی اب وہاں صرف درد ہے اور یہ درد میں کبھی کسی سے نہیں بانٹوں گا۔" وہ مسکرا دیا۔

"تو آخر تم کرو گے کیا؟" وہ اس سے سچ اگلوانا چاہتی تھی کہ اب ماموں کو تنگ کرنے کے لیے وہ کون سا نیا کارنامہ سرانجام دینے والا تھا۔

"ابھی سوچا نہیں ہے۔"

☼ ☼ ☼
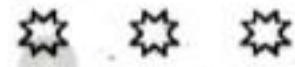
آج اس نے دکان سے چھٹی لی تھی۔ اسے اسماء سے ملنے جانا تھا عام سی جینز پہ اس نے کالی ٹی شرٹ پہن رکھی تھی۔ بڑھی ہوئی شیو' بالوں کو بھی محض ہاتھوں سے ہی سنوارا تھا۔

زیبو نے اس کے بکھرے سے حلیے کو قدرے ناگواری سے دیکھا۔

"اس حلیے میں اس سے ملنے جاؤ گے۔" ناشتے کی ٹرے اس کے سامنے رکھنے کے بعد وہ دوبارہ کچن سے کچھ لینے گئی تھی اس کا حقہ پانی زیبو کے دم سے ہی چل رہا تھا ورنہ امی اور ڈیڈی دونوں نے اس کا بائیکاٹ کر رکھا تھا۔

"مجھے کون سا اپنی گرل فرینڈ سے ملنے جانا ہے۔ بس ٹھیک ہوں میں ایسے ہی۔" کسل مندی سے کہتے ہوئے وہ آلو بھرے پراٹھوں کے ساتھ انصاف کرنے لگا تھا۔ اتنے دنوں کی بھوک ہڑتال کے بعد آج کل وہ ندیدوں کی طرح کھا رہا تھا۔

"بیٹا! کیوں میرے بھائی کو پریشان کرر کھا ہے۔" پھوپھو بھی اسے سمجھانے کو وہیں لاؤنج میں آبیٹھی تھیں۔

"آپ کے بھائی صاحب کنجوسی کی اعلا مثال ہیں۔ اچھا ہے میرے نہ پڑھنے سے ان کی کچھ بچت ہی ہو جایا کرے گی۔"

لاپروائی سے کہتے ہوئے اس نے نیپکن سے ہاتھ صاف کیے اور جلدی جلدی کا شور مچا کر وہاں سے نکل گیا۔ ورنہ پھوپھو کا والدین کی خدمت اور ان کی اطاعت پر دیا جانے والا لیکچر ڈیڑھ گھنٹے سے بھی تجاوز کرنے والا تھا۔

☼ ☼ ☼

اپنے دوست اسد سے اس نے بات کرلی تھی وہ گاڑی لے کر آیا تھا۔ دونوں ابھی شہر کی حدود سے نکلے ہی تھے جب اس کی سیل پر اسماء کی کال آئی تھی۔

"میں اس وقت لاہور میں ہوں۔" وہ شاید بہت جلدی میں تھی ساتھ رو بھی رہی تھی۔ "تم مجھ سے قائداعظم لائبریری کے باہر ملو۔"

وہ اس کی بات سن کر خود پریشان ہو چکا تھا اس نے اسد کو گاڑی واپس موڑنے کو کہا تھا۔ آدھے گھنٹے کے بعد وہ قائداعظم لائبریری کے باہر اس کے پاس کھڑا تھا' بقول اس کے گھر والوں نے آج کی شام اس کا نکاح مخالف قبیلے کے چوہدری رفاقت کے ساتھ طے کردیا تھا جس کی عمر ساٹھ سال تھی اور وہ پہلے سے شادی شدہ اور پانچ بچوں کا باپ بھی تھا اور اپنے بچاؤ کی کوئی صورت نہ پا کر وہ گھر سے بھاگ آئی تھی۔

معمولی سی شکل وصورت کی وہ لڑکی اسے پہلی نظر میں تو بالکل اچھی نہیں لگی تھی۔

"صرف تم ہو جو میری مدد کر سکتے ہو۔ تمہارے ہی بھروسے پر میں نے اتنا بڑا قدم اٹھایا ہے۔" وہ بڑی آس بھری نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔

"فیصل چھوڑو اسے! تمہارے کام کی نہیں ہے۔ میں تو کہتا ہوں سینما جا کر کوئی اچھی سی مووی دیکھتے ہیں۔ ذرا طبیعت شاد ہو جائے گی۔"

اسد اس کے کان کے پاس آکر بولا تھا۔ دل تو اس کا بھی یہی چاہ رہا تھا مگر وہ اس کی مدد کا وعدہ کر چکا تھا۔ اسے

اپنے حقوق کی خاطر لڑنے پر اکساتا رہا تھا۔ اب وہ گھر سے بھاگ آئی تھی تو وہ اسے چھوڑ کر کیسے چل دیتا۔

"چلو میرے ساتھ۔" وہ کچھ سوچتے ہوئے بولا تھا۔

"کہاں لے کر جاؤ گے اسے۔" اسد نے پھر سرگوشی کی۔

"میں اس کے ساتھ آج ہی کورٹ میرج کروں گا۔" وہ فیصلہ کر چکا تھا۔

"دماغ تو ٹھیک ہے تمہارا؟" اس کے سر پر جیسے کوئی بم بلاسٹ ہوا تھا۔ وہ اچھل کر دو قدم پیچھے ہٹا اور گھور کر اسے دیکھا۔

"ہاں اور اس کی وجہ سے ٹھیک ہے۔" اسے یاد تھا انعم کے بعد وہ کیسے ٹوٹ کر بکھر چکا تھا، پھر یہی لڑکی تھی جس نے اپنی توجہ اور اپنی دوستی سے اسے سمیٹا، اس کا دھیان بٹایا تھا، اس کا وہ برا وقت گزارا تھا۔

"تم اس کی مدد کرنا چاہتے ہو تو اس کے اور بھی راستے ہیں۔" اسد نے سمجھانے کی کوشش کی تھی۔

"تم میرے ساتھ چل رہے ہو کہ نہیں؟" اس نے جیسے آخری بار پوچھا تھا۔ اسد نے منہ کے ہزار زاویے بناتے ہوئے گاڑی کا دروازہ کھول دیا تھا۔

☼ ☼ ☼

کورٹ میرج کرنے کے بعد وہ اسے سیدھا گھر نہیں لے کر گیا تھا، پہلے اسے امی کو تیار کرنا تھا۔ ڈیڈ کی اسے کوئی فکر نہیں تھی ان کے رد عمل سے وہ واقف تھا اور دل ہی دل میں مسرور بھی۔ ایک گھر سے بھاگی ہوئی معمولی شکل و صورت کی لڑکی سے نکاح کر کے اس نے گویا ان سے اپنی تمام تر نا آسودہ خواہشات اور ناکام و نامراد محبت کا بدلہ لیا تھا اور اس بے عزتی کا بھی جو انعم باجی نے عفیفہ آنٹی کی کی تھی۔

زیبو کو اس نے بتایا تو وہ سر پکڑ کر بیٹھ گئی۔

"یہ دیکھو! اس کی تصویر، سب سے پہلے تمہیں دکھا رہا ہوں۔" اور تصویر دیکھ کر اس کی آنکھیں اور کھل گئیں۔

"یہ لڑکی ہے!" اس کا رد عمل فطری تھا۔ اس کا اتنا خوبرو، ہینڈسم سا کزن، جسے اسکول کی سب سے خوب صورت لڑکی سے محبت ہوئی تھی، جو کہتا تھا "زیبو! تم دیکھنا میری لائف پارٹنر اس دنیا کی سب سے خوب صورت لڑکی ہوگی۔" اور اس نے اس عام سے نقوش والی لڑکی سے شادی کر لی تھی۔

"اب اتنی بھی بری نہیں ہے۔" وہ برا ہی مان گیا۔

"اتنی نہیں لیکن۔" اس نے جان کر فقرہ ادھورا چھوڑ دیا تھا۔

"ماموں اس بار تو تمہیں سیدھا شوٹ ہی کریں گے، خاندان کی عزت مٹی میں ملا دی۔ کتنا ارمان تھا مجھے تمہاری شادی کا اور تم یہ چاند چڑھا کر آ گئے۔ شرم آنی چاہیے تمہیں۔"

"اب بس کرو نا، باقی کے ڈائیلاگز امی کے لیے رہنے دو۔" اس کی معصوم سی التجا پر اسے ہنسی آ گئی۔

"میں بتا رہی ہوں تمہارا حشر بہت برا ہونے والا ہے۔"

"ڈیڈی کی تو شکل دیکھنے لائق ہوگی۔" اسے سوچ کر ہی مزا آ رہا تھا۔

"بڑے کمینے ہو تم۔" زیبو کو اور ہنسی آئی۔

"اچھا پلیز! میری اچھی دوست ہو نا جا کر امی سے بات کرو نا۔" رشوت کے طور پر وہ چاکلیٹ بھی لایا تھا مگر زیبو نے صاف ہری جھنڈی دکھا دی۔

"مجھے مامی سے جوتے نہیں کھانے۔"

موقع غنیمت جان کر آخر اس نے خود ہی بات کر لی تھی، امی تو صدمے کے مارے بے ہوش ہونے کے قریب ہو گئیں۔

"امی وہ لڑکی بہت مشکل میں تھی۔ میں نے صرف اس کی مدد کی ہے۔" وہ ہر طرح سے منانے کو تیار کھڑا تھا مگر ان کا واویلا شروع ہو گیا۔ شام تک پوری کانفرنس سج چکی تھی۔

دونوں بہنیں اور ڈیڈی بھی موجود تھے۔

"اپنی عمر دیکھو اور اپنی حرکتیں دیکھو، بس اس بات کی کسر رہ گئی تھی۔" جب بہنیں اور امی بول بول کر خاموش ہو جاتیں، تب وقفے وقفے سے وہ یہی جملہ

دہراتے۔

"دیکھو فیصل! تم ہمارے پیارے بھائی ہوتا۔ تمہیں اگر شادی ہی کرنی ہے تو ہم جہاں تم کہو گے خوب دھوم دھام سے تمہاری شادی کریں گے۔"

"ہاں! ایک دو لڑکیاں تو میں نے تمہارے لیے دیکھ بھی رکھی تھیں۔" انجم اور سائرہ باجی اسے گھیرے بیٹھی تھیں مگر وہ ہنوز "صم بکم" بنا بیٹھا سوچ رہا تھا کیا تھا جو وہ یہ ڈرامہ چند ماہ پہلے کرلیتا تو شاید انعم اس کی زندگی میں شامل ہو ہی جاتی۔

"میں آج ہی وکیل سے بات کرتا ہوں۔" ڈیڈی نے جیب سے سیل فون نکالا۔

اب بھی نہ بولتا تو.....

"میں کسی بھی صورت اسے طلاق نہیں دوں گا۔ آپ کی ہر کوشش فضول ہی ہے۔" کہہ کر وہ اوپر اپنے کمرے میں چلا آیا تھا۔

"دیکھا تم نے! کیسے بات کر رہا تھا۔" وہ بیوی سے مخاطب ہوئے۔

"مجھے تو لگتا ہے انعم کے گھر والوں نے کچھ گھول کر پلا دیا ہے ورنہ ایسا تو نہیں تھا۔" انجم باجی دل برداشتہ سی کہہ رہی تھیں۔

"اچھا بس ختم کرو یہ کھٹ راگ' کرتا ہوں میں اس کا بھی علاج۔"

"جانے کس خاندان کی لڑکی ہے آپ تو جانتے ہیں قبائلی نظام کو' آئے روز کیسی دل دہلا دینے والی خبریں آتی ہیں کہیں ہم کسی مصیبت میں نہ پڑ جائیں۔"

"ہوں۔" وہ ہنکارا بھر کر کسی سوچ میں ڈوب گئے۔

☼ ☼ ☼

اگلے روز شام میں وہ اسے اپنے ساتھ گھر لے آیا تھا۔ اس کی امی اور دونوں بہنیں سر جوڑے بیٹھی تھیں۔ گھر میں سخت کشیدگی کا ماحول تھا۔

"سنو اسماء! یہاں میرے سوا کوئی بھی تمہاری آمد سے خوش نہیں ہے' ہاں میری ایک دوست ہے زیبو۔ بہت اچھی اور پیاری' وہ تمہارا خیال رکھے گی۔ باقی کوئی کچھ بھی کہتا رہے۔ بالکل برداشت کرنا۔" اپنے انداز میں وہ اسے بھرپور تسلی دے رہا تھا اور ساتھ پیش آنے والے ہر قسم کے حالات کے لیے تیار کر رہا تھا۔

امی سمیت ان دونوں نے بھی اسے اندر داخل ہوتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔

"امی! یہ اسماء ہے۔" محض اتنا تعارف کافی تھا۔

تینوں کے منہ حیرت سے کھل گئے۔

وہ نکاح کا صدمہ بالکل بھول چکی تھیں۔ لڑکی کی شکل و صورت اس کا حلیہ سب سے بڑا جھٹکا تھا ان کے لیے۔ اس سے اچھی شکل کی تو ان کی گھریلو ملازمائیں تھیں۔

اسماء نے جب اتنی خوب صورت خواتین کو دیکھا تو اس کا سر مزید جھک گیا۔

• "تمہاری ہمت کیسے ہوئی اس لڑکی کو گھر لے کر آنے کی۔" عالیہ بیگم تنفر سے بولیں۔

"یہ لڑکی میری بیوی ہے امی!۔ اور اب یہ اسی گھر میں رہے گی۔" وہ بھی اکڑ کر بولا تھا۔

"سارے زمانے میں تمہیں یہی ایک ملی تھی۔" انجم کا غصے کے مارے برا حال تھا۔

"ہاں۔" بے شرمی سے کہتا اس کا ہاتھ پکڑ کر وہ دھپ دھپ کرتا سیڑھیاں چڑھ گیا تھا۔

"توبہ! حد ہو گئی۔ ڈھٹائی اور دیدہ دلیری کی۔" سائرہ نے دانت پیسے۔

"لڑکی تو دیکھو ذرا!" اماں نے سر تھام لیا۔

"فیصل! میری وجہ سے تمہیں یہ ساری جنگ لڑنی پڑ رہی ہے۔ میں بہت شرمندہ ہوں تم سے۔ اپنے ساتھ ساتھ میں نے تمہیں بھی مشکل میں ڈال دیا ہے۔" وہ بے حد شرمندہ اور ملول تھی۔

"اچھا چھوڑو یہ سب باتیں' جو ہونا تھا ہو چکا۔ تم بس ریلیکس رہو۔ کچھ دنوں میں سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

☼ ☼ ☼

دوسری صبح ناشتے کے بعد وہ اسے شاپنگ کروانے

لے گیا تھا۔ امی اور بہنوں کو وہ دانستہ نظرانداز کر رہا تھا۔ دکان سے اس نے ایک ہفتے کی چھٹیاں لے لی تھیں۔ وہ چاہتا تھا کہ اس ایک ہفتے میں سب کچھ ٹھیک ہو جائے۔ امی اس لڑکی کو اپنی بہو تسلیم کر لیں مگر جب تک اس کی بہنیں اس گھر میں تھیں، ایسا ممکن نہیں تھا۔ جب وہ چلی جائیں گی تو وہ امی کو منا لے گا۔

اسماء نے بس تین ہی سوٹ خریدے تھے۔

"فیصل اب گھر چلو، باقی شاپنگ پھر کبھی کر لیں گے۔"

"گھر جا کر کیا کریں گے؟ پھر وہی ٹینشن بھرا ماحول، چلو کسی اچھی سی جگہ بیٹھ کر آرام سے باتیں کرتے ہیں۔"

"اگر کسی نے دیکھ لیا تو۔۔؟" وہ ڈر رہی تھی۔

"ہاہاہا! وہ بے ساختہ ہنسا۔" یہاں کون دیکھے گا ہمیں؟" تمہارے گھر والے اب تک صبر کر چکے ہوں گے اب کوئی ڈر کوئی خطرہ نہیں ہے۔ تم اتنی ٹینشن نہ لیا کرو۔"

"جب تک حالات نارمل نہیں ہو جاتے میں آرام سے نہیں رہ سکتی۔"

"بہت ہی بزدل ہو تم۔" اس نے گاڑی واپس گھر کی سمت موڑلی تھی۔

واپسی پر وہ اسے پھوپھو کے پورشن میں لے آیا تھا زیب ان کے لیے اچھا سا لنچ تیار کر کے منتظر بیٹھی تھی۔ پھوپھو اس سے خفا تھیں لیکن اسماء کے سامنے وہ نارمل ہی رہی تھیں۔

شام کو وہ اسے گھر لایا تو سائرہ اور انجم تب تک اپنے سسرال جا چکی تھیں۔ اس نے رات امی سے بات کرنے کی کوشش کی لیکن انہوں نے کچھ بھی سننے سے انکار کر دیا تھا۔

دو روز اس خاموشی میں سکون سے کٹ گئے۔ ڈیڈی نے بھی اس کے بعد سے کوئی ہنگامہ نہیں کیا تھا لیکن بالا ہی بالا وہ کیا کچھ کر چکے تھے، یہ دو روز بعد شام میں اسے معلوم ہوا تھا۔

وہ سردار، اسماء جس کے ساتھ منسوب تھی ڈرائنگ روم میں موجود تھا۔ اس کے ابو اس دنیا میں نہیں تھے۔ وہ تایا کی فیملی کے ساتھ رہتی تھی۔ جرم اس کے تایا زاد نے کیا تھا اور سزا اسے بھگتنی پڑی تھی لیکن عین وقت پر اس کی امی نے اسے فرار کروا دیا تھا۔ فیصل کے ابو نے یہ ساری معلومات فیصل کے دوست اسد سے لی تھیں اور اس سردار سے خود رابطہ کر کے اسے یہاں بلایا تھا۔ فرار کی تمام راہیں مسدود ہو چکی تھیں۔

"اسماء! تم اب میری بیوی ہو اور کسی بھی صورت ان کے ساتھ نہیں جاؤ گی۔"

وہ اسے دونوں شانوں سے جھنجھوڑتے ہوئے کہہ رہا تھا مگر اس کی رنگت ہلدی کی مانند زرد ہوتی جا رہی تھی۔

"وہ مجھے مار ڈالیں گے۔"

"کچھ نہیں ہوگا تمہیں، میں تمہارے ساتھ ہوں۔" وہ اس کا ہاتھ تھامے اسے ڈرائنگ روم میں لے تو آیا تھا مگر اسماء بھلا اپنے تایا کے سامنے کیسے ٹھہر سکتی تھی۔

کمرے میں سردار، اس کے محافظ اور تایا ابو کے علاوہ فیصل کے ڈیڈی اور وکیل صاحب بھی موجود تھے۔

"بچے ہیں ابھی اور بچوں سے غلطی ہو ہی جاتی ہے، فیصل تم ان کاغذات پر سائن کر دو بیٹا۔" وکیل صاحب نے چند کاغذات اس کی جانب بڑھاتے ہوئے کہا تھا۔

"ڈیڈی! کیا ہے یہ سب کچھ۔"

"مزید تماشا بنانے کی ضرورت نہیں ہے، وکیل صاحب جو کہہ رہے ہیں وہ کرو، سمجھے!" ان کا لہجہ انتہائی درشت اور دھمکی آمیز تھا۔

"ایسا کبھی نہیں ہوگا۔" وہ ان سے بھی زیادہ زور سے چلایا تھا۔

"تم!" سردار اٹھ کر انتہائی غصے میں اس کی سمت بڑھا، جسے وکیل صاحب نے اٹھ کر روکا تھا۔

مستعد کھڑے محافظوں نے بندوقیں تان لیں۔

"اسماء! اس لڑکے سے کہو، کاغذات پہ سائن کرے۔" اس کا تایا اب اسماء سے کہہ رہا تھا۔

"تایا ابو۔" وہ رو پڑی تھی۔

"سنا نہیں تم نے؟" وہ اچانک دھاڑے تھے۔ سردار کی مکروہ نگاہیں اس پر جم گئیں۔ اس نے فیصل کی سمت دیکھا وہ نفی میں سر ہلا رہا تھا۔

آنسو ضبط کرتے ہوئے اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

وہ اسے مزید کسی مصیبت میں مبتلا نہیں کرنا چاہتی تھی۔

☼ ☼ ☼

اس کی زندگی میں جیسے اب کچھ نہیں بچا تھا۔ انتہائی غصے میں دوڑاتے ہوئے اس نے اپنی بائیک دیوار پہ دے ماری تھی۔ بمشکل ہی اس کی جان بچ پائی تھی۔ ہوش میں آتے ہی اس نے چلانا شروع کر دیا تھا۔ وہ اپنے گھر والوں میں سے کسی کی بھی شکل نہیں دیکھنا چاہتا تھا۔ زیبو اس کے پاس رکی ہوئی تھی اور اس کا ہر طرح سے خیال رکھ رہی تھی۔

"ابھی بھی ماموں اگر آپ نے اپنا رویہ نہ بدلا تو اپنے بیٹے کو ہمیشہ کے لیے کھو دیں گے۔ آپ ہمیشہ عمر کو اس پر پریفر کرتے آئے ہیں۔ اتنا اعتماد اگر آپ نے اپنے بیٹے کو دیا ہوتا تو وہ آج کبھی ایسا نہ ہوتا وہ ہر الٹا کام صرف آپ کو زچ کرنے کے لیے کرتا ہے' آپ اس کے مزاج کو نہیں سمجھ پائے' اسے سختی کی نہیں صرف محبت کی ضرورت ہے' اگر گھر سے اسے پیار ملا ہوتا تو وہ کبھی اسے باہر تلاش نہ کرتا۔"

جانے ماموں کے سامنے وہ کیسے اتنا بول گئی تھی مگر اب اسے ہر صورت اس سرد جنگ کو ختم کرنا تھا جو بچپن سے باپ اور بیٹے کے درمیان چل رہی تھی۔

جب وہ اسپتال سے رخصت ہوا تو بیچ سڑک میں گاڑی رکوا کر بیٹھ گیا۔

"میں اب اس گھر میں کبھی نہیں جاؤں گا۔" اس کی ایک ہی ضد تھی۔ "میرا اب ان لوگوں سے کوئی تعلق نہیں رہا وہ کبھی مجھے خوش نہیں دیکھ سکتے۔ ان کا سکون ان کی خوشی مجھے مینٹلی ٹارچر کرنے میں پوشیدہ ہے۔ وہ ایسا کوئی موقع کبھی جانے نہیں دیں گے جس سے مجھے اذیت پہنچ سکے۔"

"یہ صرف تمہارے دماغ کا فتور ہے فیصل ورنہ تمہارے ڈیڈی بہت محبت کرتے ہیں تم سے۔"

"محبت۔" وہ استہزائیہ انداز میں ہنسا تھا۔

"جانتی ہو! اگر یہ ایکسیڈنٹ ان کی گاڑی سے ہوتا تو وہ فون کر کے سب سے پہلے یہ پوچھتے کہ میری گاڑی ٹھیک ہے۔" اس نے گاڑی پہ خاصا زور دیا۔

"انہوں نے بس تمہاری اچھی تربیت کرنے کی کوشش کی تھی فرق صرف تمہاری سوچ کا ہے۔"

"غلط فہمی ہے تمہاری۔"

"اگر بقول تمہارے وہ اچھے نہیں ہیں تو تم اچھے بن جاؤ۔ وہ تمہارا خیال نہیں رکھتے تو تم رکھ لو ان کا خیال۔ وہ تم سے محبت نہیں کرتے تو تم محبت کر لو ان سے۔ اگر انہیں تمہاری خواہشات کا احترام نہیں تو تم مان رکھ لو ان کا۔"

"وہ میرے باپ ہیں۔" اس نے جیسے یاد دلایا تھا۔

"ہاں! اور تم ان کے بیٹے جھکنا تمہیں ہی پڑے گا۔"

☼ ☼ ☼

اور اس دن کے بعد سے اس نے خود کو سرتاپا بدل لیا تھا۔ نہ کوئی ضد نہ خواہش اور نہ ہی فرمائش۔ گھر میں وہ سب سے بہت ہی آرام سے بات کرتا تھا ہر کام میں تابع داری سے سر ہلا دیتا۔ دکان چھوڑ کر وہ ابا کی لانڈری جا رہا تھا۔ تنخواہ کا بھی کوئی مطالبہ نہیں ڈیڈی، جتنی رقم دیتے خاموشی سے تھام لیتا' نہ دیتے تو کوئی احتجاج بھی نہیں۔

وہ بالکل ویسا بن گیا تھا جیسے اس کے گھر والے چاہتے تھے۔ ڈیڈی بھی اب اس سے خوش رہنے لگے تھے۔ انہوں نے اسے گاڑی بھی لے کر دی تھی لانڈری کا منیجر اب وہی تھا۔

تنخواہ بھی اچھی تھی۔ سب کچھ کتنی آسانی سے مل گیا تھا۔

اور تو اور اب ڈیڈی عمر کے مقابلے میں اس کی بات کو اہمیت دینے لگے تھے مگر وہ پھر بھی خوش نہیں تھا۔ اس کے نزدیک اب ان باتوں کی کوئی اہمیت نہیں رہی تھی۔

ان ہی دنوں اس کی پھوپھو کا اچانک انتقال ہو گیا زیبو کے غم میں وہ برابر کا شریک تھا۔ وہ بہت تنہا اور اداس ہو گئی تھی۔ ڈیڈی اسے اپنے پورشن میں لے آئے تھے۔ اس کے ابو ملک سے باہر تھے سسرال میں کوئی تھا نہیں تو پھوپھو کے لیے جو دادا نے الگ پورشن بنوایا تھا وہ ادھر ہی رہتی تھیں۔

اس کے ابو نے زیبو کے تمام اختیارات ڈیڈی کو سونپ دیے تھے۔ اب اسے ادھر ہی رہنا تھا اس لیے وہ گھر کے کاموں میں دلچسپی لینے لگی تھی بلکہ اس نے تو آتے ہی سارا گھر سنبھال لیا تھا۔ امی کے مزاج سے وہ بچپن سے واقف تھی سو اسے اس ماحول کا حصہ بننے میں کوئی مشکل نہیں ہوئی تھی۔

امی بھی اس سے خوش تھیں کہ زیبو ہر کام میں ان کی مدد کے لیے ہمہ وقت تیار رہتی تھی۔

البتہ عمر کی آمد و رفت ان کے گھر اب کچھ زیادہ ہی ہونے لگی تھی۔ اس نے اکثر دونوں کو ساتھ بیٹھ کر باتیں کرتے دیکھا تھا مگر وہ جانتا تھا کہ زیبو بچپن کی طرح آج بھی اسے بالکل پسند نہیں کرتی۔

اور پھر ایک روز امی نے اسے بتایا تھا کہ تایا ابو نے عمر کے لیے زیبو کا ہاتھ مانگا ہے اور اس میں عمر کی پسند بھی شامل ہے۔

ڈیڈی نے رضامندی دے دی تھی۔

اور آج شام وہ لوگ باقاعدہ رشتہ لے کر آنے والے تھے۔ ساتھ ہی منگنی کی چھوٹی سی رسم بھی ہو جاتی۔ اس نے یہ سنتے ہی گھر میں ہنگامہ اٹھا دیا تھا۔

زیبو کی آنکھوں میں آنسو دیکھ کر تو وہ مزید بھڑک اٹھا تھا۔ اس کی اتنی اچھی، اتنی پیاری دوست اور ایک انتہائی ناپسندیدہ شخص کے ساتھ ساری زندگی گزار دے۔ ناممکن۔

"زیبو کی شادی کسی بھی صورت عمر سے نہیں ہو گی اگر ایسا ہوا تو میں خود کو شوٹ کر لوں گا۔" وہ ڈیڈی کے سامنے جا کھڑا ہوا۔

"کیا تکلیف ہے تمہیں! خود کو شوٹ کرنے والی؟" انہوں نے انتہائی تحمل سے دریافت کیا تھا اور اب وہ جواز کیا دیتا۔

"میں نے جو کہا ہے وہی کروں گا۔" ڈھٹائی کی حد تھی۔

"دیکھو! وہ گھر کی لڑکی ہے۔ مجھے سارہ اور انجم سے زیادہ پیاری ہے۔ آپا نے اس کی ذمہ داری مجھے سونپی تھی۔ بھائی صاحب نے بھی کلی اختیار مجھے سونپ رکھا ہے اور میں اس کے لیے عمر سے زیادہ کس کو اہمیت دوں۔ وہ گھر کا لڑکا ہے دیکھا بھالا' میں اس سے زیادہ کسی پہ بھروسہ نہیں کر سکتا۔"

"اگر بات گھر کے لڑکے کی ہے تو فیملی میں اور بھی لڑکے ہیں' عمر ہی کیوں؟" وہ زچ ہو گیا۔

"جو ہیں' وہ سب شادی شدہ ہیں۔ باقی زیبو سے چھوٹے ہیں اور کوئی اس کے میچ کا بھی نہیں۔"

"آپ عمر پہ بھروسا کر سکتے ہیں' اپنے بیٹے پر نہیں۔" آخر اسے یہی حل مناسب لگا۔ وہ کسی قیمت پر زیبو کی زندگی برباد ہوتے نہیں دیکھ سکتا تھا۔ ڈیڈی نے کڑے تیوروں سے اسے گھورا۔

"میں آپ کو یقین دلاتا ہوں میں زیبو کو بہت خوش رکھوں گا اور پھر وہ عمر کو پسند بھی نہیں کرتی' یہ ایک بے جوڑ رشتہ ہے۔" بالآخر ایک طویل مباحثے کے بعد وہ ڈیڈی کو قائل کر چکا تھا۔ دونوں کی نسبت طے ہو گئی۔

تایا ابو کو ڈیڈی نے سہولت سے انکار کر دیا تھا۔

دونوں گھرانوں میں ایک ان دیکھی خلیج حائل ہوتی چلی گئی۔ عمر ملک چھوڑ کر باہر چلا گیا تھا۔

اور زیبو وہ اداس گم صم سی جیسے خود میں سمٹ کر رہ گئی تھی۔

☆ ☆ ☆

اس دوران اسے علی ملا تھا اس نے باتوں' باتوں میں ایک بات کہی تھی۔

"فیصل بھائی! زندگی میں کبھی پیچھے مڑ کر بھی دیکھ لینا چاہیے۔ ہو سکتا ہے کوئی آج بھی تمہارا منتظر ہو۔"

اور وہ 'جواب' کبھی پیچھے مڑ کر نہیں دیکھنا چاہتا تھا' نہ جانے کیسے اس کے قدم اسی راستے کی سمت اٹھ گئے تھے۔ علی نے یہ بھی بتایا تھا کہ دادی اسے بہت یاد کرتی ہیں۔ اس کی امی فوت ہو چکی تھیں۔ علی خود شادی کر چکا تھا۔ دادی بے حد ضعیف ہو گئیں تھیں آج بھی اس سے بہت محبت اور پیار سے ملیں۔

"میں نے ہمیشہ تمہیں بہت یاد کیا۔" دادی اس سے کہہ رہی تھیں۔ فیصل نے ان کے دونوں ہاتھ تھام لیے۔

"میں بھی آپ کو بہت یاد کرتا رہا ہوں۔" اب وہ ان کے بوڑھے جھریوں زدہ ہاتھوں کو چوم رہا تھا۔ انعم اندر آئی تو دروازے میں ٹھٹک کر رک گئی۔

فیصل کا دل یکبارگی دھڑکا۔ وہ جو سمجھ رہا تھا اسے مکمل طور پر بھول چکا ہے' آج جو سامنے آئی تھی تو دھڑکنوں نے پھر وہی راگ چھیڑ دیا تھا۔ دل کی اندھیر نگری میں جیسے کوئی چراغ جل اٹھا تھا۔ وہ عاشقی کا زمانہ!

سارے منظر روشن ہوتے چلے گئے۔

وہ کھڑی رہی' وہ دیکھتا رہا۔ کتنے ہی پل یونہی بیت گئے۔

"فیصل! اب تم ہی سمجھاؤ اسے' اتنے رشتے آ چکے ہیں مگر مانتی ہی نہیں۔ علی تو اپنے گھر بار کا ہو گیا اس کا بھی کوئی ٹھکانہ ہو تو میں سکون سے مر سکوں۔" وہ بے حد آزردہ لگ رہی تھیں۔

"دادی! آپ نے پھر وہی باتیں شروع کر دیں۔"

"دادی ٹھیک ہی تو کہہ رہی ہیں۔" وہ جیسے دل پہ پتھر رکھ کر بولا تھا۔ انعم نے ایک شکوہ بھری نظر اس پر ڈالی اور کمرے سے باہر چلی گئی۔

وہ بوجھل دل لیے واپس چلا آیا۔

دادی اس سے کیا کہنا چاہتی تھیں' وہ سمجھ چکا تھا مگر اب بہت دیر ہو چکی تھی۔ اس نے سوچ لیا تھا کہ دوبارہ اب کبھی اس گلی کی سمت مڑ کر نہیں دیکھے گا۔

چاہے کوئی عمر بھر اسی دہلیز پہ بیٹھا اس کی راہ تکتا رہے۔

✡ ✡ ✡

دو سال بیت گئے۔ عمر واپس آ گیا تھا۔ اس نے زیبو کو پردے کی اوٹ سے باہر تکتے پایا تو دو قدم آگے بڑھتے ہی اس کے قدم ٹھٹک گئے۔

وہ سڑک پہ کھڑے عمر کو اپنی گاڑی میں بیٹھتے ہوئے چپکے سے دیکھ رہی تھی۔ بچپن کی طرح آج بھی وہ اس کھڑکی کو بند کرنا چاہتا تھا لیکن.... خاموشی سے پلٹ آیا زیبو خود میں اتنی مگن تھی کہ اس کی آمد کو محسوس ہی نہیں کر پائی تھی۔

مگر وہ الجھ گیا تھا۔ اور الجھن بڑھتی ہی جا رہی تھی۔

ڈیڈی کی طبیعت آج کل خراب رہنے لگی تھی۔ سارا کاروبار اس کے حوالے کر کے اب وہ گھر میں آرام کیا کرتے تھے۔ امی کو اچانک ہی گھر کی ویرانی اور سونے پن سے وحشت ہونے لگی تھی۔

انہوں نے دونوں کی شادی کی تاریخ طے کر دی۔

یہ خبر سنتے ہی اس کی دونوں بہنیں بھی چلی آئی تھیں۔ گھر میں اب مخصوص شادی والا ہنگامہ جاگ اٹھا تھا' ڈیڈی' زیبو کا جہیز بنا رہے تھے۔ اس کی امی اور بہنیں مل کر شاپنگ کر رہی تھیں رات گئے تک ڈھولک بجتی رہتی۔

اور وہ ان سارے ہنگاموں سے الگ تھلگ جانے کن کاموں میں خود کو الجھائے رکھتی تھی۔

جیسے جیسے شادی کے دن قریب آ رہے تھے اس کا دل جیسے کوئی مٹھی میں لے کر دھیرے دھیرے بھینچ رہا تھا۔ درد کی شدت سے وہ دہری ہو جاتی۔ اذیت حد سے سوا ہوئی تو ایک روز اچانک بڑے کمرے میں سب کو چائے پیش کرتے ہوئے گر گئی۔

ڈاکٹر نے نروس بریک ڈاؤن بتایا تھا۔

✡ ✡ ✡

اصل بھید اب کھلا تھا' تو کیا وہ ہمیشہ سے ہی عمر کو پسند کرتی تھی؟" اس نے مٹھیوں میں جکڑے بال آزاد

کیے اور سر گھٹنوں میں دے کر بیٹھ گیا۔

وہ سات روز سے اسپتال میں تھی۔ ڈاکٹرز نے کہا تھا شدید ذہنی کشمکش کے باعث اس کا نروس بریک ڈاؤن ہوا تھا۔

"ذہنی کشمکش!" وہ الجھن میں پڑ گیا۔

"زیبو کو کیا مسئلہ ہو سکتا ہے؟" اس نے گھر آکر اس کے کمرے کی ہر چیز کھنگال ڈالی اور ذہنی کشمکش کا سراغ مل گیا۔

ایک مخملی کیس اور ٹوٹا ہوا بریسلیٹ ساری کہانی سنا گیا تھا۔

"جس کی دوستی کی خاطر میں نے اپنا پیار چھوڑ دیا تھا وہ بھی دو سالوں سے اپنا پیار بھلائے محض دوستی نبھائے جا رہی تھی۔ میری زندگی تو عذاب تھی ہی، ساتھ میں نے اسے بھی کانٹوں پہ گھسیٹ ڈالا۔ کیوں ایسا سوچا میں نے کہ جو شخص مجھے اچھا نہیں لگتا وہ زیبو کو بھی پسند نہیں ہو گا۔" پچھتاوا، بے بسی، دکھ، دلدوز سوچیں۔ کیا نہیں تھا جو اس کے دل کے ساتھ وجود کو بھی چھلنی کر رہا تھا۔

پچھلے سات روز سے اس کی یہی کیفیت تھی۔ وہ رات کو ایک پل کے لیے بھی سو نہیں پاتا تھا۔

اس نے مجھ سے ایک بار تو کہا ہوتا کیوں چپ چاپ خاموشی سے میری خواہش پہ سر جھکا دیا۔ آخری سگریٹ کو ایش ٹرے میں مسلتے ہوئے اس نے اپنے بال مٹھیوں میں جکڑ لیے تھے۔

حالانکہ وہ میری خواہش نہیں مجبوری تھی۔ کاش اس بار تمہاری آنکھوں میں چمکنے والے آنسوؤں سے میں نے اپنی مرضی کا مطلب اخذ نہ کیا ہوتا۔ اپنے دل کی ساری کہہ دینے کے بعد میں نے کبھی تمہارے دل میں بھی جھانک کر دیکھا ہوتا۔ کبھی تمہاری بھی سنی ہوتی۔ میں نے ہمیشہ تمہیں اپنے مطلب کے لیے استعمال کیا اور جب تمہارے دل میں کسی نرم گداز جذبے نے سر اٹھایا تو میری اس ہمدردی اس رحم اس عنایت نے تمہاری جان ہی لے لی اور اس قربانی سے مجھے کیا ملا؟ پچھتاوا، بے بسی، درد اور کبھی نہ ختم ہونے والی اذیت، میں قاتل ہوں تمہاری معصوم امنگوں کا، تمہاری محبت کا۔

میری ناکام محبت نے دل پہ اتنے گھاؤ نہیں لگائے تھے جیسا زخم تمہارے لگائے ہوئے مرہم نے دیا ہے۔ اس سے تو اچھا تھا تم بھی دھتکار دیتیں مجھے۔

اس نے سختی سے آنکھیں میچ لیں۔ فکر، بے سود۔

وہ اٹھ کر اسپتال چلا آیا۔

اسے زیبو سے شادی نہیں کرنی تھی، کسی صورت نہیں۔ وہ اسے یہ سزا نہیں دے سکتا تھا۔

☼ ☼ ☼

وہ ہنوز آنکھیں موندے لیٹی تھی۔

کمزوری، نقاہت، بے کلی اس کے چہرے سے واضح جھلک رہی تھی۔

"بند کرو یہ بیماری کا ڈھونگ اور اٹھ کر میری بات سنو۔" وہ اس کے سر پہ کھڑا درشتی سے کہہ رہا تھا۔

اس نے بمشکل ہی آنکھیں کھولی تھیں۔

"ہر بات پر مجھ سے لڑنے والی، میرا دماغ کھانے والی، ذرا سی بات پر ہنگامہ اٹھا دینے والی زیبو میری دوست تھی۔ تم کون ہو بتاؤ؟"

"میں تمہارا بھرم نہیں توڑنا چاہتی تھی۔" وہ رو پڑی۔

"اور اب جو میرے ساتھ کیا ہے وہ۔۔۔! انعم دو سال سے بیٹھی میرا انتظار کر رہی ہے۔ اس کی دادی تو اسی روز میرا نکاح پڑھا دیتیں مگر تم۔۔۔"

"بدتمیز! بے ہودہ، مطلبی انسان، میں تمہاری وجہ سے بستر مرگ پر پہنچ گئی اور تمہیں آج بھی اپنی فکر ہے۔" بغیر کسی لحاظ کے اس نے سائیڈ میز پر رکھی ٹوکری اس پر الٹ دی تھی۔

"چلو، تمہاری طرف سے کچھ تو تسلی ہوئی کہ تمہارا ذہنی توازن نہیں بگڑا۔" بے ساختہ قہقہہ لگاتے ہوئے وہ پھل ٹوکری میں واپس ڈالنے لگا تھا۔

دروازے میں کھڑا عمر اندر چلا آیا۔

زندگی میں پہلی بار فیصل اس سے ذرا اچھے انداز

میں ملا تھا۔

"آج سورج کیا مغرب سے نکلا ہے فیصل! تم مجھ سے گلے مل رہے ہو۔" وہ مصنوعی شوخی سے کہہ رہا تھا۔

"اب اتنی عزت تو تمہاری کرنی پڑے گی۔" وہ منہ بسور کر بولا تو زیب اور عمر ہنس پڑے۔

"لیکن فیصل! ماموں سے اب اگر تم نے انکار کیا تو وہ سیدھا تمہیں شوٹ ہی کریں گے۔" اچانک خیال آنے پر وہ فکر مندی سے بولی تھی۔

"ابو کو اپنا بھائی اور عمر مجھ سے زیادہ عزیز ہیں ویسے بھی انہوں نے تمہارے لیے عمر کو ہی ترجیح دی تھی۔" اس نے طنز نہیں کیا تھا لیکن عمر کو تو کنا پڑا۔

"میں نے تو تمہیں ہمیشہ اپنا بھائی سمجھا تھا۔ تم نے دل میں اتنی رقابت پال لی۔"

"یہ سب ڈیڈی کی وجہ سے ہوا تھا میں ان کا اکلوتا بیٹا تھا مگر وہ مجھے چھوڑ کر ہر وقت تمہارے گن گاتے تھے۔ مجھ سے زیادہ تمہیں چاہتے تھے۔ پھر میں تم سے حسد کرنے لگا تھا، حسد یا تو انسان کو سنوار دیتا ہے یا بگاڑ دیتا ہے۔ میرے ساتھ دوسرا معاملہ ہوا۔ میں اپنی ہی سوچوں اور خیالوں کی آگ میں جل کر تنہا ہو گیا۔ مجھے صرف محبت چاہیے تھی اور ڈیڈی کو صرف محبت کرنی نہیں آتی تھی۔ ہم دونوں کا ایک ہی مسئلہ تھا اور وہ مسئلہ تم تھے۔ وہ مجھے تمہارے جیسا بنانا چاہتے تھے اور میں اپنے جیسا رہنا چاہتا تھا۔ بچوں کا ہر وقت کا موازنہ کس قدر ذہنی اذیت کا باعث بنتا ہے کاش تم جان سکتے، پھر جب مجھے پتا چلا کہ تم زیب کو چاہتے ہو مجھے تم سے بدلہ لینے کا موقع مل گیا اور میں نے زیبو سے منگنی کر لی مگر میں کبھی جان ہی نہیں پایا کہ میری سب سے قریبی دوست میرے سب سے نزدیک کے دشمن کو اس قدر چاہتی ہے۔"

آخر میں اس نے زیبو کو آنکھیں دکھائیں تو وہ بے ساختہ سر جھکا گئی۔ دونوں کے بیچ جو ایک ان کہی تھی وہ آج اس نے یوں سر عام عیاں کر دی تھی۔

زیبو کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔

عمر نے دلچسپی سے اسے شرماتے ہوئے دیکھا تو فیصل نے زیبو کا ہاتھ اس کے ہاتھ میں تھماتے ہوئے زیبو کی انگوٹھی اتار کر عمر کی جانب بڑھا دی۔

"میرا یہ احسان یاد رکھنا۔ اپنی منگیتر تمہیں دے رہا ہوں۔"

"نہیں، تم مجھے میری محبت دے رہے ہو۔" وہ بھی برجستہ بولا تھا۔

"چلو! یوں ہی سہی اب بدلے میں تمہیں بھی مجھے میری محبت دینی پڑے گی کیونکہ ڈیڈی مجھ سے زیادہ تمہاری مانتے ہیں۔" ساتھ ہی شرط بھی عائد کر دی۔

"تم پرپوزل تیار رکھو۔" وہ بھی ہنس پڑا تھا۔

زیبو اور اسے کچھ لمحوں کے لیے اکیلا چھوڑ کر وہ باہر نکل آیا۔ باہر ڈیڈی اور تایا ایک ساتھ کھڑے تھے۔ ساری رنجشیں، گلے شکوے آج ختم ہو چکے تھے۔ عمر کے ساتھ وہ مذاق کر رہا تھا۔ انعم اور اس کے رشتے میں بھی اب کوئی رکاوٹ حائل نہیں تھی۔

کیونکہ ایک بازی اس نے بھی ڈیڈی کے ساتھ کھیلی تھی۔

وہ اپنے بھائی سے ملنے کے لیے بہت تڑپتے تھے کیونکہ تایا ابو کا رویہ اس روز کے بعد سے بہت روکھا اور لیے دیے والا ہو گیا تھا۔

اور فیصل نے ان سے کہا تھا۔

"وہ زیبو کی شادی عمر سے کروا دیں لیکن اس کے لیے انہیں اس کی شادی انعم سے کروانی پڑے گی۔"

اور وہ اس کی یہ شرط مان گئے تھے۔

اور اب وہ تازہ مہکتے گلابوں کا گلدستہ لیے روٹھے صنم کو منانے آیا تھا۔ دادی اسے دیکھ کر بے حد خوش ہوئی تھیں۔

اس نے اپنا مدعا پہلے دادی سے بیان کیا تھا۔ ساری کہانی ان کو بتا دی، سمجھا دی بلکہ رٹوا دی۔

وہ دادی کے لیے سوپ بنا کر لائی تھی۔ گہرے سبز رنگ کے سوٹ میں ملبوس وائٹ دوپٹہ لیے ہمیشہ کی طرح وہ بہت پیاری لگ رہی تھی۔ اس کے بال کمر سے نیچے تک جھول رہے تھے۔ گلابی رنگت کملا کر زرد

سی ہو رہی تھی۔ سنہری آنکھوں تلے سیاہ حلقے بے حد نمایاں تھے۔

حزن و ملال کے رنگوں میں لپٹی وہ خوش رنگ تتلی نہیں جانتی تھی کہ آج کوئی اس کے لیے گلابوں کا موسم لے کر آیا تھا۔

اسے مکمل طور پر نظرانداز کرتے ہوئے وہ دادی کی طرف متوجہ تھی۔

"دادی اب لیٹ جائیں! آپ کو آرام کی ضرورت ہے۔ اتنی دیر تک بیٹھنا آپ کی صحت کے لیے اچھا نہیں ہے۔" وہ صاف اسے سنا رہی تھی کہ اب وہ جا سکتا ہے۔

اس نے مدد طلب نظروں سے دادی کی سمت دیکھا تھا۔

"اب تم خود ہی سمجھالو۔" دادی نے عین وقت پر صاف ہری جھنڈی دکھادی تھی۔

جبکہ انعم ان کے اشارے کنائیوں سے بے خبر اس جملے سے سابقہ معنی اخذ کرتے ہوئے فوراً" بولی تھی۔

"انہیں سمجھانے کی ضرورت نہیں ہے میرے لیے جو بھی پہلا پرپوزل آئے آپ قبول کرلیں۔ میں شادی کے لیے تیار ہوں۔"

وہ کہہ کر رکی نہیں تھی اٹھ کر اوپر اپنے کمرے میں چلی آئی تھی اور آتے ہی دونوں ہاتھوں میں چہرہ چھپا کر اس نے زاروقطار رونا شروع کردیا تھا۔

کیوں آجاتا ہے یہ شخص ہر بار اس کی بے بسی کا تماشا دیکھنے۔ دادی کو دو کٹری کا نشان دکھاتا وہ ایک ساتھ دو دو سیڑھیاں پھلانگتے ہوئے اوپر آیا تھا۔ اسے روتا دیکھ کر پہلے مسکرایا پھر اس کے قریب چلا آیا اور اس کے سامنے دوزانو ہو کر بیٹھ گیا۔

"کیا اتنا برا ہوں میں جو مجھ سے شادی کرنے پر اس قدر قیمتی و نایاب آنسو بہائے جارہے ہیں۔" اور وہ رونا بھول کر اس کا چہرہ دیکھنے لگی تھی۔

ناسمجھی، بے یقینی، حیرت کیا کچھ نہیں تھا ان آنسو بھری آنکھوں میں۔

"تمہارے لیے پہلا پرپوزل میں لے کر آیا ہوں جو دادی نے قبول کرلیا ہے۔"

ناسمجھی، بے یقینی، حیرت کے تمام تاثرات اچانک کہیں غائب ہوئے تھے اور اب اس کے چہرے پر ایک ہی رنگ تھا۔

خوشی و انبساط کا رنگ، محبت کا رنگ اور ایسے ہی ڈھیر سارے رنگوں سے سجی ایک خوب صورت محبت بھری زندگی دونوں کی منتظر تھی۔

☆

عفت سحر طاہر

امتیاز احمد اور سفینہ کے تین بچے ہیں۔ معیز' زارا اور ایزد۔ صالحہ' امتیاز احمد کی بچپن کی منگیتر تھی مگر اس سے شادی نہ ہو سکی تھی۔ صالحہ دراصل ایک شوخ' الھڑسی لڑکی تھی۔ وہ زندگی کو بھرپور انداز میں گزارنے کی خواہش مند تھی مگر اس کے خاندان کا روایتی ماحول امتیاز احمد سے اس کی بے تکلفی کی اجازت نہیں دیتا۔ امتیاز احمد بھی شرافت اور اقدار کی پاس داری کرتے ہیں' مگر صالحہ ان کی مصلحت پسندی' نرم طبیعت اور احتیاط کو ان کی بزدلی سمجھتی تھی۔ نتیجتاً" صالحہ نے امتیاز احمد سے محبت کے باوجود بدگمان ہو کر اپنی سہیلی شازیہ کے دور کے کزن مراد صدیقی کی طرف مائل ہو کر امتیاز احمد سے شادی سے انکار کر دیا۔ امتیاز احمد نے اس کے انکار پر دلبرداشتہ ہو کر سفینہ سے نکاح کر کے صالحہ کا راستہ صاف کر دیا تھا مگر سفینہ کو لگتا تھا جیسے ابھی بھی صالحہ' امتیاز احمد کے دل میں بستی ہے۔

شادی کے کچھ ہی عرصے بعد مراد صدیقی اپنی اصلیت دکھا دیتا ہے۔ وہ جواری ہوتا ہے اور صالحہ کو غلط کاموں پر مجبور کرتا ہے۔ صالحہ اپنی بیٹی ابیہا کی وجہ سے مجبور ہو جاتی ہے مگر ایک روز جوئے کے اڈے پر ہنگامے کی وجہ سے مراد کو پولیس پکڑ کر لے جاتی ہے۔ صالحہ شکر ادا کرتے ہوئے ایک فیکٹری میں جاب کر لیتی ہے۔ اس کی سہیلی زیادہ تنخواہ پر دوسری فیکٹری میں چلی جاتی ہے جو اتفاق سے امتیاز احمد کی ہوتی ہے۔ اس کی سہیلی صالحہ کو امتیاز احمد کا وزیٹنگ کارڈ لا کر دیتی ہے۔ جسے وہ اپنے پاس محفوظ کر لیتی ہے۔ ابیہا میٹرک میں ہوتی ہے۔ جب مراد رہا ہو کر آجاتا ہے اور پرانے دھندے شروع کر دیتا ہے۔ دس لاکھ کے بدلے جب وہ ابیہا کا سودا کرنے لگتا ہے تو صالحہ مجبور ہو کر امتیاز احمد کو فون کرتی ہے۔ وہ "فوراً" آجاتے ہیں اور ابیہا سے نکاح کر کے اپنے ساتھ لے جاتے ہیں۔ ان کا بیٹا معیز احمد باپ کے اس راز میں شریک ہوتا ہے۔ صالحہ مر جاتی ہے۔ امتیاز احمد' ابیہا کو کالج میں داخلہ دلا کر ہاسٹل میں اس کی رہائش کا بندوبست کر دیتے ہیں۔ وہاں حنا سے اس کی

دوستی ہے جو اس کی روم میٹ بھی ہوتی ہے' مگر وہ ایک خراب لڑکی ہوتی ہے۔
معیز احمد اپنے باپ سے ابیہا کے رشتے پر ناخوش ہوتا ہے۔ زارا اور سفیر احسن کے نکاح میں امتیاز احمد' ابیہا کو بھی مدعو کرتے ہیں' مگر معیز اسے بے عزت کرکے گیٹ سے ہی واپس بھیج دیتا ہے۔ زارا کی نند رباب' ابیہا کی کالج فیلو ہے۔ وہ تفریح کی خاطر لڑکوں سے دوستیاں کرکے' ان سے پیسے بٹور کر ہلا گلا کرنے والا مزاج رکھتی ہے۔ اور اپنی سہیلیوں کے مقابلے اپنی خوب صورتی کی وجہ سے زیادہ تر ٹارگیٹ جیت لیا کرتی ہے۔ رباب' معیز احمد میں بھی دلچسپی لینے لگتی ہے۔
ابیہا کا ایکسیڈنٹ ہوجاتا ہے مگر وہ اس بات سے بے خبر ہوتی ہے کہ وہ معیز احمد کی گاڑی سے ٹکرائی تھی کیونکہ معیز اپنے دوست عون کو آگے کردیتا ہے۔ ایکسیڈنٹ کے دوران ابیہا کا پرس کہیں گرجاتا ہے۔ وہ نہ تو ہاسٹل کے واجبات ادا کرپاتی ہے۔ نہ ایگزامز کی فیس۔ بہت مجبور ہو کر وہ امتیاز احمد کو فون کرتی ہے مگر وہ دل کا دورہ پڑنے پر اسپتال میں داخل ہوتے ہیں۔ ابیہا کو بحالت مجبوری ہاسٹل اور ایگزامز چھوڑ کر حنا کے گھر جانا پڑتا ہے۔ وہاں حنا کی اصلیت کھل کر سامنے آجاتی ہے۔ اس کی ماما جو کہ اصل میں "میم" ہوتی ہیں' زور زبردستی کرکے ابیہا کو بھی غلط راستے پر چلانے پر مجبور کرتی ہیں۔ ابیہا بہت سر پٹختی ہے مگر میم پر کوئی اثر نہیں ہوتا۔ امتیاز احمد دوران بیماری معیز سے اصرار کرتے ہیں کہ ابیہا کو گھر لے آئے' مگر سفینہ بھڑک اٹھتی ہیں۔ امتیاز احمد کا انتقال ہوجاتا ہے۔ مرنے سے قبل وہ ابیہا کے نام پچاس لاکھ' گھر میں حصہ اور ماہانہ دس ہزار کرجاتے ہیں۔ اس بات پر سفینہ مزید سیخ پا ہوتی ہیں۔ معیز' ابیہا کے ہاسٹل جاتا ہے۔ کالج میں معلوم کرتا ہے' مگر ابیہا کا کچھ پتا نہیں ملتا۔ وہ چونکہ رباب کے کالج میں پڑھتی تھی۔ اس لیے معیز باتوں باتوں میں رباب سے پوچھتا ہے مگر وہ لاعلمی کا اظہار کرتی ہے۔
عون' معیز احمد کا دوست ہے۔ ثانیہ اس کی منکوحہ ہے۔ مگر پہلی مرتبہ بہت عام سے گھریلو حلیے میں دیکھ کر وہ ناپسندیدگی کا اظہار کردیتا ہے۔ جبکہ ثانیہ ایک پڑھی لکھی ذہین اور بااعتماد لڑکی ہوتی ہے۔ وہ عون کے اس طرح انکار کرنے پر شدید ناراض ہوتی ہے۔ پھر عون پر ثانیہ کی قابلیت کھلتی ہے تو وہ اس سے محبت میں گرفتار ہوجاتا ہے' مگر اب ثانیہ اس سے شادی سے انکار کردیتی ہے۔ دونوں کے درمیان خوب تکرار چل رہی ہے۔
میم' ابیہا کو سیفی کے حوالے کردیتی ہیں جو ایک عیاش آدمی ہوتا ہے۔ ابیہا اس کے دفتر میں جاب کرنے پر مجبور کردی جاتی ہے۔ سیفی اسے ایک پارٹی میں زبردستی لے کرجاتا ہے' جہاں معیز اور عون بھی آئے ہوتے ہیں مگر وہ ابیہا کے یکسر مختلف انداز حلیے پر اسے پہچان نہیں پاتے تاہم اس کی گھبراہٹ کو محسوس ضرور کرلیتے ہیں۔ ابیہا پارٹی میں

ایک ادھیڑ عمر آدمی کو بلاوجہ بے تکلف ہونے پر تھپڑ مار دیتی ہے۔ جواباً" سیفی بھی اسی وقت ابیہا کو ایک زوردار تھپڑ جڑ دیتا ہے۔ عون اور معیز کو اس لڑکی کی تذلیل پر بہت افسوس ہوتا ہے۔ گھر آکر سیفی میم کی اجازت کے بعد ابیہا کو خوب تشدد کا نشانہ بناتا ہے۔ جس کے نتیجے میں وہ اسپتال پہنچ جاتی ہے۔ جہاں عون اسے دیکھ کر پہچان لیتا ہے کہ یہ وہی لڑکی ہے جس کا معیز کی گاڑی سے ایکسیڈنٹ ہوا تھا۔ عون کی زبانی یہ بات جان کر معیز سخت حیران اور بے چین ہوتا ہے۔ وہ پہلی فرصت میں سیفی سے میٹنگ کرتا ہے۔ مگر اس پر کچھ ظاہر نہیں ہونے دیتا۔ ثانیہ کی مدد سے وہ ابیہا کو آفس میں موبائل بھجواتا ہے۔ ابیہا بمشکل موقع ملتے ہی باتھ روم میں بند ہو کر اس سے رابطہ کرتی ہے' مگر اسی وقت دروازے پر کسی کی دستک ہوتی ہے۔ حنا کے آجانے سے اسے اپنی بات ادھوری چھوڑنی پڑتی ہے۔ پھر بہت مشکل سے ابیہا کا رابطہ ثانیہ اور معیز احمد سے ہوجاتا ہے۔ وہ انہیں بتاتی ہے کہ اس کے پاس وقت کم ہے۔ میم اس کا سودا کرنے والی ہیں لہٰذا اسے جلد از جلد یہاں سے نکال لیا جائے۔ معیز احمد' ثانیہ اور عون کے ساتھ مل کر اسے وہاں سے نکالنے کی پلاننگ کرتا ہے اور یہیں اسے اپنا پرانا راز کھولنا پڑتا ہے۔
وہ بتادیتا ہے کہ ابیہا اس کے نکاح میں ہے' مگر وہ نہ پہلے اس نکاح پر راضی تھا نہ اب پھر ثانیہ کے آئیڈیا پر عمل کرتے ہوئے وہ اور عون میڈم رعنا کے گھر جاتے ہیں۔ میڈم ابیہا کا سودا معیز احمد سے طے کردیتی ہے' مگر معیز کی ابیہا سے ملاقات نہیں ہوپاتی کیونکہ وہ ڈرائیور کے ساتھ بیوٹی پارلر گئی ہوتی ہے۔ وہاں موقع ملنے پر ابیہا' ثانیہ کو فون کردیتی ہے۔ ثانیہ بیوٹی پارلر پہنچ جاتی ہے۔ دوسری طرف تاخیر ہونے پر میڈم' حنا کو بیوٹی پارلر بھیج دیتی ہے' مگر ثانیہ' ابیہا کو وہاں سے

نکالنے میں کامیاب ہو جاتی ہے۔ ثانیہ کے گھر سے معیز اسے اپنے گھر انیکسی میں لے جاتا ہے۔ اسے دیکھ کر سفینہ بیگم بری طرح بھڑک اٹھتی ہیں، مگر معیز سمیت زارا اور ایزد انہیں سنبھالنے کی کوشش کرتے ہیں۔ معیز احمد اپنے باپ کی وصیت کے مطابق ابیہا کو گھر لے تو آتا ہے، مگر اس کی طرف سے غافل ہو جاتا ہے۔ وہ تنہائی سے گھبرا کر ثانیہ کو فون کرتی ہے۔ وہ اس سے ملنے چلی آتی ہے اور حیران رہ جاتی ہے۔ گھر میں کھانے پینے کو کچھ نہیں ہوتا۔ وہ عون کو فون کر کے شرمندہ کرتی ہے۔ عون نادم ہو کر کچھ اشیائے خورد نوش لے آتا ہے۔ معیز احمد بزنس کے بعد اپنا زیادہ تر وقت رباب کے ساتھ گزارنے لگتا ہے۔

سفینہ بیگم اب تک یہ ہی سمجھ رہی ہیں کہ ابیہا مرحوم امتیاز احمد کے نکاح میں تھی مگر جب انہیں پتا چلتا ہے کہ وہ معیز کی منکوحہ ہے تو ان کے غصے اور نفرت میں بے پناہ اضافہ ہو جاتا ہے۔ وہ اسے اٹھتے بیٹھتے بری طرح ٹارچر کرتی ہیں اور اسے بے عزت کرنے کے لیے اسے نذیراں کے ساتھ گھر کے کام کرنے پر مجبور کرتی ہیں۔ ابیہا ناچار گھر کے کام کرنے لگتی ہے۔ معیز کو برا لگتا ہے، مگر وہ اس کی حمایت میں کچھ نہیں بولتا۔ یہ بات ابیہا کو مزید تکلیف میں مبتلا کرتی ہے۔ وہ اس پر تشدد بھی کرتی ہیں۔

پرانے شکوے شکایتیں دور کرنے کی خاطر عون کے ابا عون اور ثانیہ کو اسلام آباد نازیہ کی شادی میں شرکت کرنے کے لیے بھیجتے ہیں۔ جہاں ارم ان دونوں کے درمیان آنے کی کوششیں کرتی ہے اور ثانیہ اپنی بے وقوفی کے باعث عون سے شکوے اور ناراضیاں رکھ کر ارم کو موقع دیتی ہے۔ عون صورت حال کو سنبھالنے کی بہت کوشش کرتا ہے مگر ثانیہ اس کے ساتھ بھی زیادتی کر جاتی ہے۔ ارم کی بہن نیلم ایک اچھی لڑکی ہے' وہ ثانیہ کو سمجھانے کی کوشش کرتی ہے کہ اگر عون نے پہلے شادی سے انکار کر کے اس کی عزت نفس کو ٹھیس پہنچائی تھی تو اب اپنی عزت نفس اور انا کو چھوڑ کر آپ کو منانے کے لیے جتن بھی کر رہا ہے۔ عزت کریں عون کی' اور دوسروں کو اپنے درمیان آنے کا موقع نہ دیں۔ ثانیہ کچھ کچھ مان لیتی ہے۔ تاہم مہندی میں کی گئی ثانیہ کی بدتمیزی پر عون دل میں اس سے ناراض ہو جاتا ہے۔

رباب' سفینہ بیگم کے گھر آتی ہے تو ابیہا کو دیکھ کر حیران رہ جاتی ہے۔ پھر سفینہ بیگم کی زبانی ساری تفصیل سن کر اس کی تضحیک کرتی ہے۔ ابیہا بہت برداشت کرتی ہے مگر دوسرے دن کام کرنے سے انکار کر دیتی ہے۔ سفینہ بیگم کو شدید غصہ آتا ہے۔ وہ انیکسی جا کر اس سے لڑتی ہیں۔ اسے تھپڑ مارتی ہیں' جس سے وہ گر جاتی ہے۔ اس کا سر پھٹ جاتا ہے اور جب وہ اسے حرام خون کی گالی دیتی ہیں تو ابیہا پھٹ پڑتی ہے۔ معیز آ کر سفینہ کو لے جاتا ہے اور واپس آ کر اس کی بینڈیج کرتا ہے۔ ابیہا کہتی ہے کہ وہ پڑھنا چاہتی ہے۔ معیز کوئی اعتراض نہیں کرتا۔ سفینہ بیگم ایک بار پھر معیز سے ابیہا کو طلاق دینے کا پوچھتی ہیں تو وہ صاف انکار کر دیتا ہے۔

بائیسویں قسط

معیز نے کبھی تصور بھی نہ کیا تھا کہ وہ ابیہا کے لیے ایسے شدید جذبات محسوس کرے گا۔ قدرت شاید اسے اسی نہج پہ بے بس کرنا چاہتی تھی۔

اور یہ سب ایک دم سے نہیں تھا۔ چور محبت نجانے کب سے اس کے دل میں نقب زنی کر رہی تھی اور اب جو پکڑی گئی تو منہ چھپانے کے بجائے فاتحانہ تن کے کھڑی ہو گئی۔

"لو کر لو جو کر سکتے ہو۔ مگر جب یہ بیرن محبت ہو جائے تو بندہ کچھ اور کرنے لائق رہ جاتا ہے کیا؟"

وہ کچھ دیر اس خالی پن کے ساتھ رہا۔ خالی ذہن اور خالی سینہ۔ اس کے بعد تو اس کے اندر اس قدر وحشت بھری کہ الاماں الحفیظ۔

سب سے پہلے تو چوکیدار کے کوارٹر میں جا کر اس کو جھاڑا' اتنی بدزبانی کی جتنی زندگی میں کبھی نہ کی ہوگی۔ وہ بول نہیں دھاڑ رہا تھا۔

"صاب... چھوٹا بیمار تھا... اسی کو دیکھنے تھوڑی دیر کے لیے ہٹا تھا۔"

وہ بیچ بیچ میں اپنی صفائی پیش کرتا، مگر "صاب" تو نجانے کیا کھو آیا تھا جو اس کا نقصان کم ہونے میں ہی نہیں آ رہا تھا۔

وہ بے چینی سے گریبان کے بٹن کھولتا تیز قدموں سے گھر کی طرف بڑھا تو شدت جذبات سے چہرہ رنگ بدل چکا تھا اور سانس دھونکنی کی مانند چل رہا تھا۔

چٹ... چٹ، چٹ...

ہاتھ مار کے اس نے لاؤنج کی تمام لائٹس آن کر دیں۔ ایراز اور عمر کو باہر کے ہنگامے کی کچھ کچھ سن گن مل ہی گئی تھی۔ اب جو لائٹس نے پورے گھر کو روشن کر دیا تو وہ دونوں فی الفور باہر نکلے تھے۔

"کیا ہوا معیز...؟"

عمر اسے اس قدر وحشت زدہ سی کیفیت میں دیکھ کر گھبرا سا گیا۔ معیز نے عجیب سی بے بسی سے اسے دیکھا۔

"ماما تو ٹھیک ہیں نا...؟" ایراز پریشان ہوا۔

"ایہا نہیں ہے عمر... وہ کہیں چلی گئی ہے۔" اس کے سرسراتے ہوئے لہجے نے جہاں عمر کو سن کیا، وہیں ایراز کے اندر بھی تھکن سی اتر گئی۔

"رات تک تو یہیں تھیں۔ کھانے کے دوران بھی۔"

"میں بھی عون اور ثانیہ سے بات ہوئی تھی۔ ثانیہ کو میسج کیا تھا اس نے مگر ابھی تک وہاں نہیں پہنچی... وہ وہاں پہنچ ہی نہیں سکتی ایراز... وہ اتنی بہادر کہاں ہے۔"

وہ بالوں کو مٹھیوں سے جکڑتا ان دونوں کو حیرت کے سمندر میں دھکیلنے لگا۔

بھلا معیز احمد کو اس "بے کار" سی لڑکی کی اتنی فکر کیوں؟

"چوکیدار سے پوچھا...؟" عمر نے آگے بڑھ کے اس کے شانے پہ ہاتھ رکھا۔

"اسے کچھ نہیں پتا... وہ کوارٹر میں تھا۔ اب بتاؤ اسے کہاں ڈھونڈوں؟"

اور بس... معیز احمد محبت کے سامنے گھٹنے ٹیکے ڈھے گیا تھا۔ عمر پر یک لخت ہی حقیقت آشکار ہو گئی۔

✡ ✡ ✡

تیز آنکھوں میں چبھتی روشنی اسے حواس میں لانے کا باعث بنی تو اس نے نیند بھری چندھیائی آنکھوں کو کھولنے کی اپنی سی کوشش کی۔ اسے لگا ایک ہی طور لیٹے رہنے سے اس کا وجود درد کی سی کیفیت میں ہے۔ اس نے ہاتھ سے آنکھیں مسلیں۔

(زارا کے کمرے میں اتنی تیز دھوپ کہاں؟)

اس کا ذہن فی الحال سوئی جاگی کیفیت میں تھا، مگر آنکھیں ملتے ہی چھوٹا سا کمرہ اور دھوپ سے بھرا مختصر سا صحن اسے حقیقت کی خوف ناک دنیا میں کھینچ گیا۔ وہ ایک دم سے اٹھی۔ خوف کی شدید لہر اس کی ریڑھ کی ہڈی کو سنسنا گئی تھی۔ اسے سب یاد آ گیا۔ وہ کیسے پھر سے ایک ظالم کے شکنجے میں آن پھنسی تھی۔

وہ بان کی کھردری چادر سے محروم چارپائی پر تھی۔ بس اس کے پیروں تلے ادوائن کی سختی کے خیال سے چادر دہری کر کے بچھائی گئی تھی۔

وہ تیزی سے چارپائی سے اتری اور اپنی چپلوں میں پاؤں پھنسا کے وہ خوف اور وحشت کے مارے وہاں سے بھاگنے کے ارادے میں تھی تب ہی دھوپ کا راستہ کسی نے روک لیا۔ ایہا نے بے اختیار چہرہ اٹھا کے دیکھا تو

اس کے چیخ نکلتے نکلتے رہ گئی۔
مردانہ تن و توش اور سخت نقوش لیے جانے وہ تیسری جنس سے تعلق رکھتی تھی یا مردنما عورت۔ چہرے پہ معنی خیز سی مسکراہٹ لیے وہ ایبہا کی پھرتی سے ہی محظوظ ہو رہی تھی۔
"تت.... تم.... کون ہو.... مجھے یہاں کیوں لائی ہو؟"
"ہونہہ.... میرا تجھ سے کیا لینا دینا۔ اور تو اچھی طرح سے جانتی ہے کون تجھے یہاں لایا ہے۔"
وہ اپنی مسکراہٹ کے برعکس بڑے تنفر بھرے انداز میں بولی تو ایبہا اٹھ کھڑی ہوئی اور اپنے بیگ کی تلاش میں ادھر ادھر نگاہ دوڑائی تو اسے دیوار کے ساتھ.... لکڑی کی بوسیدہ میز پہ پایا مگر ایسے کہ لگتا تھا اچھی طرح تلاشی لی گئی ہے۔ زپ کھلی ہوئی تھی اور گولہ بنے کپڑے آدھے اندر اور آدھے باہر تھے۔
وہ بے ترتیبی اور خوف سے دھڑکتے دل کے ساتھ کانپتے ہاتھوں سے کپڑوں کو بیگ میں ٹھونسنے لگی۔
کاجل کی موٹی دھاروں سے سجی چندھی آنکھوں کے ساتھ وہ تمسخرانہ انداز میں ایبہا کی مصروفیت دیکھ رہی تھی۔ وہ بیگ لے کے پلٹی تو اس مردنما عورت کو یونہی دروازے میں ایستادہ پایا۔
ایبہا کا دم حلق میں اٹکنے لگا۔ اس نے ہلکا سا کھنکھار کے گویا خود میں ہمت مجتمع کی۔
"مجھے یہاں سے جانا ہے۔ میرے گھر والے میرا انتظار کر رہے ہوں گے۔"
"جو گھر والیاں ہوں، وہ آدھی رات کو گھر سے بھاگا نہیں کرتیں میری لاڈو۔"
وہ تحقیر بھرا انداز۔ ایبہا کو سخت بری لگی اس کی بات۔ خود کو مضبوط بنا کر کہا۔
"وہ میرے شوہر کا گھر ہے۔ اور میں وہاں سے بھاگ نہیں رہی تھی۔"
وہ شانے جھٹک کر طنز سے مسکرا دی۔
"راستہ دو۔ مجھے جانا ہے۔" ایبہا نے اپنے خوف کو اندر دباتے ہوئے تحمل سے کہا۔
"اری چل.... بیٹھ جا آرام سے۔ سبزی لینے آئی ہے کیا؟ بھائی ایک کلو آلو دینا.... اور میں ڈال دوں گی۔"
جواباً وہ اس قدر حقارت سے بولی کہ ایبہا کے حواس ٹھٹھرنے لگے۔
"دیکھو.... تمہارا مجھ سے کیا واسطہ.... مجھے یہاں بند رکھنے سے تمہیں کیا فائدہ...."
ایبہا گھگھیانے پر اتر آئی۔ اسے شدت سے اپنی فاش غلطی کا احساس ہوا جو اس نے معیز کا گھر چھوڑ کے کی تھی۔
"جو تجھے یہاں لایا ہے اس کا تجھ سے تعلق بھی ہے اور فائدہ بھی۔"
وہ محظوظ انداز میں مسکراتے ہوئے ایک قدم آگے بڑھی تو ایبہا خوف زدہ سی ہو کر پیچھے ہٹ گئی۔ چلاتے پیلے لان کے سوٹ میں ہونٹوں کو سرخی سے لال کیے چندھی آنکھوں میں سرمے کی موٹی موٹی لائنیں کھینچے وہ ایبہا کو خواجہ سرا ہی لگ رہی تھی، وجہ اس کا مضبوط سراپا اور مردانہ نقوش کے ساتھ رعب داب والی آواز تھی۔
"دیکھو.... اگر تمہیں پیسے چاہئیں تو.... وہ میں تمہیں دے دوں گی۔ جتنے مانگو گی.... مگر ابھی مجھے جانے دو۔ میرا شوہر مجھے ڈھونڈ رہا ہو گا۔" ایبہا کو ٹوٹ کر معیز احمد یاد آیا۔ کیا سنگین غلطی کی تھی اس پناہ گاہ کو چھوڑ کے۔
"اچھا...." وہ متاثر ہونے والے انداز میں بولی۔ "بڑا پیسہ ہے تیرے پاس؟" دلچسپی سے پوچھا تو آنسو پونچھتی ایبہا کی ڈھارس بندھی۔
"ہاں.... بس۔ مجھے یہاں سے جانے دو۔ جتنا کہو گی اتنا پیسہ دوں گی۔" اس نے بعجلت کہا۔
"دو لاکھ....؟" اس کا انداز اکسانے والا تھا۔

"تین دے دوں گی۔ اللہ کے واسطے مجھے یہاں سے نکال دو۔" **ایہا** نے لرزتے ہاتھ اس کے آگے جوڑے۔
جس گڑھے میں آن گری تھی، وہاں سے نکلنے کی یہ رقم اسے بہت تھوڑی لگی تھی۔
وہ عورت ہونٹ ٹیڑھے کر کے عجیب سے انداز میں مسکرائی۔ پھر ذرا سا چہرہ صحن کی طرف موڑ کر اس نے اونچی آواز میں ہانک لگائی۔
"سنتے ہو مراد صدیقی.... بھئی، تمہاری بیٹی تو بہت لکھ پتی ہے۔ دو مانگو تو تین لاکھ دے رہی ہے۔"
اس کی آواز میں کامیابی کی کھنک تھی۔ وہ مردانہ نقوش والی عورت اچھی طرح اندازہ لگا چکی تھی کہ شکار "کسی بھی" قیمت پر چھٹکارا پانے کی خواہش رکھتا ہے۔
مراد صدیقی کا چہرہ وہ آخری چہرہ تھا جسے **ایہا** اس دنیا میں دیکھنا چاہتی تھی۔ وہ دروازے سے اندر داخل ہوا تو **ایہا** کی رہی سہی ہمت ٹوٹ گئی۔ کٹی شاخ کی مانند اس کا بازو پہلو میں لٹکا تو کندھے سے بیگ پھسل کر زمین پہ جا گرا۔ لڑکیوں کو والدین کی صورت میں زندگی دکھائی دیتی ہے، مگر **ایہا** کو اپنے باپ کی صورت دروازے میں موت کھڑی دکھائی دی تھی۔ وہ لڑکھڑا کے پیچھے ہٹی تو چارپائی سے ٹکرا کر وہیں گر گئی۔

☆ ☆ ☆

اب جبکہ اس پہ آشکار ہو ہی گیا تھا کہ **ایہا** اس کے لیے کیا اہمیت رکھتی تھی تو جیسے وہ بن پانی کی مچھلی کی طرح تڑپ رہا تھا۔
ایراز اور عمر تو اس کی بدلی ہوئی قلبی و ذہنی ماہیئت پہ دنگ تھے اور زارا تو **معیز** کی جذباتیت دیکھ کر گویا کھڑے کھڑے مر ہی گئی تھی۔ پیلی پھٹک رنگت اور دکھیا شاید کسی خوف سے سپید پڑتے ہونٹ.... وہ لڑکھڑا کر صوفے پر گر سی گئی۔
"کیا کروں.... کہاں ڈھونڈوں۔ میری بیوی ہے وہ۔ خدا جانے کن حالات میں ہو گی۔ آدھی رات کو نکلی تھی اور اب صبح ہو گئی ہے۔ ثانیہ کی طرف بھی نہیں گئی وہ۔" اس کا ذہن ماؤف تھا۔
"پولیس میں رپورٹ درج کراتے ہیں۔ باقی اپنے سورسز استعمال کریں گے۔ دارالامان وغیرہ چیک کریں گے۔ چلو اٹھو جلدی سے۔" عمر ہی نے اس کی ہمت بندھائی۔ ورنہ وہ تو خود کو بند گلی میں مقید پا رہا تھا۔
ایراز کو بھائی پہ ترس تو آیا مگر غصہ زیادہ.... اپنی سادہ سی زندگی کو وہ خود اپنے لیے مشکل بنا چکا تھا۔
وہ تینوں پولیس اسٹیشن چلے گئے۔ زارا ابھی تک اسی پوزیشن میں بیٹھی تھی۔ دفعتاً اس کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔ اسے اچھی طرح ادراک ہوا تھا اپنی فاش غلطی کا۔ کیا کر دیا میں نے؟

☆ ☆ ☆

ہاتھ میں پکڑی ماچس کی تیلی کے ساتھ دانتوں میں خلال کرتا وہ فاتحانہ مسکراہٹ لیے مراد صدیقی ہی تھا۔
ایہا مراد کا باپ.... یا پھر نام نہاد باپ۔
ایہا کا دل کرلایا۔ ماں کی یاد اس زور سے آئی کہ لگا، دل غم کی شدت سے پھٹ جائے گا۔ وہ اونچی آواز میں بے ختیار رو دی۔
"لو... لڑکیاں تو میکے آنے پہ خوش ہوتی ہیں۔ اس کا تو رونا ہی نہیں تھم رہا۔" وہ عورت منہ بگاڑ کے تبصرہ کر رہی تھی۔ اب جانے وہ **ایہا** کی نگرانی کے لیے "ہائر" کی گئی تھی یا پھر مراد.... سے اس کا کوئی قریبی تعلق تھا۔
مراد صدیقی کھنکارا۔ بدوضع سا موڑھا کھینچا اور اس کے پاس بیٹھ گیا۔

"کیوں لائے ہیں مجھے یہاں....." وہ روتی کرلاتی بے بسی سے بولی تو مراد نے گویا چہرے پر تاسف آمیز تاثرات چھاپ لیے۔

"کیا اب ایک باپ کو بھی یہ صفائی پیش کرنا پڑے گی؟" اف..... اس قدر بناوٹی لہجہ۔ زمانے بھر کے "میکوں" کا پیار ایک اسی میکے میں سمٹ آیا ہو جیسے۔ ایہا کے اندر گویا بجلی سی کوندی۔

"باپ ایسے اپنی بیٹیوں کو اغوا نہیں کیا کرتے۔" وہ چیخی تھی۔

"اغوا.....؟" وہ حیران ہوا۔ "میں نے کب اغوا کیا ہے تمہیں..... بلکہ میں تو تمہیں سنسان سڑک سے اٹھا کے لایا تھا۔ وہاں گری رہتیں تو اچھی تھیں۔" ناراضی کا اظہار کیا۔

"ہاں..... پڑا رہنے دیتے وہیں مجھے....." ایہا پر اس کی اداکاری کا کوئی اثر نہیں ہوا تھا۔ مراد نے گھور کے اسے دیکھا۔

"میری بیٹی آدھی رات کو کپڑوں کا بیگ لے کے گھر سے بنا بتائے بھاگ نکلے اور میں چپ چاپ دیکھتا رہوں، تھو ہے مجھ پر۔" اس نے ایک طرف تھوک کر بڑی مردانگی سے کہا۔ تو بہت کچھ ایہا کے لبوں تک آیا۔ ڈبڈبائی نظروں سے اس "نام کے" باپ کو دیکھا اور پھر اس کے آگے کپکپاتے ہاتھ جوڑ دیے۔

"مجھے جانے دیں یہاں سے۔ سب مجھے ڈھونڈ رہے ہوں گے۔"

"ڈھونڈنے دو۔" مراد صدیقی نے گویا ہاتھ سے مکھی اڑائی۔ "ذرا انہیں بھی تو پتا چلے، مراد صدیقی کی بیٹی کو تنگ کرنے کا کیا انجام ہو سکتا ہے۔"

بڑا غیرت مند تھا بے چارہ مراد صدیقی اپنی بیوی کو دھندہ کرنے پر مجبور کرنے والا اور بیٹی کو جوئے میں چند لاکھ کے بدلے داؤ پہ لگا دینے والا غیرت مند۔

"مجھے کسی نے بھی تنگ نہیں کیا تھا۔ میں بہت خوش تھی اپنے شوہر کے گھر میں۔" وہ روتے ہوئے اسے یقین دلا رہی تھی۔

"اچھا۔" مراد نے اسے تمسخرانہ دیکھا۔ "تو آدھی رات کو فروٹ خریدنے جا رہی تھیں یا سبزی؟"

"پلیز..... مجھے جانے دو۔ کیوں لائے ہو مجھے یہاں۔"

"ایسے تھوڑی جانے دیں گے چندا! تیرے گھر والے کو بھی تو ذرا پتا چلے مراد صدیقی کی بیٹی اتنی سستی نہیں ہے کہ اس کے ساتھ جو جی چاہے سلوک کیا جائے۔"

وہ عورت اس کے پائنتی بیٹھتے ہوئے بولی۔ تو اس کے الفاظ پر ایہا بپھر سی گئی۔

"ہاں تب ہی بہت بھاری قیمت وصول کی تھی اس بیٹی کی انہوں نے۔" مراد نے اسے گھور کے دیکھا۔ جی تو چاہا الٹے ہاتھ کی گھما کے لگائے مگر پھر سرد مہری سے دانت پیس کر بولا۔

"پہلے تو وہ سالا مفت میں لے گیا تھا۔ قیمت تو اب لگاؤں گا۔ میں خود اپنی مرضی کی۔"

ایک باپ کے اپنی بیٹی کے لیے یہ الفاظ۔ ایہا کے حواس ٹھٹھر گئے۔ جی چاہا زمین پھٹے اور وہ اس کے اندر سما جائے۔ قیامت کی نشانی تھی۔ رشتوں کا تقدس ختم ہو رہا تھا۔

"اور ہاں..... یہ سلطانہ....." وہ اٹھتے اٹھتے کچھ یاد آنے پہ اس عورت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے گویا تعارف کرانے لگا۔

"ذرا ادب اور دید لحاظ کے ساتھ رہنا۔ ماں ہے تیری۔" ایہا کے دل میں کراہیت کا احساس بیدار ہوا۔ اپنی خوب صورت اور نازک سی ماں یاد آئی۔

محض ایک غلطی جس کی بدصورتی بن گئی تھی۔

مراد کے اٹھتے ہی ایہا بھی جلدی سے چارپائی سے نیچے اتری۔ وہ کسی صورت ہار ماننا نہیں چاہتی تھی۔ وہ چیخے گی، چلائے گی۔ چھوٹے سے گھر سے آواز لازمی باہر جائے گی تو لوگ یقیناً متوجہ ہوں گے۔

"آپ کو پیسہ چاہیے نا۔ وہ دے گا آپ کو۔ جتنا آپ کہیں گے، آپ مجھے ساتھ لے جائیں۔"

ایہا نے تیقن سے کہا۔ اسے معیز کی آخری بدلتی نگاہ یاد تھی۔ وہ کہیں کا بادشاہ ہوتا تو اب کی بار ایہا کے لیے اپنی سلطنت لٹا دیتا۔

"زیادہ ہوشیاری مت دکھا لڑکی۔ چپ چاپ ادھر پڑی رہ، جب تک تیرے گھر والے سے معاملہ طے نہیں ہو جاتا۔" سلطانہ نے اس کا بازو اپنی ظالمانہ گرفت میں اس طرح جکڑا کہ وہ بلبلا اٹھی۔

"دھیان رکھنا اس کا۔ باہر نکلنے نہ پائے۔" مراد کہتا ہوا باہر نکل گیا۔

"رکیں، ٹھہریں۔ آپ ایسے زبردستی مجھے یہاں نہیں رکھ سکتے.... وہ لوگ پولیس بلوا لیں گے۔"

وہ زور سے چیخی اور مزید چلاتی مگر سلطانہ کے زوردار الٹے جھانپڑ نے اسے الٹ کر چارپائی پر گرنے پر مجبور کر دیا۔ اس کی پیشانی چارپائی کے پائے سے ٹکرائی تو درد کی ایک شدید لہر نے اسے تڑپا دیا۔ اس نے اپنے منہ میں خون کا ذائقہ گھلتا محسوس کیا۔ سلطانہ کے تھپڑ نے اس کا ہونٹ پھاڑ دیا تھا۔ وہ بے بسی سی چارپائی پہ مڑی تڑی گٹھڑی بنی بلک بلک کے رونے لگی۔

سلطانہ نے جلدی سے باہر نکل کر دروازے کی کنڈی چڑھا دی مگر خوف زدہ ہونے کے بعد ایہا میں اتنی ہمت نہ تھی کہ وہ اٹھ کے دروازہ بجانے کی کوشش کرتی۔

اندھیرے کمرے کو دروازے کی درزوں اور روشن دان سے آتی روشنی قدرے نیم تاریک بنا رہی تھی۔ پیشانی سے نکلتے خون کی چپچپاہٹ وہ اپنے ہاتھ پہ اچھی طرح محسوس کر رہی تھی، مگر فی الحال خوف اور بے بسی کا احساس اسے بے حس و حرکت رہنے پر مجبور کر رہا تھا۔

☼ ☼ ☼

"خس کم جہاں پاک...." ایہا کے لاپتا ہونے کی خبر سن کر سفینہ بیگم نے انتہائی اطمینان سے ہاتھ جھاڑے تو سب ہی کو تاسف ہوا۔

"بس کر دیں ماما۔ یہ لاحاصل نفرت لاحاصل عداوت۔" معیز کو گہرا دکھ ہوا تھا۔

"وہ تو سمجھو اب ہو ہی گئی۔ اس لڑکی کے "ہونے" ہی کی تو ساری لڑائی تھی۔" انہوں نے بڑی بے نیازی سے کہا تو وہ اٹھ کے ہی چلا گیا۔

"پھوپھو پلیز۔" عمر نے ان کے پاس بیٹھتے ہوئے ان کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں تھام لیا۔ اور لجاجت سے بولا۔

"معیز بہت پریشان ہے۔ اور آپ اسے بجائے تسلی دینے کے...." ذرا سے لب بھینچ کر وہ دوبارہ گویا ہوا۔

"لڑکی ذات ہے۔ آدھی رات کو گھر سے نکلی تھی۔ عون کی طرف نہیں پہنچ پائی۔ کچھ انتہائی بھی ہو سکتا ہے۔ اس کے لیے دعا کریں اور معیز کو حوصلہ دیں۔"

"ارے ہٹو...." وہ تنفر سے بولیں اور اپنا ہاتھ ایک جھٹکے سے چھڑایا۔ "اپنی ماں کی تربیت لی ہے اس لڑکی نے۔ اس نے بھی یونہی کسی اور کو پھانس لیا تھا.... معیز کو تو شکر ادا کرنا چاہیے اللہ کا کہ اس زبردستی کے بندھن سے جان چھوٹی۔"

ان کا انداز سابقہ ہی تھا۔ وہ سفینہ بیگم تھیں۔ اتنی آسانی سے بدلنے والی نہیں تھیں۔

"ہم ایسے لاتعلقی اختیار نہیں کر سکتے ماما۔! وہ اس گھر کی عزت ہیں۔" ایراز نے سنجیدگی سے کہا تو وہ اسے گھورنے لگیں پھر قطعیت سے بولیں۔

"جو ہوا سو ہوا مگر آئندہ جو کچھ ہوگا' وہ میری مرضی سے ہوگا۔"

ایراز گہری سانس بھر کے رہ گیا۔

☆ ☆ ☆

اس کا موبائل بھی بیگ میں سے نکال لیا گیا تھا۔ ورنہ وہ کسی سے رابطہ کر لیتی۔ سلطانہ نے منہ بناتے ہوئے اس کے ماتھے پہ پٹی کر دی۔ سونے کی چڑیا تھی وہ۔ ورنہ سلطانہ کہاں کسی کی چاکری کرتی تھی۔

اگلے تین روز ابیہا نے اسی اندھیرے کمرے میں سوتے جاگتے' خوف سے ٹھٹھرتے گزارے۔ پتلے شوربے والے بدذائقہ کھانے اور کم چینی والی پانی پتلی چائے سے مراد صدیقی کے حالات کا اچھی طرح اندازہ ہوتا تھا۔ جب ہی وہ اس بار لمبا ہاتھ مارنے کے موڈ میں تھا۔ اللہ جانے شدید غربت نے نشے کی لت چھڑا دی تھی یا سلطانہ کے "عشق" نے یہ کارنامہ سرانجام دیا تھا۔

"رحم کرو... اللہ کا واسطہ ہے تمہیں۔ مجھے جانے دو یہاں سے۔ جتنے پیسے کہو گی میں خود دلا دوں گی تمہیں۔ بلکہ میرے اپنے اکاؤنٹ میں پیسے ہیں۔ میں وہ بھی دے سکتی ہوں تم لوگوں کو۔"

تیسری رات جب سلطانہ نے دروازہ کھول کے اندر پیر رکھا تو وہ بلک اٹھی۔ سلطانہ کی آنکھیں چمکیں۔

"اچھا..."

"لیکن میری چیک بک گھر میں پڑی ہے۔ مجھے جانے دو' میں وعدہ کرتی ہوں کہ جو طے ہوگا' وہی کروں گی۔"

وہ جلدی سے بولی۔ تو سلطانہ سر جھٹک کر کھانے کی ٹرے اس کے سامنے رکھتی باہر نکل گئی اور دروازہ بند کر کے کنڈی چڑھا دی۔

"معیز..." ابیہا کی آنکھیں پھر سے ابل پڑیں۔ کتنی چاہت اور بے اختیاری سے اس نے بانہوں میں بھرا تھا۔ بھلا اب وہ ابیہا پر کوئی آنچ بھی آنے دیتا؟

تو پھر... تو پھر میں کیوں نکل آئی اپنی جنت سے باہر؟ اس کے دماغ میں ٹیسیں اٹھنے لگیں۔

اسے یاد آیا۔ کسی نے اس کے آگے ہاتھ جوڑے تھے... مگر کس نے؟

اسے یاد کرنے میں دقت پیش آئی۔

☆ ☆ ☆

سفیر احسن' سفینہ بیگم کی عیادت کے لیے آیا تھا۔ زرد پڑتی زارا کو دیکھ کر دنگ رہ گیا۔ دنوں میں وہ مرجھا گئی تھی۔

"تمہیں کیا ہو گیا ہے... اب تو آنٹی ماشاءاللہ سے ٹھیک ہیں۔"

سفیر نے اپنی بے چینی کو لہجے کی شگفتگی میں چھپاتے ہوئے مسکرا کر پوچھا تو وہ یونہی خاموش نگاہیں جھکائے انگلیاں مسلتی رہی۔

آنکھ کیسے ملاتی... کہ آنکھ سو کھتی ہی کب تھی۔ تو کیا وہ اس نمی کی تحریر کا مطلب نہ پوچھتا؟

"آنٹی...! مجھے زارا کی طبیعت کچھ ٹھیک نہیں لگتی۔" وہ تشویش سے اسے دیکھتے ہوئے سفینہ سے بولا۔

"کتنی بار اس سے کہا ہے کہ میں اب بالکل ٹھیک ہوں۔ بستر سے اتر کر پورے گھر کا چکر لگا لیتی ہوں۔ ایسے ہی دل تھوڑا کیے رہتی ہے یہ۔"

"اگر آپ اجازت دیں تو میں اسے لانگ ڈرائیو کے لیے لے جاؤں؟"

سفیر نے جھجکتے ہوئے پوچھا۔

"ارے بھی۔ تمہاری چیز ہے اب۔ اجازت کی کیا ضرورت ہے۔" سفینہ بیگم مسکرائیں۔ داماد انہیں بہت پسند تھا۔ تیسرا بیٹا لگتا تھا۔

"زارا۔ جاؤ بیٹا! کپڑے تبدیل کر لو۔ سفیر کے ساتھ چکر لگا آؤ باہر کھلی ہوا میں۔"

انہوں نے پیار سے گم صم بیٹھی زارا کو متوجہ کیا۔ تو اسے نہ چاہتے ہوئے بھی اٹھنا ہی پڑا۔

سفیر نے اس کے گم صم انداز اور بے رغبتی کو اچھی طرح محسوس کیا تھا مگر سبب سے وہ ناواقف تھا۔ گاڑی میں اس کے ساتھ بیٹھے سفیر کا موڈ قدرتی طور پر بہت خوش گوار تھا۔

ایک لمبے عرصے کے بعد وہ اس کے ہمراہ محو سفر تھی۔ تھوڑے دنوں بعد جو اس کی عروس بن کے دل و جاں معطر کرنے والی تھی۔ وہ اپنی سوچ پر بے ساختہ مسکرا دیا اور یونہی مسکراتے ہوئے زارا کی طرف دیکھا۔ وہ چہرہ موڑے کھڑکی سے باہر دیکھنے میں مگن تھی۔

"کیا بات ہے زارا...! ناراض ہو مجھ سے یار! تو کھل کے کہو۔" وہ بڑے پیار سے بولا۔ زارا نے اس کی طرف دیکھا اور بجھے انداز میں مسکرا دی۔

"نہیں۔ آپ سے کیوں ناراض ہوں گی۔"

"تو پھر اس اداسی کی وجہ... اس بے توجہی کا سبب؟ یہ میری زارا تو نہیں ہے۔" وہ قطعیت سے بولا۔ تو چند لمحے زارا نے خود پر ضبط کرنے میں لگائے مگر بے بس ہو گئی تو چہرہ ہاتھوں میں چھپا کے رو دی۔ وہ بوکھلا سا گیا۔

"ارے..." بے ساختہ گاڑی کی رفتار کم کر دی۔ "کیا ہوا زارا... فار گاڈ سیک۔ میں تو یونہی پوچھ رہا تھا۔" وہ پریشان ہونے لگا۔ زارا کو بھی جلد ہی اپنی بے وقوفی کا احساس ہو گیا۔ اس نے جلدی سے آنسو پونچھے تو سفیر نے ٹشو پیپر کے ڈبے میں سے دو چار ٹشو پیپرز کھینچ کر اس کے ہاتھ میں تھمائے۔

"تھینک یو..." اس کی آواز مدھم تھی۔ چہرہ صاف کرنے لگی۔ سفیر اب خاموشی سے گاڑی ڈرائیو کرتا وقتاً فوقتاً اسے دیکھ رہا تھا مگر اب اور کچھ نہیں پوچھا۔ وہ چاہتا تھا زارا خود کھل کے اپنی پریشانی شیئر کرے۔

"بس یونہی دل پریشان سا تھا..." رندھی ہوئی بوجھل آواز میں زارا نے گویا صفائی پیش کی۔

"حالانکہ اب تو نہیں ہونا چاہیے۔ آنٹی بالکل ٹھیک ہیں۔" وہ برجستہ بولا۔ گویا اس دلیل کو مسترد کر دیا گیا تھا۔ وہ بے چینی سے بیگ کا اسٹریپ مسلتی گاڑی سے باہر دیکھنے لگی۔ گویا بتانے یا نہ بتانے کی کشمکش میں ہو۔ پھر چہرہ موڑ کے سفیر کو دیکھا تو اس نے ایک سائیڈ پہ گاڑی روک دی۔

گاڑی سے باہر تیز دھوپ اور آگ برساتی زندگی تھی۔ تو نیو ماڈل گاڑی کے اندر اے سی کی کولنگ گویا تمام غموں کو اندر آنے سے روکے ہوئے تھی۔ اس کے متوجہ ہونے پر سفیر مسکرایا۔

"بولو۔ کیا بات پریشان کر رہی ہے تمہیں؟"

تب زارا نے ہمت کر کے ایہا اور معیز کی زندگی کے واقعات سے آہستہ آہستہ پردہ اٹھانا شروع کیا۔

"تو اس میں کیا مسئلہ ہے۔ یہ تم لوگوں کا خالصتاً نجی معاملہ ہے۔ مجھے اس میں کوئی انٹرسٹ نہیں اور نہ ہی میں کسی قسم کا اعتراض کرنے کا حق رکھتا ہوں۔"

سفیر نے ان دونوں کے نکاح اور پھر اسے سب سے چھپا کے رکھنے والی بات سن کر صاف گوئی سے کہا۔

"لیکن... مجھ سے ایک غلطی ہو گئی ہے۔" زارا کی زبان لڑکھڑائی۔ سفیر نے چونک کے اسے دیکھا۔ تو وہ بھرائے ہوئے لہجے میں بولی۔

"ماما اسے کسی بھی حالت میں قبول نہیں کر رہی تھیں اور ڈاکٹرز نے ماما کو اسٹریس فری رہنے کا کہا ہے... تو میں نے اس سے ریکویسٹ کی... کہ وہ یہاں سے چلی جائے کیونکہ ابو کے بعد اب میں اپنی ماما کو نہیں کھو سکتی... اور وہ واقعی چلی گئی۔"

اس کے آنسو پھر سے بہنے لگے۔ تو سفیر کی آنکھوں میں تاسف اتر آیا۔

"بے وقوف ہو تم۔ معیز کو خود سے اپنی زندگی کا یہ معاملہ حل کرنے دیتیں' وقت اور حالات ہمیشہ ایک سے نہیں رہتے۔ انسان بہت اثر پذیر مخلوق ہے۔ منٹوں میں بدلتی ہے اس کی ذہنی اور قلبی ماہیئت۔ بس کسی کیفیت کا وارد ہونا شرط ہے۔"

"ہاں... اور اب بھائی اتنے پریشان ہیں کہ... لگ رہا ہے وہ ایہا کو قبول کر چکے تھے لیکن میری بے وقوفی کی وجہ سے اسے کھو بیٹھے۔"

وہ مسلسل رو رہی تھی اور سفیر کا ضبط آزما رہی تھی۔

"کم آن زارا! میں تمہیں رلانے کے لیے تو باہر نہیں لایا ہوں۔" وہ خفگی سے بولا۔ تو زارا نے جلدی سے چہرہ صاف کر لیا۔ وہ اسے ناراض نہیں کرنا چاہتی تھی۔

"ہوں... گڈ گرل۔" وہ دھیمی سی مسکراہٹ کے ساتھ اسے دیکھ رہا تھا۔

"دیکھو... تمہارا جذباتی پن اپنی جگہ' تم نے اپنی ماما کی محبت میں اس سے اگر کچھ غلط کہہ بھی دیا تو وہ فیصلہ کرنے میں بااختیار تھی۔ سوچ سمجھ کے ہی قدم اٹھایا ہوگا اس نے۔ وہ چاہتی تو نہ جاتی۔" سفیر نے اسے شرمندگی کے حصار سے نکالنے کی سعی کی' مگر وہ نہیں جانتا تھا کہ شرمندگی سے اوپر کی بات ہے۔

زارا نے نفی میں سر ہلایا۔ وہ آنسو روکنے کی پوری کوشش کر رہی تھی۔ بھرائے لہجے میں بولی۔

"اسے ہم سے محبت ہو گئی تھی سفیر... جو کام نفرت نہ کروا سکی' وہ محبت نے کروا دیا۔"

اس کی بات سن کر سفیر چپ سا ہو گیا جبکہ زارا کا ضمیر اسے مسلسل ملامت کر رہا تھا۔

☼ ☼ ☼

وہ سوچ سوچ کے ہار رہا' مگر اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ ایہا نے ایسا قدم کیوں اٹھایا۔ عون کی شادی والے روز اس نے قطعی انداز میں اس تعلق کو نبھانے اور یہاں سے کبھی نہ جانے کا ارادہ ظاہر کیا تھا... پھر میں بھی تو ہار مان گیا تھا ان روتی کرلاتی آنکھوں کے آگے پھر...؟

اور یہ "پھر" ہی حل نہ ہو پا رہا تھا۔

سفینہ بیگم کے رویے سے ڈر کے تو وہ گئی نہیں تھی۔ معیز جانتا تھا وہ سفینہ... کا اس سے بھی سخت اور کرخت رویہ جھیل چکی تھی۔ پولیس میں رپورٹ درج کرانے کا بھی کوئی فائدہ نہ ہوا تھا۔ ابھی تک ہر طرف جامد خاموشی تھی۔

اور ایسے میں معیز احمد کی اندرونی ٹوٹ پھوٹ کا کوئی اندازہ نہیں لگا سکتا تھا۔ اس سے پہلے جب وہ سیفی کے قبضے میں تھی تب بھی اسے تسلی تھی کہ کسی نہ کسی طور اسے وہاں سے چھڑوا ہی لے گا' مگر اب تو اس نے کوئی نشان

ہی نہ چھوڑا تھا کہ اسے تلاشنے کی سعی کی جاتی۔
گزرے تین دنوں میں میڈم کے انتہائی اندر کے آدمی کو بھاری رقم دے کر وہ معلوم کر چکے تھے کہ وہاں کوئی بھی نئی لڑکی نہیں لائی گئی۔
تو پھر ایہا کہاں گئی؟

وہ اپنے بال نوچتا یا دیواروں سے ٹکریں مارتا۔ سب بے سود تھا..... تو بے حس بن گیا۔
سمندر..... گہرا۔ اوپر سے پرسکوت مگر اندر کیسا طوفان انگڑائیاں لے رہا تھا' کوئی نہ جانتا تھا۔ اسے یاد تھا تو بس ایک نرم و ملائم خوف زدہ..... بے یقین سا لمس۔ جواب بھی سینے میں ایک ہلکی سی گرمائش کا احساس جگا دیتا تھا۔
اور کیسے وہ بے یقین آنکھیں اٹھی تھیں اس کی طرف جیسے تاقیامت معیز کی طرف سے اس التفات کی امید نہ تھی اسے۔ وہ ان آنکھوں کی حسرت اور بے یقینی یاد کرتا تو دل بے بسی بھری بے چینی کا شکار ہو جاتا۔ ایک ایسی بے چینی..... جس کا چین حاصل کرنے کے لیے وہ بے بس تھا۔
ایک بھاگم دوڑ تھی جس کا وہ شکار ہو چکا تھا۔ سارا دن شہر کے ہاسٹلز اور دارالامان چیک کرتا اور شام کو اسپتالوں کے ایمرجنسی وارڈز۔ عمر' عون اور ایراز اس کی دیوانگی پر دم بخود تھے اور معیز کے اپنے اختیار میں تھا ہی کب کہ کسی سے چھپاتا۔ دل کی لگی اسے کیا سے کیا بنا گئی تھی۔
وہ شام ڈھلے آیا تو اس کا تھکا ہارا' نڈھال انداز اور ملگجا حلیہ..... اس کے انتظار میں بیٹھی سفینہ بیگم کو طیش دلا گیا۔

"السلام علیکم....." وہ صوفے پر گر سا گیا اور اس کے چہرے پر اس قدر مایوس کن تاثرات تھے کہ چائے لاتی زارا کا دل گویا کسی نے مٹھی میں کر لیا۔ جب سے ایہا لاپتا ہوئی تھی' معیز کے چہرے کی مسکراہٹ گم گئی تھی۔
"کہاں سے آرہے ہو تم.....؟"
سفینہ بیگم تیزی سے روبصحت تھیں۔ شاید جو ذہنی دباؤ تھا' وہ ایہا کے جاتے ہی ختم ہو گیا تھا۔ اب بھی انہوں نے تیوری چڑھا کر پوچھا تو عمر نے چونک کر انہیں دیکھا پھر معیز کو' جو سر صوفے کی بیک سے ٹکائے تھکے ہوئے انداز میں پیشانی کو انگلیوں سے مسل رہا تھا۔ یونہی مدھم لہجے میں بولا۔
"ایہا کو تلاش کرنے گیا تھا ماما۔"
"بس کرو معیز! خدا کے لیے اب یہ پاگل پن چھوڑ دو۔" وہ جیسے زچ آکر بولیں تو وہ ایک دم سیدھا ہو بیٹھا۔
عمر نے بے اختیار سفینہ کو چپ رہنے کا اشارہ کیا۔ زارا فوراً" چائے پیش کرنے لگی۔
"یہ لیں ماما۔ اور ذرا یہ کوکیز ٹرائی کریں۔ میں نے بالکل نئی ریسیپی (ترکیب) سیکھی ہے چینل سے۔" وہ بدقت تمام ان کی توجہ اپنی طرف دلاتے ہوئے خوش دلی سے بولی مگر وہ بڑی قطعیت سے معیز کی طرف متوجہ تھیں۔
"میری بیوی گم ہوئی ہے ماما! کوئی بلی کا بچہ نہیں۔" وہ تلخی سے بولا۔
"اٹس اوکے معیز۔ وہ مل جائے گی ان شاء اللہ۔" عمر نے اس کا دھیان اپنی طرف کرنا چاہا۔ "اور میری چھٹی بھی ختم ہو گئی ہے۔ اسی ویک کے اینڈ پہ واپس جانا ہے مجھے۔"
"ہاں....." وہ عجیب سی ہنسی ہنسا۔ "تمہارا مشن مکمل ہوا۔ چاہے کسی بھی صورت سہی۔" عمر ساکت ہوا۔ وہ معیز کے تلخ جملے کو اچھی طرح سے سمجھا تھا۔
"تم اچھی طرح جانتے ہو کہ ایہا کو جان لینے کے بعد میں نے ہمیشہ اس کی فیور ہی کی ہے۔ تم پہ تو وہ بہت بعد میں "آشکار" ہوئی ہے۔"

عمر نے سنبھلتے ہوئے تیکھے لہجے میں اسے باور کرایا۔

"دیکھو۔ بند کرو یہ سارا ڈرامہ۔ اب بھی تم لوگ اس کی گیم نہیں سمجھے....."

سفینہ بیگم نے اونچی آواز میں کہا تو وہ سب ان کی طرف دیکھنے لگے۔

"وہ یہی سب چاہتی تھی۔ دولت جائیداد' پیسہ۔ ہاتھ لگتے ہی کیسے اڑنچھو ہوئی' دیکھا۔ شوہر بھی یاد نہیں آیا اسے۔" وہ تنفر بھرے انداز میں ایبہا کی ذات کے پرخچے اڑاتے ہوئے بولیں تو معیز کو شدید صدمہ پہنچا۔

"اس کی ہر چیز یہیں ہے ماما! چیک بک تک نہیں لے گئی وہ تو' جائیداد کیا خاک لے جاتی ساتھ....."

زارا کو رونا آگیا تھا۔

"تم چپ رہو۔ ایک بھائی کیا کم دیوانہ ہو رہا ہے' جو تم بھی اس کی حمایت میں نکل پڑیں۔"

"ماما! آپ کو کیا پتا' آپ کی بیماری کے دنوں میں اس نے کتنا خیال رکھا میرا۔ کتنا ساتھ دیا۔ کتنی دعائیں کیں آپ کے لیے۔"

"ہنہ..... یہ سب اس گھر میں گھسنے اور اس پہ قبضہ کرنے کے طریقے تھے اس کے۔ اور تم بے وقوف آ بھی گئیں اس کے ہتھکنڈوں میں۔" انہوں نے زارا کو گھورا۔

"ماما! اس نے اس گھر پر قبضہ کرنا ہوتا تو میرے ایک دفعہ منت کرنے پہ وہ یہاں سے چلی نہ جاتی۔" وہ بے اختیار بولی اور پھر رو دی۔

مگر وہاں تو گویا کوئی دھماکا ہی ہو گیا تھا۔ معیز نے بے یقینی' حد درجہ بے یقینی سے اپنی نرم دل بہن کو دیکھا۔ وہ ایبہا سے کتنی محبت سے پیش آنے لگی تھی ان دنوں میں۔

"لیکن مجھے ماما سے زیادہ پیار تھا۔ میں ماما کو کھونا نہیں چاہتی تھی۔ اس کی وجہ سے ماما ذہنی دباؤ کا شکار رہتی تھیں تو میں نے اس سے کہا..... بھائی بھی تو اسے بسانے کو تیار نہیں تھے۔ میں نے سوچا یہی موقع ہے وہ اپنی زندگی جی سکے گی اور بھائی اپنی....."

زارا روتے ہوئے اعتراف جرم کر رہی تھی۔ عمر نے سر دونوں ہاتھوں میں تھام لیا۔

"اور جس کی زندگی ہی میں بن گیا تھا زارا..... اس کے لیے تم نے کیوں نہیں سوچا.....؟"

معیز کا لہجہ دکھ سے چور تھا۔ روتا کرلاتا۔ زارا کے رونے میں اور شدت آگئی۔ وہ اب ٹھیک سے سمجھی کہ اس کا جرم کتنا بڑا تھا۔

"اللہ جو کرتا ہے' اس میں اس کی کوئی نہ کوئی مصلحت ہوتی ہے۔ اس میں بھی سب کی بہتری ہی ہوگی۔ بس اب صبر شکر کرو اور نارمل ہو جاؤ سب۔"

سفینہ بیگم نے اپنے غصے کو اندر دباتے ہوئے بظاہر نارمل انداز میں بات کو دوسری طرف گھمایا۔ معیز اٹھ کھڑا ہوا اور سرد لہجے میں بولا۔

"بالکل۔ آپ سب نارمل ہو جائیں' لیکن میں اپنی بیوی کو ڈھونڈ کر ہی چین سے بیٹھوں گا۔"

"سوری بھائی....." زارا بے چاری تو اس راز کو اندر رکھ رکھ کے ادھ موئی ہوئی جا رہی تھی۔ آج بے اختیار ہی اگل دیا تھا۔

معیز نے شاکی نظروں سے اسے دیکھا۔ رت جگوں اور ضبط کی لالی سے سجی آنکھیں زارا کا دل ہی تو چیر گئیں۔ وہ روتے ہوئے اٹھ کر بھائی سے لپٹ گئی۔

معیز نے اس کے سر پہ ہاتھ پھیرا۔

"وہ تو پہلے ہی آزمائشوں میں گھری تھی زارا! تم نے اسی کو کیوں چنا...؟ مجھے چنتیں تو کوئی بات بھی تھی۔ وہ تو بتا بھی نہیں پائی ہوگی تمہیں اپنے دل کی بات۔ میں ہوتا تو بتاتا کہ وہ میرے لیے کیا ہو گئی ہے...."

وہ بڑے ضبط سے بولا پھر زارا کو پیچھے ہٹاتا لمبے ڈگ بھرتا چلا گیا تو وہ ہاتھوں میں منہ چھپائے وہیں بیٹھتی چلی گئی۔

"آپ بھی دل سے کدورت ختم کردیں پھوپھو! وہ آپ کے لیے دعا کرتی رہی ہے۔ اس کی سلامتی کے لیے بھی دعا کریں۔ یقین کریں یہ دعا اور اس کی قبولیت آپ کے بیٹے کی سلامتی ہوگی۔"

عمر نے سفینہ بیگم کو سمجھایا تو انہوں نے ناگواری سے اسے دیکھا۔

"ہاں۔ تاکہ اس کی ماں کی روح خوش ہو جائے کہ جو کام وہ نہ کرپائی وہ اس کی بیٹی نے کرلیا۔"

"اف...." عمر سر تھام کے بیٹھ گیا۔ "ہم لوگ زندوں کو تو کیا مرے ہوؤں کو بھی خوش نہیں کرسکتے۔"

"ماما پلیز۔ آپ بھائی کو تسلی اور ہمدردی نہیں دے سکتیں تو دکھ دینے والی بات بھی نہ کریں۔"

زارا بے بسی سے بولی۔ تو وہ گرجیں۔

"ایک تو میں تم لوگوں کی بے جا جذباتیت سے بہت تنگ ہوں۔ بند کردو اس ڈرامے کو اب۔ دفع ہو گئی ہے وہ۔ سارا گھر دھلوایا ہے میں نے نذراں سے۔ ایک ایک شے کی جھاڑ پونچھ کروا کے ساری بیڈ شیٹس اور کورز تبدیل کرائے ہیں۔ اس کی نحوست دور کرنے کے لیے۔"

ان کا تنفر حد سے سوا تھا۔

بندے اگر تو جان لے کہ خدا کے نزدیک تکبر کس قدر بڑا گناہ ہے تو تو زندگی میں کبھی تکبر نہ کرے۔

لیکن ہم جاننے کی کوشش ہی کب کرتے ہیں؟

عمر گہری سانس بھرتا اٹھا۔

"کسی اپنے کی خوشی پورے گھر کی خوشی بن جایا کرتی ہے۔ پھوپھو! سوچیے گا اس بات پر۔"

وہ بھی چلا گیا تھا۔ سفینہ بیگم نے سر جھٹکا۔ پھر زارا کو ہلکا سا گھور کے دیکھا۔

"اور تم سے کس نے کہا تھا معیز کے سامنے اپنی بے وقوفی کا ڈھنڈورا پیٹو۔ ایسے تو میں یہی کہتی کہ وہ بھاگ گئی ہوگی کسی کے ساتھ۔ تم نے تو منٹوں میں اپنے سر جرم لے کر اس بدذات کو بری کردیا۔"

زارا نے زور سے آنکھیں میچ لیں۔ جی تو چاہا کان بھی بند کرلے مگر ماں کا ادب و لحاظ آڑے آگیا۔

سفینہ بیگم بڑبڑاتے ہوئے چائے اور کوکیز کی طرف متوجہ ہو گئیں۔

☆ ☆ ☆

"جو یونہی گم ہو جائیں، وہ کبھی نہ کبھی کہیں نہ کہیں کسی ذریعے یا رابطے سے مل ہی جایا کرتے ہیں مگر وہ تو خود دنیا کی بھیڑ میں کھو جانے کہیں چھپ جانے کے ارادے سے نکلی تھی۔

تو تمہیں اب میں کہاں ڈھونڈوں ایہا....؟

وہ کھڑکی سے پار اندھیرے لان میں گھور تا رات کی وحشت کو خود پر طاری ہوتا محسوس کر رہا تھا۔

"میں اس قدر بے چین و مضطرب ہوں.... تو تم تو مجھ سے بھی پہلے اس "واردات" کا شکار تھیں جسے عرف عام میں محبت کہا جاتا ہے۔ تو تم نے کیسے کھو دیا اپنی محبت کو؟ میں تو کبھی خود میں اتنی ہمت نہ جمع کرپاتا۔

کیا قیامت کردی تم نے زارا.... زندگی جینے سے پہلے ہی چھین لی مجھ سے۔

وہ بڑے جذب بھرے دکھ اور شدت سے اسے سوچ رہا تھا۔ وہ جو وہاں سے میلوں دور اندھیرے کمرے میں کھردری چارپائی پہ نڈھال اور بے بس پڑی تھی۔ جہاں معیز کے خیال کی رو بھی پہنچ نہ سکتی تھی۔

☼ ☼ ☼

"اب بس بھی کرو مراد..... !تنگ آ گئی ہوں میں تمہاری اس لاڈلی کی خدمت گزاری سے۔"
سلطانہ نے عادتاً" منہ بگاڑتے ہوئے کھانے کے دوران مراد سے شکوہ کیا تو اس نے گھور کے سلطانہ کو دیکھا۔
"دیکھ رہا ہوں جو اس کی خدمت کر رہی ہے تو۔ سوکھ کے تنکا ہوئی جا رہی ہے۔" وہ طنز سے بولا۔
"تو میں کہاں سے مرغ بریانی لا کے دوں اسے۔ اور خود بھی کچھ نہیں کھاتی ہے وہ۔" سلطانہ بگڑی۔ تو مراد صدیقی ٹھنڈا پڑا۔
"دیکھ سلطانہ !اس کا پورا دھیان رکھ۔ اسے ایسے حالوں میں واپس کریں گے تو اس کا شوہر زندہ نہیں چھوڑے گا ہمیں۔"
"اسی لیے تو کہتی ہوں سوچ کیا رہا ہے۔ پیسہ لے اور اسے حوالے کر اس کے۔" وہ اسی انداز میں بولی۔ تو مراد صدیقی اس کے تیکھے لب و لہجے پر فدا ہو گیا۔
"ارے میری شہزادی !موقع دیکھ رہا ہوں بس۔ ذرا ڈھول بیٹھنے کا انتظار تھا۔ اس کے گھر والے نے اسے ڈھونڈنے کے لیے جو زور لگانا ہے لگا لے پھر میں رابطہ کروں گا اس سے۔"
"تو رابطہ کر کے تو دیکھ۔ اب تک تو اس کی دنیا زیر و زبر ہو چکی ہو گی۔" سلطانہ نے اسے اکسایا۔
"چلو۔ صبح دیکھتا ہوں۔ اس کے موبائل میں نمبر ہے اس کے گھر والے کا۔" وہ مان گیا۔
"اس کا موبائل آن کرنے کی بے وقوفی بھی مت کرنا۔ سم آن ہوتے ہی پولیس تیری گردن آن دبوچے گی۔" سلطانہ نے کر ختگی سے کہا۔
"اتنا بے وقوف نہیں ہوں میں۔ کسی پی سی او سے فون کروں گا۔" مراد نے دانت نکوسے۔
"ہر دفعہ کسی الگ فون بوتھ سے۔ فلموں میں دیکھا ہے نا۔" وہ بھی بھرپور انداز میں مسکرائی۔
اندر دم سادھے لیٹی ایبہا نے ان کے پلان کا ایک ایک لفظ سنا تھا۔
میرا موبائل..... ایک بار میرے ہاتھ لگ جائے تو..... نیند کی وادی میں ڈوبتا اس کا ذہن مسلسل ایک ہی بات سوچے جا رہا تھا۔
سلطانہ نے اتنے دنوں سے اسی اندھیری کوٹھڑی کو اس کا مقدر بنا رکھا تھا۔ محض باتھ روم کے استعمال کے لیے اسے بازو سے دبوچ کے ساتھ لے جاتی۔ اس کے علاوہ اسے باہر نکل کے ایک بھی سانس لینے کی اجازت نہ تھی۔
اس کی آنکھ کھٹاک کی آواز سے کھلی۔ روشنی کا تیز جھماکا اس کے چہرے پہ پڑا۔ تو اس نے بے اختیار آنکھوں پہ ہاتھ رکھ لیا۔ کئی ثانیے گزرے مگر اندر کوئی نہیں آیا۔
ہوا کے زور سے کھلنے والا دروازہ اب ہلکے ہلکے ہل رہا تھا۔ دھوپ کی لکیر بڑھتی اور کم ہوتی رہی۔
کچھ خیال آنے پہ وہ بہ سرعت اٹھی۔ ساری کمزوری اور نقاہت کہیں دور جا سوئی تھی۔ اس نے دروازے کو آہستہ سے کھولا اور باہر جھانکا۔ چھوٹا سا صحن خالی تھا۔ وہ دھڑکتے دل کے ساتھ کمرے سے باہر نکلی۔ اس کے کان چوکنے خرگوش کی طرح کھڑے تھے۔ ساتھ والے کمرے کا دروازہ بھی چوپٹ کھلا تھا اور وہاں کوئی نہ تھا۔
(تو کیا سلطانہ اور مراد کو ایمر جنسی میں کہیں جانا پڑ گیا تھا؟)
اس کا ذہن تیزی سے کام کرنے لگا۔ اونچی دیواروں والا صحن۔ چھت پہ جانے کو کوئی سیڑھی نہ تھی ورنہ وہ چھت پر چڑھ کے ہی شور مچا دیتی۔ باہر کا دروازہ دھڑ دھڑانے کا بھی کچھ فائدہ نہ ہوتا۔ یقیناً" باہر تالا لگا ہو گا۔ آبادی سے ہٹ کے یہ مکان تھا۔ وہ ساتھ والے کمرے میں آئی اور تیزی سے ادھر ادھر ہاتھ مار کے چیزیں الٹ پلٹ

کرنے لگی۔

جلد ہی اسے اپنی مطلوبہ چیز مل گئی۔ ایبہا کے ہاتھ پاؤں لرزنے لگے۔ یہ اس کا موبائل فون تھا۔ جو کہ آف تھا اس نے پاور کا بٹن لحہ بھر کو پریس کیا تو اس کا دل بے ترتیبی سے دھڑکنے لگا۔ موبائل کی بیٹری چارج تھی۔ موبائل آن ہو گیا تھا۔ اس نے جلدی سے معیز کا نمبر ملایا۔ اسی وقت باہر کے دروازے پر کھٹکا ہوا۔ تالا کھل رہا تھا۔ اس کے بعد کنڈی کھلنے کی آواز۔ ایبہا کے اعصاب کشیدہ ہونے لگے۔

"معیز... معیز... فون اٹھالو پلیز..."

وہ کرب سے بڑبڑائی۔ سلطانہ اور مراد صدیقی آگے پیچھے ہی اندر داخل ہوئے تھے۔ اسی وقت دوسری طرف سے کال ریسیو کرلی گئی۔ ایبہا کے اندر جیسے نئی توانائی بھر گئی۔

"معیز..."

"ایبہا... کہاں ہو تم...؟ پاگلوں کی طرح ڈھونڈ رہا ہوں' میں تمہیں ہر جگہ..."

ان دونوں کی ایبہا پر نگاہ پڑ چکی تھی۔ غصے اور کرختگی نے ان کے چہرے بگاڑ دیے۔ ایبہا پر وحشت سی طاری ہو گئی۔ وہ دونوں ایک جست میں اس تک پہنچے تھے۔

"معیز میں... مجھے اس نے اغوا کیا ہے..."

وہ تعین نہ کرپائی کہ مراد صدیقی کا "تعارف" نام سے کرائے... یا رشتے سے؟

"کون... کون ہے وہ...؟" معیز نے تیز لہجے میں پوچھا اور ابھی وہ بولنے ہی لگی تھی کہ مراد صدیقی نے اس کے ہاتھ سے موبائل چھین لیا اور آف کردیا۔ سلطانہ نے کھینچ کے ایک تھپڑ اس کے منہ پر مارا۔

"معیز... معیز... میری بات کرادو اس سے... معیز!" وہ چیخی اور پھر چیختی ہی چلی گئی۔

"تیرا ستیاناس حرام خور۔"

سلطانہ ہڑبڑا کر اٹھی۔ ایبہا شاید خواب میں چیخ رہی تھی۔ اسے گالیوں سے نوازتے ہوئے تلملا کر سلطانہ نے تکیہ اٹھا کر اس کے منہ پر رکھ دیا تو گھٹن کے مارے ہاتھ پاؤں مارتی وہ حواس کی دنیا میں لوٹی۔ تکیہ اٹھا کے پرے پھینکا۔

"کیا بات ہے کمینی۔ کیوں چیخے جارہی ہے۔" سلطانہ غرائی۔

مدھم روشنی میں اس کے مردانہ نقوش بہت بھدے لگ رہے تھے۔ ایبہا کو اس سے خوف محسوس ہوا۔ پسینے میں شرابور جسم اور دھونکنی کی طرح چلتا سانس' وہ یقیناً "خواب" ہی دیکھ رہی تھی۔

مگر معیز کی پکار ابھی تک اس کی سماعتوں میں تازہ تھی۔ ابھی کل ہی کی تو بات لگتی تھی۔ وہ سیڑھیوں کے کنارے تک اس کا نام پکارتے ہوئے اس کے پیچھے آیا تھا۔ رشتہ جڑنے کے اتنے عرصے میں پہلی بار اس نے دل سے اتنی بے تابی کے ساتھ ایبہا کو پکارا تھا۔ تو اب روز رات کو اسے بدل بدل کے خواب آتے۔ جس میں معیز اسے اتنی ہی بے قراری سے پکارتا تھا۔

سلطانہ پھر سے اونگھ گئی تو ایبہا نے دبی سسکاری بھری۔

تو آج پھر یہ ایک خواب ہی تھا...

☆ ☆ ☆

رباب تو معیز کی حالت دیکھ کر دنگ ہی رہ گئی۔

"اس لڑکی کو تو عادت ہے ان ڈراموں کی معیز! اب تک تو تمہیں عادی ہو جانا چاہیے تھا۔" وہ حسب عادت

زہر اگلنے سے باز نہیں رہی تھی۔ معیز نے بہت ناگواری سے اسے دیکھا۔ تو زارا جلدی سے کچن سے آئی۔
"آؤ رباب! میں تمہیں ڈریسز دکھاؤں۔ کیا کمال کلیکشن آئی تھی "پہناوا" پر۔ تمہارے لیے بھی دو سوٹ لیے ہیں میں نے۔"
وہ جیسے زبردستی اٹھ کے زارا کے کمرے میں آئی' وگرنہ اس کا ایسا کوئی ارادہ نہیں تھا۔
"یہ معیز کس خوشی میں اسے ڈھونڈتا پھر رہا ہے۔ دفع ہو گئی ہے تو ہونے دو۔"
رباب کی سوئی ابھی تک وہیں پر اٹکی تھی۔ پیکٹ میں سے سوٹ نکالتے ہوئے زارا کا ہاتھ رک گیا۔
اسے دھیان آیا۔ رباب کا انداز گفتگو بالکل سفینہ..... جیسا تھا۔
"ایک انسان لاپتا ہوا ہے رباب..... اسے ڈھونڈنا ہمارا فرض ہے۔" زارا نے تحمل سے کہا۔ رباب نے تیوری چڑھائی۔
"ایک بالغ انسان اپنی مرضی سے کہیں چلا جائے تو اس کے پیچھے اس کی تلاش میں نکل جانا عقل مندی نہیں کہلاتا۔"
"انسان سے غلطی بھی ہو سکتی ہے رباب! اور ویسے بھی وہ یہاں سے عون بھائی کے گھر جانے کے لیے نکلی تھی مگر وہاں نہیں پہنچی اور آج پانچواں روز ہے۔" زارا کی آواز نا چاہتے ہوئے بھی رندھ سی گئی۔
"سو واٹ یار..... " وہ زور دیتے ہوئے بولی۔ "نہیں رہنا چاہتی ہو گی وہ یہاں۔ اور ہو سکتا ہے کسی کے ساتھ اس کا کوئی چکر وغیرہ ہو۔ پہلے بھی وہ کالج سے غائب ہو گئی تھی۔ ہاسٹل بھی چھوڑ دیا تھا بنا بتائے۔" رباب نے آرام سے کہا تو زارا کے سر میں درد شروع ہو گیا۔
"تب بھی اس کے ساتھ ایک حادثہ ہو گیا تھا۔ بھائی اچھی طرح واقف ہیں اس کی ہسٹری سے۔"
"معیز کو اس کی ہسٹری میں بڑی دلچسپی ہے۔" رباب نے طنز کیا۔ تو لہجہ تلخ تھا۔ زارا گڑبڑائی۔
"ہاں..... ہے دلچسپی پھر.....؟" معیز دروازے میں آن کھڑا ہوا تھا۔ سپاٹ لہجے میں بولا تو زارا کا دل دھک سے رہ گیا۔
رباب نے بے یقینی سے اسے دیکھا۔ وہ عجیب بے اعتنائی کے موڈ میں تھا۔ اس سے بہت دور ایک اجنبی سا معیز احمد۔
"بہت خوب....." سنبھلتے ہوئے رباب نے سینے پہ بازو لپیٹے اور طنزیہ نظروں سے معیز کو دیکھا۔ "اس دلچسپی کی وجہ پوچھ سکتی ہوں میں؟" تلخی سے پوچھا۔
زارا کا دل گویا منہ کو آنے کو تھا۔ وہ ایک ٹک معیز کی آنکھوں میں اترتی سرخی اور سرد تاثرات کو دیکھ رہی تھی۔
"ہے وجہ..... لیکن میرا نہیں خیال کہ میں تمہیں بتانے کا پابند ہوں۔" وہ اسی سرد مہری سے بولا۔
"تم میری انسلٹ کر رہے ہو معیز۔" رباب نے غصیلے لہجے میں کہا تو زارا نے بات سنبھالنے کی غرض سے آگے بڑھ کے اس کا ہاتھ تھاما۔
"ایسا کچھ نہیں ہے رباب! بھائی ڈسٹرب ہیں ایبھا کی گمشدگی کی وجہ سے....."
"وہ تو میں دیکھ ہی رہی ہوں۔ کافی "ڈسٹرب" ہیں اس کی وجہ سے۔" وہ طنز و تمسخر سے بھرپور لہجے میں بولی تو معیز نے تیز نظروں سے اسے دیکھا۔ پھر اعتراف کرتے ہوئے بولا۔
"ہاں۔ ہوں ڈسٹرب۔ تو پھر.....؟" رباب تلملائی۔
"تو پھر یہ کہ تم اتنے عرصے سے میرے ساتھ کیا کھیل کھیل رہے ہو.....؟"

"وہی۔ جو تم چاہتی تھیں۔ دوستی کا ہاتھ تم نے بڑھایا تھا میں نے نہیں۔" وہ آرام سے بولا اور اسے جتا بھی دیا۔

"اونہہ۔۔۔ مجھے بہت پہلے ہی سمجھ جانا چاہیے تھا جب تم مجھے اس سے کمپیئر کرتے تھے۔" وہ پھنکاری۔

"ہاں۔۔۔ اور مجھے بھی لیکن افسوس۔ مجھے سمجھنے اور جاننے میں دیر ہو گئی۔" معیز کا لہجہ رباب کی سمجھ میں آنے والا نہیں تھا، مگر زارا کا تو دھاڑیں مار کے رونے کو جی چاہا۔ اس کے جان سے پیارے بھائی کی زندگی تباہ ہو گئی تھی۔

"مگر تمہاری سمجھ میں یہ نہیں آیا کہ جیسے اس نے "سات پردوں" میں رہ کے تمہیں پھانس لیا تھا ویسے ہی کسی اور کو پھنسا کے نکل گئی ہو گی۔"

رباب کی تو زبان کے آگے خندق بلکہ کھائی تھی۔ معیز کا وجود جیسے شراروں سے بھر گیا۔

"اسے نہ تو کسی اور کو پھانسنے کی ضرورت ہے اور نہ ہی مجھے۔"

"اس کلاس کی لڑکیاں۔۔۔"

رباب نے کہنا چاہا تو معیز دانت پیستا دو قدم آگے بڑھ آیا اور اس کی بات کاٹ کر بولا۔

"تم جو زبان استعمال کر رہی ہو، وہ بھی کسی اچھی کلاس کو پورٹریٹ نہیں کر رہی رباب۔" رباب تلملا اٹھی۔

"تم میرا اور اس کا مقابلہ کر رہے ہو؟"

"پہلے تو میں یوں ہی کہا کرتا تھا رباب۔۔۔" وہ بے ساختہ کہتے ہوئے رکا۔ پھر دکھ سے بولا۔ "مگر اس کا اور تمہارا واقعی کوئی مقابلہ نہیں۔"

"تم میری انسلٹ کر رہے ہو معیز۔" رباب نے غصے سے مٹھیاں بھینچیں۔

"اور تم میری بیوی کی۔۔۔" وہ جتانے والے انداز میں اس قدر اچانک بولا کہ جہاں زارا کا سر چکرایا وہیں رباب کے سر پہ گویا پوری چھت ہی آن گری۔

"ک۔۔۔ کون؟" رباب نے تحیر اور بے یقینی سے معیز کو دیکھا۔

"دراصل رباب۔۔۔ میں نے بتایا تھا نا ہمارے فیملی ریلیشنز ہیں ایمہا کی امی سے۔۔۔ تو ابو نے جذباتی ہو کر اپنے انتقال سے پہلے بھائی اور ایمہا کا نکاح کروایا تھا۔ حالات ہی کچھ ایسے ہو گئے تھے۔ بھائی کی تو مرضی ہی نہیں تھی۔"

زارا سے بات سنبھالی نہ جاتی تھی۔ رشتہ ہی ایسا تھا اس سے۔ مگر معیز بالکل پرسکون تھا۔ جیسے کوئی بہت صحیح فیصلہ کر لیا ہو۔

اور رباب۔۔۔ یک لخت وہ ڈھیری بن گئی جس پہ ایمہا نے فتح کا پرچم ٹھونک دیا تھا۔ رگ رگ میں گویا تیزاب دوڑ اٹھا۔

"اور تم۔۔۔ تم مجھ سے فلرٹ کرتے رہے۔" وہ پھنکاری تھی۔ یوں جیسے ابھی معیز پر جھپٹ پڑے گی۔

"دوستی کا ہاتھ تم نے بڑھایا تھا رباب! میں تو کافی عرصہ تک اگنور کرتا رہا تھا۔" وہ جتاتے ہوئے بولا تو وہ چیخی۔

"تم مجھے اپنے نکاح کا بتا دیتے تو میں پیچھے ہٹ جاتی۔"

"تم پھر بھی نہ ہٹتیں کیونکہ تب تک میں اس نکاح کو مانتا ہی نہیں تھا، تو تم کیسے مان لیتیں۔" اس کی آنکھوں میں تاسف تھا اور لہجے میں اپنے لیے پشیمانی۔

"تم نے میرے ساتھ بلف (دھوکا) کیا ہے۔ گیم کھیلا ہے میرے ساتھ۔ جس میں تمہاری بہن بلکہ تمہاری پوری فیملی انوالوڈ (شامل) ہے۔" رباب نے تیز نظروں سے زارا کو گھورتے ہوئے غصے سے کہا۔

وہ تو خود معیز کو جھٹکا دینے والی تھی۔ اسے ٹھکرا کر اس پر سیفی کو ترجیح دیتی تو وہ کیسے تڑپتا۔ کیسے اس کی منتیں کرتا۔ مگر ادھر تو کھیل ہی اور چل رہا تھا۔ رباب کی باری آئی نہیں تھی اور اس کے سارے کے سارے مہرے پٹ بھی گئے۔

"زارا کو اس معاملے میں مت گھسیٹو۔ اس نے تمہیں مجھ سے دوستی کرنے کا مشورہ نہیں دیا تھا۔ یہ تمہارا ذاتی فیصلہ تھا۔ تمہیں یاد ہے نا۔ وہ رانگ کالز، جو تم مجھے کیا کرتی تھیں؟"

معیز نے سرد لہجے میں کہا تو زارا کے سامنے اس پر گھڑوں پانی پڑا۔

"مگر تم لوگوں کو اس کا خمیازہ بھگتنا پڑے گا۔" وہ تلملائی، پھنکارتی ہوئی زخمی ناگن کی طرح بل کھاتی وہاں سے نکلی تھی۔ زارا سر تھام کے بیٹھ گئی۔

"رباب.... رباب...." معیز لاؤنج میں آیا تو سفینہ اسے آوازیں دیتی لاؤنج کے دروازے تک گئیں۔ مگر وہ ان کے احترام میں بھی نہیں رکی۔ سفینہ غصے سے واپس آئیں۔

"یہ کیا تماشا لگا رکھا ہے تم لوگوں نے.... کیا کہا تھا رباب سے تم نے؟" انہوں نے معیز سے پوچھا۔

"ایہا کے متعلق بتایا ہے اور بس...." وہ اطمینان سے بولا تو سفینہ بیگم کے پیروں تلے جیسے انگارے بچھ گئے۔

"بس...." وہ تلملائیں۔ "یہ بس ہے نان سینس؟ جانتے نہیں ہو، زارا سے اس کا کیا رشتہ ہے اور فیوچر میں وہ اس گھر کی بہو بننے والی ہے۔"

"اسے بھی یہ ہی غلط فہمی تھی ماما! مگر آج میں نے اس کی یہ غلط فہمی دور کر دی ہے۔"

اس کے اطمینان میں کوئی فرق نہیں پڑا تھا۔ سفینہ بیگم کو طرارہ آیا۔

"دیکھو اس مت کرو معیز! میری نرمی کا ناجائز فائدہ مت اٹھاؤ، جو تمہارا باپ کر گیا تھا وہ ہی کافی ہے ہماری بدنامی کو۔ اب اس گناہ کی پوٹ کو اپنے سر پہ مت لادو۔ دفع ہو گئی ہے تو ہاتھ جھاڑ لو تم بھی۔"

معیز کی رنگت مارے ضبط و برداشت کے سرخ ہو گئی۔ "ماما پلیز۔۔۔" وہ انہیں اونچی آواز میں ٹوک گیا اور بس۔ اس سے زیادہ نہ مذہب اجازت دے رہا تھا اور نہ ہی ڈاکٹر۔

"میری ایک بات کان کھول کے سن لو معیز! میں اس گھر میں اس لڑکی کے قدم برداشت نہیں کر سکتی۔ جس کی غیر موجودگی میں تباہی مچ رہی ہے' اس کی موجودگی تو میرا گھر توڑ کے رکھ دے گی۔" سفینہ بیگم نے قطعی انداز میں اپنا فیصلہ سنا دیا تھا۔ معیز کا جی چاہا انہیں بتائے۔ ماں وہ تو اپنا بنانے والوں میں سے ہے۔ توڑنے نہیں جوڑنے والوں میں سے ہے۔ اس گھر کی خوشی کی خاطر جو اپنی جان کی پروا کیے بغیر یہاں سے نکل گئی تھی۔ آپ کا گھر' پیسہ اور بیٹا بھی چھوڑ کر۔

معیز کے لب لرزے۔ اس کی آنکھیں بے اختیار نم ہو گئیں۔ وہ وہیں سے چپ چاپ پلٹ گیا جبکہ سفینہ بیگم مارے غصے کے کتنی ہی دیر بڑبڑاتی رہیں۔

✡ ✡ ✡

ثانیہ کے بس میں ہوتا تو وہ زمین کھود کے ایہا کو کہیں سے برآمد کر لیتی۔ بے بسی سی بے بسی تھی۔ کہ کوئی بھی کچھ نہیں کر پا رہا تھا۔ سنسان سڑک سے جانے کون اسے کہاں لے گیا تھا۔ اس معصوم اور بے ریا لڑکی سے ثانیہ کا بہت پیار کا تعلق رہا تھا۔ وہ آنکھوں پہ بازو رکھے لیٹی۔ بہت آزردہ سی سوچوں کا شکار تھی جب عون جان بوجھ کر دھڑام سے اس کے پاس گرنے کے سے انداز میں بیٹھا۔

ثانیہ نے چونک کر بازو ہٹایا۔

"تم سو رہی تھیں؟" عون نے جیسے بے یقینی سے پوچھا تو اس کے انداز پر ثانیہ چڑ کر بولی۔

"نہیں۔۔۔ موٹر سائیکل چلا رہی تھی۔"

"ہاں بھئی۔۔۔ تم سے کچھ بعید نہیں۔ تم تو موت کے کنویں میں بھی موٹر سائیکل چلا سکتی ہو۔" عون نے متاثر ہونے والے انداز میں سر ہلایا تو ثانیہ نے تکیہ اٹھا کے اسے دے مارا۔ وہ ڈھٹائی سے ہنسنے لگا۔

"تنگ مت کرو عون۔ میرا دل ایہا کے لیے بہت پریشان ہے۔" وہ پھر سے اداس ہونے لگی۔

"حقیقت ہے' مرے ہوئے پہ صبر آہی جاتا ہے' مگر زندہ انسان کھو جائے تو کسی پل چین نہیں ملتا۔ کہیں سے ایک خبر' ایک خیر کی آواز۔ دل ترستا ہی رہتا ہے۔

"دعا کرو اس کی خیریت کے لیے اور بس۔۔۔" وہ بھی سنجیدہ ہو گیا' پھر بتانے لگا۔

"معیز بھی بہت پریشان ہے۔ بہت خراب حالت ہے اس کی' میں تو حیران ہوں دیکھ کر۔"

"ہونہہ۔۔۔ اب کیا فائدہ؟ جب موجود تھی تب تو اسے دیکھنے کے بھی روادار نہ تھے۔" ثانیہ کو غصہ آیا تو تلخی سے بولتی ہوئی اٹھ بیٹھی۔

"اچھا۔۔۔ یعنی کافر کو ساری عمر کافر رہنا چاہیے۔ کیوں کہ وہ تو اللہ کو مانتا ہی نہیں تھا پہلے۔" عون نے بھی طنز کی مار ماری۔

ثانیہ نے سر جھٹکا اور بالوں کو جوڑے کی شکل میں لپیٹنے لگی۔

"بے وقوف۔ پہلے کو چھوڑو اور اب کی بات کرو۔ وہ مان گیا تھا اس کی حیثیت کو۔ معافی بھی مانگ لی تھی اس نے ایہا سے' پھر بھی وہ چلی گئی۔" عون نے نرمی سے بتایا۔ تو ثانیہ نے بے یقینی سے اسے دیکھا۔

"معیز نے خود بتایا ہے مجھے۔" عون نے اس کی نظروں کی زبان سمجھتے ہوئے وضاحت کی پھر ساتھ ہی وجہ بھی بتادی کہ ایہا کس طرح اور کن حالات میں گھر سے نکلی تھی تو ثانیہ نے سر ہاتھوں میں تھام لیا۔

"یا اللہ۔۔۔ یہ پوری فیملی تو امتحان لینے پہ اتری ہوئی ہے' اس کی بے بسی اور بے کسی کا۔"

"اللہ بہتری کرے گا ان شاء اللہ۔" عون نے اس کا سر اپنے شانے سے لگالیا۔

ایک عورت کا گم ہو جانا' پورے گھرانے کی عزت جانے کے مترادف ہے۔

اور اس وقت وہ سب اسی کیفیت کا شکار تھے۔

☼ ☼ ☼

عمر آج واپس جا رہا تھا۔

"وہ صحیح معنوں میں ایک بہترین لڑکی ہے معیز! چاہے جیسے بھی حالات ہوں' اسے تنہا مت چھوڑنا۔ پھپھو کو منالینا۔ اولاد کو بہت سے طریقے آتے ہیں والدین سے بات منوانے کے۔ تم بھی کچھ ایسا ہی فارمولا آزمانا۔ میں جا کے تم سے رابطہ رکھوں گا اور ایہا کے لیے بہت دعا کروں گا۔" جاتے ہوئے اس نے معیز سے کہا تھا۔ ایراز اسے ایئر پورٹ چھوڑنے جا رہا تھا۔

آج ساتواں روز تھا۔ اب تو معیز کو یہ سب طفل تسلیاں لگنے لگی تھیں۔

"وہ مل جائے گی' وہ آجائے گی' کب؟ ابھی کیوں نہیں' ابھی میں پلکیں جھپکوں اور وہ نم آنکھیں لیے میرے سامنے ہو۔ مجھ سے لڑے جھگڑے۔۔۔ میں آپ کی زندگی سے کبھی نہیں جاؤں گی اور جس کی زندگی ہی آپ ہو گئے ہوں' اس کا کیا؟"

وہ تھکے ہارے انداز میں سیڑھیاں طے کر رہا تھا اور کانوں میں گویا ایہا کی آواز گونج رہی تھی۔ اس کا دل درد کے مارے پھٹ جانے کو تھا۔

زندگی کا ہاتھوں سے نکلنا کیسا ہوتا ہے' یہ اس پل معیز پر آشکار ہو رہا تھا۔

وہ آخری سیڑھی پر پہنچا تو اس کے کانوں میں ایک جانی پہچانی آواز گونجی۔

اس کا پژمردہ ہوا ذہن چوکنا ہوا۔

یہ اس کے موبائل کی کالنگ ٹون تھی۔ جو اس نے ایہا کی کال کے لیے پچھلے دنوں سلیکٹ کی تھی کہ شاید وہ اسے کبھی کال کرے۔ وہ بے اختیار اپنے کمرے کی طرف دوڑا۔ بیڈ پہ پڑے موبائل کی اسکرین روشن تھی اور وہ مخصوص کالر ٹیون بج رہی تھی۔

معیز نے جھپٹ کر موبائل اٹھایا تو "ایہا کالنگ" کے الفاظ دیکھ کر اس کا دل بے ترتیب ہوا۔

"ہیلو۔۔۔ ایہا؟" اس قدر بے تابی' بے قراری سے اس نے تصدیق چاہی کہ میلوں دور موبائل کان سے لگائے ایہا کا وجود سنسنا اٹھا۔ اس کی آنکھیں آنسوؤں سے لبریز ہو گئیں۔

"معیز۔۔۔ معیز۔۔۔" وہ اسے پکارتے ہوئے بے اختیار روئے چلی گئی۔

"ہیلو۔۔۔ ہیلو۔" معیز نے یکلخت لائن منقطع ہوتی محسوس کی تو وہ بے اختیار پکارتا چلا گیا۔ مگر دوسری طرف جامد خاموشی تھی۔

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

تنزیلہ ریاض

نور محمد برطانیہ میں رہائش پذیر ہے اور لوٹن کی جامع مسجد میں موذن ہے۔ پیسے والا اور خوب دل والا ہے۔ ایک چھوٹے سے فلیٹ میں رہتا ہے۔ جس کا ایک کمرا ایک عربی طالب علم اپنے دوست کے ساتھ شیئر کرتا ہے' جبکہ دوسرے کمرے میں اس کے ساتھ ایرانی زین العابدین رہتا ہے۔ اسے اپنے ایرانی ہونے پر فخر ہے۔ وہ برطانیہ میں اسٹڈی ویزے پر جاب کرتا ہے۔ سخت محنتی ہے مگر پاکستان میں موجود بارہ افراد کے کنبے کی کفالت خوش اسلوبی سے نہیں کر پا رہا۔

عمر شہروز کا کزن ہے' جو اپنی فیملی کے ساتھ انگلینڈ میں مقیم ہے۔ وہ لوگ تین چار سال میں پاکستان آتے رہتے ہیں۔ عمر اکثر اکیلا بھی پاکستان آجاتا ہے۔ وہ کافی منہ پھٹ ہے۔ اسے شہروز کی دوست امائمہ اچھی لگتی ہے۔ شہروز کی کوششوں سے ان دونوں کی منگنی ہو جاتی ہے۔

ڈاکٹر زارا شہروز کی سادہ مزاج منگیتر ہے۔ ان کی منگنی بڑوں کے فیصلے کا نتیجہ ہے۔ ان دونوں کے درمیان محبت ہے لیکن شہروز کے کھلنڈرے انداز کی بنا پر زارا کو اس کی محبت کا یقین نہیں ہے۔

اس کے والد نے اسے گھر پر پڑھایا ہے اور اب وہ اسے بڑی کلاس میں داخل کرانا چاہتے ہیں۔ سر شعیب انہیں منع کرتے ہیں کہ ان کا بچہ بہت چھوٹا ہے۔ اسے چھوٹی کلاس میں ہی داخل کروائیں مگر وہ مصر رہتے ہیں کہ انہوں نے اپنے بچے پر بہت محنت کی ہے۔ وہ بڑی کلاس میں داخلے کا مستحق ہے۔ سر شعیب اسے بچہ پر ظلم سمجھتے ہیں مگر اس کے باپ کے

مکمل ناول

اصرار پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ وہ بچہ بڑی کلاس اور بڑے بچوں میں ایڈجسٹ نہیں ہو پاتا۔ اسکالرشپ حاصل کرنے والے اس بچے سے حیرت انگیز طور پر ٹیچرز اور فیلوز میں سے بیشتر ناواقف ہوتے ہیں۔ اس کی وجہ اس کے باپ کی طرف سے غیر نصابی سرگرمیوں میں حصہ لینے پر سخت مخالفت ہے۔

وہ خواب میں ڈر جاتا ہے۔

73ء کا زمانہ تھا اور روپ نگر کا علاقہ۔

بلی انڈیا میں اپنے گرینڈ پیرنٹس کے ساتھ آیا تھا۔ اس کے والد کا انتقال ہو چکا ہے۔ وہ برطانیہ کے رہنے والے تھے۔ گرینڈپا یہاں کسی پروجیکٹ کے سلسلے میں آئے تھے۔ گرینی نے یہاں کوچنگ سینٹر کھول لیا تھا۔ مینا راؤ اس کے ہاں پڑھنے آتی تھی۔ اس نے کہا تھا۔ ماس مچھی کھانے والے کسی کے دوست نہیں بن سکتے۔ وہ وفادار نہیں ہو سکتے۔ گرینڈپا کو بتایا' وہ اسے سمجھاتے ہیں کہ قدرت نے ہمیں بہت محبت سے تخلیق کیا ہے اور ہماری فطرت میں صرف محبت رکھی ہے۔ انسان کا اپنی ذات سے اخلاص ہی اس کی سب سے بڑی وفاداری ہے۔

امائمہ کے کسی رویے پر ناراض ہو کر عمر اس سے انگوٹھی واپس مانگ لیتا ہے۔ زارا شہروز کو بتاتی ہے۔ شہروز اور عمر کا جھگڑا ہو جاتا ہے۔

اس کی کلاس میں سلیمان حیدر سے دوستی ہو جاتی ہے۔ سلیمان حیدر بہت اچھا اور زندہ دل لڑکا ہے۔ سلیمان کے کہنے پر پڑھائی کے ساتھ ساتھ کھیل میں بھی دلچسپی لینے لگتا۔ وہ اپنے گھر جا کر امی سے بیٹ کی فرمائش کرتا ہے تو اس کے والد یہ سن لیتے ہیں' وہ اس کی بری طرح پٹائی کر دیتے ہیں۔ ماں بے بسی سے دیکھتی رہ جاتی ہیں۔ پھر اس کے والد اسکول جا کر منع کر دیتے ہیں کہ سلیمان حیدر کے ساتھ نہ بٹھایا جائے۔ سلیمان حیدر اس سے ناراض ہو جاتا ہے اور اسے ابنارمل کہتا ہے۔ جس سے اس کو بہت دکھ ہوتا ہے۔

کلاس میں سلیمان حیدر پہلی پوزیشن لیتا ہے۔ پانچ نمبروں کے فرق سے اس کی سیکنڈ پوزیشن آتی ہے۔ یہ دیکھ کر اس کے والد غصے سے پاگل ہو جاتے ہیں اور کمرا بند کر کے اسے بری طرح مارتے ہیں۔ وہ وعدہ کرتا ہے کہ آئندہ پینٹنگ نہیں کرے گا۔ صرف پڑھائی کرے گا۔

اس کے والد شہر کے سب سے خراب کالج میں اس کا ایڈمیشن کراتے ہیں۔ تاکہ کالج میں اس کی غیر حاضری پر کوئی کچھ نہ کہے۔ [illegible] اس سے کہتے ہیں کہ وہ گھر بیٹھ کر پڑھائی کرے۔ باہر کی دنیا سے اس کا رابطہ نہ ہو۔ اس کا کوئی دوست نہیں ہے۔

امائمہ کی والدہ شہروز کو فون کرتی ہیں۔ شہروز کے سمجھانے پر عمر کو عقل آجاتی ہے اور وہ اپنے والد کو فون کرتا ہے۔ جس کے بعد عمر کے والد امائمہ کے والد کو فون کر کے کہتے ہیں کہ بچوں کا نکاح کر دیا جائے۔ دونوں کے والدین کی رضامندی سے عمر اور امائمہ کا نکاح ہو جاتا ہے۔ نکاح کے چند دن بعد عمر لندن چلا جاتا ہے۔

نکاح کے تین سال بعد امائمہ عمر کے اصرار پر اکیلے ہی رخصت ہو کر لندن چلی جاتی ہے۔ لندن پہنچنے پر عمر اور اس کے والدین امائمہ کا خوشی خوشی استقبال کرتے ہیں۔

امائمہ عمر کے ساتھ ایک چھوٹے سے فلیٹ میں آجاتی ہے' جبکہ عمر کے والدین اپنے گھر چلے جاتے ہیں۔ امائمہ عمر اتنے چھوٹے فلیٹ میں رہنے سے گھبراتی ہے اور عمر سے اپنی خواہش کا اظہار کرتے ہوئے عمر کے والدین کے گھر رہنے کو کہتی ہے' جسے عمر یہ کہہ کر رد کر دیتا ہے کہ وہ اپنے والدین پر مزید بوجھ نہیں ڈالنا چاہتا۔

اس شخص کے شدید اصرار پر نور محمد اس سے ملنے پر راضی ہو جاتا ہے۔ وہ اس سے دوستی کی فرمائش کرتا ہے۔ نور محمد انکار کر دیتا ہے' لیکن وہ نور محمد کا پیچھا نہیں چھوڑتا ہے۔ وہ نور محمد کی قرات کی تعریف کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اس نے نماز پڑھنا نور محمد سے سیکھا ہے۔ پھر وہ بتاتا ہے کہ اسے نور محمد کے پاس کسی نے بھیجا ہے۔ نور محمد کے پوچھنے پر کہتا ہے۔ خضر الٰہی نے بھیجا ہے۔

روپ نگر سے واپس برطانیہ آنے پر گرینڈپا کا انتقال ہو جاتا ہے اور گرینی مسٹر ایرک کی دوستی بڑھنے لگتی ہے۔ وہ بلی سے

کہتی ہیں کہ وہ اپنی ممی سے رابطہ کرے۔ وہ اسے اس کی ممی کے ساتھ بھجوانا چاہتی ہیں۔ بلی انکار کے باوجود وہ کوہو کو بلوالیتی ہیں اور اسے ان کے ساتھ روانہ کردیتی ہیں۔

میری کالج میں طلحہ اور راشد سے واقفیت ہوجاتی ہے۔

عمر نے اسے پبلک لائبریری کا راستہ بتا دیا ہے۔ عمر کو آرٹ سے کوئی دلچسپی نہیں۔ لیکن وہ امائمہ کی خاطر دلچسپی لیتا۔ دونوں بہت خوش ہیں۔ لیکن امائمہ وہاں کی معاشرت کو قبول نہیں کرپارہی۔ عمر کی دوست مارتھا کے شوہر نے امائمہ کو گلے لگا کر مبارک باد دی تو اسے یہ بات بہت ناگوار گزری' گھر جاکر دونوں میں جھگڑا ہوگیا۔

گرینی کے انتقال کے بعد بلی کوہو کے ساتھ رہنے پر مجبور تھا۔ کوہو پہلے بھی گرینی سے اچھا خاصا معاوضہ وصول کرتی رہی تھی۔ بلی کو اپنے پاس رکھنے کے معاملے پر کوہو نے مسٹر ایرک سے جھگڑا کیا کیونکہ گرینی نے انہیں بلی کا نگراں مقرر کیا تھا۔ پھر دونوں نے سمجھوتا کرلیا اور کوہو نے مسٹر ایرک سے شادی کرلی۔

نور محمد' احمد معروف کو اپنے ساتھ گھر لے آیا تھا۔ احمد معروف کے اچھے اطوار' عمدہ خوشبو' نفیس گفتگو' اعلا لباس کے باعث وہ سب اسے پسند کرنے لگے تھے۔ نور محمد بھی اس سے گھل مل گیا تھا۔ احمد نے کہا تھا کہ وہ جہاں رہتا ہے وہاں سے مسجد کافی دور ہے' اس لیے وہ اس کے ساتھ رہنا چاہتا ہے۔ نور محمد بھی اس سے گھل مل گیا تھا۔ احمد نے کہا تھا کہ وہ جہاں رہتا ہے وہاں سے مسجد کافی دور ہے' اس لیے وہ اس کے ساتھ رہنا چاہتا ہے۔ نور محمد اس سے کہتا ہے اسے دنیا سے کوئی دلچسپی نہیں ہے' اس کے لیے اللہ کا دین کافی ہے۔ احمد معروف کہتا ہے۔ "اللہ کا دین تو کیا دنیا اللہ کی نہیں ہے۔" "اسلام کی سب سے اچھی بات یہی ہے' اس میں دنیا کا انکار نہیں ہے۔ آپ دنیا کے ساتھ وہ مت کریں جو ابلیس نے آپ کے ساتھ کیا تھا۔

صبا نورین کالج کی ذہین طالبہ ہونے کے ساتھ ساتھ بہت چالاک بھی تھی۔ صبا نے اس سے صرف نوٹس حاصل کرنے کے لیے دوستی کی تھی۔ اکیڈمی کے لڑکوں طلحہ اور راشد نے اسے دوسرا رنگ دے کر اس کا مذاق بنالیا۔ اس مسئلہ پر لڑائی ہوئی اور نوبت مار پیٹ تک آگئی۔

امائمہ اور عمر میں دوستی ہوگئی لیکن دونوں کو احساس ہوگیا تھا کہ ان کے خیالات بہت مختلف تھے۔

کوہو کے ساتھ رہتے ہوئے بھی زندگی کا محور صرف کتابیں اور اسکول تھا۔ ایک دوست کے ہاں پارٹی میں ایک عرصے بعد اس کی ملاقات ہیتا راؤ سے ہوئی۔ وہ اب ٹیا کہلاتی تھی۔ اس کا تعلق ہندوستان کے ایک بہت اعلا تعلیم یافتہ گھرانے سے تھا۔ وہ رقاصہ کے طور پر اپنے آپ کو منوانا چاہتی تھی اس لیے گھر والوں کی مرضی کے خلاف یہاں چلی آئی تھی۔

احمد معروف کی باتوں سے نور محمد عجیب الجھن میں مبتلا ہوجاتا ہے اور اپنے ذہن میں اٹھنے والے سوالوں سے گھبرا کر احمد معروف کو سوتے میں سے جگادیتا ہے۔ نور محمد معروف کے سامنے پھوٹ پھوٹ کر رونے لگتا ہے اور اسے اپنے ماضی کے بارے میں بتانے لگتا ہے۔

اکیڈمی میں ہونے والی لڑائی کے بعد جنید اور طلحہ کے والدین کے ساتھ نور محمد کے والد کو بھی بلوایا گیا تھا۔ طلحہ اور جنید کے والدین اپنے بیٹوں کی غلطی ماننے کے بجائے نور محمد کو قصوروار ٹھہراتے ہیں جبکہ نور محمد کے والد اس کو موردالزام ٹھہرا کر لاتعلقی ظاہر کرتے ہیں۔ اکیڈمی کے چیئرپرسن حمید کاردانی جنید اور طلحہ کے ساتھ نور محمد کو بھی اکیڈمی سے فارغ کر دیتے ہیں۔ نور محمد اکیڈمی سے نکالے جانے سے زیادہ اپنے والد کے رویے سے ٹوٹ جاتا ہے۔ وہ اسٹیشن کی طرف نکل جاتا ہے۔ ٹرین میں سفر کے دوران نور محمد کی ملاقات سلیم نامی جیب کترے سے ہوجاتی ہے۔ سلیم کو پکڑنے کے لیے پولیس چھاپہ مارتی ہے تو سلیم بھاگنے میں کامیاب ہوجاتا ہے' جبکہ نور محمد کو پکڑ کر پولیس تھانے لے آتی ہے اور پھر نور محمد کے والد پولیس کو رشوت دے کر اسے چھڑا کر گھر لے آتے ہیں۔

بھائی پھپھو سے لاہور تک کے پورے راستے میں نور محمد سے اس کے والد کوئی بات نہیں کرتے۔ لیکن گھر آکر وہ اونچی آواز میں چلا کر غصے کا اظہار کرتے ہوئے اس سے کہتے ہیں کہ "وہ آج سے اس کے لیے مرچکے ہیں اور اس سے ان کا کوئی

تعلق نہیں ہے۔" پہلی بار اس کی ماں بھی کہہ اٹھتی ہیں کہ اس سے بہتر تھا کہ وہ مرجاتا۔ نور محمد، احمد معروف کو اپنے بارے میں سب بتا دیتا ہے۔ جسے سن کر احمد معروف کا دل بوجھل ہو جاتا ہے اور اسے نور محمد کو سنبھالنا مشکل لگتا ہے۔

بلی ثیا کو بے حد چاہتا ہے، لیکن وہ انتہائی خود غرض، مطلب پرست اور چالاک لڑکی ہے۔

بلی کے گھر فیملی فرینڈ عوف بن سلمان آتا ہے۔ جس کا تعلق سعودی عرب سے ہے۔ عوف کو فوٹو گرافی کا جنون کی حد تک شوق ہوتا ہے۔ بلی عوف سے ثیا کو ملواتا ہے۔ ثیا، عوف سے مل کر بہت خوش ہوتی ہے۔ عوف اپنے کیمرے سے رقص کرتی ثیا کی بہت سی خوب صورت تصویریں کھینچ لیتا ہے۔ عوف اور ثیا تصویروں کو فرانس میں ہونے والی کسی تصویری مقابلے میں بھیج رہے تھے۔ بلی، ثیا کو ایسا کرنے سے روکنا چاہتا ہے۔ لیکن ثیا اس بات پہ بلی سے ناراض ہو جاتی ہے۔ عوف بتاتا ہے کہ وہ ثیا جیسی بناوٹی، خود پسند لڑکی کو بالکل پسند نہیں کرتا۔

بلی کو پتا چلتا ہے کہ اس کی ماں کو ہو کے عوف سے تعلقات ہیں، زارا کے والدین زارا اور شہروز کی شادی جلد از جلد کرنا چاہتے ہیں، جبکہ شہروز ایک ڈیڑھ سال تک شادی نہیں کرنا چاہتا ہے، کیونکہ اس نے ایک مشہور اخبار کا چینل جوائن کر لیا ہے اور اسے اپنی جاب کے علاوہ کسی چیز کا ہوش نہیں رہا ہے۔ شہروز، زارا سے کہتا ہے کہ جب تک وہ اسے شادی کرنے کے لیے گرین سگنل نہیں دیتا اس وقت تک وہ پھپھو (یعنی اپنی والدہ) کو اس کے ڈیڈی سے شادی کی بات کرنے سے روک کر رکھے۔ زارا کے لیے یہ ساری صورت حال سخت اذیت کا باعث بن رہی ہے۔

امائمہ، نور محمد کی بہن ہے۔ امائمہ کی ماں نے اس کی شادی عمر سے اسی لیے کی تھی کہ وہ لندن جا کر بھائی کو ڈھونڈے۔ وہ عمر کے علم میں لائے بغیر بھائی کو ڈھونڈنے کی کوششیں کرتی ہے، مگر عمر کو پتا چل جاتا ہے۔ امائمہ یہ جان کر حیران رہ جاتی ہے کہ عمر، نور محمد کو جانتا ہے۔ وہ اس کا ساتھ دیتا ہے۔ ثیا رقاصہ بن چکی ہے مگر غلط ہاتھوں میں چلی جاتی ہے اور اپنا بہت نقصان کر کے بلی کو ملتی ہے۔ بلی اس وقت تک ایک کامیاب ناول نگار بن چکا ہے۔ وہ دونوں شادی کر لیتے ہیں۔ ثیا کو بچوں کی خواہش ہوتی ہے۔ کافی علاج کے بعد انہیں خوش خبری ملتی ہے، مگر ثیا کے مس کیرج ہو جاتا ہے۔ ثیا خودکشی کر لیتی ہے۔

بلی کو کچھ لوگ مجبور کرتے ہیں کہ مسلمان دہشت گردوں کے خلاف ناول لکھے۔ وہ لوٹن کی مسجد کے موذن کے خلاف بات کرتے ہیں کہ وہ مسلمان دہشت گرد ہے۔ بلی اس موضوع پر ناول لکھنے کی تیاری کرتا ہے اور اس سلسلے میں نور محمد سے ملتا ہے۔ نور محمد سے احمد معروف کے نام سے ملنے والا شخص بلس گرانٹ ہی ہے، مگر نور محمد سے مل کر اسے محسوس ہوتا ہے کہ اس کے خلاف کی گئیں ساری باتیں غلط ہیں۔ وہ نور محمد سے متاثر ہونے لگتا ہے۔ کیونکہ وہ اسے اپنے سارے حالات بتا چکا ہوتا ہے کہ کس طرح اس کا باپ اس پر پڑھائی کے معاملے میں سختی کرتا تھا۔ کس طرح اکیڈمی سے نکالنے پر وہ دلبرداشتہ ہوا، پاگل ہوا۔ پھر اس کے ماموں اپنے ساتھ لندن لے آئے۔ وہاں انہوں نے اس کی مجبوری سے فائدہ اٹھایا اور اپنی بگڑی ہوئی بیٹی گڑیا سے شادی کر دی، جو پانچ ماہ بعد ہی ماں بن گئی۔ نور محمد نے سب کچھ سمجھنے کے باوجود اس بچی سے محبت کی۔ اسے پالنے لگا۔ مگر جب گڑیا نے بخار کی وجہ سے بچی کو برانڈی پلانے کی کوشش کی اور نور محمد کے منع کرنے کے باوجود باز نہ آئی تو تھپڑ مار دیا۔ جس پر ماموں نے اسے خوب لعن طعن کی اور وہ ان کا گھر چھوڑ کر یہاں آگیا۔ ماموں نے اس کے گھر والوں کو کہہ دیا کہ نور محمد ان کے گھر سے چوری کر کے بھاگ گیا ہے۔ تب سے نور محمد اور امائمہ کی ماں پریشان ہیں اپنے شوہر سے بھی بائیکاٹ کر چکی ہیں۔ زارا کی زندگی میں اتفاق سے ٹیپو نامی لڑکا آتا ہے۔ وہ بہت اچھا ہے۔ زارا اس پر بہت بھروسا کرتی ہے۔ شہروز خوب ترقی کر رہا ہے۔ اس کی ملاقات عوف بن سلمان سے ہوتی ہے۔ وہ شہروز کو اپنے ساتھ کام کرنے کی آفر دیتے ہیں۔ شہروز بہت خوش ہوتا ہے۔

ستر ہویں اور آخری قسط

اس نے یو ایس بی کو لیپ ٹاپ میں لگا کر اپنے ساتھ بیٹھے پاکستانی دوست شہروز منور کی جانب دیکھا۔ وہ اپنی آئس کریم کافی کے بڑے سے کپ کو ہاتھ میں لیے اسٹرا منہ میں دبائے ارد گرد کی چکا چوند میں مگن تھا۔ یہ

اس کا پانی کا پہلا سفر تھا اور یہ سفر تعمور نے ہی اس کے لیے ترتیب دیا تھا۔ وہ ویلز کی بندرگاہ ہولی ہیڈ سے بذریعہ فیری (چھوٹا بحری جہاز) آئرلینڈ جارہے تھے۔ تعمور کو احساس تھا کہ اس نے اپنے مہمان کے سامنے اس کے وطن کی خامیاں گنوانے میں کچھ زیادہ ہی سفاکی کا مظاہرہ کیا تھا' سو وہ اپنے رویے کا ازالہ کرنے کی خاطر اسے ویلز اور ڈبلن کی سیر کروا رہا تھا۔

شہروز منور اس کی مہمان نوازی سے خوش دکھائی دیتا تھا اور فیری کے سفر شروع کرتے ہی وہ اطمینان سے عرشے پر بیٹھ کر پانی پر بننے والے چاند کے عکس کو دیکھنے میں مگن ہو گیا تھا۔ تعمور کو پانی کا سفر کبھی خوش گوار نہیں لگا تھا۔ وہ یہ اعتراف کرنے سے کتراتا تھا کہ اسے پانی کے سفر سے خوف آتا تھا اسی لیے وہ چاہتا تھا کہ ادھر ادھر دیکھے بنا ایک آدھ گھنٹے میں بل گرانٹ کے مواد کا سرسری جائزہ لے لے تو اچھا ہے۔

وہ اس سارے کھیل کا ایک بہت ہی طاقت ور مہرہ تھا۔ عوف بن سلمان کے بعد وہ واحد شخص تھا جو واقعی جانتا تھا کہ نور محمد امریکی تحویل میں ہے۔ عوف بن سلمان کی ڈاکیومینٹری کے لیے اسی نے نور محمد کا پہلا تحریری انٹرویو اور بعد میں فوٹیجز تیار کی تھیں۔ وہ نا صرف اس سے مل چکا تھا بلکہ اس نے اس سے اردو زبان میں کئی باتیں بھی کی تھیں۔ اس وقت نور محمد کو امریکی تحویل میں آئے چند مہینے ہوئے تھے۔ تعمور نصار کو وہ بہت معصوم بلکہ کسی قدر بے وقوف لگا تھا۔ اس کے پاس وہ فوٹیج اور متعلقہ مواد اور اس کے علاوہ بھی کچھ اہم ثبوت ابھی بھی موجود تھے۔ وہ اس سارے پراجیکٹ سے اور اس کے ایک ایک موڑ اور اتار چڑھاؤ سے بخوبی واقف تھا۔ پراجیکٹ "عہد الست" اس کے لیے بھی بہت اہم تھا۔ وہ اپنی اس ڈاکیومنٹری کے متعلق بہت پرامید تھا کہ یہ اس کے کیریر کے لیے

ایک بڑا سنگ میل ثابت ہو گا۔ وہ نا صرف بین الاقوامی ایوارڈ حاصل کرنے کے خواب دیکھ رہا تھا بلکہ یورپ میں اپنے لیے وہ جگہ بھی حاصل کرنے کا خواہاں تھا جو آنے والے وقت میں اسے مزید شہرت' کامیابی اور یوروز دلوانے میں اہم کردار ادا کرنے والی تھی۔

وہ بہت قابل اور کائیاں آدمی تھا۔ اس کی قوت مشاہدہ بھی غضب کی تھی۔ وہ اڑتی چڑیا کے پر تو نہیں گن سکتا تھا' لیکن اس کی رفتار دیکھ کر اس کی منزل کی سمت کا تعین ضرور کر لیتا تھا۔ نور محمد (بل گرانٹ) کا پراجیکٹ اسی لیے اسے بے حد اہم لگ رہا تھا کہ وہ بالواسطہ اور بلاواسطہ اس کا حریف بن چکا تھا۔ اس نے بل گرانٹ کے ساتھ اس کے گھر میں کئی مہینے گزارے تھے۔ وہ اس بات سے بھی واقف تھا کہ وہ ایک اچھا انسان تھا جس کے قول و فعل میں تضاد نہیں تھا' لیکن وہ اپنے پراجیکٹ سے صرف اس بات پر علیحدہ نہیں ہو سکتا تھا کہ بل گرانٹ نے اتنے مہینوں اس سے اتنا اچھا سلوک کیا تھا' اس کے باوجود یہ بھی سچ تھا کہ اسے بل گرانٹ کے مسودے میں بے پناہ دلچسپی تھی' وہ ان کے سامنے تو یہی ظاہر کر کے آیا تھا کہ اسے ان کے ناول سے کوئی دلچسپی نہیں ہے' لیکن وہ اپنی خوش قسمتی پر نازاں تھا کہ اسے ایک دفعہ اپنے حریف کے کام کو بھی جانچنے کا موقع مل رہا تھا۔ اسی لیے وہ اپنی ساری توانائی مجتمع کیے لیپ ٹاپ پر آنکھیں گاڑے بیٹھا تھا۔

یو ایس بی کے لگتے ہی سسٹم نے اپنا کام کرنا شروع کیا تھا۔ چند لمحوں میں اس کے لیپ ٹاپ نے وہ مواد نقل کرنا شروع کر دیا تھا اور پھر اس کے سامنے عہد الست کا پہلا صفحہ کھل گیا تھا۔

☆ ☆ ☆

روشنی کو حکم تھا کہ وہ اس کے پورے وجود کو اپنی بانہوں میں بھر کر اس کا اوڑھنا بچھونا ہو جائے۔ روشنی کی بساط نہ اوقات کہ وہ اس کے حکم سے انکار کرتی سو اس نے فقط پلکیں جھپکی تھیں اور ایک معصوم وجود کو تاریکی سے روشنی میں دھکیل دیا گیا تھا۔

اسے زندگی عطا کر دی گئی تھی۔ وہ آ چکا تھا ایک ایسی دنیا میں جو تخلیق ہی اس کے لیے کی گئی تھی تا کہ وہ اس

طرح جی سکے جس طرح جینے کا حکم ہے۔ اسی لیے وہ مطمئن اور پرسکون تھا۔ اسے زندگی کی نعمت دان کردی گئی تھی۔ اس کے معصوم چہرے کا ایک ایک نقش، اس کے جسم کا ایک ایک عضو اور اس کے خون کی ایک ایک بوند اس نعمت پر شکر گزاری کے جذبے سے سرشار تھی۔ وہ چند لمحے قبل دنیا میں آیا تھا، لیکن اس کی حسیات مکمل تھیں۔ وہ سوچ سکتا تھا اور وہ سوچ رہا تھا۔

"کیا واقعی دنیا، ایک حقیقت ہے؟"

☆ ☆ ☆

اس نے کسمسا کر آنکھیں کھولی تھیں اور پھر بند کرلی تھیں۔ روشنی اسے تکلیف دیتی تھی۔ یہ اسے ماں کی کوکھ سے ماں کی گود تک کا فرق سمجھاتی تھی اور اسے اس فرق سے نفرت تھی۔

"تم کون ہو؟" اس کی سماعتوں نے وہی سوال سنا تھا، جس کی وہ عادی تھیں۔ روشنی جب بھی تاریکی کو چیر کر اس تک پہنچتی تھیں۔ اس کی سماعتیں یہی سوال سنتی تھیں۔

"نمبر دو سو ایک۔" اس نے بکھرتے نچڑتے اعصاب کو سمیٹنے کی کوشش کرتے ہوئے جواب بھی دے دیا تھا۔

"کہاں سے آئے ہو؟" یہ دوسرا سوال تھا اور شاید دو سوویں مرتبہ پوچھا گیا تھا یا دو ہزارویں مرتبہ... اسے یاد نہیں تھا۔ اسے اس سوال کا صرف جواب یاد رہتا تھا۔

"پتا نہیں۔" اس نے جواب دے دیا تھا۔

"کہاں جاؤ گے؟" تیسرا سوال تھا۔

"پتا نہیں؟" اس نے تیسرا جواب بھی ٹھیک دیا تھا۔

"کیا کرتے ہو؟" اس نے تیسرا جواب ٹھیک دیا تھا، اس لیے چوتھا سوال پوچھا گیا۔

"پتا نہیں۔"

"کیا کرنا چاہتے ہو؟" یہ آخری سوال تھا۔

"پتا نہیں۔" اس نے آخری سوال کا جواب بھی درست دیا تھا۔

"بہت خوب، تم بہت ذہین ہو... تم نے سب کچھ سیکھ لیا ہے... اب تم جنت میں جانے کے لیے بالکل تیار ہو... وہاں زندگی قابل رشک ہوگی کیوں کہ وہاں ستر حوریں ہوں گی... ستر ہوں گی یا اسّی ہوں گی... یاد رکھنا تم ایک کے بھی قابل نہیں ہوگے... وہ تمہاری چھپکلی جیسی شکل پر تھوک دیں گی، لیکن کفرانِ نعمت مت کرنا... وہ حوریں ہمیں دے دینا... ہم نے یہاں تمہارا خیال رکھا ہے، تم وہاں ہمارا خیال رکھنا... اوکے باس..."

اس کی تھکی ہوئی بصارت و سماعت نے تضحیک و تحقیر کی آمیزش سے تر جملہ سنا تھا، پھر کھی کھی کرتی ہوئی ہنسنے کی آوازیں آئی تھیں۔ یہی آخری جملہ تھا جو ہمیشہ تبدیل ہو جاتا تھا۔ باقی سب وہی تھا جو ایک عرصے سے وہ سن رہا تھا۔ اس سوال کے ساتھ ہی اس کی گردن بالکل ایک طرف لڑھک گئی تھی۔ اس کے اعصاب کی بچی کھچی ہمت جواب دے گئی تھی۔ اس سے پہلے کہ وہ گر پڑتا۔ اسے ایک پلیٹ تھما کر آگے دھکیل دیا گیا تھا۔

اسے کچھ سمجھ میں آتا تھا، کچھ نہیں آتا تھا۔ اس کے دماغ تک جانے والی رگوں کا راستہ پتا نہیں کیوں اتنا پیچیدہ ہو گیا تھا کہ وہ خون جو طاقت و توانائی کا منبع ہے، ان رگوں میں چکراتا رہتا تھا، مگر منزل تک نہیں پہنچ پاتا تھا، جس کی وجہ سے وہ ہمیشہ غنودگی میں رہتا تھا اور ہوش و حواس میں آتا ہی نہیں تھا۔ ہر وقت نیند کی کیفیت اس پر مسلط رہتی تھی۔ اسے واقعی یاد نہیں تھا، وہ کون تھا، وہ کیا تھا، وہ کہاں تھا اور وہ کیوں تھا۔ اسے ایک لفظ ادا کرنا آتا تھا۔

"نہیں" وہ ہر سوال کا جواب یہی دیا کرتا تھا، کیوں کہ ایک عرصے سے اس پر نت نئے تشدد کر کر کے اسے سکھایا گیا تھا کہ اسے صرف "نہیں" بولنا ہے

اور اب اسے "نہیں" پر اتنی مہارت ہو گئی تھی کہ وہ بولتا ہی "نہیں" تھا۔ اسے "نہیں" بولنے پر معافی ملتی تھی اور کھانا بھی۔ اور وہ اس صورت حال سے بہت مطمئن تھا' ورنہ ابتدا میں جب وہ سن' بول اور سمجھ سکتا تھا' تب اسے "نہیں" بولنا نہیں آتا تھا' تب اسے کھانا اور معافی دونوں پانے کے لیے بہت سخت سزاؤں سے گزرنا پڑتا تھا۔ وہ باتھ روموں میں کتوں کے ساتھ بھی سویا تھا اور کتوں کی غلاظتیں بھی کھائی تھیں۔

اس کے اعصاب نے اتنے بدبودار احساسات سہے تھے کہ اس کی حسیات مفلوج نہ ہوتیں تو خودکشی کر لیتیں۔ سو اب وہ اس "لایعنی کیفیت" میں خوش تھا۔ "نہیں" اس کا اوڑھنا بچھونا تھا۔ یہ "نہیں" اسے پہلی قطار سے دوسری تیسری اور پھر چوتھی قطار تک لے جاتا تھا۔ پہلی قطار میں اچھی کارکردگی پر دوسری قطار کا پاس ملتا تھا۔ دوسری قطار میں پلیٹ اور گلاس ملتا تھا۔ تیسری قطار میں پھیکا شوربہ اور ایک بن ملتا تھا۔ چوتھی قطار سب سے اچھی تھی' وہاں اسے ایک انجکشن دیا جاتا تھا جو اسے اس "نہیں" کی کیفیت سے نکال کر کہیں دور بہت دور لے جاتا تھا۔ وہ اس کی ماں کی گود تھی جہاں وہ سکڑ سمٹ کر لیٹ جاتا تھا' وہاں صرف سکون تھا اور جب وہ اس پرسکون کیفیت سے نکلتا تھا تو اسے صرف اپنا نام یاد رہتا تھا۔۔۔۔ نمبر دو سو ایک۔۔۔۔ یہاں اس کا یہی نام تھا۔

☆ ☆ ☆

آسمان کی سیاہی پانی کو پوری طرح اپنے رنگ میں رنگے ہوئے تھی' لیکن دور سے نظر آتی تاریکی کو چیرتی ہوئی روشنیاں' پانی پر اپنا عکس دیکھنے کے قابل ہوتیں تو خود ہی اپنی بلائیں لیتے نہ تھکتیں۔ شہروز بھی ان کی چھپاتی شرارتوں سے مبہوت ہوا جا رہا تھا۔ وہ کب سے عرشے پر کھڑا دور سے نظر آتی ان روشنیوں کو دیکھنے میں مگن تھا۔ آئرلینڈ کی بندرگاہ نظر آنا شروع ہو گئی تھی۔ شہروز کا یہ فیری (چھوٹا بحری جہاز) کا پہلا سفر تھا۔ وہ تیمور نصار کے ساتھ آئرلینڈ جا رہا تھا۔ پہلے وہ اسی کے ساتھ برمنگھم آیا تھا' پھر بذریعہ سڑک مختلف شاہراہوں سے ہو کر ویلز بنگور سے ہوتے ہوئے وہ ہولی ہیڈ (ویلز کی بندرگاہ) پہنچے تھے اور پھر بذریعہ فیری اب وہ ڈبلن جانے کا ارادہ رکھتے تھے۔ یہ ایک تفریحی ٹور تھا جو تیمور نصار نے اس کی خاطر ترتیب دیا تھا۔

لندن میں عمر سے چپقلش کے بعد بظاہر کوئی فرق نہیں پڑا تھا' لیکن دلوں میں بال سا آ گیا تھا۔ اس کی واپسی میں بھی چند دن ہی باقی رہ گئے تھے' سو اب وہ اپنی پیشہ ورانہ مصروفیات کا بہانہ کر کے آرام سے اپنے کام نپٹانے میں مگن تھا۔

تیمور فیری میں سوار ہوتے ہی اپنا لیپ ٹاپ آن کر کے بیٹھ گیا تھا اور اب وہ اسی میں مکمل طور پر غرق تھا۔ شہروز بھی اسی لیے اس سکون کو محسوس کرنے میں مگن ہو گیا تھا' جو ارد گرد پھیلا ہوا تھا۔ یہاں پوری دنیا آباد نظر آتی تھی۔ ایسا نہیں لگ رہا تھا کہ وہ پانی پر سفر کر رہا ہے بلکہ یہ ایک شاپنگ مال میں گھومنے پھرنے کے برابر تھا جہاں نا صرف ایک لائبریری تھی' بچوں کے لیے پلے ایریا تھا۔ فوڈ کورٹ بھی تھا جہاں تقریباً" دس مشہور فوڈ چینز کے اسٹال تھے۔ غرض یہ کہ احساس ہی نہ ہو رہا تھا کہ یہ ایک چھوٹا موٹا بحری سفر ہے۔ ان دونوں نے اپنے لیے کافی لی تھی اور اب اطمینان سے منزل پر پہنچنے کا انتظار تھا۔ آدھا گھنٹے میں وہ ڈبلن کی بندرگاہ پر پہنچ گئے تھے۔ تیمور ابھی بھی لیپ ٹاپ میں منہ دیے کام میں مصروف تھا۔۔۔ ڈبلن کی پورٹ پر پہنچ کر سب لوگ قطار بنا کر باہر نکلنے لگے تھے جب تیمور نے اپنا لیپ ٹاپ بند کیا۔ شہروز بھی اس کو اٹھتا دیکھ کر ہی اٹھا تھا۔ فیری سے باہر نکل کر وہ چند قدم ہی چلے تھے کہ "پاسپورٹ کنٹرول" نام والی تختی نے ان دونوں کو ہی ٹھٹک کر رکنے کے لیے مجبور کیا۔

"پاسپورٹ۔۔۔۔؟" شہروز نے حیرانی سے تیمور کا چہرہ دیکھا۔ وہ اپنے ساتھ پاسپورٹ نہیں لایا تھا۔ اس کے اس طرح کے تمام ضروری کاغذات چاچو کے گھر میں ہی تھے' کیوں کہ پاکستان کے لیے اس کی فلائٹ

بہتھرو سے ہی تھی۔ وہ انہیں ہمہ وقت اپنے ساتھ نہیں رکھتا تھا۔ اس نے پاکستان سے آتے ہی اس بارے میں عمر سے پوچھا تھا تو عمر نے کہا تھا' یہ لندن ہے سعودی عرب نہیں ہے کہ ہر وقت اپنی شناختی دستاویز ساتھ لے کر پھرنا پڑے اور اب یہاں امیگریشن حکام کا ہونا اسے کنفیوز کر رہا تھا۔ تعمور اس کے عقب میں ہی تھا۔

''کیا یہاں پاسپورٹ کی ضرورت پڑتی ہے؟'' اس نے پوچھا تھا۔ وہ کندھے اچکا کر آگے دیکھنے لگا۔

''پاسپورٹ پلیز'' ایک آفیسر نے ان کے کنفیوزڈ چہرے دیکھ کر خود بھی سپاٹ چہرہ بنالیا تھا۔ شہروز ایک بار پھر مڑ کر تعمور کی جانب دیکھنے لگا۔

''ایکسکیوزمی۔۔۔۔ کیا یہاں پاسپورٹ کی ضرورت پڑتی ہے؟'' تعمور نے وہی سوال آفیسر سے پوچھا جو شہروز نے اس سے پوچھا تھا۔

''آف کورس۔۔۔۔ آئرلینڈ ایک آزاد ملک ہے۔۔۔۔ برطانیہ نے اس پر اپنا تسلط جما رکھا ہے تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ ہم آنے والوں سے پاسپورٹ بھی طلب نہیں کرسکتے۔''

اسی آفیسر کے ساتھ کھڑی ایک لیڈی آفیسر نے اس سوال کا جواب دیا تھا۔ وہ سخت نگاہوں سے شہروز کو دیکھ رہی تھی۔ تعمور' شہروز کے بالکل ساتھ ہو کر آفیسر ڈیکس کے سامنے آگیا۔

''معاف کیجیے گا۔۔۔۔ ہمیں کسی نے ہولی ہیڈ سے روانہ ہوتے وقت اس بارے میں نہیں بتایا تھا ورنہ ہم پاسپورٹ ساتھ لے آتے۔۔۔۔ میں تعمور ہوں۔ میرا تعلق ترکی سے ہے۔ یہ میرے پاکستانی دوست ہیں۔۔۔۔ ڈبلن دیکھنے کے لیے میرے ساتھ آئے ہیں۔ آپ اجازت دیں تو ہم دو گھنٹے میں شہر دیکھ کر واپس آجاتے ہیں۔۔۔۔ اگر آپ کو اس میں کوئی قباحت محسوس ہوتی ہے تو ہم یہیں سے واپسی کا ٹکٹ لے کر واپس چلے جاتے ہیں۔'' وہ بے حد مہذب اور شستہ لہجے میں ان سے مخاطب تھا۔ انہوں نے ایک دوسرے کو دیکھا اور آنکھوں ہی آنکھوں ایک دوسرے کو کچھ اشارہ کیا۔

''کیا آپ کے پاس آپ کی شناخت کے لیے کوئی دستاویز ہے؟'' لیڈی آفیسر نے تعمور کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔ وہ کچھ زیادہ ہی کھوئی ہوئی کیفیت میں تھا۔ اس نے لمحہ بھر سوچا پھر نفی میں سر ہلایا پھر یک دم جیسے اسے کچھ یاد آگیا تھا۔

''میرے پاس لندن کی پبلک لائبریری کا کارڈ ہے۔۔۔۔ آپ وہ دیکھ سکتے ہیں۔۔۔۔ میں کئی سالوں سے یہاں ہوں۔۔۔۔ ڈبلن پہلی بار آنے کا اتفاق ہوا ہے۔''

''کیا ہم اسے اپنے پاس رکھ سکتے ہیں۔'' لیڈی آفیسر نے کہا تھا۔ تعمور نے سر ہلایا۔ شہروز نے پہلے ہی سوچ لیا تھا۔ اس کے والٹ میں اس کا پاکستانی شناختی کارڈ موجود تھا اور اس کے علاوہ اس کے پاس اس چینل کا کارڈ بھی تھا جس کے لیے وہ کام کرتا تھا۔ وہ بہت آرام سے اپنے یہ کارڈز ان کو دکھا سکتا تھا۔ تعمور کے سر ہلانے پر لیڈی آفیسر نے اس کی اینٹری کردی تھی۔ وہ آرام سے آگے بڑھا تو شہروز نے اس کی جگہ لے لی تھی۔

''آپ پاکستانی ہیں۔'' وہ پوچھ رہی تھی۔ اس نے کارڈ کی جانب دیکھا بھی نہیں تھا۔ شہروز نے سر ہلایا۔ تعمور اسے باہر انتظار کرنے کا اشارہ کرکے آگے بڑھ گیا تھا۔

''آپ ایک طرف آجایے۔'' اسی آفیسر نے شہروز کو کہا۔ اسے بڑی حیرانی ہوئی' لیکن وہ اس کے اشارہ کی گئی سمت میں ہو گیا تھا۔ اگلا مسافر اس کی جگہ پر آگیا۔ وہ اسی آفیسر کی رہنمائی میں ڈیسک کے اندر کی جانب ہوا تھا۔

''اپنا بیگ یہاں رکھ دو'' اس لیڈی آفیسر کا لہجہ کیبن میں جاتے ہی بہت کرخت ہو گیا تھا۔ شہروز کو کافی برا محسوس ہوا۔ اس نے کچھ کہے بنا اپنا بیگ میز پر رکھ دیا تھا۔ یہ ایک چھوٹا سا سفری بیگ تھا۔ اس میں لیپ ٹاپ کے علاوہ ایک چھوٹا تولیا اور اسی طرح کی چند ضروری چیزوں کے علاوہ کچھ نہ تھا۔ وہ آفیسر اس کے بیگ کو تنقیدی نگاہوں سے گھورتے ہوئے اس پر اسکینر پھیرنے لگی تھی' پھر اس نے شہروز کو دیکھا۔

”اسے کھولو۔“ یہ دوسرا حکم تھا۔

”میرے پاس میرا شناختی کارڈ ہے۔“ شہروز نے وضاحت کی۔ لیڈی آفیسر نے اسے گھور کر دیکھا۔

”میں نے کہا بیگ کھولو۔“

”اس میں کچھ بھی نہیں ہے۔۔۔۔ صرف ایک لیپ ٹاپ۔۔۔۔“ وہ اتنا ہی بولا تھا کہ اس کی بات کاٹ دی گئی۔

”اسے کھولو۔“ اس آفیسر کا لہجہ مزید کرخت ہوا۔ شہروز کے بدن میں آگ سی لگ گئی تھی۔ اس آفیسر کو بولنے کی بھی تمیز نہیں تھی۔

اس نے سپاٹ چہرے کے ساتھ اسے گھورتے ہوئے بیگ کھول دیا تھا۔

وہ تنقیدی نگاہوں سے بیگ کو الٹ پلٹ کر دیکھتی رہی پھر اس نے اندرونی چھوٹی جیبوں میں ہاتھ ڈال کر چیک کرنا شروع کیا تھا۔

”تم مجھے چور سمجھ رہی ہو؟“ وہ چڑ کر پوچھ رہا تھا لیڈی آفیسر نے نگاہیں اٹھا کر اسے دیکھا پھر اس سے بھی زیادہ چڑ کر بولی۔

”نہیں۔۔۔۔ دہشت گرد۔“ شہروز کا دماغ بھٹس کی آواز کے ساتھ پھٹا تھا۔

”کیا۔۔۔۔ کیا کہا تم نے۔۔۔۔ میں تمہیں دہشت گرد نظر آرہا ہوں۔۔۔۔ کیا میرے سینے پر بارودی جیکٹ بندھی دیکھی ہے تم نے؟“ اس کی آنکھوں میں جیسے خون اتر آیا تھا۔ یہ اس کی توہین تھی۔ اس نے خود دیکھا تھا، وہاں پاسپورٹ کنٹرول والے ڈیکس پر ہر شخص کو معمولی کارروائی کے بعد جانے دیا جا رہا تھا تو پھر اس کو کیوں روک لیا گیا تھا۔

”تم خاموش رہو اور مجھے اپنا کام کرنے دو۔۔۔۔ میں نے ابھی تمہاری جیکٹ چیک نہیں کی، لیکن کوئی بعید نہیں کہ تمہاری شرٹ کے نیچے ایسا کچھ ہو۔۔۔۔ آخر تم مسلمان ہو۔۔۔۔ اور پھر پاکستانی بھی ہو۔“

وہ خباثت سے طنزیہ انداز میں اسے دیکھتے ہوئے مسکرائی بھی تھی۔ شہروز کا دل چاہا اس کا گلا دبا دے۔

”کیا بکواس ہے یہ۔۔۔۔ میں ایک معزز شہری ہوں۔۔۔۔ میرا کوئی پولیس ریکارڈ ملا ہے کیا جو تم مجھے دہشت گرد قرار دے رہی ہو۔“

”میں دوسری بار کہہ رہی ہوں۔۔۔۔ مجھے اپنا کام کرنے دو اور خاموش رہو۔“ وہ شہروز کے غصیلے انداز پر غرا کر بولی۔ شہروز کے نتھنے غصہ برداشت کرنے کے چکر میں پھولنے لگے تھے۔ لیڈی آفیسر اس کی جانب دیکھے بنا اب بیگ کو ٹٹولنے میں مصروف تھی۔ لیپ ٹاپ والے بیگ سے اس نے کچھ کاغذ برآمد کیے تھے۔ یہ اخبارات کے کچھ تراشے تھے، وہ انہیں کھول کر دیکھنے لگی تھی۔ شہروز نے یہ تراشے کچھ پرانے اخبارات سے لیے تھے۔ ان میں ای ڈی ایل (یو ای ایل یعنی لوٹن کے رہنے والے تعصب پسند سفید فام لوگوں کی یہ تنظیم کالعدم ہو گئی تھی تو پھر اس کی جگہ ایک تنظیم ای ڈی ایل بنائی گئی تھی) کے متعلق ایک آرٹیکل تھا۔ لوٹن کے رہنے والے ایک سعودی مسلمان نے سویڈن میں خودکش حملہ کیا تھا جس کی تصویر اور اس کے متعلق مواد بھی ان تراشوں میں شامل تھا۔ شہروز یک دم کچھ محتاط ہوا تھا۔ اس نے یہ تراشے کسی غلط مقصد کے لیے نہیں سنبھالے تھے۔ وہ انہیں صرف فراغت کے اوقات میں پڑھنا چاہتا تھا۔

”یہ آرٹیکلز ہیں۔۔۔۔ میں ایک ڈاکیومنٹری پر کام کر رہا ہوں۔۔۔۔ جو کہ۔۔۔۔“ اس نے وضاحت دینے کی کوشش کی تھی، لیکن اس آفیسر نے اس کی بات درشت انداز میں کاٹ دی تھی۔

”اپنی شرٹ اتارو۔“

”کیا آ آ آ۔۔۔۔ تمہارا دماغ چل گیا ہے کیا آفیسر۔۔۔۔ میں نے آخر کیا کیا ہے۔۔۔۔ میرے بیگ سے بم نکل آیا ہے کیا۔۔۔۔ یہ عام سے اخباری تراشے ہیں۔۔۔۔ میں ان سے کوئی دھماکا نہیں کرنے والا تھا؟“ وہ انتہائی برا مان کر بولا تھا۔ پاکستان ہوتا تو وہ ہر چیز کو لات رسید کر کے اب تک باہر نکل چکا ہوتا، لیکن یہ آئرلینڈ تھا۔

”تم اگر خود شرٹ اتار سکو تو اچھا ہے، ورنہ میں اپنے ساتھی کو بلوا لیتی ہوں۔۔۔۔ یہ ضابطے کی کارروائی ہے۔۔۔۔ تم اگر تعاون کرو تو اچھا ہے۔“ لیڈی آفیسر اب کی بار ذرا نرم لہجے میں بولی تھی۔ وہ بار بار ان اخباری

کٹنگز کو الٹ پلٹ کر دیکھ رہی تھی۔

"یہ اگر واقعی ضابطے کی کارروائی ہے تو پھر سب کے ساتھ ایسا ہی ہونا چاہیے تھا.... صرف میرے ساتھ کیوں.... مجھے وضاحت کا موقع تو دو۔" اس کے نرم لہجے سے شہروز کو مزید شہہ ملی تھی۔ وہ چلا کر بولا تھا۔

"پاسکر.... اندر آؤ.... مجھے تمہاری ضرورت ہے۔" اس لیڈی آفیسر نے باہر کی جانب منہ کر کے اونچی آواز میں کہا تھا۔ ایک لمحے میں ہی اس کا اونچا لمبا ساتھی اندر آ گیا۔

"کیا مسئلہ ہے؟"

"یہ شخص تلاشی لینے نہیں دے رہا۔" اس نے کندھے اچکا کر کہا اور وہ کٹنگز بھی اس کے چہرے کے آگے لہرائی تھیں۔ پاسکر نامی آفیسر نے اسے گھور کر دیکھا۔

"میں آپ کو مشورہ دوں گا کہ ہمارے ساتھ تعاون کریں.... ہم صرف اپنا فرض ادا کر رہے ہیں.... آپ تلاشی لینے دیں۔"

"میں تعاون کر رہا ہوں.... آپ تلاشی لے لیجیے.... لیکن میرے صرف ایک سوال کا جواب دیں.... کیا آپ لوگ سب ہی آنے والوں کی شرٹس اتروا کر تلاشی لیتے ہیں.... اگر آپ کا جواب ہاں ہے تو مجھے کوئی اعتراض نہیں.... آپ بخوشی اپنا کام کیجیے، لیکن اگر سب کے ساتھ یہ سلوک نہیں کیا جاتا تو میرے ساتھ یہ امتیازی سلوک کیوں؟" وہ سابقہ انداز میں بولا تھا۔

"تم مسلمان ہو۔"

"وہ شخص جو میرے ساتھ آیا ہے وہ بھی مسلمان ہے.... اس کو تو ہاتھ بھی نہیں لگایا تم نے۔" شہروز نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالی تھیں۔

"تم مسلمان ہو اور پاکستانی بھی.... دہشت گردی کے عالمی کھلاڑی.... میں تمہیں یہ بات پہلے ہی بتا چکی ہوں۔" وہ آفیسر کندھے اچکا کر بولی تھی۔

"سب مسلمان دہشت گرد نہیں ہیں.... یہ بات تم جتنی جلدی ذہن نشین کر لو.... تمہارے لیے اتنا اچھا ہے۔" وہ اسے کھا جانے والی نظروں سے دیکھتے ہوئے بولا تھا۔

"ہو سکتا ہے تم ٹھیک کہہ رہے ہو.... لیکن تم پاکستانی بھی ہو۔" وہ اسی انداز میں بولی تھی۔ شہروز کے تلووں سے لگی اور سر پر بجھی۔

"پاکستانی دہشت گرد نہیں ہیں۔" وہ غرا کر بولا تھا۔

"میں اس بحث میں نہیں پڑنا چاہتی.... تم میرا بہت وقت ضائع کر چکے ہو.... اب مجھے اپنی ڈیوٹی کرنے دو.... میں تمہیں جانے دیتی اگر تمہارے بیگ سے یہ تراشے نہ ملتے۔" وہ ٹس سے مس بھی نہیں ہوتی تھی۔ شہروز غصے سے کھولتا ہوا ان کی جانب دیکھتا رہا۔

"شرٹ اتار دو مسٹر!" پاسکر بولا تھا۔

شہروز نے خاموشی سے اپنی شرٹ اتار دی تھی۔ ان دونوں آفیسر نے چیک کیا کہ اس نے کوئی جیکٹ تو نہیں پہن رکھی۔ اسی لیڈی آفیسر نے اس کے پاؤں تک ہاتھ لگا کر چیک کیا تھا۔

"کیا تم لوگ اب یہ چاہتے ہو کہ میں اپنی پینٹ بھی اتار دوں۔" وہ نظروں ہی نظروں میں انہیں گھورتے ہوئے بولا تھا۔ وہ دونوں ہی قہقہہ لگا کر ہنسے۔

"اوہ.... اب اتنے بھی ہیرو مت بنو....." پاسکر بولا تھا۔ اس کے بعد وہ آنکھوں ہی آنکھوں میں ایک دوسرے سے کچھ اشاروں کی زبان میں باتیں کرتے رہے۔ لیڈی آفیسر نے آئرش میں اپنے ساتھی سے کچھ بات بھی کی جس سے شہروز فقط اندازہ ہی لگا سکا کہ وہ عورت اسے اینٹری دینے کے خلاف تھی، جبکہ پاسکر نامی آفیسر تراشوں کو معمولی قرار دیتے ہوئے شہروز کو جانے کی اجازت دینے کی حمایت کر رہا تھا۔

"تم اپنی شرٹ پہن سکتے ہو۔" اسے اجازت دے دی گئی تھی۔ لیڈی آفیسر نے وہ تراشے اپنے پاس ہی رکھ لیے تھے۔

"شکریہ.... بہت مہربانی۔" شہروز کا انداز ابھی بھی ویسا ہی تھا۔

"اب تمہیں یقین ہو گیا ہو گا کہ میں دہشت گرد نہیں ہوں۔" وہ با آواز بلند بڑبڑا رہا تھا۔

"مجھے یہ یقین تب تک نہیں ہو سکتا جب تک کہ

تم ڈبلن سے واپس نہیں آجاتے... تم مسلمان ہو اور پاکستانی ہو... تمہارے بارے میں مشکوک رہنے کے بہت سے جواز ہیں میرے پاس۔" وہ لیڈی آفیسر بے حد بدتمیز اور مغرور تھی۔

"بھاڑ میں جاؤ تم دونوں۔" وہ خود کو کہنے سے روک نہیں پایا تھا۔ اس نے شرٹ کے بٹن لگائے تھے اور بیگ اٹھا کر باہر نکل آیا تھا۔ باہر موجود آفیسر نے اسے سر سے پیر تک دیکھا اور شہوز کا پارہ یہ دیکھ کر مزید ہائی ہو گیا کہ قطار میں جو لوگ موجود تھے وہ بھی اسے گھورنے میں مگن تھے۔ شاید اس کی بلند آوازیں باہر تک آرہی تھیں۔ وہ انتہائی بُرا چہرہ بناتا ہوا باہر کی سمت آیا تھا۔ ذرا سا ہٹ کر ویٹنگ ایریا میں تعمور اس کے انتظار میں بیٹھا تھا۔

"مجھے واپس جانا ہے۔" وہ دو ٹوک انداز میں بولا تھا۔

"کیا ہوا... کوئی مسئلہ ہو گیا کیا... سب ٹھیک ہے نا؟" وہ اس کا سرخ چہرہ دیکھ کر بولا۔

"سب ٹھیک ہے... ضرورت سے زیادہ ٹھیک... اب واپس چلیں... تم چاہو تو بعد میں آجانا۔" شہوز نے اتنا کہا اور پھر اس کی جانب دیکھے بنا واپسی کے لیے قدم بڑھائے تھے۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ اڑ کر اس سرزمین سے دور چلا جائے جہاں اس کی اتنی توہین کی گئی تھی۔ ان دونوں آفیسرز کو گالیاں دینے کی خواہش اس کے دل میں اتنی زور سے اٹھ رہی تھی کہ اسے برداشت کرتے ہوئے وہ مزید تپ رہا تھا۔ یہ پردیس تھا جہاں اس کے ساتھ ایسا سلوک کیا گیا تھا جو اگر اس کے ساتھ اس کے دیس میں کوئی کرتا تو اس سے مار ہی کھا لیتا۔

کیا وہ واپسی کے سفر پر چل پڑا تھا؟

☼ ☼ ☼

"آپ پاکستان آئیں گے؟" سلمان نے حیرانی سے سوال کیا تھا۔ نور محمد (بل گرانٹ) نے سر ہلایا پھر ان کی آواز سنائی دی۔

"بہت خوشی اور طمانیت کے ساتھ۔" وہ واقعی پرسکون لگتے تھے۔ سلمان کو بھی اچھا لگا۔ یہ ان کے ساتھ اس کی پہلی اسکائپ کال تھی۔ وہ کچھ عرصے سے اس کے ساتھ مسلسل رابطے میں تھے 'بالخصوص تب سے جب سے انہوں نے دوبارہ سے "عہد الست" پر کام شروع کیا تھا۔ وہ بہت سے نکات اس کے ساتھ زیر بحث لاتے رہے تھے۔ سلمان بھی اپنی کارکردگی کے متعلق ہر بات رپورٹ کرتا رہتا تھا۔ آج اسکائپ پر ویڈیو کال پہلی مرتبہ ہو رہی تھی۔ سلمان نے دیکھا ان کی سرمئی اور سنہری بالوں والی داڑھی پہلے سے کچھ گھنی ہو چکی تھی اور چہرہ پہلے سے زیادہ پرنور ہو چکا تھا۔ اسے ان پر رشک آیا۔ وہ اللہ کے چنیدہ بندوں میں سے تھے۔

"ہمیں آپ کو خوش آمدید کہتے ہوئے بہت اچھا لگے گا... پاکستان کو آپ سے ملاقات کا بے چینی سے انتظار رہے گا۔" وہ اپنی خوشی چھپائے بنا بولا تھا۔

"اور مجھے اس دن کا بے چینی سے انتظار ہے جس روز نور محمد اپنی سرزمین پر قدم رکھیں گے... اپنے گھر والوں سے ملیں گے... میں اس روز ذہنی طور پر بالکل ہلکا پھلکا ہو جاؤں گا۔"

"ان شاء اللہ۔" سلمان نے کہا لیکن اس کا انداز کسی قدر پژمردہ ہو چلا تھا۔

"میں چاہتا ہوں آپ میرے آنے پر ایک پریس کانفرنس کی تیاری کریں۔" نور محمد کے چہرے پر سوچ کی پرچھائیاں بکھری تھیں۔

"پریس کانفرنس۔ وہ کس لیے سر!"

"میں جانتا ہوں عہد الست کی اشاعت کے بعد نور محمد کے متعلق بہت سے مزید سوالات اٹھیں گے۔ مزید ابہام پیدا ہو جائے گا۔ میں اس ابہام کو دور کرنا چاہتا ہوں کیونکہ ابہام جتنا کم ہو گا ہماری بات میں اتنا ہی وزن پیدا ہو گا۔ اس سے نور محمد کی جلد رہائی میں مدد ملے گی۔" ان کی دلیل میں وزن تھا مگر سلمان نے اس تجویز کو رد کر دیا تھا۔

"سر! میڈیا کے ساتھ آپ کی براہ راست ملاقات

کوئی اچھی تجویز نہیں ہے۔ آپ ان کے سوالوں کے جواب نہیں دے پائیں گے۔ میں آپ کے علم و ہنر یا تجربے پر شک نہیں کر رہا لیکن حقیقت یہ ہے کہ کچھ چیزیں آپ کو الجھا دیں گی۔ آپ کو اندازہ نہیں ہے کہ میں نے گزشتہ سالوں میں جب بھی کسی سے عہد الست یا نور محمد کے متعلق بات کی ہے۔ لوگوں نے اسے مثبت طریقے سے نہیں لیا ہے۔ زیادہ تر لوگ باقاعدہ ثبوت مانگتے ہیں، ورنہ وہ ہماری بات کو جھوٹ کا پلندہ قرار دیتے ہیں۔ آپ مجھے اور میجر صاحب کو میڈیا سے نبٹنے دیں۔" سلمان کا اپنا ایک موقف تھا۔

"میں نے گزشتہ سالوں میں دنیا سے چھپ کر دیکھ لیا ہے۔ اس کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔ آپ نہیں چھپ سکتے۔ آپ کو سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ورنہ آپ بددیانتی کے مرتکب ہوتے ہیں۔ میں نے نور محمد سے عقیدت تو رکھی، لیکن ان سے بددیانتی بھی کی۔ ان کے بارے میں اتنا عرصہ خاموش رہنا عقل مندی نہیں تھی۔ میں نے یہ سوچنے میں بہت وقت گزارا کہ میری بات جھوٹ قرار دی جائے گی یا لوگ مجھے مورد الزام ٹھہرائیں گے۔ مجھے یہ نہیں کرنا چاہیے تھا۔ اور اب مجھے احساس ہو رہا ہے کہ کہیں نہ کہیں ہم دین اسلام کے ساتھ بھی یہی رویہ رکھ رہے ہیں۔ خود کو مسلمان بھی کہتے ہیں، اس کی پیروی بھی کرتے ہیں، لیکن دنیا کے سامنے اس کا دفاع بھی نہیں کرتے۔ ڈر جاتے ہیں، میں کیوں اس بات سے خوف زدہ ہوں کہ میں اگر اسلام کے متعلق ٹھوک بجا کر بات کروں گا تو لوگ مجھے دہشت گرد سمجھیں گے۔ لوگوں کو جو سوچنا ہے۔ وہ سوچیں گے۔ کل انسانیت کو راہ راست پر لانا میرا کام نہیں ہے۔ یہ اللہ کا کام ہے۔ میں یا آپ اللہ کے کاموں کو اپنے ہاتھ میں نہیں لے سکتے۔ ہم صرف کوشش کر سکتے ہیں۔ نڈر بے خوف کوشش۔ بس اب مجھے کوشش کرنے دیں، مجھے اس خوف سے نکلنے دیں۔ میں نور محمد کی رہائی کے لیے ہر ممکن کوشش کرنا چاہتا ہوں۔" وہ چپ ہوئے یہ دیکھنے کو کہ سلمان ان کی بات سن بھی رہا ہے، کہیں رابطہ کٹ تو نہیں گیا۔

"ہم۔" سلمان نے ہنکارا بھرا تھا۔

"آپ نور محمد کی رہائی والی بات پر اس قدر مایوس کیوں لگتے ہیں؟" نور محمد نے اس کے انداز کو بغور دیکھا تھا۔ سلمان نے چند ساعتیں کچھ سوچنے میں گزاریں۔

"مایوس تو نہیں ہوں سر!" اس کے منہ سے ان کے سوال کے جواب میں پہلا جملہ یہی نکلا تھا۔ اس کا انداز اس کے بیان کی نفی کر رہا تھا۔

"سر! مجھے آپ کے ایک ایک لفظ سے اتفاق ہے۔ آپ جو کہہ رہے ہیں وہی سچ ہے۔ برحق ہے۔ لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ ہماری ہر کوشش کے باوجود ابھی بھی کچھ چیزیں ہیں جو الجھی ہوئی ہیں۔ ہمارے پاس جو چیزیں دستاویز کی شکل میں ہیں۔ عوف بن سلمان صاحب کے پاس بھی وہ سب چیزیں موجود ہیں۔ ان کی ڈاکومنٹری زیادہ مستند سمجھی جائے گی، کیونکہ ان کا نیٹ ورک بہت بڑا ہے۔ ان کی رسائی بہت دور تک ہے۔ آپ جانتے ہیں۔ ان کی ایک بڑے بین الاقوامی چینل کے ساتھ کاروباری وابستگی بھی ہے۔ وہ سچے بے شک نہ ہوں لیکن کامیاب ضرور ہو چکے ہیں۔ ہم کئی سالوں کی کوشش کے بعد بھی جو کچھ اکٹھا کر پائے ہیں وہ سب چند مہینوں میں انہوں نے بھی اکٹھا کر لیا ہے۔ ان کے پاس بہت سے لوگوں کے تحریری بیان ہیں۔ میرے بہت سے ساتھی ان کی معاونت کر رہے ہیں۔ میں نہیں جانتا کہ سچے ہونے کے باوجود ہم تعداد اور طاقت میں ان کا مقابلہ کر پائیں گے یا نہیں۔ یہ چیز بعض اوقات مجھے پریشان کر دیتی ہے۔ میں نے آفاق صاحب کو بہت امید دلا دی ہے، لیکن اگر میں ان کے بیٹے کے لیے کچھ نہیں کر پایا تو ان سے زیادہ مجھے دکھ ہو گا۔"

اس نے انہیں اپنی الجھن سے آگاہ کر دیا تھا۔ نور محمد کے چہرے پر مسکراہٹ بکھری "میں نے نبی آخر الزماں کی زندگی سے یہ بھی سیکھا ہے کہ جنگیں تعداد اور طاقت سے نہیں حکمت عملی سے جیتی جاتی ہیں۔ مایوس مت ہوں۔ اگر آپ مایوس ہو کر میدان میں

اتریں گے تو یقیناً آپ ہار جائیں گے۔ آپ بھی میری طرح دعا کریں کہ اللہ ہمیں مزید اچھے لوگوں کا ساتھ بخشے۔ میرے پیارے نبی نے بھی جب اللہ سے دعا کی تھی تو انہیں حضرت عمر جیسے انسان کی معاونت عطا کی گئی تھی جن کی اسلام دشمنی کسی سے ڈھکی چھپی نہیں تھی۔ بھروسا رکھیے۔ اللہ ہم سے بہتر حکمت والا ہے۔

ان کے سمجھانے کا انداز اس قدر مسحور کن تھا کہ سلمان کو اپنی ساری مایوسی چھٹتی ہوئی محسوس ہوئی۔

☆ ☆ ☆

وہ واپسی کا سفر تھا۔

ڈبلن کی روشنیاں ماند پڑ رہی تھیں۔ وہ دونوں اسی جگہ پر بیٹھے تھے جس جگہ پر وہ ڈبلن جاتے ہوئے بیٹھے تھے۔ پانی کی ہلکی سی باس دیتی خوشبو، فضا میں بکھری چہل پہل اور پانی پر بنتا دھندلی ہوتی ہوئی روشنیوں کا عکس۔ دوسرے مسافروں کے قہقہے، آوازیں، سرگوشیاں کچھ بھی تو نہیں بدلا تھا۔ اس کے باوجود کچھ ایسا۔ تھا کہ وہ دونوں ہی گم صم سے تھے۔

تعمور نے شہروز کا الجھا ہوا انداز دیکھ کر اسے دوبارہ مخاطب نہیں کیا تھا، یا شاید وہ خود ہی کرنا نہیں چاہتا تھا۔ شہروز کے ساتھ بھی یہی معاملہ تھا۔ وہ چاہ کر بھی کچھ بول نہیں پارہا تھا لیکن پھر اس نے **تعمور** کو ان دونوں آفیسر کے رویے کے متعلق سب کچھ بتادیا تھا۔ وہ با آواز بلند بڑبڑانا چاہتا تھا۔ اسے فی الوقت کسی اچھے سامع کی ضرورت تھی۔ وہ اپنے تاثرات چاہ کر بھی چھپا نہیں پارہا تھا۔ وہ ان کے رویے پر کافی برہم تھا۔

اس کے ساتھ جو بھی ہوا تھا اچھا نہیں ہوا تھا۔ یہ ننانوے پر پہنچ کر سانپ کے ڈس جانے اور پھر دوبارہ سے زیرو پر پہنچ جانے کے مترادف تھا۔ بظاہر تو کچھ نہیں ہوا تھا۔ آندھی آئی تھی نہ طوفان۔ کوئی آکر اس سے اس کا اسٹارڈم چھین کر تو لے نہیں گیا تھا، لیکن دو آفیسرز نے اسے اس کی اوقات یاد دلادی تھی۔ اس کے تن کا برانڈڈ لباس اور اس کا لہجہ بدل کر بولتا ہوا بدیسی برٹش لہجہ بھی اس کے کام نہ آیا تھا۔

"مجھے یہ یقین تب تک نہیں ہوسکتا جب تک کہ تم ڈبلن سے واپس نہیں آجاتے، تم مسلمان ہو اور پاکستانی ہو۔ تمہارے بارے میں مشکوک رہنے کے بہت سے جواز ہیں میرے پاس۔"

اس لیڈی آفیسر کا لہجہ ابھی بھی اس کے کانوں میں گونج رہا تھا۔ اس نے گہری سانس لیتے ہوئے سر جھٹک کر اس سارے واقعہ کو بھول جانا چاہا تھا۔ اس واقعے کو بھول جانا ہی بہتر تھا۔

"تم اتنا ناراض مت ہو۔ پاکستان اور پاکستانیوں کے متعلق یہ ایک عمومی رویہ بن چکا ہے۔ مغربی اقوام تم لوگوں کو قابل عزت نہیں سمجھتیں۔" **تعمور** نے افسوس کرنے والے انداز میں کہا تھا۔ شہروز نے اسے گھور کر دیکھا۔

"تو پھر بھاڑ میں جائیں مغربی اقوام۔ میں سیاست دان نہیں ہوں۔ میں ان کی فنڈنگ پر پلنے والی کسی این جی او کا مالک بھی نہیں ہوں۔ مجھے کھانے کو نہیں دیتے یہ لوگ۔ لعنت بھیجتا ہوں میں ان سب پر۔" وہ غرا کر بولا تھا۔ اس کے انداز پر **تعمور** ذرا سا مسکرایا تھا۔

"اب اتنا برہم بھی مت ہو۔ جن کے گھر میں بیٹھے ہو۔ ان کے بارے میں ایسے بات مت کرو۔" وہ شاید اس کے گرم مزاج کو معتدل کرنے کے لیے شگفتہ سے انداز میں بول رہا تھا۔

"یہ میری زندگی کی سب سے بڑی غلطی ہے کہ میں ان کے گھر بیٹھا ہوں۔ ان لوگوں کو تو اتنی تمیز بھی نہیں ہے کہ کسی دوسرے ملک سے آنے والا ان کے بارے میں کیا سوچ گا۔ کبھی ہمارے یہاں آکر دیکھیں ہم غیر ملکیوں کو کتنی عزت دیتے ہیں۔ سر آنکھوں پر بٹھاتے ہیں۔ کسی کی اتنی توہین نہیں کرتے۔" وہ چڑ کر بولا تھا۔

"تم لوگوں کی مجبوری ہے۔ تم لوگ امداد بہت لیتے ہو ان سے اس لیے۔" شہروز نے اب کی بار اس کی بات کاٹنے کے لیے الفاظ استعمال نہیں کیے تھے۔ اس

نے صرف ہاتھ کا اشارہ کر کے اسے چپ ہو جانے کے لیے کہا تھا۔

"مسٹر تعمور۔ میں درخواست نہیں کر رہا۔ میں صرف بتا رہا ہوں کہ اس وقت مجھ سے یہ سب باتیں مت کرو۔ میری کھوپڑی بالکل گھومی ہوئی ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ میں تم سے الجھوں۔ امداد کہاں سے آتی ہے کہاں جاتی ہے۔ کس طرح استعمال ہوتی ہے' کس کے مفاد کے لیے استعمال ہوتی ہے۔ یہ تم بھی جانتے ہو۔ ان کی امداد ان ہی کی ملٹی نیشنل کمپنیوں کے مفاد میں کھپ جاتی ہے۔ اس لیے مجھے ان کے احسانات مت گنواؤ۔" وہ کھا جانے والے انداز میں بولا تھا۔

تعمور کے چہرے کی مسکراہٹ گہری ہوئی۔

"تمہیں ایک بات بتاؤں۔ تم پاکستانیوں کی ایک بات مجھے بڑی پسند ہے۔ تم لوگ اپنی عورتوں' اپنے وطن اور اپنے مذہب کے لیے بڑی جلدی جذباتی ہوتے ہو۔ مرنے مارنے پر تل جاتے ہو۔" وہ ابھی بھی اسے چڑا رہا تھا۔

شہوز اس کی بات پر خاموش کا خاموش رہ گیا۔ وہ وطن کے لیے جذباتی کب ہوا تھا۔ وہ تو وطن کے لیے جذباتی ہونے کو بے وقوفی قرار دیتا تھا اور مذہب کے بارے میں تو اس نے سوچا ہی نہیں تھا ایک عرصے سے۔

وہ تو اسلام کا ایک نیا ورژن تلاش کر رہا تھا کہ پاکستان میں اسے نافذ کر کے دنیا کے سامنے خود کو آزاد خیال اور اعتدال پسند ثابت کر سکے۔ ایک دم سے پچھتاوے کی عجیب سی لہر اس کے اندر اٹھی تھی۔ اسے یاد آیا تھا کہ عمر نے اسے کچھ سمجھانے کی کوشش کی تھی اور وہ اسے جذباتیت کا مارا ہوا قرار دے کر اس سے منہ موڑ آیا تھا' وہ تو خود کو اتنا بڑا مدبر سمجھتا تھا کہ اسے لگتا تھا وہی پاکستان کی بھلائی کے متعلق سوچ سکتا ہے۔ اس کے لیے پاکستان کی بھلائی صرف اس میں تھی کہ وہ بنیاد پرستی سے نکل آتا اور اس مقصد کے لیے وہ کچھ بھی کرنے کو تیار تھا۔

اس کے ساتھ واقعی بہت برا ہوا تھا۔ دو لوگوں کے رویے نے اسے بہت کچھ سوچنے پر مجبور کر دیا تھا۔

وہ جو اپنے آپ کو معزز سمجھ کر دوسروں کو دہشت گرد قرار دینے کے تکلیف دہ کھیل کا حصہ بننے چلا تھا' اسے خود کو ہی دہشت گرد قرار دے دیا گیا تھا۔ وہ خود کو بہت قابل سمجھتا تھا۔ اس نے اس مقام تک پہنچنے کے لیے سخت محنت کی تھی۔ اسے لگتا تھا اس نے جو بھی حاصل کر لیا' اس میں اس کی قابلیت اور دانائی کا ہی ہاتھ ہے۔ اسے یقین تھا کہ وہ اپنے لفظوں سے اپنے انداز سے لوگوں کے دلوں پر راج کرتا ہے۔ وہ جو بولتا ہے۔ لوگ سنتے ہیں۔ وہ جو کہتا ہے لوگ اسے سچ مانتے ہیں۔ وہ اسے اپنی طاقت سمجھتا تھا۔ وہ خود پسندی کے اس مقام پر پہنچ چکا تھا جہاں اپنے علاوہ بھی اگر کوئی نظر آ جائے تو وہ آئینہ ہوتا ہے جہاں انسان صرف اپنا عکس دیکھ دیکھ کر خوش ہوتا رہتا ہے۔ وہ خود ہی اپنے لیے تالیاں بجاتا ہے' وہ خود ہی اپنے آپ کو سراہتا رہتا ہے۔ اسے اپنے آگے کوئی اہم نہیں لگتا اور پھر وہ ایسے کام کرنے کے لیے بھی تیار ہو جاتا ہے جو غلط ہوتے ہوئے بھی خود پسندی کی عینک کے عقب سے غلط نہیں لگتے۔ اسے کوئی اتنی حقارت سے دہشت گرد کیسے کہہ سکتا تھا۔ کوئی اس کی اتنی توہین کیسے کر سکتا تھا۔

اس کے اندر یکدم ایک خیال بجلی کی طرح کوندا تھا۔

"کیا مجھے حق ہے کہ میں کسی کو بنا تحقیق کے دہشت گرد کہہ دوں جبکہ میں خود اس بات کا سخت برا مانتا ہوں کہ کوئی میرے لیے یہ لفظ استعمال کرے۔"

اس نے خود سے یہ سوال کیا تھا۔ اس کے پاس اس سوال کا کوئی جواب نہیں تھا۔ وہ خود احتسابی کے مرحلے سے گزر رہا تھا اور ایسے مرحلے بہت تکلیف دہ ہوتے ہیں۔

وہ شہوز منور تھا۔ جس نے گزشتہ کچھ سالوں میں اپنے سر کے بال سے لے کر اپنے پاؤں کی انگلی تک پر بے حد محنت کی تھی۔

وہ برانڈڈ کپڑے پہنتا تھا۔ وہ دبئی سے شاپنگ کرتا

تھا۔ چائنیز کھانے کھاتا تھا۔ امریکن اسٹائلسٹ سے گرومنگ کے لیے رابطے میں رہتا تھا۔ جاپانی انسٹرکٹر کے جم میں جاتا تھا۔ یہ سب اس کے لیے زندگی گزارنے کے جدید طریقے تھے۔ یہ سب کر کے وہ سمجھتا تھا کہ سب کو یہی کرنا چاہیے۔ پاکستان کو اصلاحات کی ضرورت تھی اور یہ اصلاحات لباس، ناچ گانے، کھانے پینے، انگریزی زبان اور ظاہری حلیے تک محدود تھیں۔ باقی سب کام سیاست دانوں کا تھا، بیورو کریٹس کا تھا، فوجیوں کا تھا۔ باقی لوگ صرف بھیڑوں کی طرح آنکھیں بند کر کے اندھی پیروی کے لیے پیدا کیے گئے تھے۔ اس لیے یہ ان جیسے میڈیا پرسنز کا دانشوروں کا اور مدبر پڑھے لکھے نام نہاد ترقی پسندوں کا کام تھا کہ وہ عوام کی رہنمائی کر کے انہیں سکھائیں کہ وہ چودہ سو سال پرانی باتیں کر کے اپنا نقصان کر رہے ہیں۔ وہ پاکستان اور پاکستانیوں کو اتاترک، ماؤزے تنگ، مارٹن لوتھر کنگ کے بارے میں بتاتے ہوئے فخر محسوس کرتا تھا۔ لیکن حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ یا حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی مثال دیتے ہوئے اسے ڈر لگتا تھا کہ کوئی اسے بھی بنیاد پرست نہ کہہ دے۔ اس نے کبھی یہ نہیں سوچا تھا کہ زندگی گزارنے کا ترقی پسندانہ طریقہ کہیں اس کا احساسِ کمتری تو نہیں۔ وہ اپنی شناخت سے اس قدر خائف کیوں تھا کہ وہ زندگی کے کسی معاملے میں مسلمان نہیں لگنا چاہتا تھا، پاکستانی نہیں لگنا چاہتا تھا۔

وہ اگر مسلمان ہونے سے پاکستانی ہونے سے اتنا خائف تھا پھر اسے کوئی حق نہیں تھا کہ وہ پاکستان کے کسی دوسرے بیٹے کے معاملے میں اناپ شناپ بولتا۔ اس کی داڑھی کو نشانہ بناتا یا اس کی نمازوں پر تنقید کرتا۔

"تم اب کیا سوچ رہے ہو؟" تعمور نے اسے اس قدر گم دیکھ کر سوال کیا تھا۔

شہوز نے چونک کر اس کا چہرہ دیکھا۔ اس نے دوسری بار سر جھکا۔ اس کے پاس اس سوال کا جواب ہی نہیں تھا۔ وہ واقعی بڑے کڑے احتسابی مرحلے سے گزر رہا تھا۔ یا شاید اسے اس کڑے احتسابی مرحلے سے گزارا جا رہا تھا۔ کس کی دعائیں رنگ لا رہی تھیں؟

"میں تمہیں بتاؤں تم کیا سوچ رہے ہو؟" تعمور نے اسے خاموش دیکھ کر کہا تھا۔ شہوز اب بھی کچھ نہیں بولا تھا۔

"تم نور محمد کے بارے میں سوچ رہے ہو نا۔؟" شہوز نے اب کی بار مزید چونک کر اس کا چہرہ دیکھا۔

اس کا دل چاہا پوچھے کون سا نور محمد۔ برٹش یا پاکستانی۔ لیکن وہ چپ رہا تھا۔ اسے طنز کرنا آتا تھا لیکن ابھی اس کا دل نہیں چاہ رہا تھا کہ وہ کچھ بھی بولے۔

"نہیں تو۔ میں صرف اپنے بارے میں سوچ رہا ہوں۔" اس نے فقط اتنا ہی کہا تھا۔

"اچھا۔ پھر شاید میں نور محمد کے بارے میں سوچ رہا ہوں۔" شہوز اس کے جملے پر حیران ہوا تھا۔ اس نے اسے بغور دیکھا آیا کہیں اس نے پی تو نہیں رکھی۔ وہ اتنا کھویا کھویا کیوں لگتا تھا۔

"میں جونیئر نور محمد سے کبھی نہیں ملا۔ لیکن مسٹر ٹیڈ نیل نے جب مجھے اس کے بارے میں بتایا تو اس شخص کے لیے لفظ "جادوگر" استعمال کیا تھا۔ مسٹر ٹیڈ نیل ہماری ڈاکیومنٹری کے کانٹینٹ ہیڈ ہیں۔ انہوں نے کہا تھا کہ نور محمد لوگوں پر جادو کر کے انہیں اندھا کر دیتا ہے، پھر وہ انہیں اپنے رنگ میں رنگ لیتا ہے۔ انہوں نے کہا کہ بل گرانٹ جیسا ذہین اور شاطر ادیب بھی اس کے جادو سے نہیں بچ سکا۔ میں نے ان کی بات کو ہنسی میں اڑا دیا تھا۔ لیکن جب میں بل گرانٹ (نور محمد) سے ملا تو مجھے اس بات کا احساس ہوا کہ جونیئر نور محمد ہی نہیں سینیئر نور محمد بھی جادوگر ہیں۔ یہ لوگ کچھ نہ کچھ تو ایسا ضرور کرتے ہیں کہ جو ان سے ملتا ہے ان کا ہو جاتا ہے۔ تمہیں پتا ہے نبی آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں بھی ان کے دشمن یہی کہا کرتے تھے کہ وہ جادوگر ہیں۔ ان کا جادو پتا ہے کیا تھا۔ ان کی محبت۔ ان کا اخلاق۔ ان کا ایثار۔ جیسی محبت اپنوں سے کرتے تھے ویسی محبت پرائے سے

بھی۔ جیسی سوچ دوست کے لیے رکھتے تھے۔ ویسی سوچ دشمن کے لیے بھی۔ جو عورت انہیں کچرا پھینک کر آلودہ کردیتی تھی' اس کا گھر صاف کر آیا کرتے تھے۔ جو لوگ پتھر مار کر لہولہان کرتے تھے ان کے لیے بھی دعا کردیا کرتے تھے۔ بتاؤ جو ایسے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے رستے پر چلے گا وہ ایسے اخلاق والا ہی ہوگا نا۔ اسے دلوں میں گھر کرنے کا گر آتا ہوگا کہ نہیں۔ میں نے نور محمد کو ایسا ایثار پسند پایا۔ مجھے اپنے پورے ناول کا مسودہ بنا سوچے سمجھے پکڑا دیا۔ یہ جانتے بوجھتے کہ میں انہیں نیچا دکھانے کا سارا سامان کیے بیٹھا ہوں۔ تم یقین نہیں کرو گے کہ میں ان کے گھر سے آتے ہوئے کتنی سخت زبان استعمال کرکے آیا ہوں کہ شاید وہ مجھ سے بھی سخت برتاؤ کریں لیکن ایسا نہیں ہوا۔ وہ خاموش رہے' لیکن مجھے برا بھلا نہیں کہا۔" وہ اب مسکرایا تھا۔ شہروز نے اس کے چہرے پر یہ مسکراہٹ پہلے نہیں دیکھی تھی۔

"جو اللہ اور اس کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے رستے پر چلتا ہے نا۔ اس کے اوصاف بدل جاتے ہیں' خصوصیات بدل جاتی ہیں۔ یہی وہ کیمیائی تبدیلی ہے جو مٹی کو سونے میں بدل دیتی ہے۔ مٹی کو خبر ہوتی ہے نہ سونے کو پتا چلتا ہے' لیکن دیکھنے والی آنکھ دیکھ رہی ہوتی ہے اور ایسا کچھ ہوجاتا ہے کہ اوصاف بدل جاتے ہیں۔" وہ عجیب فلسفیانہ انداز اپنا کر بول رہا تھا۔ شہروز نے زیادہ پسندیدگی سے نہیں دیکھا تھا اسے۔

"مجھے نہیں پتا وہ پہلے کیسا لکھتے رہے ہیں' لیکن میں نے عہد الست کا کچھ حصہ پڑھ کر دیکھا ہے۔ میں سمجھتا تھا۔ چار لائنیں گھسیٹ کر ہمیں بھی انتہا پسند بنانے کا مواد اکٹھا کر رکھا ہوگا۔ لیکن اب جب چند صفحات پڑھ کر فارغ ہوا ہوں تو سوچ رہا ہوں۔" وہ چپ سا ہوگیا تھا۔ شہروز نے اس کی جانب دیکھا۔

"کیا سوچ رہے ہو؟" اس نے اس کی جانب رخ کیا اور آواز کو دھیما کرتے ہوئے بولا۔

"نور محمد واقعی جادوگر ہیں۔ انہوں نے مجھ پر جادو سا کردیا ہے۔ میں بدل رہا ہوں میرے پاکستانی دوست۔

وہ کس قدر پراسرار لگتا تھا۔

"تم کیا بول رہے ہو۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا" شہروز نے اس کی پراسراریت کے اثر کو زائل کرنے کے لیے اس کی جانب دیکھنا بند کردیا تھا۔

"اس میں کچھ ایسی چیزیں ہیں جنہوں نے مجھے بہت کچھ سوچنے پر مجبور کردیا ہے۔ وہ اپنے ناول میں لکھتے ہیں کہ جب ہم کسی حرام فعل کو سرانجام دیتے ہیں تو کائنات میں بگاڑ پیدا ہوتا ہے۔ اس بگاڑ کو روکنے کے لیے قدرت اپنا ایک مخصوص خود کار بحالی نظام متحرک کرتی ہے' تاکہ اس توڑپھوڑ کو روکا جاسکے۔ یعنی قدرت ہم سب کو راہ راست پر آنے کا موقع ضرور فراہم کرتی ہے اور اس کے ذرائع کچھ بھی ہوسکتے ہیں۔ اور میرا ذریعہ بنی یہ چھوٹی سی فلیش ڈرائیو۔" اس نے بات مکمل کرکے اپنی گردن کے گرد لٹکے کیمرہ کے پاؤچ سے ایک ڈرائیو برآمد کی تھی اور اسے انگوٹھے اور انگلی میں پھنسا کر شہروز کے چہرے کے سامنے کردیا تھا۔

"یہ کیا ہے؟" شہروز الجھ کر پوچھ رہا تھا۔

"یہ ایک عام سی یو ایس بی ہے۔ لیکن تم اسے تلاوت کی وہ آواز سمجھ لو جو اسلام کے ایک دشمن کے کانوں تک پہنچی تھی اور پھر ان کے بھی اوصاف بدل گئے تھے' آج کی مسلم دنیا اس دشمن کو اللہ کے پیارے رسول کے دست راست کے طور پر جانتی اور پہچانتی ہے اور ان کا نام اتنے سال گزرنے کے بعد بھی زندہ و جاوید ہے۔ وہ عمر بن خطاب تھے لیکن ہم انہیں عمر فاروق کہنا ہی پسند کرتے ہیں۔ تاریخ میں مٹی کو سونے میں بدل دینے کی اس سے بڑی مثال نہیں مل سکتی۔"

تعمور نصار کی پراسراریت عروج پر تھی۔ شہروز نے ایک بار پھر اس کے چہرے کی طرف دیکھنے سے احتراز برتا تھا۔ اسے یقین ہوچلا تھا کہ وہ اپنے ہوش میں نہیں ہے۔

"اسے تم رکھ لو۔" اس نے وہ یو ایس بی شہروز کا ہاتھ پکڑ کر اس کی ہتھیلی پر رکھ دی تھی۔

"نہیں اب اس کی ضرورت نہیں رہی؟" شہروز اپنے لہجے کا طنز چھپا نہیں پایا تھا۔ اس میں اس کا قصور

نہیں تھا۔ وہ جس قسم کی جاب کرتا تھا، اس میں طنزیہ گفتگو کرنا ایک ہنر مانا جاتا تھا۔ **تعمور** اس کے انداز اور الفاظ پر مسکرایا۔

"نہیں۔ کیونکہ مجھے یاد آگیا ہے کہ میں تو خود بھی تلاوت کر سکتا ہوں۔ الحمدللہ۔"

☆ ☆ ☆

"بل گرانٹ اپنے ارادے سے باز نہیں آیا۔ وہ پاکستان جارہا ہے۔" مسٹر ٹیرن نے ناک چڑھا کر کہا تھا۔

"اس کے اندر کا انقلابی انسان ابھی تک زندہ ہے۔ حالانکہ اسے قسمت نے اتنے تھپڑ مارے ہیں۔ لیکن جس نے سبق نہیں سیکھنا، نہیں سیکھنا۔" مسٹر ٹیڈ نیل نے اپنا سگار منہ میں رکھتے ہوئے لاپروائی سے کہا تھا۔ وہ دونوں لندن کے ایک لگژری اپارٹمنٹ کی کافی ٹیبل کے گرد بیٹھے تھے۔ یہ اپارٹمنٹ مسٹر ٹیرن کا تھا۔

"کچھ لوگ واقعی کتے کی دم کی طرح ہوتے ہیں لیکن بل گرانٹ تو تیندوے کی دم ثابت ہوا۔ لمبی اور بے کار۔" مسٹر ٹیرن کا انداز ابھی بھی ویسا ہی تھا۔

"آپ فکر کیوں کرتے ہیں۔ اسے اس کے حال پر چھوڑ دیں۔ جب چیزوں کو بدلا نہ جاسکے پھر انہیں چھوڑ دینا چاہیے۔" مسٹر ٹیڈ نیل کو زیادہ فکر نہیں تھی۔ وہ وقتاً فوقتاً کھڑکی سے باہر جھانکنے لگتے تھے۔

"وہ اپنے ناول کو پبلک کررہا ہے مسٹر ٹیڈ نیل۔ بیک وقت دو زبانوں میں۔ اردو اور انگلش۔ اس میں لوٹن کے متعلق بھی اناپ شناپ لکھے گا اور پھر اسلام کی محبت میں تقریریں بھی ہوں گی۔ مجھے اس بات کا سخت رنج ہے۔" مسٹر ٹیڈ نیل نے کافی کا مگ میز پر رکھ دیا۔ اس میں موجود کافی ویسے بھی ٹھنڈی ہوچکی تھی اور فی الوقت ان کے جذبات بھی۔

"آپ رنج مت کریں۔ اسے کرنے دیں جو کررہا ہے۔"

"مسٹر ٹیڈ نیل۔ تم حد کرتے ہو۔ میری سالوں کی محنت ہے۔ سب اس شخص نے برباد کردی۔ لوٹن کے ریڈیکلز، میرے بچے کو میری نظروں کے سامنے ورغلا کر لے گئے، میرا نو عمر بیٹا جہادی بن گیا، لیکن سیاستدان کچھ کرسکے لوٹن کے لیے، نہ تم جیسے لوگ۔ ہم پاؤنڈز اور محنت دونوں خرچ کر کر کے تھک گئے۔ اور پھر محنت کتنی لگی ہے میری۔ ایک نیم پاگل ریڈیکل کو تشدد کرواکر میٹروپولیٹن پولیس سے گرفتار کروانا، پھر اس کا غلط ریکارڈ بنوانا پھر اسے مردہ ڈیکلئر کروانا۔ کسی اور کی لاش کو اس کی لاش میں بدل کر دنیا کے سامنے پیش کرنا۔ اس کا فیونرل کروانا۔ یہ سب آسان نہیں تھا میرے لیے۔ لیکن مجھے اس کا کوئی افسوس نہیں ہے، میں اپنے ملک کو ریڈیکلائزڈ ہوتے نہیں دیکھ سکتا۔ یہ بات تم بھی لکھ لو کہ اسلامائزیشن کا وائرس ایسے ہی اس ملک کے لوگوں کو لاحق ہوتا رہا تو ایک دن یہاں کے سب لوگ داڑھیاں رکھ کر سر پر ٹوپی پہنے نظر آئیں گے۔ میری بات یاد رکھنا۔" وہ چڑ کر بولا تھا۔

"ایسا کچھ نہیں ہوگا۔ اوور ری ایکٹ مت کرو۔ تم کچھ زیادہ ہی سوچ رہے ہو۔ اس بات کو کچھ زیادہ ہی حواسوں پر سوار کررہے ہو۔ ایک شخص کے اسلام قبول کرلینے سے کوئی خاص فرق نہیں پڑتا۔" مسٹر ٹیڈ نیل نے انہیں تسلی دینے کی کوشش کی تھی۔

"میں زیادہ سوچ رہا ہوں۔ میں۔؟۔ تمہیں اندازہ ہے کہ اگر وہ ناول پبلک ہوگیا اور یہ ثابت ہوگیا کہ میں اس ساری پلاننگ میں شامل تھا تو میری ساکھ کس قدر متاثر ہوگی۔ میں لوٹن میں ایک ہیومن ایکٹیویسٹ کے طور پر جانا جاتا ہوں۔ میں کیسے نہ سوچوں۔ مجھے ہی سوچنا ہے۔ تم لوگ تو ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے ہو ہم لوگوں سے امیگریشن کی کوئی پالیسی مرتب نہ ہوسکی اب تک۔ مسلمز جوق در جوق ہر سال یہاں آرہے ہیں، یہاں کے بینیفٹ کے مزے لے رہے ہیں اور یہاں رہنے والوں کو اندھی ریڈیکلائزیشن کا نشانہ بنارہے ہیں۔ ہماری نسلیں ان کے رنگ میں رنگتی جارہی ہیں۔ تم کہہ رہے ہو ایک شخص سے فرق نہیں پڑتا۔ تمہیں نہیں پتا بل گرانٹ جیسا ایک شخص دس لوگوں کو اپنی طرف راغب کرلیتا ہے اور وہ دس لوگ مزید سو

لوگوں کو نگل جاتے ہیں۔ تم لوگوں سے اور کچھ نہیں ہوتا تو ایک کام کرو اس ملک کا نام بدل کر مکہ یا مدینہ رکھ لو۔" وہ بہت غصے میں تھے۔

"اچھا اچھا، تم ہائپر مت ہو۔ ہم نے اپنی پوری نیک نیتی سے ایک کوشش کی تھی۔ بل گرانٹ ہی دغا دے گیا تو اب اس میں ہمارا کیا قصور ہے۔" مسٹر ٹیڈنیل کو اپنے جذبات کو اعتدال میں رکھنا آتا تھا۔

"بل گرانٹ کو ہوا کیا۔ مجھے تو یہ سمجھ میں نہیں آتا۔ اچھا بھلا انسان تھا۔ وہ بھی ریڈیکل ہو گیا۔" وہ مزید بولے تھے۔

"اچھا بھلا۔؟" مسٹر ٹیرن نے طنزیہ انداز میں ہنکارا بھرا۔

"اب دیکھنا اسے تم۔ میری بازو کے جتنی داڑھی ہے۔ نام بھی نور محمد رکھ لیا ہے۔ ڈھیلی سی شرٹ اور سادہ سے ٹراوزر میں لوٹن کی گلیوں میں چلتا پھرتا نظر آتا ہے۔ بہرحال میں اس کے متعلق بات کر کے مزید وقت ضائع نہیں کرنا چاہتا۔ مجھے صرف اس بات سے غرض ہے کہ اس نے اپنا ناول مکمل کر لیا ہے اور وہ اسے پبلک کرنے والا ہے۔" وہ تنگ کر بولے تھے۔

"میں نے کہا نا تم ہائپر مت ہو میں آج ہی عوف بن سلمان کو فون کرتا ہوں۔ اسے گرین سگنل دیتا ہوں کہ ناول سے پہلے ڈاکومنٹری آن ایر کر دے۔" انہوں نے تسلی دی تھی۔

"اس سے کیا ہو گا؟" مسٹر ٹیرن نے مزید ناک پھلائی تھی۔

"ڈاکومنٹری ہو یا ناول۔ جو چیز پبلک کے سامنے پہلے آئے گی۔ وہ ہی سچی قرار پائے گی۔ باقی سب جھوٹ کا پلندہ سمجھی جائے گی۔"

"ڈاکومنٹری کا سارا کام مکمل ہے؟" مسٹر ٹیرن کو اب کی بار دلچسپی محسوس ہوئی تھی۔

"تقریباً۔ عوف بن سلمان نے اپنا ایک بہت ہی ہوشیار ترکش بندہ اس کام پر لگایا ہوا ہے۔ تعمور نصار سے مل چکا ہوں میں بڑا ہوشیار اور محنتی آدمی ہے۔ مجھے یقین ہے بہت اچھے نتائج حاصل ہوں گے۔"

وہ مزید تسلی دیتے ہوئے تفصیلات بتانے لگا۔ مسٹر ٹیرن کی آنکھیں چمکنے لگی تھیں۔

☆ ☆ ☆

وہ عمر رسیدہ تھکی ہوئی ٹیمز کا کنارا تھا۔

کسی لاچار ضعیفہ کی طرح زمانے بھر سے نالاں، وہ اپنے آپ میں گم لاپروا بہتی چلی جاتی تھی۔ ٹیمز کی جولانی اور عروج کا وقت گزر چکا تھا۔ اس کا حسن ماند پڑ چکا تھا اور اس کا سحر مدہم ہو گیا تھا۔ لندن کے پاس دنیا کو مرعوب کرنے کے لیے اب ٹیمز سے بھی زیادہ دلکش چیزیں موجود تھیں۔ اس لیے شہروز کو اس کے بہتے پانی میں ایک وقار جھلکتا محسوس ہوتا تھا لیکن کشش نہیں۔ پاکستانی سیاحوں کی ٹیمز کا حسن بکھیرتی داستانیں ماضی بعید کا قصہ معلوم پڑتی تھیں۔

ٹیمز کی طرح اس کے جذبات بھی تھکے ہوئے لاچار اور افسردہ سے تھے۔

وہ کل رات کی فلائٹ سے واپس جا رہا تھا۔ لندن آنے کے بعد وہ پہلے بھی دوبار یہاں آیا تھا۔ اس کنارے کے گرد بیٹھ کر دور سے نظر آنے والی روشنیوں کو اس نے پہلے بھی دیکھا تھا لیکن آج کچھ الگ بات تھی۔ آج عمر کے ساتھ اس کی آخری رات تھی۔ وہ ایک رات پہلے اپنے سات روزہ ٹور سے واپس آیا تھا اور تب سے ہی وہ عمر کو کچھ پریشان لگتا تھا، لیکن اس نے پوچھا نہیں تھا۔ حالانکہ وہ سب کے ساتھ ہنس بول رہا تھا۔ ان سب کے لیے چھوٹے موٹے تحائف بھی لایا تھا لیکن اس نے اپنے ٹور کی کوئی بھی قابل ذکر بات نہیں کی تھی۔ اس نے ان سب کو اپنی تصویریں بھی نہیں دکھائی تھیں۔ وہ ٹورازم کا دلدادہ تھا اور اسے ہر نئی جگہ کی تصویریں لینے کا شوق تھا وہ اپنے فیس بک پیج پر ہر روز دسیوں پکچر اپ لوڈ کرتا، لیکن عمر نے ڈبلن کی کوئی بھی تصویر نہیں دیکھی تھی۔ اسی لیے عمر کو اس کے رویے سے کچھ غیر معمولی رنگ جھلکتے محسوس ہوتے تھے۔ ان دونوں کے درمیان

اگرچہ تعلقات اب نارمل ہو چکے تھے۔ لیکن ہر اس موضوع سے وہ دونوں کترا رہے تھے جو گھوم پھر کر نور محمد کی طرف چلا جاتا۔ وہ دونوں ہی اب اپنے اپنے راستوں پر اکیلے چلنے کو ترجیح دینا چاہتے تھے۔ عمر جان بوجھ کر اس سے کسی ایسے موضوع پر بات ہی نہیں کرتا تھا جو ان کے درمیان کسی مزید اختلاف کا باعث بنتے، لیکن وہ محسوس کر رہا تھا کہ شہروز کچھ اداس ہے، مگر براہ راست پوچھنے پر بھی دل مائل نہیں تھا۔

"ہماری اگلی ملاقات اب ان شاء اللہ پاکستان میں ہوگی۔" اسے لگا شاید وہ ان سب کے لیے اداس ہے۔ اس لیے اس نے کب سے پھیلی خاموشی کو جیسے درمیان سے برخاست کرنا چاہا تھا۔

"کب تک پلان کرو گے تم لوگ۔؟" شہروز نے بھی اسی کے انداز میں بات برائے بات کی تھی۔

"تم جب بھی اپنی شادی کی بریانی کھانے کے لیے ہمیں بلاؤ گے ہم فوراً ہی آجائیں گے بس" وہ اس نادیدہ تناؤ کو کم کرنا چاہتا تھا۔

"اس کا مطلب بہت جلد ارادہ ہے پاکستان آنے کا۔" شہروز اس کی جانب مڑا تھا۔ اس نے اپنی طرف سے یہ باور کروایا تھا کہ وہ جلد شادی کا ارادہ رکھتا ہے۔

"ہاں ارادہ تو ایسا ہی ہے۔ بس تمہاری طرف دیکھ رہے ہیں۔ تم کچھ فائنل کرو تو چھٹی کے لیے اپلائی کریں۔ لیکن ذرا دھیان رہے کہ میرا بیٹا دنیا میں آچکا ہو۔ اسے بھی تایا کی شادی کے جشن میں شریک ہونے کا موقع ملنا چاہیے۔" عمر مسکراتے ہوئے بولا تھا۔ امائمہ کی ڈیوڈیٹ کچھ ہفتوں میں متوقع تھی۔

"تایا۔؟" شہروز نے آنکھیں پھیلائیں۔ "جانے دو یار۔ تایا تو تم ہو گے۔ میں تو چاچو بنوں گا۔ دو سال چھوٹا ہوں تم سے۔"

"عمروں سے فرق نہیں پڑتا۔ تم زیادہ ذہین ہو۔ زیادہ تجربہ کار ہو۔ زیادہ پڑھے لکھے ہو۔ اور زیادہ امیر بھی۔ اور میں زیادہ ہینڈسم ہوں بس۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ میرا درجہ زیادہ ہو گیا۔ وہ تمہارا ہی ہو گا۔ اس لیے میں نے فیصلہ کیا ہے کہ میرا بیٹا تمہیں تایا کہے گا۔" وہ اپنی دھن میں مگن بول رہا تھا۔ شہروز کچھ نہیں بولا۔ عمر اس کے چہرے کی جانب دیکھ رہا تھا۔ اور اسے یقین ہونے لگا تھا کہ وہ واقعی پریشان ہے۔

"تم کچھ پریشان ہو؟" عمر نے یک دم اس سے سوال کیا تھا۔ وہ اس سے زیادہ صبر نہیں کر سکتا تھا۔ شہروز نے چونک کر اس کا چہرہ دیکھا لیکن بولا کچھ نہیں تھا۔

"چپ کیوں ہو۔ بولو نا۔" اس نے اسے بولنے کے لیے مجبور کیا تھا۔

"وہ میرا بھی بیٹا ہو گا۔ تایا کہے چاچا کہے کیا فرق پڑتا ہے۔" وہ مصنوعی انداز میں مسکرا کر بولا۔ عمر نے پوچھا کچھ تھا، وہ جواب کچھ اور دے رہا تھا۔

"شہروز۔ کیا بات ہے۔ تم کچھ پریشان لگتے ہو" عمر کو اپنے سامنے کھڑے اس شخص سے بھائیوں والی الفت تھی۔ یہ ممکن نہیں تھا کہ وہ پریشان ہوتا اور شہروز کو اندازہ نہ ہوتا اور اندازہ ہو جاتا تھا اور پھر وہ استفسار نہ کرتا۔ شہروز کے لیے بھی یہ بہت مشکل تھا، کہ اس کے دل میں کچھ کشمکش یا بے چینی ہوتی اور وہ عمر سے اس متعلق بات نہ کرتا۔

"آئرش کافی تعصب پسند ہیں۔" شہروز نے اس کی جانب دیکھے بنا کہا تھا۔ عمر نے اس کے اس جملے کے پیچھے سے جھانکتی کسی کہانی کو کھوجنے کی کوشش کی، لیکن وہ اس معاملے میں اتنا ہوشیار نہیں تھا۔

"میں ایک ہی بار گیا ہوں۔ جب میں ہائی اسکول میں تھا تب کی بات ہے۔ اچھا تجربہ تھا میرے لیے تو۔ دراصل وہاں زیادہ تر کیتھولک لوگ ہیں۔ پینے پلانے کے دلدادہ۔ اور برٹش نیشنل کو زیادہ پسند نہیں کرتے، لیکن سیاحوں کے ساتھ تو بہت اچھی طرح پیش آتے ہیں۔ اس فیلڈ سے ان کا کاروبار وابستہ ہے۔ کیا ہوا؟ کوئی بات ہوئی کیا؟" عمر نے اپنا تجربہ بیان کرنے کے بعد پوچھا تھا۔ شہروز نے ہونٹ بھینچے جیسے سوچ رہا ہو کہ کیا کہنا چاہیے اور کیا نہیں، پھر اس نے تھک کر سارا قصہ بیان کر دیا تھا۔

"انہوں نے ڈبلن کی انٹری ہی نہیں دی؟" عمر سن کر حیران ہوا تھا۔

"انٹری تو دے دی تھی لیکن میرا دل نہیں چاہا کہ میں مزید آگے کا سفر کرتا۔ اتنی توہین اتنا برا رویہ میں نے ایسا کیا ہی کیا تھا کہ انہوں نے مجھے مجرم سمجھ لیا۔" اس نے خود کو لفظ "دہشت گرد" کہنے سے روکا۔ وہ عمر کے سامنے یہ لفظ استعمال نہیں کرنا چاہتا تھا۔ ابھی تو **تعمور** نصار کی باتیں ہی ذہن میں گونج رہی تھیں۔ وہ اپنی ذہنی الجھن میں اس قدر گم تھا کہ **تعمور** نصار کی کایا پلٹ والی گتھی پر بھی غور نہیں کر پا رہا تھا۔ اس نے جو باتیں کی تھیں وہ بھی کافی غور طلب تھیں۔ عمر اس کے چہرے کے اتار چڑھاؤ کو بغور دیکھ رہا تھا۔

"اتنا پریشان نہ ہو۔ یہ کوئی ایسا خاص ایشو نہیں ہے۔ اتنا سر پر سوار مت کرو۔ آرش بعض اوقات اس طرح کا رویہ اپنا جاتے ہیں، لیکن اس کا مطلب یہ تو نہیں کہ تم جذباتی ہی ہو جاؤ۔ یہ تو میری خاصیت ہے۔"

وہ اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر تھپتھپاتے ہوئے بولا تھا۔ شہروز نے اسے دیکھا پھر دیکھتا ہی رہا۔ اسے پہلی دفعہ احساس ہوا تھا کہ جب کوئی آپ کو یہ کہتا ہے کہ جذباتی مت ہو تو دل چاہتا ہے کہ اسے مزید جذباتی ہو کر دکھایا جائے۔ بپھرے ہوئے دریاؤں پر بند باندھنا آسان نہیں ہوتا۔

"انہوں نے میرے لیے لفظ دہشت گرد استعمال کیا عمر! تم تصور کرو۔ مجھے دہشت گرد کہہ دیا۔"

وہ واقعی اس ایک ایشو کو سر پر سوار کر چکا تھا کہ اس سے ان دونوں آفیسرز کا رویہ بھلایا ہی نہیں جا رہا تھا۔ عمر نے جتانے والے انداز میں اسے دیکھا، پھر اس کے چہرے پر پھیلا سوچوں کا جال دیکھ کر اس نے خود کو کچھ کہنے سے روکا تھا۔

"میں نے تو داڑھی بھی نہیں رکھی ہوئی۔ میرا لباس مغربی لوگوں سے زیادہ مغربیت لیے ہوئے تھا۔ میں نے تو کسی سے یہ سوال بھی نہیں کیا تھا کہ آیا وہاں کی فوڈ کورٹ میں حلال فوڈ دستیاب بھی ہے یا نہیں۔ میں نے وہاں ایک جوڑا بیٹھا دیکھا تھا جس کے دونوں رکن مرد تھے، لیکن میں نے ان کو دیکھ کر ناک بھوں تک نہیں چڑھائی۔ پچھلی سیٹ پر بیٹھا تو عمر لڑکا مسلسل شراب پینے میں مصروف تھا لیکن میں نے برا مان کر اپنی سیٹ تبھی نہیں بدلی۔ اس سے زیادہ غیر اسلامی ہو کر کیسے دکھاؤں ان کو۔" یہ ایک انتہائی بودی دلیل تھی۔

"میں سوچ رہا تھا دنیا میں کسی کو دہشت گرد کہہ دینا کیا اتنا ہی آسان ہے۔ آپ کے بارے میں کوئی ثبوت بھی نہ ہو۔ آپ لباس انداز اور گفتگو میں دوسری اقوام کی نقل کر کر کے تھک کر ٹوٹ چکے ہوں پھر بھی کیا آپ کا کلمہ گو ہونا آپ کو دنیا کے لیے خطرے کی علامت قرار دے دیتا ہے۔ ان آفیسرز نے اچھا نہیں کیا۔ انہوں نے مجھے اندر سے توڑ دیا ہے۔ انہیں کوئی حق نہیں تھا کہ وہ میرے لیے اتنی حقارت سے یہ لفظ استعمال کرتے۔" وہ اپنے بالوں میں انگلیاں پھنسا کر انہیں سنوارنے کی کوشش کر رہا تھا۔

"برا مت ماننا لیکن اسی لیے میں چاہتا ہوں کہ تم نور محمد کے بارے میں بھی ایسے مت سوچو۔ جب ایک لفظ تمہیں اپنے لیے گالی لگ رہا ہے تو پھر تمہیں کوئی حق نہیں ہے کہ تم کسی دوسرے شخص کو وہ گالی دو۔ اسے دہشت گرد قرار دو۔"

وہ اب شہروز کا چہرہ دیکھ رہا تھا۔ اس نے لہجے اور الفاظ کو حتی الامکان حد تک نرم رکھا تھا۔ شہروز کی ذہنی حالت کے باعث وہ اس قدر احتیاط کا مظاہرہ کر رہا تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ شہروز سمجھے کہ وہ کم ظرفی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اسے کچھ جتا رہا ہے۔ شہروز نے برا سا منہ بنا کر اسے دیکھا۔

"تم بھی کہاں کی بات کہاں لے جاتے ہو عمر! نور محمد کا ذکر یہاں کہاں سے آگیا۔ وہ تو سرٹیفائیڈ دہشت گرد ہے۔ وہ واقعی لوگوں کو انتہا پسندی کی جانب لے جا رہا تھا۔"

شہروز نے اس کی بات کا کچھ جواب تو دینا ہی تھا سو اس نے دیا۔ یہ ان خیالات سے بھی زیادہ بودا جواب تھا، جو اس کے ذہن میں گول گول گھوم رہے تھے۔ عمر نے گہری سانس بھری۔

"انتہا پسندی پتا نہیں کسے کہتے ہو تم۔ نماز روزہ کی تلقین یا پھر حلال حرام کی احتیاط۔ اس سے زیادہ تو کچھ نہیں کرتا تھا وہ انسان۔ اس کے اچھے اخلاق اور رویے نے اگر کسی کے بیٹے کو یا کسی کی بیٹی کو اسلام میں دلچسپی لینے کے لیے مجبور کر دیا تو اس کی بنا پر وہ دہشت گرد ہو گیا۔ سرٹیفائیڈ دہشت گرد ہو گیا۔" عمر نے بہت ہی تحمل بھرے انداز میں لفظ "سرٹیفائیڈ" پر زور دیا تھا پھر شہروز کو بولنے کا موقع دیے بغیر بولا۔

"مذاہب کی تبلیغ و تشہیر کرنے والوں کو اگر دہشت گرد قرار دینا ٹھیک ہے تو پھر سب سے پہلے عیسائی مشنریز کو دہشت گرد قرار دیا جانا چاہیے۔" وہ اس سے سوال کر رہا تھا۔

"تم اسے معصوم سمجھتے ہو نا؟" شہروز نے اسی انداز میں سوال کیا تھا۔

"وہ معصوم ہی تو ہے۔ مجھے بتاؤ اس شخص کا قصور کیا ہے۔ کیا صرف یہ کہ وہ ایک پریکٹیکل مسلم (عملی مسلمان) ہے۔ جوان بچوں پر چیختا تھا جو مسجد کے احاطے میں خالی بیئر کے ٹن اور خنزیر کا فضلہ پھینک جاتے تھے۔ کیا اپنی عبادت گاہ کی حفاظت اس کا جرم ہے۔ کیا رہنمائی طلب کرنے کے لیے آنے والوں کو اللہ کا پیغام دینا اسے دہشت گرد قرار دے دینے کے لیے کافی ہے۔ تمہیں نہیں لگتا کہ تم بھی اس طرح اس کی توہین کر رہے ہو۔" عمر نے اس سے سوال کیا تھا۔

"شاباش ہے دوست۔ تم اب میرا موازنہ اس شخص سے کرو گے۔ بہت خوب۔ یہاں میں اپنی الجھنوں میں ہوں اور تم مجھے طعنے دینے لگ گئے ہو۔ مجھے نہیں کرنی کوئی بات" آؤ اب گھر چلتے ہیں۔ میں واقعی جذباتی ہو رہا ہوں۔ ہو جاؤں گا ٹھیک خود بخود۔" شہروز چڑ کر بولا تھا۔ عمر چپ کا چپ رہ گیا تھا۔ اس نے سبق پڑھ لیا تھا۔ لیکن سبق سیکھا نہیں تھا۔

✡ ✡ ✡

"زارا باجی! آپ سے ملنے کوئی آنٹی آئی ہیں۔"

چوکیدار نے انٹر کام پر بتایا تھا۔ وہ دوپہر کے بعد اسپتال جانے والی تھی۔ اس لیے ابھی تک بستر سے نہیں نکلی تھی اور نکلنے کو دل بھی نہیں چاہ رہا تھا۔ اس لیے اس نے ابھی تک سلیپنگ سوٹ بھی نہیں تبدیل کیا تھا۔ وہ کسلمندی سے بستر میں گھسی واٹس اپ میسجز دیکھ رہی تھی۔ امائمہ کا میسج تھا۔ ممانی (عمر کی امی) کے میسجز بھی آئے ہوئے تھے۔ وہ سب پوچھ رہے تھے کہ کچھ چاہیے تو ابھی بھی بتا دو۔

شہروز کی رات کی فلائٹ تھی۔ اسے قطر میں دو گھنٹے رکنے ___ کے بعد دوپہر تک لاہور پہنچ جانا تھا۔ عمر نے بھی اسی قسم کا ایک میسج کیا تھا... نہیں کیا تھا تو شہروز نے نہیں کیا تھا۔ زارا نے اس کا فیس بک پیج بھی دیکھ لیا تھا جہاں مکمل سناٹا تھا۔ اس نے چند دن سے کوئی اسٹیٹس دیا تھا نہ کوئی نئی تصویر نظر آ رہی تھی۔ ورنہ اسے عادت تھی کہ خبطیوں کی طرح سوشل میڈیا پر ان رہتا تھا۔ اپنا آنا جانا، اٹھنا بیٹھنا وہ ہر چیز اپنے دوستوں اور اپنے فینز کے ساتھ ڈسکس کرتا رہتا تھا۔ اس لیے اس کا کوئی نیا اسٹیٹس یا تصویر نہ پا کر فطری طور پر زارا اسی سوچ میں الجھی تھی کہ آیا وہ اس طرح غیر حاضر کیوں ہے۔ سلمان حیدر نے اس سے اس کے متعلق انکشافات کا ڈھیر نہ لگایا ہوتا تو شاید وہ اس بات کو عام سے انداز میں لیتی اور اب تک غیر سنجیدہ انداز میں اس کے پیج پر اس کی غیر حاضری کے متعلق کوئی پھبتی کس چکی ہوتی۔ لیکن اب وہ اس صورت حال کے کئی معنی خود ہی اخذ کر رہی تھی اور خود ہی رد کر رہی تھی۔ اس لیے کسی آنٹی کی آمد کا سن کر اس نے زیادہ توجہ نہیں دی تھی، ممی کی وفات کے بعد سے اب ہر آنے والے مہمان کو خوش آمدید کہنا اس کے فرائض میں خود بخود شامل ہو چکا تھا، لیکن زیادہ تر دوست احباب ہمیشہ کال کر کے آتے تھے۔ آنے والے مہمان کے متعلق اندازے لگاتے ہوئے وہ باتھ روم میں گھس گئی تھی۔ کپڑے تبدیل کر کے بال درست کرتی وہ ڈرائنگ روم میں آ گئی۔

"آپ آئی ہیں... اور مجھے کسی نے بتایا بھی

نہیں۔" وہ آنٹی رافعہ کو اپنے انتظار میں بیٹھا دیکھ کر خوش ہوتے ہوئے بولی پھر انہیں انتظار کروانے پر شرمندگی محسوس ہوئی تو بولی۔

"آپ مجھے کال کر لیتیں آنٹی... دراصل میں آج سو کر ہی لیٹ اٹھی تھی... شام کی ڈیوٹی تھی تو دل ہی نہیں چاہا کچھ کرنے کو... آئی ایم سوری آپ کو اکیلے بیٹھنا پڑا... کسی نے آپ کو پانی وانی بھی پوچھا ہے کہ نہیں... میں آپ کے لیے چائے بنواتی ہوں۔" ایک ہی سانس میں کئی جملے بول ڈالے تھے اس نے...

"یہاں آؤ اور آرام سے میرے پاس بیٹھو... بدحواس ہونے کی ضرورت نہیں ہے... تم کیوں شرمندہ ہو رہی ہو... غلطی تو میری ہے... مجھے بتا کر آنا چاہیے تھا..." انہوں نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے اپنے ساتھ بٹھایا پھر مسکراتے ہوئے بولیں۔

"میں تم سے گلہ کرنے آئی ہوں۔" انہوں نے مزید کہا تھا۔ زارا حیران ہوئی۔

"کیا ہوا آنٹی... مجھ سے کوئی غلطی ہو گئی۔"

"تم نے مجھے شہروز کے بارے میں کیوں نہیں بتایا... اتنی باتیں ڈسکس کیں... اتنا کچھ بتایا اپنے متعلق... لیکن جو بتانا چاہیے تھا' وہی نہیں بتایا۔" وہ مسکراتے ہوئے مصنوعی ناراضی ظاہر کر رہی تھیں۔

"مجھے ٹیپو نے بتایا اور یہ بھی بتایا کہ تم لوگوں کی جلد شادی ہونے والی ہے۔" وہ اس کے چہرے کی جانب دیکھتے ہوئے بول رہی تھیں۔ زارا کے چہرے پر شرمگیں سی مسکراہٹ پھیلی۔ یہ شاید پہلی مرتبہ تھا کہ وہ اس ذکر پر کسی کے سامنے شرمائی تھی۔ آنٹی رافعہ نے بغور اس کے انداز کا مطالعہ کیا تھا۔

"خوش ہونا... میں بھی تمہارے لیے بہت خوش ہوں... اللہ تمہیں آئندہ زندگی کے تمام سکھ عطا کرے۔" وہ دعا دے رہی تھیں۔

"کیسا بچہ ہے شہروز...؟" وہ اسے بولنے کا موقع دیے بغیر ساتھ ہی سوال بھی کر رہی تھیں۔ زارا کو چائے پانی سب بھول گیا تھا۔ اسے بس ایسے لگ رہا تھا کہ کوئی دیرینہ سہیلی سامنے آبیٹھی تھی اور اس کے محبوب کا ذکر کر چھیڑ دیا تھا۔

"اچھا ہے آنٹی... میرے ماموں کا بیٹا ہے۔" وہ مسکرائی تھی۔

"ماموں کا ہو یا چاچو کا... یا کسی دور پار کے عزیز کا بیٹا... تمہارے حق میں اچھا ہے تو بس سب سے اچھا ہے۔" وہ اس کے ہاتھ کو تھپتھپا رہی تھیں۔

"جی آنٹی بہت اچھا ہے۔" اس کی مسکراہٹ گہری ہوئی تھی۔

"سن کر خوشی ہو رہی ہے۔" وہ سابقہ انداز میں بولی تھیں۔

"میں آپ کے لیے چائے لاتی ہوں۔" اس نے اٹھنا چاہا تھا' لیکن انہوں نے اس کا ہاتھ تھامے رکھا اور اسے اٹھنے نہیں دیا تھا۔

"چائے ہی نہیں کھانا بھی کھاؤں گی لیکن ابھی نہیں... ابھی میں ایک کام سے تمہارے پاس آئی ہوں۔" وہ ایک بار پھر اس کا ہاتھ تھپتھپا رہی تھیں۔ زارا نے الجھ کر ان کا چہرہ دیکھا۔

"زارا! جو ہمارے حق میں اچھا ہو... دل چاہتا ہے نا کہ وہ سب کے حق میں بھی اچھا ہو... ہے نا... میں ٹھیک کہہ رہی ہوں نا۔" وہ بھی اس کی آنکھوں میں دیکھ رہی تھیں جہاں تاثرات کچھ الجھے ہوئے سے تھے۔

"مجھے ٹیپو نے شہروز کے متعلق بہت سی باتیں بتائی ہیں... وہ غلط ہاتھوں میں ہے... اس نے تم سے بھی ذکر کیا ہو گا۔" زارا سے چند لمحے کچھ نہیں بولا گیا اور آنٹی بھی خاموشی سے اس کی جانب دیکھتی رہی تھیں۔

"جی آنٹی... دراصل..." وہ کچھ کہنا چاہتی تھی' وضاحت دینا چاہتی تھی' لیکن آنٹی رافعہ کے ساتھ اس کا رشتہ اس نہج کا ہو چکا تھا کہ وہ ان سے کوئی بات چھپا نہیں سکتی تھی۔ اس لیے وہ دو لفظ بول کر ہی چپ ہو گئی تھی۔

"زارا! میں تمہارے لیے یہ اجازت نامہ لائی ہوں... عہد الست کی تقریب رونمائی ہے... میں چاہتی ہوں کہ تم وہاں شہروز کے ساتھ آؤ... میڈیا

پرسن کی حیثیت سے شہروز کو بھی مدعو کیا جائے گا، لیکن میں....'' انھوں نے اتنا کہا پھر رک گئیں۔

''ہم چاہتے ہیں کہ تم دونوں وہاں ایک ساتھ آؤ.... شہروز اپنے حوالے سے نہیں بلکہ تمہارے حوالے سے وہاں آئے.... سمجھ رہی ہو نا میری بات۔''

وہ اب سوالیہ انداز میں اسے دیکھ رہی تھیں۔ زارا کے چہرے کی مسکراہٹ کا زاویہ پہلے سپاٹ ہوا تھا پھر الٹے ہوئے آدھے دائرے کی طرح ہونٹوں کے کنارے نیچے جھک گئے تھے۔ وہ ہمیشہ ہتھیار ڈالنے میں عجلت کا مظاہرہ کرتی تھی۔

''یہ بہت مشکل کام ہے آنٹی.... آپ کو ٹیپو نے سب کچھ بتایا ہو گا.... آپ جس ناول کی بات کر رہی ہیں نا شہروز بھی ایسی ایک ڈاکیومینٹری پر کام کر رہا ہے.... اس حساب سے یہ تقریب اس کے لیے اپنے حوالے سے اہم ہوگی.... وہ کبھی نہیں مانے گا.... اسے اپنے حوالے زیادہ عزیز ہیں.... وہ کبھی میری نسبت سے اس تقریب میں شریک نہیں ہو گا.... وہ میری بات بھی نہیں سنے گا۔''

''زارا! تم اس کی ہونے والی شریک حیات ہو۔ تمہاری بات کی اہمیت ہونی چاہیے.... بالفرض اگر اس کی نظر میں تمہارے مؤقف کی اہمیت نہیں بھی ہے تب بھی، یہ تمہارا فرض کہ تم اسے سمجھاؤ کہ وہ جس طرف جا رہا ہے.... وہ غلط ہے۔ وہ تباہی کے دہانے کی طرف بڑھ رہا ہے۔''

آنٹی نے ذرا سا برا مان کر کہا تھا پھر اس کا پژمردہ انداز دیکھ کر نرم ہوتے ہوئے بولیں۔

''ہر بات میں کمزور پڑ جانا اچھی بات نہیں ہوتی.... میرے بچے! اپنی طاقت کو پہچانو.... تم اس کی نصف بہتر بننے جا رہی ہو.... تم اس کے دم سے اور وہ تمہارے دم سے پہچانا جائے گا.... عورت کو اللہ نے مرد کی ذات پر بڑے اختیارات دیے ہیں.... بہت حق دیا ہے.... اور جہاں حق زیادہ ہوتے ہیں وہاں فرائض بھی زیادہ ہوتے ہیں.... عورت مرد کی زندگی میں صرف لاڈ اٹھوانے، اپنے حسن کو سراہنے یا پھر اس کے بچے پیدا کرنے ہی نہیں آتی.... وہ اسے راہ راست پر لانے کے لیے بھی آتی ہے.... اپنی ذمہ داری کو پہچانو.... تم شہروز کی زندگی کا قطب نما ہو.... تمہارا فرض ہے کہ اسے حق اور باطل میں فرق کرنا سکھاؤ۔''

آنٹی نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے اسے نصیحت کی تھی۔ زارا ان کی بات کو سن رہی تھی اور ایمان بھی لا رہی تھی۔ اس کے سامنے بیٹھی خاتون کو ایک عجیب وصف حاصل تھا۔ وہ لوگوں کو اپنی بات سمجھا لینے کے فن سے بخوبی آگاہ تھیں۔

☼ ☼ ☼

''تمہارے پاؤں تو بالکل روغنی نان بنتے جا رہے ہیں۔'' عمر نے اس کے گلابی سوجے ہوئے پھولے پھولے پاؤں کی جانب دیکھتے ہوئے مزاحیہ انداز میں کہا تھا۔ امائمہ نے اس کے اس طرح کہنے پر پاؤں کی جانب دیکھا پھر مسکراتے ہوئے بولی۔

''مجھے تو لگتا ہے میں خود پوری کی پوری روغنی نان بن گئی ہوں.... وزن اتنا بڑھ گیا ہے یک دم.... اور پاؤں تو بالکل کپا ہو گئے ہیں.... درد بھی بہت کرتے ہیں۔'' اس نے ٹانگوں کو سیدھا کر کے پھیلایا تھا۔ وہ آج کل کافی سہل پسند سی ہو گئی تھی۔ ایک تو دن ایسے تھے اور پھر عمر اور آنٹی بھی اسے زیادہ کام نہیں کرنے دیتے تھے، جس کی وجہ سے وہ ہمہ وقت تسلی سے آرام کرتی رہتی تھی۔ ابھی بھی وہ آرام سے ٹانگیں پسارے کاؤچ پر بیٹھی تھی جبکہ عمر فلور کشن پر لیپ ٹاپ گود میں لیے مگن تھا۔ اس کے پاؤں پر نظر پڑی تو چڑانے کے لیے ایسے بول دیا درد کا سن کر عمر کے چہرے کے تاثرات بدلے تھے۔

''واقعی، بہت درد کرتے ہیں؟''

اس کے سوال پر امائمہ نے منہ بنایا۔

''اور نہیں تو.... سارا وزن پاؤں پر ہی تو ہوتا ہے.... اتنے سوجے ہوئے ہیں تو درد ہی کریں گے نا۔''

''اوہو.... تم نے پہلے کیوں نہیں بتایا....'' اس کا دھیان ابھی بھی لیپ ٹاپ کی جانب تھا۔ امائمہ

مصنوعی ناراضی سے اس کی جانب دیکھ رہی تھی۔

"پہلے بتا دیتی تو کون سا تیر مار لیتے آپ۔" وہ طنز کر رہی تھی۔ عمر ہنسا۔

"کیا پتا کوئی تیر مار ہی لیتا۔" ایسا کہتے ہوئے اس نے دائیں آنکھ بھی دبائی تھی۔

"تم آنکھ ہی مار سکتے ہو..... تمہیں کہاں آتا ہے یہ تیر ویر مارنا..... یہ تو بہادر سورماؤں کا کام ہے۔" امائمہ نے ذرا سا آگے ہو کر اپنی پشت پر پڑا کشن ٹھیک کیا تھا پھر ریموٹ اٹھا کر بولی تھی۔

"ارے یہ بہادر سورما تو بس قصے کہانیوں میں ملتے ہیں..... اصل بہادر تو عورت ہوتی ہے۔ بہادر، باہمت اور واقعی جفاکش۔" وہ لیپ ٹاپ ایک طرف رکھ کر اٹھا تھا۔

"وہ کیسے.....؟" امائمہ نے بات برائے بات کی تھی۔ اس کا دھیان ٹی وی میں لگ گیا تھا۔

"وہ ایسے کہ اتنا وزن اٹھانا اور پھر اٹھائے رکھنا میرے بس کی تو بات نہیں مگر تم دن رات اٹھائے پھرتی ہو..... یہ بہادر ہمت اور جفاکشی ہی تو ہے۔"

وہ اسے سراہتے ہوئے باتھ روم کی سمت چلا گیا۔ امائمہ دوبارہ سے ٹی وی دیکھتے ہوئے سوچنے لگی تھی کہ اس کے کتنے کام اس کی سستی کی وجہ سے رکے ہوئے ہیں۔ بے بی کے آنے میں تھوڑا وقت ہی رہ گیا تھا اور جیسے جیسے دن قریب آ رہے تھے وہ مزید سستی کا شکار ہوتی جا رہی تھی۔ گھر میں نئے مہمان کی ضرورت کی چیزیں آنے لگی تھیں۔

آنٹی نے عمیر کا اب تک سنبھالا ہوا، جھولا اور بے بی کاٹ بھجوا دیا تھا۔ وہ بھی ایسے ہی کھلے پڑے تھے جبکہ ان دونوں نے مل کر بھی کچھ کپڑوں وغیرہ کی شاپنگ کی تھی۔ وہ سب بھی ایسے ہی پھیلا پڑا تھا۔ امائمہ کا دل چاہتا تھا نہ اس میں ہمت تھی کہ وہ سب چیزیں سمیٹ کر رکھ لے۔ وہ روز سوچتی تھی کہ آج یہ سب نبٹا لوں گی لیکن پھر سستی آڑے آ جاتی۔

وہ ذہنی طور پر اب کچھ مطمئن ہوتی جاتی تھی اور اس کی وجہ بھی عمر ہی تھا۔ اس نے وہ فیس بک پیج جو نور محمد کی تلاش کے لیے بنایا تھا۔ اسی میں تبدیلیاں کر کے اسے فعال کر دیا تھا۔ وہ امائمہ سے ڈسکس تو نہیں کرتا تھا لیکن امائمہ کو فیس بک کی وجہ سے ہی اطلاعات ملتی رہتی تھیں۔ وہ فیس بک پیج پر لوگوں کا ریسپانس دیکھ کر ششدر رہ گئی تھی۔ پیج کے فعال ہوتے ہی چند گھنٹوں میں لوگوں نے اس میں دلچسپی لینی شروع کر دی تھی۔ اس پر لائکس کی تعداد ہزاروں میں پہنچ گئی تھی اور سب سے زیادہ اچھی بات یہ تھی کہ اس میں ایتھنکس کی تخصیص نہیں تھی۔ وہ سفید فام جو نو مسلم تھے ان کا ٹرن آؤٹ سب سے زیادہ تھا۔ وہ اپنے مکمل تعاون کا یقین دلا رہے تھے اور اس سے بھی بڑھ کر سب اس بات پر اصرار کر رہے تھے کہ اگر نور محمد واقعی معصوم ہے تو پھر اسے فی الفور رہا کیا جانا چاہیے۔

امائمہ کو یہ سب دیکھ کر بہت ڈھارس ملی تھی۔ پہلے جب یہ موضوع چھڑا تھا تو ساس سسر اور سب سے بڑھ کر شہروز کی باتیں سن کر وہ بہت ناامید ہو گئی تھی اور اسی لیے اس کی رائے بھی اپنے بھائی کے بارے میں کنفیوژن کا شکار ہو گئی تھی، لیکن اب وہ پرامید ہو چلی تھی کہ اللہ کوئی سبیل ضرور پیدا کر دے گا۔ اس نے امی سے بھی بات کی تھی، اسے ان سے بھی بہت کچھ پتا چلا تھا۔ ابو کے رویے میں آنے والی مثبت تبدیلی اور سلمان حیدر نامی صحافی کی معاونت..... یہ سب چیزیں اس کو حوصلہ اور شرم دونوں دلانے کے لیے کافی تھیں۔ وہ عمر سے اس بات پر معذرت کرنا چاہتی تھی کہ اس نے بزدلی اور منافقانہ رویہ اپنا کر غلطی کی تھی لیکن عمر اسے اس کا موقع ہی نہیں دے رہا تھا۔ ٹی وی اسکرین کی طرف دیکھتے ہوئے وہ یہی سب سوچ رہی تھی، جب عمر باتھ روم سے نکلا۔ اس کے ہاتھ میں پانی سے بھرا چھوٹا ٹب تھا۔ اس نے وہ لا کر امائمہ کے کاؤچ کے سامنے رکھ دیا تھا۔

"یہ لیں بیگم صاحبہ آپ بھی کیا یاد کریں گی۔" وہ کہہ رہا تھا۔ امائمہ نے سوالیہ انداز میں اس کی جانب دیکھا۔

"اس نیم گرم پانی میں کچھ دیر پاؤں رکھ کر بیٹھو... سوجن دور ہوگی اور تمہیں اچھا لگے گا۔" وہ اپنی جانب سے ٹوٹکا بتا رہا تھا۔

"واقعی... لیکن تمہیں کس نے بتایا؟" امائمہ دل ہی دل میں اس کے انداز محبت پر نہال ہوئی، لیکن سوال پوچھتے وقت عام سا انداز اپنا لیا۔

"میں نے ابھی نیٹ سے دیکھا ہے کہ اگر اس حالت میں پاؤں میں ورم ہو تو کیا کرنا چاہیے۔" عمر خوش ہوتے ہوئے بولا تھا۔ وہ پہلے بھی ایسے کام کرتا رہتا تھا۔ انٹرنیٹ سے اس کے لیے پریگننسی میں صحت مند رکھنے کے ٹوٹکے اور یوٹیوب سے اس کے لیے یوگا کے آسن کی ویڈیوز ڈاؤن لوڈ کرنا اس کی روٹین میں شامل تھا۔ امائمہ نے اپنے پاؤں کھسکا کر پانی میں ڈبو دیے تھے۔ عمر اس کے پاس ہی بیٹھ گیا تھا۔ امائمہ کو چند لمحوں میں ہی گرم پانی کی تاثیر پورے بدن میں محسوس ہونے لگی۔ اس نے آنکھیں بند کرکے اپنی کمر کاؤچ کی پشت سے ٹکالی تھی۔ ایسا لگتا تھا تھکن کوئی پاؤں کی انگلیوں کے ذریعے نچوڑ کرلے جارہا ہو۔ پاؤں کو سکون ملا تو ذہنی سکون بھی خود بخود پیدا ہونے لگا تھا۔ دل میں عمر جیسا شریک حیات ملنے پر شکر گزاری کے جذبات بڑھنے لگے۔

اس نے آنکھیں کھول کر عمر کی طرف دیکھا۔ اسی لمحے اس نے بھی اس کی جانب دیکھا پھر وہ دونوں ایک ساتھ مسکرائے تھے۔

"تمہیں پتا ہے عمر! میری امی تمہارے بارے میں کیا کہا کرتی تھیں... امی کہا کرتی تھیں کہ امائمہ ایک دن تم عمر احسان جیسا لائف پارٹنر چننے کے فیصلے پر فخر کروگی اور واقعی مجھے فخر ہوتا ہے عمر کہ مجھے تم جیسا ساتھی ملا... یو آر دا بیسٹ عمر۔" وہ اس کی جانب دیکھے بنا بولی تھی۔

"اس چھوٹے سے پانی کے ٹب کی وجہ سے اب اتنا بھی شکر گزار مت ہو امائمہ... یہ واقعی میرا فرض ہے۔" وہ عام طور سے ایک دوسرے کی ایسی باتیں مذاق میں اڑا دیا کرتے تھے، لیکن اس لمحے نہ صرف امائمہ بلکہ عمر بھی سنجیدہ تھا۔ اس نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا تھا۔

"میں تمہارا خیال نہیں رکھوں گا تو اور کون رکھے گا... تم میری خاطر ہی تو یہ سب تکلیف سہ رہی ہو... تمہیں اس حالت میں دیکھتا ہوں تو دل میں تمہاری ریسپیکٹ مزید بڑھ جاتی ہے... عورت بے حد قابل عزت ہے یار... میرا تو ماننا ہے دنیا کی ہر عورت اچھی ہوتی ہے... ورنہ اتنی تکلیف سہنا آسان بات نہیں ہے اور اسی لیے اللہ کے یہاں عورت کا اتنا درجہ ہے... آج تک یہی پڑھتے سنتے آئے ہیں کہ مرد اور عورت برابر ہیں لیکن اب یقین ہو چلا ہے کہ عورت جب ماں بن جاتی ہے نا تو اس کا درجہ مرد سے بہت برتر ہو جاتا ہے... وہ بہت زیادہ کی مستحق ہو جاتی ہے۔" وہ اس کے ہاتھ کو تھپتھپا رہا تھا۔ وہ اب ایسی باتیں کثرت سے کرتا تھا۔

"عمر یہ بات میں اس لیے نہیں کہہ رہی کہ تم ایک اچھے شوہر ہو یا اچھے بیٹے ہو... بلکہ اس لیے کہ تم ایک اچھے انسان ہو... ایک بہترین انسان۔"

"آج تو کوئی اچھا ہی دن ہے بھائی... بیوی تعریف کرنے کے موڈ میں ہے۔" عمر نے اس کی بات کو مذاق میں اڑایا تھا۔ امائمہ چند لمحے کچھ نہیں بولی بلکہ لفظ جمع کرتی رہی۔

"میں نے وہ پیج دیکھا عمر... نور محمد والا... میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں کس طرح تمہارا شکریہ ادا کروں... تم واقعی بہت اچھے ہو... ورنہ کون کرتا ہے کسی کے لیے اتنا... تم میرے ماں باپ اور بھائی کے لیے جو کر رہے ہو... اللہ ہی تمہیں اس کا اجر دے گا عمر۔" امائمہ اب بھی اس کی جانب نہیں دیکھ رہی تھی۔ وہ اگر دیکھتی تو پھر شاید جملہ مکمل نہ کرپاتی۔ عمر نے گہری سانس بھری۔

"امائمہ! ایک بات یاد رکھنا یہ کام میں کسی کے لیے نہیں کر رہا... یہ میرے اپنے ذہنی سکون کے لیے بہت ضروری ہے... اور میں اسے پایہ تکمیل تک پہنچائے بغیر آرام سے نہیں بیٹھوں گا... بات صرف یہ نہیں

ہے کہ نور محمد تمہارا بھائی ہے۔۔۔ وہ اگر کوئی ایکس وائے زیڈ بھی ہوتا اور کوئی مجھے اس کی زندگی کے یہ سب واقعات بتا کر اس کی مدد کرنے کو کہتا تو میں تب بھی اس کی مدد ضرور کرتا۔۔۔" عمر کے لہجے میں اس قدر استقامت تھی کہ امائمہ کو اس پر رشک آیا۔

"تم نے واقعی وہ پیج دیکھا۔۔۔ میں بہت خوش ہوں لوگوں نے بہت اچھا رسپانس دیا ہے۔۔۔ عمیر بھی میرے ساتھ مل گیا ہے۔۔۔ ابو بھی آج صبح پتا ہے کیا کہہ رہے تھے۔۔۔ کہنے لگے عمر تو بہت ڈھیٹ ہے۔۔۔ جس بات پر ڈٹ جاتا ہے پھر اس پر ڈٹا رہتا ہے لیکن خوشی اس بات کی ہے کہ ہمیشہ جائز بات پر ضد کرتا ہے۔۔۔ اس بات کا مطلب یہ کہ وہ بھی اب ناراض نہیں ہیں۔ اور تم دیکھنا اب بہت جلد تمہارا بھائی مل جائے گا' میں نے آج تک اس کام میں ناکامی کا منہ نہیں دیکھا جس میں میرے پیرنٹس میرے ساتھ تھے۔۔۔ ان شاء اللہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔۔۔ تم صرف اپنا حوصلہ قائم رکھو اور دوبارہ کچھ غلط ملط مت سوچنا۔۔۔ میں بہت پر امید ہوں۔۔۔ اور مجھ سے زیادہ سر نور محمد پر امید ہیں۔۔۔ وہ اس ویک اس پورے کاز کو پبلک کے سامنے اسپورٹ کرنے پاکستان جا رہے ہیں۔۔۔ ان کے ناول کی تقریب رونمائی ہوگی اور پھر میڈیا نور محمد کا ذکر کھلے عام کرنے سننے پر مجبور ہو جائے گا' میری آج ان سے بات ہوئی تھی۔۔۔ کہہ رہے تھے کہ بہت خوش ہوں۔۔۔ دانہ دانہ کر کے تسبیح بن رہی ہے۔" امائمہ کو یہ سب بتاتے ہوئے وہ بھی کافی خوش نظر آیا۔

"مجھے بھی پاکستان میں ہونا چاہیے تھا۔" امائمہ نے اس کے چہرے پر پھیلے سکون کو محسوس کرتے ہوئے خواہش ظاہر کی تھی۔

"ان شاء اللہ۔۔۔ یہ ذرا شہزادہ عالم یا شہزادی صاحبہ دنیا میں تشریف لے آئیں پھر ہم بھی جائیں گے۔" وہ اسے اپنے ساتھ لگاتے ہوئے تسلی دے رہا تھا۔ امائمہ کو اب کی بار پہلے سے بھی زیادہ سکون محسوس ہوا۔

☆ ☆ ☆

"تمہیں یہ سب کس نے بتایا زارا؟"

شہوز اس کے منہ سے عوف بن سلمان اور پھر اپنے ڈاکیومینٹری پراجیکٹ کے متعلق اتنی تفصیلات سن کر حیران ہوا تھا۔ زارا نے سینٹرل ٹیبل پر پڑا اس کا لایا ہوا سفید ٹیولپ کا بوکے دیکھا۔ اس کی مہک اسے کاؤچ تک آ رہی تھی۔ ٹیبل پر وہ تحائف بھی پڑے تھے جو اسے ماموں ممانی اور امائمہ نے بھجوائے تھے اور ان ہی میں وہ خوب صورت پلاٹینم کا ڈائمنڈ پینڈینٹ بھی تھا جو شہوز اس کے لیے لایا تھا اس نے واٹس ایپ پر اسے اس کا امیج بھی بھیجا تھا۔ وہ صبح لاہور پہنچ گیا تھا اور اب ڈنر سے پہلے وہ اس کے گھر موجود تھا۔

زارا جانتی تھی وہ اسے ڈنر کے لیے باہر بھی لے جائے گا۔ وہ جب بھی بہت دن کے بعد اس سے ملتا تھا' اسے اتنا وقت ضرور دیتا تھا کہ وہ ایک وقت کہیں اطمینان سے بیٹھ کر چائے کافی پی سکیں یا کھانا کھا سکیں۔ اتنے دن بعد ملنے پر ان چند گھنٹوں میں اس کا التفات بھی عروج پر ہوتا تھا۔ وہ اس سے باتیں کرتا تھا' اس کے مسئلے بھی سن لیتا تھا' اپنی تعریفیں بھی کر لیتا تھا اور کبھی کبھی اس کی تعریف بھی کر لیتا تھا۔ اس حساب سے دیکھا جاتا تو آج کا دن زارا کے لیے بڑا قیمتی تھا۔ ایسے دن اس کے حافظے میں بہت دیر تک محفوظ رہتے تھے لیکن اس کے باوجود وہ خود کو شہوز کے سامنے وہ متنازعہ مسئلہ چھیڑنے سے روک نہیں پائی تھی۔ وہ شاید ایسا کر بھی لیتی اگر آنٹی رافعہ نے اس کی اتنی اچھی برین واشنگ نہ کی ہوتی۔

"اس بات سے کیا فرق پڑتا ہے شہوز! کہ کس نے بتایا۔۔۔ فرق اس بات سے پڑتا ہے کہ تم نے نہیں بتایا۔" زارا نے عام سے انداز میں کہا تھا۔ یہ شکوہ نہیں تھا۔ وہ شکوے کر کے اس کا موڈ خراب نہیں کرنا چاہتی تھی۔ اس کے لیے گفتگو کا موضوع ہی کافی تھا۔

"زارا۔۔۔" اس نے ہاتھ پھیلا کر اس کا نام لیا جیسے جتانا چاہ رہا ہو کہ تم بھی حد کرتی ہو۔

"یہ ایک انتہائی کانفیڈینشل ایشو ہے یار۔۔۔ آفس میں ہونے والی سب باتیں تو میں نہیں بتاتا تمہیں۔۔۔

"میری جاب ہی ایسی ہے۔" وہ وضاحت نہیں دے رہا تھا صرف اپنی جھنجلاہٹ چھپا رہا تھا۔ وہ اپنی ہونے والی بیوی سے یہ باتیں نہیں کرنے آیا تھا۔

"شہروز... اس بات کو چھوڑ دو... فی الوقت اس سے زیادہ اہم مسئلہ درپیش ہے... تم یہ پراجیکٹ چھوڑ دو شہروز... ہمیں کوئی ایسا کام نہیں کرنا جو اللہ کی ناراضی کا باعث بنے۔" وہ بہت تحمل سے بولی تھی۔

"زارا..." وہ مزید چڑ گیا۔ اس کی آنکھیں بھی پھیل سی گئی تھیں۔

"اس معاملے میں اللہ کہاں سے درمیان میں آگیا... یہ ایک الگ مسئلہ ہے اور کیا تم سوچ بھی سکتی ہو کہ میں کوئی ایسا کام کروں گا جو اللہ کو ناپسند ہو... میں شہروز منور ہوں... جون، فلپ یا اسمتھ نہیں ہوں... مجھے یہ اسلامیات کا درس مت دو۔"

"شہروز! امائمہ کا بھائی دہشت گرد نہیں ہے۔" وہ لاچاری سے بولی تھی۔ اسے اپنی بات اسی طرح منوانی آتی تھی۔ شہروز نے اس کا چہرہ بغور دیکھا۔

"او... اب میں پہنچ گیا ہوں صحیح اسٹیشن پر... تمہیں صرف میرے پراجیکٹ کا ہی نہیں پتا بلکہ یہ بھی پتا ہے کہ اس کا موضوع کیا ہے... تمہیں یقیناً عمر نے بتائی ہیں یہ سب باتیں... وہ خود جب کچھ نہیں کرسکا تو اس نے تمہیں میرے خلاف بھڑکا دیا۔" وہ طنزیہ انداز میں بولا تھا۔ زارا نے فوراً نفی میں گردن ہلائی تھی۔

"نہیں شہروز... عمر نے کچھ نہیں کہا... اس سے میری بات بھی نہیں ہوئی... مجھے سلمان حیدر نے بتایا ہے یہ سب۔" زارا نے اس کے سامنے یہ نام لینا ضروری سمجھا تھا۔

"سلمان حیدر...؟" اس نے سوالیہ انداز میں اس کا چہرہ دیکھا۔

"وہ بھی ایک صحافی ہیں... یونیورسٹی میں تمہارے سینئر تھے... فری لانسر ہیں... رضوان اکرم صاحب جانتے ہیں انہیں۔" وہ اسے تفصیل سے بتا رہی تھی۔

"رضوان صاحب کو چھوڑو... تم یہ بتاؤ تم کیسے جانتی ہو انہیں...؟" اس کی ٹون مزید طنزیہ ہوئی تھی۔ زارا نے تاسف سے اس کے انداز کو دیکھا تھا۔

"شہروز! تم ان سب باتوں کو چھوڑ دو... میں تمہیں سب کچھ بتا دوں گی، لیکن ابھی تم میری بات غور سے سنو... تم اس پراجیکٹ کو چھوڑ دو... میری خاطر۔" اس نے التجائیہ انداز اپنایا تھا۔

"زارا! تم کب بچوں کی طرح بی ہیو کرنا چھوڑو گی... یہ کوئی اسکریبل کا گیم نہیں ہے کہ تم ایک بار کہو اور میں تمہاری دلجوئی کی خاطر سب چھوڑ چھاڑ کر بیٹھ جاؤں..." وہ اچھل کر بولا تھا۔

"شہروز... پلیز... میری خاطر۔" وہ منت پر اتر آئی تھی اور وہ جانتی تھی کہ شہروز اس کے اس انداز سے چڑتا ہے۔

"زارا یہ دیکھو..." اس نے اس کے سامنے ہاتھ جوڑے۔

"میں ہاتھ جوڑتا ہوں تمہارے آگے... میں پہلے ہی بہت اپ سیٹ ہوں... عمر کو ناراض کر کے آیا ہوں... اور اب تم یہاں یہ جذباتی فلم اسٹارٹ کر کے بیٹھ گئی ہو... تم لوگ مجھے جانتے نہیں ہو کیا... میں کوئی غلط کام کیسے کرسکتا ہوں۔" وہ جھنجلائے ہوئے انداز میں بول رہا تھا۔ زارا چند لمحے کچھ نہیں بولی۔ اس کے پاس الفاظ کا ذخیرہ ختم ہو رہا تھا۔

"تم اس سارے معاملے سے دور رہو یار... یہ تمہارے لیے ایک الگ سیارے کی کہانی جیسا ہے... تمہیں جو بتایا گیا ہے وہ سب حقیقت پر مبنی نہیں ہے... میں جانتا نہیں ہوں کہ سلمان حیدر کو تم کیسے جانتی ہو لیکن وہ بھی ان لوگوں میں شامل ہے جو ابھی تک اپنی ضدی طبیعت کے باعث اپنا کیریئر نہیں بنا پایا... حیرانی اس بات کی ہے کہ اس نے تمہیں کیوں اپروچ کیا... تم اس ساری سازش پر غور کرو... وہ جلتا ہے مجھ سے... میری ترقی نے میرے بہت سے حریف پیدا کر دیے ہیں... وہ بندہ بھی ان ہی میں سے ایک ہے۔" وہ اب اپنے لہجے کو نرم رکھ کر اسے سمجھانے کی کوشش کر رہا تھا۔

"شہوز! تم غلط سمت میں سوچ رہے ہو.... میں اس شخص کو بہت اچھی طرح جانتی ہوں.... تمہارا پروجیکٹ اگر میرے لیے کسی اور سیارے کی کہانی ہے نا تو یہ بندہ تمہارے لیے کسی اور سیارے کی مخلوق ہے.... وہ کسی کا حریف نہیں ہو سکتا۔"

ساری گفتگو میں وہ پہلی مرتبہ ٹھوس لہجے میں بولی تھی۔ شہوز نے اس کی جانب غور سے دیکھا۔

"زارا! تمہیں میری بات کا یقین نہیں ہے۔ اس خلائی مخلوق کی بات کا یقین ہے.... ٹھیک ہے تمہاری مرضی.... میں اس پروجیکٹ کی خاطر عمر کی ناراضی مول لے سکتا ہوں تو پھر کسی کی بھی ناراضی مول لے سکتا ہوں۔" وہ اتنا کہہ کر کاؤچ پر پیچھے کی جانب ہوا تھا اور کسی ناراض بچے کی طرح منہ بسور کر بیٹھ گیا تھا۔ اس کے لفظوں نے زارا کا دل توڑ کر رکھ دیا تھا۔ وہ اس شخص کے لیے کبھی پہلے نمبر پر نہیں رہی تھی۔ وہ ہمیشہ دوسرے تیسرے نمبر کی امیدوار تھی۔ یہ بہت تکلیف دہ سچ تھا۔ وہ بھی ہاتھوں کی انگلیوں کو چٹخاتی ہوئی، رنج والم کی تصویر بن کر بیٹھ گئی تھی۔ چند لمحے بعد شہوز نے اسے دیکھا پھر نہ جانے اس کے دل میں کیا سمائی۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر اس کے قریب آبیٹھا تھا۔

"زارا.... میری جان...." اس نے اس کے چہرے کو دونوں ہاتھوں سے تھاما تھا۔

"تمہیں لگتا ہے میں اتنا برا ہو سکتا ہوں؟ میں کبھی کوئی غلط کام کر سکتا ہوں کیا؟ تم لوگ کیوں نہیں سمجھتے۔ میں اتنا برا نہیں ہوں۔ مجھے بھی اللہ کو منہ دکھانا ہے۔" وہ زارا کو اتنا لاچار کبھی نظر نہیں آیا تھا۔ اس نے اسے کبھی اتنی محبت سے اسے مخاطب بھی نہیں کیا تھا۔ زارا کو یک دم احساس ہوا کہ وہ بھی الجھا ہوا نظر آتا تھا۔ اس کی ذہنی کیفیت بھی مخدوش ہو سکتی تھی۔ وہ واقعی اگر اس پروجیکٹ کے لیے عمر کی ناراضی مول لے رہا تھا تو یقیناً یہ پروجیکٹ اس کے لیے بہت اہم تھا۔ زارا کچھ نہیں بولی۔ وہ اتنے مضبوط دل کی مالک نہیں تھی کہ محبوب کو اس طرح لاچار بیٹھا دیکھتی اور پھر بھی اپنے موقف پر ڈٹی رہتی۔

"میں پہلے ہی بہت اکتایا ہوا ہوں یار....! میرے ذہن میں بھی ہلچل مچی ہے۔ دل کہتا ہے جو بھی عمر کہہ رہا ہے وہ بھی غلط نہیں ہے۔ میں خود ڈبلن میں بہت کچھ سہہ کر آیا ہوں.... مسلمانوں کے لیے مغرب میں تعصب بڑھ رہا ہے۔ امائمہ کا بھائی دہشت گرد نہیں ہو سکتا لیکن وہ انتہا پسندانہ جذبات تو رکھتا تھا اور یہ بات سب جانتے ہیں۔ اب میں یہ.... کہہ کر تو اس مسئلے سے جان نہیں چھڑا سکتا کہ اوہو! نور محمد تو میرا رشتہ دار ہے اس لیے وہ بہت معصوم ہے۔ دنیا ان باتوں کو نہیں مانتی.... یہاں جو دکھتا ہے وہی بکتا ہے۔ نور محمد گوانتاناموبے میں ہے۔ یہ ہی امر اسے دہشت گرد قرار دینے کے لیے کافی ہے۔ تم بھی سمجھنے کی کوشش کرو۔ یہ پروجیکٹ میرے کیریئر کے لیے بہت اہم ہے۔ میرا ایک ترکش کولیگ اس پروجیکٹ سے علیحدہ ہو گیا ہے۔ میں اب یہ پورا پروجیکٹ ہینڈل کروں گا۔ اس پر صرف میرا نام ہوگا۔ یہ میری شناخت کا ذریعہ بنے گا۔ میری ایک الگ پہچان بن جائے گی صحافت کی دنیا میں.... میں اسے نہیں چھوڑ سکتا۔ کسی قیمت پر نہیں، میرے ساتھ یہ سب مت کرو.... مجھے اکیلا مت کرو.... میری طاقت بنو یار، میری مدد کرو.... مجھے میری شناخت بنانے دو۔"

وہ اس کے چہرے کو ہاتھوں میں لیے بے حد نرم لہجے میں اپنا موقف واضح کر رہا تھا۔ اس کے انداز میں محبت سے زیادہ التجا تھی۔ وہ ایک دوست سے کنارہ کر آیا تھا اور اب یہاں دوسرا کڑا مرحلہ درپیش تھا۔ جان سے بھی زیادہ عزیز کزن جس کے ساتھ اس کی زندگی کی ہر چھوٹی سے چھوٹی خوشی وابستہ تھی اس سے کنارہ کرنے کو تیار بیٹھی تھی۔ زارا چند لمحے اس کے ہاتھوں کی حرارت کو محسوس کرتی رہی۔ وہ ٹھیک ہی تو کہہ رہا تھا۔ وہ اتنا برا نہیں ہو سکتا تھا۔ ہو ہی نہیں سکتا تھا۔

"تم شہوز کی زندگی کا قطب نما ہو.... تمہارا فرض ہے کہ اسے حق اور باطل میں فرق کرنا سکھاؤ۔" جس مقام پر اس کا اعتماد اور توانائی ایک ساتھ کم پڑنے لگی

تھی عین اسی مقام پر اسے آنٹی رافعہ کی بات یاد آگئی۔

"شہروز!" زارا نے اپنے گالوں پر جمے اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھا، پھر اسے اپنے چہرے سے ہٹا دیا، لیکن چھوڑا نہیں۔

"تم بہت ذہین ہو... میں تمہارا مقابلہ نہیں کرسکتی... میں تو عام سی باتیں کرنے والی عام سے انداز میں سوچنے والی لڑکی ہوں، لیکن ایک بات میں بہت اچھی طرح سمجھتی ہوں۔ انسان اپنی ذات کے حوالے سے بہت دیر میں پہچانا جاتا ہے۔ ایک وقت ہوتا ہے وہ بلپ "اپنے خاندان کی نسبت سے جانا جاتا ہے۔ پھر ذات برادریاں اور قبیلے آجاتے ہیں۔ قدرت گنے چنے خوش قسمت انسانوں کو وہ مقام دیتی ہے کہ وہ صرف اپنے نام سے پہچانے جاتے ہیں۔ تمہیں بھی قدرت نے اس مقام تک پہنچا دیا ہے کہ تمہارا اپنا ایک حوالہ ہے۔ ایک شناخت ہے۔"

وہ بات ادھوری چھوڑ کر اس کی جانب دیکھنے لگی تھی۔ اس کا ہاتھ ابھی بھی اس کے ہاتھ میں تھا۔

"شہروز! انسان کتنا بھی سوٹڈ بوٹڈ ہولے، اس کی گفتگو میں کتنے ہی اسرار کیوں نہ جھلکتے ہوں۔ وہ جس قدر چاہے مشہور ہو۔ ایک حد کے بعد اس کی ذاتی شناخت ختم ہوجاتی ہے۔ اس کے بعد اس کی شناخت اس کا مذہب ہوتا ہے۔ اس کا وطن ہوتا ہے اور وہ ان ہی حوالوں سے پہچانا جاتا ہے اور یہ حوالے کبھی نہیں بدلتے۔ اس کی یہ ہی شناخت اہم ہوتی ہے۔ باقی سب پیچھے رہ جاتا ہے۔ تم یو ایس اے چلے جاؤ یا فرانس... ایمی زون کے جنگل ہوں یا کینیڈا کے دور دراز علاقے... تم مسلمان رہو گے... پاکستانی ہی رہو گے۔"

زارا کی توانائی بحال ہو رہی تھی۔ اسے ادا کرنے کو مناسب لفظ مل ہی گئے تھے۔ شہروز نے اسے دیکھا، پھر اس کے ہاتھ سے اپنا ہاتھ چھڑوا لیا۔

"میں یہ بات بہت اچھی طرح جانتا ہوں زارا! اور میرے لیے یہ حوالے بہت اہم ہیں... یہ مجھے اپنی جان سے بھی زیادہ عزیز ہیں۔" وہ عام سے انداز میں بولا تھا۔

"اس لیے شہروز! تمہاری اولین ذمہ داری ان حوالوں کو معتبر بنانا ہے۔ انہیں سنوارنا ہے۔ جس قدر یہ حوالے معتبر ہوں گے، اسی قدر تم معتبر ہوگے۔ تمہیں قدرت موقع دے رہی ہے، اسے پہچانو شہروز... کوئی ایسا کام مت کرو جس سے تم تو معتبر ہوجاؤ، لیکن تمہارے حوالے متاثر ہوں۔ اپنے حوالوں کی توہین مت کرو۔" زارا نے کہا تھا۔

شہروز نے ایک نظر اس کے چہرے پر ڈالی، پھر وہ اپنے ہاتھوں کی جانب دیکھنے لگا تھا۔ وہ کس قدر درست بات کر رہی تھی اور پھر ڈبلن کے پورٹ پر اس کے ساتھ جو ہوا تھا اگر وہ سب اسے کچھ نہیں سکھا پایا تھا تو پھر اسے کچھ بھی... "کچھ" نہیں سکھا سکتا تھا۔ شہروز نے ایک بار پھر اس کے چہرے کو دیکھا۔ یہ چہرہ کس قدر قیمتی تھا اس کے لیے... یہ زارا کا چہرہ تھا... اس کی زارا کا چہرہ... زارا قیمتی تھی اس کے لیے... اور وہ یہ بھی جانتا کہ وہ خود زارا کے لیے کس قدر قیمتی تھا۔ وہ اس کی روح کی ساجھے دار تھی۔ دنیا میں بہت سے لوگ ہوتے ہیں جن سے آپ اس قدر بے تکلف ہوتے ہیں کہ آپ کا وجود ان کے لیے کھلی کتاب کی طرح ہوتا ہے۔ ان سے آپ کچھ نہیں چھپا پاتے، لیکن ان ہی لوگوں میں شاید کوئی ایک آدھ ایسا ہوتا ہے۔ جن کو آپ اپنی روح تک رسائی دیتے ہیں۔ زارا واقعی اس کی روح کا حصہ تھی۔ وہ اس کی احمقانہ باتوں کو رد نہیں کرپاتا تھا تو اس کی اتنی قیمتی بات کیسے رد کردیتا لیکن دوسری جانب اس کا کیریئر تھا۔ جس کو بنانے میں اس کا ایک ایک لمحہ صرف ہو رہا تھا۔ یہ پروجیکٹ اس کے لیے اب مزید اہم ہوگیا تھا۔ عوف بن سلمان نے اسے خود کال کرکے کہا تھا کہ وہ ڈاکومنٹری کی سب ذمہ داریاں اب اکیلے نبھائے گا اور اس کے لیے اسے تمام چینلز پر مکمل پروجیکشن دلوائی جائے گی۔ بین الاقوامی خبر رساں ادارے بھی اسی کا نام لے کر یہ ساری باتیں بریک کریں گے۔

وہ کافی پریشان تھے اور انہوں نے اس بات کا اظہار نہیں کیا تھا کہ تیمور کے اس طرح ان کے پروجیکٹ

سے علیحدہ ہو جانے پر ان کے کاز کو کافی نقصان پہنچ رہا تھا۔ وہ صرف اتنا چاہتے تھے کہ یہ کام جتنی جلدی ممکن ہو' پایہ تکمیل تک پہنچ جائے۔ وہ شہروز کو مزید شہرت کے خواب دکھا دکھا کر پاگل کیے دے رہے تھے۔ مشہور ہو جانے کی خواہش اس کے دریئن دریئن میں پنپ رہی تھی۔

ایسی صورت حال میں زارا کی باتیں اسے جھنجلانے پر مجبور کر رہی تھیں۔ شہرت کی' وہ ہوش اڑا دینے والی دیوی تھی جو بانہیں پھیلائے اسے اپنی آغوش میں لینے کو بے تاب کھڑی دکھائی دیتی تھی' وہ اسے بھی کیسے رد کر دیتا۔ وہ پاگلوں کی طرح اس کی تلاش میں پھرا تھا اور اب جب وہ سامنے کھڑی تھی تو اس کی پھیلی ہوئی بانہوں کو جھٹلا دینا آسان نہیں تھا۔ اس نے اپنے درد کرتے سر کو اپنے ہاتھوں میں گرا لیا تھا۔

☼ ☼ ☼

"شہروز۔۔۔ کیا بات ہے' میرا بیٹا کچھ پریشان ہے؟"

امی کب اس کے کمرے میں آئیں اور کب اس کے پیچھے آکھڑی ہوئیں۔ اسے خبر بھی نہ ہوئی تھی۔ وہ کب سے بالکونی میں کھڑا سامنے سڑک پر سے گزرنے والی گاڑیوں کو دیکھنے میں مگن تھا۔ وہ لاہور ہی میں تھا' ان کے علاقے میں گزشتہ کچھ مہینوں میں تین نئے کیفے ٹیریا بنے تھے۔ جہاں رات گئے تک ہجوم رہتا تھا۔ نوجوان لڑکے لڑکیاں نت نئے فیشن کے دلدادہ باؤلنگ کھیلنے اور شیشہ پینے کے شوق میں وہاں جمع رہتے۔ ان کا علاقہ بہت پرسکون ہوا کرتا تھا' لیکن اب یہاں شور ہنگامہ بہت بڑھ گیا تھا' جس کی بنا پر مقامی آبادی خوش نہیں تھی' لیکن کوئی شکایت بھی نہیں کرتا تھا' کیونکہ تقریباً" ہر گھر سے ایک آدھ بچہ ان کیفے ٹیریا میں اپنی شامیں بتانے کا شوقین تھا۔ ان کیفے کی وجہ سے یہاں ٹریفک کا ہجوم بھی زیادہ رہنے لگا تھا' لیکن شہروز وہاں بنا کسی مقصد کے کھڑا لایعنی سوچوں میں گھرا تھا۔ عجیب سناٹا تھا جو روح پر جمود طاری کر رہا تھا اور عجیب شور تھا جو کانوں کو تکلیف دہ لگتا تھا۔ امی کی آواز سن کر اس نے گہری سانس بھری اور مڑ کر ان کی جانب دیکھا۔ وہ اس کے برابر آگئی تھیں۔

شہروز کچھ نہیں بولا اور پھر سامنے کی جانب دیکھنے لگا۔ بجلی چلی گئی تھی لیکن ایک ہی لمحہ لگا تھا جب تاریکی نے سارے ماحول کو اپنے پنجے میں جکڑ کر' ہڑپنے کی کوشش کی تھی اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے یو پی ایس' جنریٹرز کی بدولت اندھیرا چھٹنے لگا تھا۔ ایک ایک کر کے روشنیاں ہونے لگی تھیں۔ ان کی شدت پہلے سے کم تھی' لیکن پھر بھی تاریکی' شکست خوردہ ایک جانب پڑی صاف محسوس ہو رہی تھی۔ ان دونوں ماں بیٹے نے یہ منظر دیکھا۔

"روشنی کبھی ہار نہیں مانتی نا۔۔۔ تاریکی کتنی ہی ظالم کیوں نا ہو۔۔۔ روشنی اپنا راستہ ڈھونڈ ہی لیتی ہے۔"

امی نے سادہ سے انداز میں کہا تھا۔ وہ اس کی ماں تھیں۔ وہ جانتا تھا کہ وہ ذو معنی باتیں نہیں کرتی تھیں' لیکن اس لمحے اس کو لگا کہ جیسے انہوں نے اس پر طنز کیا ہے۔ وہ سامنے ہی دیکھتا رہا' ان کی بات کا کوئی جواب دیا' نہ کچھ چہرے پر کوئی تاثر ابھرا۔ امی ایک نظر اس پر ڈالتیں اور پھر سامنے دیکھنے لگتیں' لیکن جب وہ کچھ بول کر نہیں دیا تو انہوں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا تھا۔

"کیا بات ہے۔۔۔؟ آج تو میرے پاس بیٹھے بھی نہیں۔۔۔ میں نے سوچا میں خود اپنے بیٹے کے پاس بیٹھ جاؤں کچھ دیر۔ کل تو پھر واپس کراچی چلے جاؤ گے۔"

وہ عام سے انداز میں کہہ رہی تھیں۔ شہروز نے بہت سست سے انداز میں ان کی جانب دیکھا۔ وہ اس کی ماں تھیں۔ اس نے یاد کرنے کی کوشش کی' وہ گزشتہ بار کب ان کے پاس اطمینان سے بیٹھا تھا' کب ان سے جی بھر کر باتیں کی تھیں۔ اسے یاد نہیں آیا تھا۔ وہ اس کی عزیز ترین ہستی تھیں۔ دنیا میں کوئی دوسرا وجود' کوئی دوسرا چہرہ' کوئی دوسری ذات اس کے لیے ان سے زیادہ مقدم نہیں تھی اور اسے یاد نہیں آرہا تھا کہ اس نے گزشتہ بار کب ان سے باتیں کی تھیں۔ ان کی

باتیں کی تھیں۔ اسے آج پتا چلا تھا کہ امی کو شوگر ہو چکی تھی۔ وہ چھ مہینے سے انسولین لے رہی تھیں، اور اسے خبر بھی نہیں تھی۔ اسے پتا بھی نہیں چلا تھا، اور وقت اس کے ہاتھوں سے پھسل کر نکل گیا تھا۔ وہ امی کے ساتھ بہت اٹیچڈ رہا۔ وہ بہت پھرتیلی قسم کی عورت تھیں۔ سارا دن پھرکی کی طرح گھر کے کاموں میں مگن گھومتی پھرتی رہتی تھیں، پھر شام کو ان کے پاؤں میں درد ہونے لگتا تو شہوزان کے پاؤں کا مساج کرتا اور ان کے پاؤں دبا دیتا اور ساتھ ساتھ ان کے پاؤں میں گدگدیاں کرتا رہتا۔ وہ ناراض ہوتیں تو کہتا۔

"امی یہ تو میرا فرض ہے۔ کیونکہ آپ نے ہی مجھے جنت میں لے جانا ہے۔ لیکن آپ مجھے تب ہی جنت تک لے جاسکیں گی نا جب خود ٹھیک سے چلیں گی۔ اس درد کرتے پاؤں کے ساتھ جنت میں کیسے جائیں گے ہم۔"

اس کی ایسی باتیں سن کر وہ ہنسنے لگتی تھیں۔ دونوں بھائی بہت چھوٹی عمروں سے آفس جانے لگے تھے۔ اس لیے گھر میں وقت نہیں دے پاتے تھے، لیکن وہ ہمہ وقت امی کے ساتھ رہنے والا بیٹا تھا۔ امی بھی اس کے لاڈ دونوں دوسرے بیٹوں سے زیادہ اٹھاتی تھیں۔ بہروز بھائی اور مہوز بھائی اسے چڑایا کرتے تھے کہ تم نے ہماری امی ہم سے ہتھیالی ہے۔ اب صورت حال یہ تھی کہ وہی ماں اس لاڈلے بیٹے کی شکل دیکھنے کو ترستی تھی۔

اس کے لیے بھی یہ سب باتیں نصف صدی کا قصہ بن کر رہ گئی تھیں۔ امی کے ساتھ اتوار بازاروں میں پھرنا، انہیں ان کی سہیلیوں کے یہاں لے جانا، ان کے ساتھ ڈائننگ ٹیبل پر بیٹھ کر مٹر کے دانے نکلواتے ہوئے ان سے ڈھیروں باتیں کرنا، خواب کے جیسا لگتا تھا۔ حالانکہ چند سال ہی تو گزرے تھے، وہ ان کے پاس بیٹھ کر انہیں سوئی میں دھاگا ڈال کر دیا کرتا تھا اور وہ اس کی شرٹ کا بٹن ٹانک دیا کرتی تھیں۔

چند سال کہنے کو چند سال تھے۔ ان سالوں میں بہت کچھ بدل گیا تھا۔ اب وہ مصروف کم اور معروف زیادہ ہو گیا تھا۔ اب وہ اچھا لگتا تھا بھلا امی کی سہیلیوں کے گھروں میں جاتا، اتوار بازاروں میں گھومتا یا ان کے ساتھ سبزیاں بنواتا! وہ یہ سب کیسے کر سکتا تھا۔ امی کا چہرہ دیکھتے ہوئے جیسے اس نے ان کی آنکھوں میں وہ سارے دھندلے منظر بھی دیکھ ڈالے تھے۔ ان کا ہاتھ ابھی بھی اس کے کندھے پر تھا۔ یہ ہوتی ہے ماں، جو اولاد کی توجہ کو ترستی ہے مگر اس کی آنکھوں میں چھپی بے چینی اور پریشانی کو ایک لمحے میں محسوس کر لیتی ہے۔

ایک دم سے پتا نہیں کیسے آنکھیں بھیگنے کے قریب ہوئیں۔ اس نے ذرا سا جھک کر ان کا ماتھا چوما تھا۔ پھر اپنا بازو ان کے کندھوں پر رکھ کر انہیں خود سے قریب کر لیا۔ وہ بھی مسکراتے ہوئے اس کے پہلو میں آگئیں اور اپنا بازو اس کی پشت پر پھیلا دیا۔ شہوز کو جیسے سکون سا آگیا تھا۔ اپنے قد سے اونچے بیٹوں کی مائیں سمجھتی ہیں، بیٹے ان کی طاقت ہیں، انہیں یہ نہیں پتا ہوتا کہ ان اونچے بیٹوں کی اصل طاقت ہوتی ہے ماں.... دنیا کی کوئی اداسی دور کرنے والی دوا ماں کے لمس سے زیادہ طاقت ور نہیں ہو سکتی۔ تین چیزیں ہمیشہ انسان کے تناؤ کو کم کر دیتی ہیں۔ ماں کا لمس، اولاد کی مسکراہٹ اور اللہ کے ــــ حضور ــــ ــ رات کی تنہائی میں پچھتاوے میں گھر کر بہایا گیا آنسو....

شہوز نے سکون اور دوا کی پہلی خوراک لے لی تھی۔ امی نے اس کی جانب دیکھا۔

"کیا بات ہے، کن سوچوں میں گم ہو۔ زارا سے جھگڑا ہو گیا کیا؟" امی کے لیے اس کے خراب موڈ کی بس اتنی سی وجوہات ہو سکتی تھیں۔

"سوچ رہا ہوں.... وقت کتنی جلدی بدل جاتا ہے نا امی!" اس نے اسی طرح امی کو اپنے بازوؤں میں لیے سامنے دیکھتے ہوئے کہا تھا۔

"وقت کبھی نہیں بدلتا میرے بچے! حالات بدل جاتے ہیں۔ ترجیحات بدل جاتی ہیں۔ معیار بدل جاتے ہیں۔ دراصل انسان بدل جاتے ہیں.... اور الزام وقت

کے سر آجاتا ہے۔" انہوں نے بھی اپنا ہاتھ اس کی پشت سے نہیں ہٹایا تھا۔ شہروز نے چونک کر ان کا چہرہ دیکھا۔

"امی! آپ کو بھی لگتا ہے میں بدل گیا ہوں۔" اس کے سوال پر امی مسکرائی تھیں اور پھر اس کی جانب دیکھا۔ ان کا انداز ایسا تھا کہ شہروز کو احساس ہوا، کچھ سوالات کبھی نہیں پوچھنے چاہئیں۔ "اچھا... آپ صرف اتنا بتا دیں کہ یہ اچھا ہوا یا برا۔" اب وہ ایسا ضدی بچہ بن رہا تھا جو کسی شرارت پر سرزنش کے بعد دلائل مانگنے لگتا ہے۔

"میں تمہیں ایک کہانی سناؤں... اپنے بچپن کا ایک واقعہ؟" امی نے اس سے سوال کر لیا تھا۔ کسی کڑوی دوائی کو شوگر کوٹڈ کیسے کرنا ہے یہ فقط ممتا ہی جان سکتی ہے۔ امی اسے اسی طرح بیڈ کی سمت لے آئی تھیں۔

"یہاں بیٹھو۔" انہوں نے اسے اپنے سامنے بٹھالیا تھا۔ وہ بھی بلا چوں چراں کیے ان کے سامنے بیٹھ گیا۔ امی اسے بتانے لگی تھیں۔

"میں جب چھوٹی تھی نا... یہ ہی کوئی ساتویں، آٹھویں میں ہوں گی شاید... تب ہم یہاں شادباغ میں اپنے آبائی گھر میں رہا کرتے تھے۔ ان دنوں لکی ایرانی سرکس کا بڑا شور ہوتا تھا۔ ہمارے سب ملنے والے باری باری اپنے بچوں کے ساتھ سرکس دیکھ کر آچکے تھے۔ وہاں کی باتیں سن سن کر ہم سب کزنز کا بڑا جی للچاتا تھا کہ ہم بھی جائیں۔ بالخصوص اس شیر کا بڑا تذکرہ ہوتا تھا جو کرسی پر بیٹھ کر دکھاتا تھا اور اپنے مالک کے پیچھے پیچھے مؤدب گھومتا رہتا تھا، کسی کو ضرر پہنچاتا تھا نہ مالک کے حکم کے بغیر دھاڑتا تھا... ہم سب دیکھنا چاہتے تھے کہ یہ کیسے ممکن ہوا کہ شیر جیسا خوف ناک جانور اتنا فرماں بردار ہوگیا۔" امی کے چہرے پر عہدِ رفتہ کی یاد مسکراہٹ بن کر بکھری تھی۔

"خیر! اللہ اللہ کرکے بڑے ابا یعنی تمہارے دادا سے اجازت لی گئی اور ہم تمہارے بڑے ماموں کی چھوٹی وین میں بھر کر سرکس پہنچے... وہ بڑے مزے کا دن تھا۔ سرکس کے شامیانوں میں ایک الگ ہی دنیا آباد تھی۔ خوب صورت سنہرے لباس پہنے ہوئے سنہری رنگت والی رقص کرتی روسی لڑکیاں، گول سی سرخ ناک لیے گدگداتا ہوا جوکر... اچھل اچھل کر بھاگتے اور پھر گرتے پڑتے بونے نما چھوٹے قد والے انسان... ہم سب بچے بہت خوش تھے... پھر وہ لمحہ آیا جب ہم سب نے بھی اس خوف ناک شیر کو بھیگی بلی بنے اپنے مالک کے پیچھے آتے دیکھا... یہ رونگٹے کھڑے کردینے والا بہت گدگداتا ہوا لمحہ تھا... ایک طرف سب خوف زدہ تھے اور دوسری جانب یہ یقین کہ یہ شیر کسی کو کچھ نہیں کہے گا۔"

امی اتنے دلچسپ انداز میں اپنے بچپن کا واقعہ اسے سنا رہی تھیں کہ اتنی پژمردہ طبیعت کے باوجود ان کی مسکراہٹ دیکھ کر وہ بھی مسکرانے لگا تھا۔

"شیر پورے رنگ میں گول گول گھومنے لگا اور ہم سب حیرت کے سمندر میں غرق اسے دیکھتے تھے۔ ہم سب نے اس لمحے کا کافی انتظار کیا تھا۔ لیکن جانتے ہو کیا ہوا...؟ تمہارے احسان چاچو (عمر کے ابو) ہم سب کزنز میں کافی ذہین تھے، نے سب سے پہلے ناک چڑھائی اور بولے۔ "مجھے یہ بالکل اچھا نہیں لگ رہا۔ سب لوگ تالیاں بجا کر چھوٹے بچوں کی طرح خوش ہو رہے ہیں۔ اس شیر کو دیکھو، ایسا ہوتا ہے شیر...! شیر کو ایسا نہیں ہونا چاہیے۔ شیر کو کبھی بکری کی طرح نہیں ہونا چاہیے۔ یہ کیسا شیر ہے جو نہ اپنی مرضی سے دھاڑ رہا ہے، نہ آنکھیں پھاڑ رہا ہے۔ سر جھکائے اپنے مالک کے پیچھے پیچھے جا رہا ہے۔ مجھے نہیں اچھا لگ رہا ایسا شیر۔"

ان کا کہنا تھا کہ ہم سب باقی لوگ بھی ایسا ہی سوچنے لگے کہ واقعی یہ کیسا شیر ہے۔ وہ تو خوف اور دہشت کی ایسی علامت ہے کہ انسان کے سامنے ہو تو انسان ڈر کے رہ جائے اور اب یہ کیسے بلی کی طرح سر جھکائے چپ چاپ بس اپنے مالک کے تعاقب میں چلا جا رہا ہے۔ ہم سب کی دلچسپی ختم ہو کر رہ گئی۔ ہم سب کے بجھے ہوئے انداز دیکھ کر بڑے ابا نے وجہ پوچھی اور وجہ

جان کر جانتے ہو وہ کیا بولے۔ وہ کہنے لگے۔۔۔

"یہ شیر نہیں ہے بلکہ یہ بکری بن چکا ہے۔" واپسی پر انہوں نے ہمیں ایک بہت ہی کام کی بات بتائی۔ انہوں نے کہا۔ "سرکس میں آکر ہمیں عبرت حاصل کرنی چاہیے کہ شکر ہے اللہ نے ہمیں روزی کمانے کے حلال اور پسندیدہ طریقے سکھا رکھے ہیں۔ ورنہ پیٹ کی طلب تو وہ چیز ہے جو جنگل کے بادشاہ کو بھی جوکر بنا سکتی ہے' اب یہ ہی دیکھ لو۔۔۔ انسانوں نے شیر کو سکھا دیا ہے کہ وہ سر جھکا کر اپنی روش سے ہٹ کر چلے گا تو تالیاں بجیں گی۔ تالیاں بجیں گی تو کھانے کو ملے گا۔ بس وہ تالیاں کماتا ہے اور ان تالیوں کا کھانا کھاتا ہے۔ اسے' اس غرض نے شیر نہیں رہنے دیا۔ اسے بکری بنا دیا ہے۔"

میں نے بڑے ابا کی بات سن کر پوچھا۔ "لیکن بڑے ابا! شیر خوش نظر نہیں آتا کیوں؟"

تو بڑے ابا بولے۔۔۔ "خوش کیسے نظر آئے۔ اب وہ کبھی خوش نہیں رہ سکتا۔ کیونکہ اس کی ترجیحات ہی بدل گئی ہیں۔ اب وہ اچھا ہونے سے زیادہ اچھا لگنے کی دھن میں مبتلا ہو چکا ہے۔" امی خاموش ہو کر اس کا چہرہ دیکھ رہی تھیں۔ شہروز کو کچھ سمجھ میں آیا تھا اور کچھ نہیں۔

"میرے بچے۔۔۔! اتنی سی بات ہے بس۔۔۔! یہ ہی آج کل کے انسان کا المیہ ہے۔ وہ اچھا ہونے سے زیادہ اچھا لگنے کے جنون میں مبتلا ہو چکا ہے۔ اس کا من چاہے کس قدر میلا ہو لیکن اس کا تن' اس کی چمڑی سفید ہونی چاہیے۔ اس کی روح بے شک زبوں حالی کا شکار ہو' لیکن اس کے بدن پر برانڈڈ چیزیں ہونی چاہئیں' تاکہ دیکھنے والی آنکھ اسے چاہے اور سراہے۔ آج کل کے انسان کو واہ واہ چاہیے۔۔۔ اور اس واہ واہ کو سمیٹنے کے چکر میں وہ اپنے مقام سے ہٹتا جا رہا ہے۔ اسے خود پتا نہیں چل رہا کہ شیر بکری بنتا جا رہا ہے۔ تالیوں کی آوازیں اسے اپنے پیاروں کی آوازوں سے زیادہ مرغوب ہوتی جا رہی ہیں۔ ستائش کی لت اسے اندر سے کھوکھلا کر رہی ہے۔ سراہے جانے کی خواہش بری نہیں ہے۔ یہ ہر انسان کے اندر فطری طور پر ہوتی ہے۔ لیکن اگر یہ خواہش مداری کے بندر کی طرح آپ کو ناچنے اور قلابازیاں لگانے پر مجبور کر رہی ہے تو پھر یہ خواہش نہیں بیماری ہے۔ میں تو یہ بھی کہوں گی کہ رزق ہو یا علم۔۔۔ عشق ہو یا ہنر۔۔۔ اگر آپ کو اپنے مقام سے ہٹا کر اپنی گرفت میں جکڑنے لگے تو یہ سب بیماری ہی ہے۔۔۔ اس سے دور رہنا ہی اچھا۔۔۔ اس لیے میرے بچے اب تم خود سوچو کہ تمہارا بدل جانا اچھا ہوا یا برا۔"

وہ اس کے ہاتھ کو اپنے ہاتھ میں لیے کہہ رہی تھیں۔

شہروز نظریں نہ اٹھا سکا تھا۔ امی کے یہ چند الفاظ۔۔۔ الفاظ نہیں تھے بلکہ آئینہ تھے اور اس آئینے میں شہروز کو اپنا عکس رنگین دھاریوں والے لباس' جھالر والی لمبی ٹوپی اور ربڑ کی سرخ ناک کے ساتھ نمایاں نظر آرہا تھا۔ تالیاں کمانے کے چکر میں جنت گنوا رہا تھا وہ۔۔۔ ستائش کی لت اسے۔ بخیہ۔ بخیہ ادھیڑ چکی تھی۔

✡ ✡ ✡

"عہد الست پاکستان کی کہانی ہے۔"

نور محمد نے اپنے سامنے موجود لوگوں کی جانب دیکھتے ہوئے اپنے سادہ مخصوص انداز میں بات شروع کی تھی۔ ہال کھچا کھچ بھرا ہوا تو نہیں تھا لیکن پھر بھی تقریباً" تمام نشستیں پر ہو چکی تھیں۔ میڈیا کے لوگوں کے علاوہ بھی تمام مکاتب فکر کے لوگوں کو سلمان حیدر نے ایک چھت کے نیچے جمع کرنے کی بھرپور کوشش کی تھی۔ میجر اظہر کی بدولت چند ریٹائرڈ آرمی آفیسرز' سول سوسائٹی کے اراکین' ہیومن رائٹس تنظیموں کے کارکن اور اس کے علاوہ ملک کے مشہور مدبر و دانشوروں کی نمائندگی کرتے بہت سے لوگ بھی موجود تھے' کچھ یونی ورسٹیوں اور کالجز کے طلبا بھی آئے ہوئے تھے۔ عمر کی سوشل میڈیا کی تحریک کے باعث نوجوان طبقے کی بھی بھرپور نمائندگی نظر آرہی تھی۔

زارا اکیلی ہی اس کانفرنس کو اٹینڈ کرنے کے لیے آئی تھی۔ شہروز نے اس دن کے بعد سے اس سے کوئی

رابطہ نہیں کیا تھا، لیکن وہ جانتی تھی کہ وہ لاہور میں ہی موجود ہے۔ آنے سے پہلے اس نے آخری کوشش کے طور پر کال کرنے کی کوشش بھی کی تھی، لیکن شہروز نے اس کی کال ریسیو نہیں کی تھی۔ زارا کا دل اس کے رویّے سے بالکل ٹوٹ گیا تھا لیکن پھر بھی وہ یہاں آ گئی تھی۔ سلمان حیدر نے اور آنٹی رافعہ نے اس کے لیے بہت کچھ کیا تھا۔ اس کا یہاں موجود ہونا اس بات کا غماز تھا کہ وہ ان کی دل سے قدر کرتی تھی۔ وہ شہروز کو اپنے ساتھ نہیں لا سکی تھی، لیکن اس نے خود آ کر ثابت کر دیا تھا کہ وہ حق اور باطل میں نہ صرف فرق کر سکتی تھی بلکہ اس میں اتنا حوصلہ تھا کہ وہ حق کا ساتھ بھی دے سکتی تھی۔

اسٹیج پر نور محمد (بل گرانٹ) کے ساتھ پروفیسر آفاق علی اور ان کی اہلیہ بھی موجود تھے۔ اس کے علاوہ بھی کچھ انجان چہرے نظر آ رہے تھے۔ سب سے پہلے حاضرین میں کچھ پمفلٹ بانٹے گئے تھے، جس میں نور محمد کے متعلق چیدہ چیدہ باتیں بیان کی گئی تھیں۔ اس کے بعد پروجیکٹر اور ایل ای ڈی پر وہ ثبوت بھی دکھائے گئے تھے جو تیمور نصار کے ذریعے ان تک پہنچے تھے۔ تیمور نصار خود بھی ہال میں موجود تھا۔ اس ڈاکومنٹری کا ذکر بھی کیا گیا تھا جو نور محمد کی زندگی پر بنائی جا رہی تھی، لیکن اس ساری سازش کا پردہ فاش ہونے پر اس کا ارادہ موخر کر دیا گیا تھا۔

تیمور نصار نے خود اٹھ کر ڈاکومنٹری سے بھی چند حصے پروجیکٹر پر دکھاتے ہوئے کچھ چیزوں کی وضاحت کی تھی۔ مسٹر ٹیڈ نیل اور مسٹر ٹیرن کا ذکر بھی کیا گیا تھا، لیکن ان کے نام کچھ وجوہات کی بنا پر ظاہر نہیں کیے گئے تھے اور انہیں فرضی ناموں کے ذریعے سب کے سامنے پیش کیا گیا تھا۔ وہاں موجود اکثر لوگوں کو پہلے ہی خبر تھی کہ اس ساری تقریب کا مقصد اور موضوع کیا ہے۔ اس لیے جب سوالات کا سیشن شروع ہوا تو لوگوں نے بھرپور حصہ لیا تھا۔

سلمان حیدر، نور محمد (بل گرانٹ) اور تیمور نصار کے پاس ہر سوال کا جواب تھا۔ اسی لیے انہوں نے سو فیصد مستند جوابات دے کر تمام تر ابہام ختم کر دیے تھے۔ سب سے آخر میں نور محمد کی تقریر تھی۔ وہ خود سب سے مخاطب ہو کر پیغام دینا چاہتے تھے۔ ان کی بات شروع ہونے سے پہلے کسی کو اندازہ نہیں تھا کہ وہ "پاکستان" کی بات کرنے والے ہیں۔

"جی ہاں! عہد الست پاکستان کی کہانی ہے اور عہد الست نور محمد کی کہانی بھی ہے۔ لیکن میں اب نور محمد کا ذکر نہیں کروں گا۔ میں ان کے بارے میں آپ کو سب کچھ بتا چکا ہوں۔ میں صرف اس بات کی نشاندہی کرنا چاہتا ہوں کہ آخر اس ساری سازش کی وجہ کیا تھی۔ مجھے کہنے دیجیے کہ کوئی بھی ریاست اس قدر کمزور نہیں ہوتی کہ کوئی بیرونی طاقت اسے جکڑ لے، ہڑپ لے اور کھا جائے۔ کمزور دراصل اس ریاست میں بسنے والے لوگ ہوتے ہیں۔ وہ کمزور پڑتے ہیں تو ریاست کمزور ہونے لگتی ہے۔ پاکستانیوں کی کمزوری نے پاکستان کو کمزور کیا ہے۔ اس کا ذمہ آپ کسی دوسرے کے سر نہیں ڈال سکتے۔ بالکل ایسے جیسے نور محمد کو سب سے پہلے اس کے اپنوں نے کمزور کیا تھا۔ انہوں نے سب سے پہلے اپنے بیٹے کا بھروسہ نہ کر کے، اس کی ناقدری کر کے اسے کمزور کیا تھا۔ باہر والوں نے تو اسے بعد میں استعمال کیا۔ یہ ہی آپ سب اپنے وطن کے ساتھ کر رہے ہیں۔ اسی لیے میں کہتا ہوں کہ عہد الست پاکستان کی کہانی ہے۔" وہ بہت موثر انداز میں اپنی بات کی وضاحت کر رہے تھے۔

تیسری رو میں بیٹھی زارا کو اس سارے عرصے میں یہ باتیں سب سے زیادہ دلچسپ لگی تھیں۔ اس کے ساتھ والی نشست پر بیٹھا ایک نوعمر طالب علم آگے خالی کرسی دیکھ کر اس پر بیٹھ گیا تھا۔ زارا کے ساتھ والی کرسی خالی ہو گئی تھی۔ اس نے دیکھا کوئی اور اس کرسی پر آ بیٹھا تھا۔ اس نے بے دھیانی میں اس جانب دیکھا تھا اور پھر وہ ساکت رہ گئی تھی۔ اس کے ساتھ شہروز آ کر بیٹھ گیا تھا۔ اس نے حیرانی اور خوشی کے ملے جلے تاثرات کے ساتھ کچھ کہنا چاہا، لیکن شہروز نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر اسے خاموش رہنے اور نور محمد کی باتیں

سننے کا اشارہ کیا تھا۔

"میں پاکستان کو نور محمد سے تشبیہ کیوں دیتا ہوں؟ میں سمجھتا ہوں نور محمد بھی وہ ہیرا تھا جس کی قدر نہیں کی گئی اور پاکستان بھی وہ ہیرا ہے جس کی قدر نہیں کی جا رہی۔ میں نے نور محمد کے بچپن کے سب حالات سنے ہیں۔ وہ ایک ایسا بچہ تھا جس کی ذہانت و قابلیت بے مثل تھی اگر اس کی صحیح رہنمائی کی جاتی تو وہ ایسے مشکل حالات سے دوچار نہ ہوتا۔ دنیا اسے الٹے سیدھے القابات دینے سے پہلے سو بار سوچتی، لیکن صد افسوس ایسا نہ ہو سکا اور یہ ہی کچھ پاکستان کے ساتھ ہو رہا ہے۔ یہ ملک ایک جیتا جاگتا معجزہ تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اللہ نے رحم کھا کر آپ لوگوں کو ایک بہترین خطہ عطا کیا تھا لیکن معذرت کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ آپ اسے ویسے سنبھال نہیں پا رہے جیسا کہ اس کا حق تھا۔ میرا ذاتی خیال ہے کہ اس خطے میں بسنے والے لوگ اس کی اساس کو سمجھ ہی نہیں پائے۔"

نور محمد رکے تھے اور پوڈیم پر رکھے گلاس میں سے چند گھونٹ پانی پیا تھا۔

"عہد الست اس زمین کے لیے ایک اساس ہے اور آپ اس اساس سے ہی نظریں چرائے پھرتے ہیں۔

عہد الست کا مطلب کیا؟ لا الہ الا اللہ.... اور... پاکستان کا مطلب کیا۔ لا الہ الا اللہ.... آپ اس خطے سے عہد الست کی نفی کر ہی نہیں سکتے۔ بالکل ایسے جیسے کوئی انسان.... اس عہد کی نفی نہیں کر سکتا کیونکہ اللہ کی وحدانیت کا اقرار اس مٹی کی سرشت میں ہے، بالکل ایسے جیسے یہ میری یا آپ کی سرشت میں ہے۔

آپ کو دنیا کے نقشے پر کوئی دوسرا ایسا ملک نہیں ملے گا۔ وہ آئیڈیالوجی جس کے تحت یہ ملک حاصل کیا گیا تھا وہ آئیڈیالوجی ہی "عہد الست" ہے۔ میں جب بھی تاریخ پاکستان کے بارے میں پڑھتا ہوں تو یہ ہی لکھا دیکھتا ہوں کہ دنیا کے چند مسلمان ایک جگہ جمع ہوئے اور انہوں نے اس بات کا اعلان کیا کہ وہ ایک ایسا خطہ حاصل کر کے رہیں گے جہاں وہ اللہ کے بتائے رستے پر چل سکیں اور اپنی زندگیاں عین اسلام کے مطابق گزار سکیں۔ اس میں صرف وہ کوششیں اور قربانیاں نہیں تھیں جو آپ کے آباء نے اس ملک کو حاصل کرنے کے لیے دیں، بلکہ یہ سچی نیت بھی تھی جو ان قربانیوں اور کوششوں کے پیچھے کارفرما تھی۔ یہ ہی وجہ ہے کہ کوئی کتنی بھی کوشش کر لے اس خطے سے مذہب کو علیحدہ نہیں کیا جا سکتا۔

آپ اس ملک کو سیکولر نہیں بنا سکتے۔ آپ اس ملک کو سیکولر ہونے دے ہی نہیں سکتے۔ آپ میں سے بہت سے لوگ یہ کہتے ہوں گے کہ عقیدہ وطنیت تو دین اسلام میں ہے ہی نہیں.... معاف کیجیے گا میں اس بات سے اتفاق نہیں کرتا۔ یقیناً" اللہ انسان کو اس کے وطن کی بنیاد پر تو نہیں جانچے گا، لیکن ہو سکتا ہے کہ اللہ وہ پاکستانی قوم سے یہ سوال تو ضرور کرے کہ بتاؤ وہ خطہ جس میں تم میرے نام لیوا بن رہنا چاہتے تھے۔ جہاں میری ماننے والے ایک جگہ جمع ہو کر زندگی گزارنا چاہتے تھے، جہاں ان تمام اصول کا نفاذ تمہاری اولین ترجیح تھی جو میں نے زندگی گزارنے کے لیے ضروری قرار دیے تھے تو بتاؤ اس خطے کا کیا حال کر کے آئے ہو؟

آپ اللہ سے اس کے ہی نام پر ایک چیز مانگتے ہیں، اور وہ آپ کو عطا بھی کرتا ہے تو کیا وہ آپ سے سوال نہیں کرے گا؟ پوچھ پڑتال تو ہوگی۔ اس لیے عقیدہ وطنیت پاکستان کے لیے بے حد اہم ہے، تھا اور رہے گا۔ آپ اسلام کو اس سے علیحدہ کر ہی نہیں سکتے۔"

نور محمد کا انداز بیان بالکل سادہ اور رواں تھا۔ وہ لکھی ہوئی تقریر نہیں پڑھ رہے تھے۔ وہ فی البدیہہ اپنا مافی الضمیر بیان کر رہے تھے۔

"مذہب اس وطن کا حوالہ ہے اور یہ وطن آپ کا حوالہ ہے۔ آپ کسی ایک چیز کو بھی دوسری سے جدا نہیں کر سکتے۔ ضرورت صرف اس امر کی ہے کہ آپ اپنے حق کو پہچانتے ہوئے اپنے فرائض کو ادا کرنے کی سعی کیجیے۔ ریاست وہاں بسنے والے ہر شہری کی وراثت ہوتی ہے اور وراثت کی دیکھ ریکھ نہ کی جائے تو اچکے

اسے لوٹ کر لے جاتے ہیں۔ اپنی ریاست کی حفاظت کیجیے۔ یہ ریاست آپ کا حق ہے اور اس کی حفاظت آپ کا فرض ہے۔ آپ سب کا۔۔۔ اور اب میں جو بات کرنے لگا ہوں۔۔۔ وہ سب سے اہم ہے۔" ان کے اس جملے نے سب کو مزید متوجہ کیا تھا۔

"ریاست سات ستونوں پر چلتی ہے۔ اس کا سارا وزن۔۔۔ یہ سات ستون اٹھاتے ہیں۔ اس میں بلا تخصیص سب لوگ ہی آجاتے ہیں۔ سیاست دان' فوج۔۔۔ کھلاڑی' وکیل' صحافی' مدبر و دانشور' اداکار' ڈاکٹر' انجینئرز' بزنس مین' ہنرمند' ریاست ان ہی افراد کے کندھوں پر چڑھ کر ترقی کرتی ہے۔ اب یہاں اپنی صورت حال دیکھیے۔ یہ تمام شعبے کرپشن کا شکار ہیں۔ ڈاکٹر ہو یا انجینئر۔ صحافی ہو یا پولیس مین۔۔۔ سب صرف اپنی غرض کے محتاج ہیں۔ جس کا جہاں اور جتنا بس چلتا ہے وہ اپنے مفاد کی خاطر اتنی کرپشن کر رہا ہے' لیکن اس کے باوجود یہ ملک سلامت ہے۔"

وہ سانس لینے کو رکے تھے اور اب ان کے سامنے بیٹھا مجمع شرمسار نظر آتا تھا۔

"آپ لوگوں کو یہ امر بے شک حیران نہ کرتا ہو' لیکن مجھے ضرور کرتا ہے کہ آخر ساتوں ستونوں کے اس قدر کمزور ہونے کے باوجود اللہ نے اس ریاست کو کس کے سہارے چھوڑ رکھا ہے۔ میرے دوستو! آپ حیران مت ہوں' دراصل ریاست کا ایک آٹھواں ستون بھی ہے اور وہ اس ریاست کی "ماں" ہے۔

وہی دراصل کسی ریاست کی طاقت کا سب سے بڑا منبع ہوتی ہے۔ ساتوں ستون کمزور پڑ جائیں تب بھی کوئی ریاست کمزور نہیں پڑتی' لیکن اگر یہ آٹھواں ستون کمزور پڑ جائے تو ریاست میں دراڑیں پڑ جاتی ہیں۔ وہ کمزور ہونے لگتی ہے۔ اس خطے کو اللہ نے بہت طاقت ور ماں سے نوازا تھا۔ مجھے افسوس کے ساتھ کہنا پڑ رہا ہے کہ اس خطے کی ماں کمزور ہوتی جاتی ہے۔ آج کی ماں اپنے بچے کو سکھاتی ہے کہ تم سب سے بہترین ہو۔ تمہارے مقابلے کا دنیا میں دوسرا کوئی نہیں۔ جاؤ اور جاکر سب کو پیچھے چھوڑ دو۔ ماں کو احساس بھی نہیں ہوتا کہ اس سبق سے کتنے بگاڑ پیدا ہوتے ہیں۔ یہ سب کو پیچھے چھوڑ دینے والا سبق کیوں سکھاتی ہے ماں۔۔۔ وہ یہ کیوں نہیں سکھاتی کہ سب کو ساتھ لے کر چلو۔۔۔ اسی میں بھلائی ہے۔۔۔ خیر ہے۔۔۔ وہ کسی نے کیا خوب کہا ہے نا کہ اگر آپ چاہتے ہیں کہ آپ کا بچہ نیک بنے تو آپ کو اپنے ہمسائے کے بچے کو بھی نیک بنانا پڑے گا کیونکہ آپ کے بچے نے گھر سے نکل کر ہمسائے کے بچے کے ساتھ ہی کھیلنا ہے۔

اب یہ فیصلہ آپ خود کریں کہ اللہ نے کتنے گھروں تک ہمسائے کی حد بندی کی ہے۔ چالیس گھر۔۔۔ یاد رکھیں چالیس گھر تک' مسلمان کے ہمسائے ختم نہیں ہوتے۔

ایک ماں کی ذمہ داری ان چالیس گھروں کے بچوں کو سنوارنے کی ہے۔ معاشرے تب ہی متوازن ہوتے ہیں' ورنہ آپ اپنے بچے کو جتنا مرضی "بہترین" بنالیں۔ وہ نہیں بن سکتا۔ اس لیے اپنی اولاد کو گھڑ دوڑ کا گھوڑا نہ بنائیں۔ اسے آگے بھاگنا مت سکھائیں۔ اسے سب کے ساتھ مل کر بھاگنا سکھائیں۔ اپنی ذمہ داریوں کو پہچانیں۔

اپنی ریاست کی ماں کو ان کاموں میں خوار مت کریں جس کے متعلق اللہ نے اس سے سوال نہیں کرنا۔ اللہ کو اس کے گورے رنگ سے غرض ہے' نہ اس کے بیش قیمت مہنگے لباس سے۔ اللہ کو غرض ہے اس کی اولاد کی تربیت سے' جسے پیمانہ بنا کر وہ جنت کا حصول آسان کردے گا۔ ماں مجسم عہد الست ہے۔ وہ مجسم دس ہے۔ یعنی اگر وہ دین (اکائی) و دنیا (صفر) کے متوازن رستے پر ہے تو ہی اس کا بچہ "بہترین" ہے۔

یہ ہی عہد الست ہے۔" وہ خاموش ہو گئے تھے۔

زارا نے شہروز کی طرف دیکھا۔ وہ بس یک ٹک سامنے نور محمد کی طرف دیکھ رہا تھا حالانکہ وہ خاموش ہو چکے تھے اور پوڈیم سے ہٹ رہے تھے۔ ہال میں اب بھنبھناہٹ سی شروع ہو گئی تھی۔

"میری وجہ سے یہاں آئے ہو۔" زارا نے اسے مخاطب کرنے کے لیے پوچھا تھا۔

وہ خود اتنی سحرزدہ تھی کہ سمجھ نہیں آرہا تھا اسے کیسے مخاطب کرے۔

"نہیں۔" شہروز نے اس کی جانب دیکھے بنا کہا تھا۔ زارا مصنوعی ناراضی سے اسے دیکھ کر بولی۔

"مجھے پہلے ہی پتا تھا۔" شہروز نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر کھڑا ہوا تھا پھر زارا نے اسے سامنے کی جانب جاتے دیکھا۔ چند لمحوں بعد وہ نور محمد کے قریب کھڑا نظر آیا تھا۔ زارا نے دیکھا وہ ان سے ہاتھ ملا رہا تھا پھر اس نے سلمان حیدر سے ہاتھ ملایا تھا۔ تعمور نصار نامی شخص کو اس نے گلے سے لگایا تھا۔ اس کے چہرے پر پھیلی روشنی زارا کو دور سے بھی محسوس ہو رہی تھی۔

یہ عہد الست کی روشنی تھی۔ زارا نے سکون کا سانس لیا تھا۔ شہروز کی جانب سے اتنا سکون اسے پہلے کبھی نصیب نہیں ہوا تھا۔

☆ ☆ ☆

"اس بار جو لوگ رہا کیے جا رہے ہیں۔ ان میں یہ نام بھی شامل کردیں۔"

اس بارعب اونچے لمبے جیلر، جس کا نام ولیم ڈیرک تھا لیکن وہ اپنے ماتحتوں میں جیلر ڈوڈی کے نام سے مشہور تھا نے اپنے سامنے بیٹھے ماتحت کو ایک چٹ پکڑائی تھی۔ اس ماتحت نے جسے سب اس کی غیر موجودگی میں جیلر ڈوڈی کی گرل فرینڈ کہتے تھے، ذرا سا آگے ہو کر وہ چٹ اپنے سامنے کرلی۔

"نمبر دو سو ایک؟ اس کو ریلیز کرنا ہے؟" وہ دہرا رہا تھا۔ چہرہ استفہامیہ انداز میں آفیسر کی جانب نظریں گاڑے ہوئے تھا۔ جیلر نے کچھ نہیں کہا تھا۔ وہ اپنے سامنے بڑی فائل کو دیکھنے میں مگن تھا۔ اس نے اطمینان سے وہ فائل دیکھی تھی، پھر ان پر اپنے دستخط کرکے مہر بھی لگا دی تھی۔ اس اثنا میں وہ ماتحت سامنے بیٹھا رہا تھا۔ جیلر ڈوڈی نے اس بار اس کا استفہامیہ انداز بغور دیکھا تھا پھر اس نے بھی آنکھوں میں سوال کیا تھا کہ وہ کیا جاننا چاہتا ہے۔

"وہ لسٹ فائنلائز ہوگئی تھی۔ چالیس لوگ پہلے ہی منتخب ہو چکے ہیں۔ ان میں پہلے ہی انیس پاکستانی ہیں۔ اب ایک اور پاکستانی رہا کرنے کا مقصد؟" ماتحت نے سوال کیا تھا۔

"نمبر دو سو ایک پاکستانی ہے؟" جیلر ڈوڈی نے کچھ حیران ہو کر پوچھا۔

"ہاں... پاکستانی ہے...." اس نے مودب انداز میں کہا تھا۔

"اچھا... لیکن یہاں تو اسے برٹش لکھا اور ظاہر کیا گیا ہے۔" جیلر ڈوڈی واقعی حیران تھا۔

"سر ایتھنک پاکستانی ہے۔ برطانوی شہریت لے لی تھی بعد میں.... الہا جرون کے ساتھ نام لیا جاتا رہا ہے اس کا۔" اس ماتحت کو زبانی کلامی اتنا ہی یاد تھا۔ جیلر ڈوڈی نے سر ہلایا۔ "الہا جرون کے ساتھ؟ افغانیوں کے ساتھ بھی رابطے رہے ہوں گے۔" جیلر ڈوڈی نے پوچھا تھا۔ ماتحت نے طنزیہ انداز میں مسکرا کر نفی میں سر ہلایا۔

"پاگل ہے سر.... حواس کام نہیں کرتے اس کے۔ میرا نہیں خیال اس کا کسی سے بھی رابطہ ہوگا۔"

"اس کا مطلب مستند قسم کا معصوم ہے؟" جیلر ڈوڈی بھی اسی انداز میں ہنسا تھا۔

"سو فیصد معصوم تو نہیں ہو سکتا۔ اشتعال انگیز تقریریں تو کرتا رہا ہوگا۔ اس کے ریکارڈ میں لکھا تھا کہ ہائی اسکول میں ٹاپ رینکرز میں سے تھا۔ ذہین ہوگا لیکن اب بالکل بے ضرر ہو چکا ہے۔" وہ ماتحت اپنے سینئر کی دلچسپی کو محسوس کرکے مزید مستعد انداز میں بولنے لگا تھا۔

"اچھی بات ہے۔ اتنی سزا تو ملنی چاہیے تھی۔" جیلر ڈوڈی نے سر ہلایا۔

"ہمارے پاس کب سے ہے؟" جیلر ڈوڈی نے اگلا سوال کیا۔

"سر سیون سیون لندن دھماکوں کے بعد ہماری تحویل میں آیا تھا۔ چھ ماہ اسکاٹ لینڈ یارڈ کے پاس تھا لیکن میں اس کی تصدیق کرکے آپ کو بتاؤں گا؟"

ماتحت نے مودب ہو کر کہا' جیلر ڈوڈی نے ہاتھ کے اشارے سے نہیں کا اشارہ کیا' پھر چہرے پر ناپسندیدگی بھی جھلکی۔

"مجھے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ بس یہاں سے گیا تو ہمارا کام ختم..... آپ صرف اپنی کارروائی پوری کریں' اور اس کا نام بھی فائنل لسٹ میں ڈال دیں اور بھجوا دیں۔ مزید کام مت بڑھائیں۔ یہ برٹش وز تو ہمارا کام ویسے بھی کبھی ختم نہیں ہونے دیتے۔ اب جب لسٹ فائنل ہو چکی تھی تو حکم آگیا کہ اس قیدی کو بھی ریلیز کر دو۔" جیلر ڈوڈی نے برا سا منہ بنایا۔

"کوئی ہائی فائی ایشو اٹھ کھڑا ہوا ہو گا سر۔ ورنہ ان کی عادت تو نہیں ہے ایسی۔" ماتحت نے بھی سر ہلایا۔

"ہائی فائی ایشو نہیں ہے۔ بس اپنے ہاتھ صاف رکھنا چاہتے ہیں۔ اس قیدی کی زندگی پر کوئی ناول لکھا گیا ہے۔ جس میں اس سازش کا ذکر ہے کہ اسے کیسے ریڈیکل قرار دے کر امریکن تحویل میں دیا گیا جبکہ یہ معصوم اور بے ضرر انسان تھا۔ اب مسئلہ یہ ہے کہ ناول بھی کسی مشہور برٹش نیشنل نے لکھا ہے۔ جس کے آباؤ اجداد کو ان کی ملکی خدمات کے سلسلے میں نائٹ کا خطاب بھی دیا گیا تھا۔ عوامی سطح پر اس کی بات کو بہت اہمیت دی جاتی ہے۔ وہ شخص خود مسلمان ہو چکا ہے۔ اور اس نے اس ناول میں ثابت کیا ہے کہ اسلام کے ماننے والوں کے خلاف سازشیں کی جا رہی ہیں۔ سوشل میڈیا پر بھی اس کا بہت ذکر ہو رہا ہے۔ اس ناول کی مخالفت میں ایک ڈاکومنٹری بھی تیار کی جا رہی تھی' لیکن آخر میں اس کے تیار کرنے والے بھی اپنی بات سے منحرف ہو کر ناول لکھنے والے کی حمایت میں اٹھ کھڑے ہوئے۔ یہ ہی وجہ ہے کہ پبلک کافی تنقید کر رہی ہے۔ سوال سے پہلے کہ پبلک میں مزید بے چینی پیدا ہو یہ خود کو کلین چٹ دلوانے کے لیے اس کی فوری رہائی چاہتے ہیں۔ ہمارا کیا جاتا ہے۔ ہم نہ تین میں نہ تیرہ میں۔ تم بس جلد از جلد پیپر ورک ختم کر کے اسے ریلیز کر دو۔ یہ پہلے اسکاٹ لینڈ یارڈ والوں کی تحویل میں دیا جائے گا۔ پھر وہاں سے جہاں مرضی جائے' ہمیں کیا' خیر تم چھوڑو ان سب باتوں کو۔ آؤ ذرا مجھے اچھا سا مساج دو۔"

جیلر ڈوڈی نے اس کی جانب دیکھتے ہوئے گردن کو دائیں بائیں ہلاتے ہوئے اپنی تھکن کو ظاہر کیا تھا۔ وہ ماتحت مسکراتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

✡ ✡ ✡

وہ عجیب رات کے پچھلے پہر کا منظر تھا۔

گھنٹہ بھر پہلے بارش برس برس کر اتنی ہلکان ہوئی تھی کہ اب تھک کر منہ چھپائے آسمان کی گود میں چھپ سی گئی تھی' لیکن چاروں طرف جل تھل ہو گیا تھا۔ رات کا سناٹا ہر طرف پھیلا ہوا تھا۔ جھینگر کی آوازیں اور اسٹریٹ لائٹ کے گرد اڑنے والے پروانوں کی بھنبھناہٹ آپس میں گڈمڈ ہوئی جاتی تھیں' جس کے باعث فضا میں ارتعاش سا آیا ہوا تھا۔ چاند کی کوئی آخری تاریخ تھی تب ہی آسمان پر چاند کا نام و نشان بھی نہ نظر آتا تھا۔ بادل اپنا کام نپٹا کر اب چھٹ چکے تھے۔ آسمان پر تاروں کی مکمل اجارہ داری زمین والوں کو دور سے محسوس ہو جاتی تھی۔ ماحول پر سکوت تھا' نہ سکون تھا' اسی وجہ سے رات ہیبت زدہ دکھائی دیتی تھی۔ رات نے ہر ذی روح کو اپنے مسکن میں محصور ہو جانے پر مجبور کر رکھا تھا۔ اسی لیے جب رات کے اس پچھلے پہر پروفیسر آفاق علی کے گھر کے باہر ایک گاڑی آکر رکی تو کسی کو کانوں کان خبر بھی نہ ہوئی تھی' حتیٰ کہ گھر والے خود بھی بے خبر بستر میں دبکے ہوئے تھے۔ گھر کی اطلاعی گھنٹی بجائی گئی تھی اور تین بار کے بعد گھر کے سناٹے بھرے ماحول میں ہلچل پیدا ہوئی تھی۔ پھر روشنیاں جلنے لگی تھیں۔

"کون ہے..... ! اس وقت کون ہو سکتا ہے؟" اس قسم کے سوال ایک دوسرے سے پوچھے جا رہے تھے۔ دروازہ کھولا جائے یا نہ کھولا جائے کی بحث آنکھوں ہی آنکھوں میں جاری تھی۔ آفاق علی گیٹ کے ذرا قریب تھے اور ساتھ ہی ان کا ملازم بھی موجود تھا جبکہ مسز آفاق علی اپنے مخصوص انداز میں شال اوڑھے

برآمدے کے دروازے کے قریب مضطرب نظر آتی تھیں۔

"یہ آفاق علی کا گھر ہے؟" جب اندر یہ ہلچل مچی ہوئی تھی تو باہر سے اچانک سوال پوچھا گیا تھا۔ سوال پوچھنے والے کی آواز بھاری اور بارعب تھی۔ پروفیسر صاحب کا اتنا تجربہ تو تھا کہ وہ آواز سے یہ اندازہ لگا سکتے کہ ان کے متعلق اس وقت سوال کرنے والا کیا مقصد لے کر آیا ہو گا۔ انہوں نے انٹرکام اٹھا کر کان سے لگایا تھا۔

"جی میں آفاق علی ہوں۔ یہ میرا ہی گھر ہے۔" انہوں نے عجیب سی امید میں گھر کر بتایا تھا۔ کافی دن ہو گئے انہیں کچھ اچھی اطلاعات ملی تھیں لیکن باربار استفسار پر بھی کچھ حتمی طور سے نہیں پتا چل سکا تھا۔ وہ انتظار کے طویل اور کڑے سفر کے سب سے مشکل مرحلے سے گزر رہے تھے۔ یہ تکلیف اس لمحے کے جیسی تھی جب بچہ ماں کی گود میں آنے والا ہوتا ہے' لیکن آیا نہیں ہوتا۔ پروفیسر آفاق علی مرد تھے لیکن وہ اس "دردزہ" کو اپنی اہلیہ کے ساتھ لمحہ لمحہ محسوس کررہے تھے۔ ان کی چھٹی حس نے الارم سا بجا کر یک دم جیسے انہیں یقین دلایا تھا کہ کوئی اچھی خبر ملنے ہی والی ہے۔ ان کا دل چاہا وہ "فوراً" سے پیش تر گیٹ کھول دیں' لیکن احتیاط بھی لازم تھی۔ حالات اب کسی پر یقین نہ کرنے کا مشورہ دیتے تھے۔ چوری چکاری کی وارداتیں اب نئے نئے طریقوں سے کی جانے لگی تھی۔ اس لیے وہ چھٹی حس کی اس غیر متوقع الارم کو من و عن مان لینے میں بھی متامل تھے۔

"نور محمد آپ کا ہی بیٹا ہے؟" دوسرا سوال پوچھا گیا۔ پروفیسر صاحب ہی نہیں اچھلے تھے' گیٹ سے ذرا ہٹ کر کھڑی ان کی اہلیہ بھی جھٹکا کھا کر گیٹ کے قریب آگئی تھیں۔

"جی جی... میرا ہی بیٹا ہے۔ میرا بیٹا ہے۔" انہوں نے وفور جذبات میں گھر کر جملہ دہرایا تھا۔

"آپ کا بیٹا ہمارے ساتھ ہے۔ دروازہ کھولیں۔" خوش خبری سنا دی گئی تھی۔ دردزہ کی اذیت جیسے ختم ہو گئی تھی۔ ان کا بیٹا انہیں مل گیا تھا۔ انہوں نے کپکپاتے ہاتھوں اور دھڑکتے دل کے ساتھ گیٹ کھول دیا تھا۔

"یہ نور محمد ہے!" ایک لاغر' جھکا ہوا' بے رنگ و رونق چہرے والا وجود دروازہ کھولتے ہی ان کے سامنے آگیا تھا۔ انہوں نے بے یقینی سے اس کی جانب دیکھا' پھر اپنی اہلیہ کی جانب دیکھا۔

یہ کہیں سے میرا بیٹا نہیں لگتا۔ انہوں نے سوچا تھا۔ ان کی اہلیہ ان کو ذرا سا پیچھے دھکیل کر آگے آئی تھیں۔ بے یقینی ان کی نگاہوں میں بھی تھی۔ وہ ان کا بیٹا تھا یا ایک تھکی ماندہ بھیڑ... انہوں نے اپنے لرزتے ہاتھوں سے اس کا ہاتھ تھاما تھا۔

"امی... میں نور محمد... میں فیل ہو گیا تھا نا!" ان کا ہاتھ جیسے لرزتا تھا' اس بھیڑ کی آواز اس سے زیادہ لرزتی ہوتی تھی۔

"کیا وہ ان کا ہی بیٹا تھا؟" انہوں نے خود سے سوال کیا تھا۔ ان کے ہاتھوں نے اس کے لمس کو محسوس کیا تھا۔ بجلی آسمان پر بھی نہیں چمکتی' یہ کبھی کبھی وجود پر بھی چمکتی ہے اور لمحہ بھر کے لیے ہی سہی لیکن کچھ ایسی چیزیں واضح ہو جایا کرتی ہیں' جنہیں عام حالات میں عقل و شعور تسلیم کرنے سے انکاری ہوتے ہیں۔

"میرا بیٹا... میرا بچہ... میرا نور محمد۔" ان کے گلے سے آواز نہیں نکلی تھی' یہ ایک چیخ تھی۔ کراہ تھی اور ایسی چیخ' ایسی کراہ ان کے حلق سے تب بھی نہیں نکلی تھی جب انہوں نے اس بچے کو جنم دیا تھا۔ انہوں نے فرط جذبات سے مغلوب ہو کر اسے اپنی بانہوں میں بھر لیا تھا۔ پروفیسر صاحب کو مزید کسی گواہی کی ضرورت نہیں تھی۔ عورت کی گواہی چاہے آدھی ہو' لیکن ایک ماں کی گواہی کبھی آدھی نہیں ہوتی۔ وہ ان کا نور محمد ہی تھا۔

☆ ☆ ☆

"میں ٹھیک نہیں رہتا۔ میری طبیعت ناساز ہے۔" اس چھوٹے سے بچے جس کے وجود پر اس سے

بڑے سائز کا سرخ چغہ تھا جو اتنا بڑا تھا کہ اس کے پاؤں بھی نظر نہیں آرہے تھے نے اپنی آواز میں مصنوعی نقاہت پیدا کر کے اپنے سامنے بیٹھے دوسرے چھوٹے بچے سے کہا تھا۔ اس بچے نے اپنے چہرے پر کالے مریم کی بڑی سی عینک ٹکا رکھی تھی۔ اس نے بھی اپنے وجود سے بڑے سائز کا اوور کوٹ ٹانگ رکھا تھا' اس کی گردن کے گرد اسٹیتھو اسکوپ نہیں بلکہ ایک ہیڈ فون لٹک رہا تھا' جس کے ساتھ جڑی تار اسی کے اوور کوٹ کے اندر جارہی تھی۔

وہ دونوں ایک چھوٹے سے اسٹیج پر کھڑے تھے۔ ان کے سروں پر شامیانہ لٹک رہا تھا جبکہ ان کے سامنے ان ہی کے ساتھ پڑھنے والے دوسرے بچے' ان کو پڑھانے والے اساتذہ' مختلف سرگرمیوں میں ان کی مدد کرنے والے ہنر مند لوگ' کبھی کبھی ان سے ملنے کے لیے آنے والے بڑی عمر کے چند مخصوص افراد' ان کی پرنسپل جنہیں وہ سب باجی آمنہ کہتے تھے' اور ان کے بیو بھائی جو ہر اتوار انہیں ملنے کے لیے ضرور آتے تھے۔ ان کے علاوہ چند دوسرے نئے مہمان بھی موجود تھے۔ وہ مل ملا کر پچاس پچپن لوگوں کا مجمع تھا جن کی نگاہیں ان دونوں بچوں پر مرکوز تھیں جس کی بنا پر وہ تھوڑا سا کنفیوژ بھی تھے لیکن ان کی ٹیچر باجی نے سختی سے ہدایت کی تھی کہ گھبراہٹ ہو تو ایک دوسرے کے چہرے کی طرف دیکھنا۔ خبردار! سامنے مت دیکھنا۔ اسی لیے وہ کافی اچھا پرفارم کر رہے تھے۔

"آپ کی یہ کیفیت کب سے ہے؟" ڈاکٹر بنے ہوئے بچے نے' مریض بچے کی نبض چیک کرنے کے لیے اس کی ہتھیلی پکڑتے ہوئے سوال کیا تھا۔ اس کے چہرے پر تاسف تھا' جیسے ایک نظر میں سمجھ گیا ہو کہ مریض کی حالت واقعی کافی خراب ہے۔ وہ وقتاً" فوقتاً" اس کے وجود پر ٹکے لال چغے کی چٹکیاں کاٹ کر نہ جانے کیا چیک کرنے کی کوشش کرتا تھا۔

"ایک ہفتے سے زیادہ ہو گیا ہے۔ بہت عجیب کیفیت میں ہوں۔" اس بچے نے آواز میں مزید نقاہت طاری کی تھی۔

"کیا محسوس کرتے ہیں؟" ڈاکٹر بچے نے دوسرا سوال کیا تھا۔

"دل چاہتا ہے بس ہر وقت یہ ہی کہتا رہوں۔ پاکستان میں کچھ نہیں رکھا۔ پاکستان میں کچھ نہیں رکھا۔ پاکستان میں کچھ نہیں رکھا۔" وہ بچہ سخت تکلیف کے عالم میں بولتے ہوئے گردن بھی ہلا رہا تھا۔ اس کی ایکٹنگ اتنی اچھی تھی کہ سامنے بیٹھے اکثر لوگوں کے چہرے پر مسکراہٹ بکھر گئی تھی۔

"اوہو....! آپ تو واقعی بیمار ہیں۔" ڈاکٹر بچے نے تاسف سے سر ہلایا۔ مریض بچہ اب کی بار کچھ نہیں بولا تھا۔

"آپ بتا سکتے ہیں کہ ایسی کیفیت ہوئی کیسے.... آپ کی روٹین میں کوئی تبدیلی آئی ہے؟" ڈاکٹر بچے کے چہرے پر سوچوں کا جال بکھرا تھا وہ بار بار اپنے ہاتھ میں پکڑے پین کا کونا منہ میں دبا لیتا تھا۔

"میں آج کل نیوز چینلز بہت دیکھ رہا ہوں۔ ایسے پروگرامز بھی بہت دیکھتا ہوں' جن میں پاکستان کے مسائل اور خامیوں کی نشاندہی کی جاتی ہے اور اتنی زیادہ کی جاتی ہے کہ سن سن کر میرے اعصاب تھک جاتے ہیں۔ میں رات کو سوتے ہوئے بھی ان ہی مسائل کے بارے میں سوچتا رہتا ہوں۔ اس وجہ سے میں ایسا بیمار سا ہو گیا ہوں۔" اس بچے نے اپنی بانہیں پھیلا کر اپنے وجود کی لاچاری اور سرخ رنگ کو ظاہر کیا تھا ان کے انداز اتنے اچھے لگ رہے تھے کہ سب کو ہی ان میں دلچسپی محسوس ہو رہی تھی۔

"اوہو.... یہ ہی تو غلطی کرتے ہیں لوگ.... مسائل اور خامیوں کو سر پر سوار کرنے سے آپ بیمار ہو گئے ہیں۔ اس سے بہتر تھا کہ آپ ان مسائل اور خامیوں کا حل تلاش کرنے میں محنت کرتے تو آپ کبھی بیمار نہ ہوتے۔ میں آپ کا ایک ضروری ٹیسٹ کرنا چاہتا ہوں۔" ڈاکٹر نے اپنی پاکٹ میں ہاتھ ڈال کر کوئی بٹن آن کیا تھا اور اپنی گردن میں لٹکا ہیڈ فون مریض بچے کے کانوں سے لگا دیا تھا۔ وہ مریض بنا بچہ چند لمحے ساکت بیٹھا رہا' پھر اس کے وجود میں ہلکی سی لرزش

ہونے لگی تھی۔ ڈاکٹر بچے نے جیب میں ہاتھ ڈال کر فوراً بٹن بند کردیا تھا۔ "مجھے پہلے ہی شک تھا... آپ میں ہیمو گلوبن کم ہوگیا ہے۔" ڈاکٹر بچے کے چہرے پر پریشانی چمکی تھی۔ مریض بچہ بھی پریشان ہوگیا۔

"اللہ اکبر... یہ ہیموگلوبن کیا ہے اور اب میرا کیا ہوگا۔ کیا میں کبھی ٹھیک نہیں ہوسکتا؟" اس نے بے ساختہ پوچھا تھا۔ حاضرین کے چہروں پر مسکراہٹ اور اشتیاق ایک ساتھ بڑھ رہا تھا۔

"ایسا کیوں سوچتے ہیں آپ... ابھی علاج کیے دیتے ہیں آپ کا۔" اس ڈاکٹر بچے نے کہا تھا۔

"یہاں میرے ساتھ کھڑے ہوجایئے۔" اس ڈاکٹر بچے نے کہا۔ مریض بچے نے اس کے کہے پر عمل کیا تھا۔ وہ دونوں حاضرین کی طرف منہ کرکے کھڑے ہوگئے۔

"اپنا دایاں ہاتھ سینے پر رکھ لیجیے۔ جس مقام پر آپ کا دل دھڑکتا ہے عین اس مقام پر اپنا دایاں ہاتھ رکھ لیجیے۔" ان دونوں نے اپنا دایاں ہاتھ سینے پر رکھ لیا تھا۔

"اب میرے ساتھ دہرایئے... لا الہ الا اللہ محمد الرسول اللہ... لا الہ الا اللہ محمد الرسول اللہ... لا الہ الا اللہ محمد الرسول اللہ۔" وہ کلمہ پڑھنے لگا تھا۔ دوسرا بچہ بھی اس کا ساتھ دینے لگا تھا۔ ان دونوں نے تین بار کلمہ دہرایا تھا۔

"اب اسی انداز میں تین بار دہرایئے... پاکستان کا مطلب کیا۔ لا الہ الا اللہ... پاکستان کا مطلب کیا... لا الہ الا اللہ... پاکستان کا مطلب کیا... لا الہ الا اللہ..."

وہ دونوں تو پڑھ ہی رہے تھے۔ سامنے بیٹھے لوگوں میں سے بھی کچھ لوگ ان ہی کے انداز میں سینے پر ہاتھ رکھے اسی طرح دہرا رہے تھے۔ ان میں سب سے نمایاں وہیل چیئر پر بیٹھا ایک لاغر سا وجود تھا جو بے حد کمزور تھا اور اس کی آواز میں عجب سی لرزش تھی، لیکن وہ اپنی پوری طاقت صرف کرتے ہوئے ان بچوں کے ساتھ سب دہرا رہا تھا۔ اس کے ماں باپ بھی اس کے ساتھ بیٹھے تھے اور اپنے بیٹے کے انداز میں ہی یہ سب کررہے تھے۔ ان تینوں کے ساتھ سلمان حیدر بیٹھا تھا اور سلمان کے ساتھ اس کی امی تھیں۔ انہوں نے بھی اپنا ہاتھ سینے پر رکھا ہوا تھا اور وہ بھی اسی طرح ان بچوں کے ساتھ دہرا رہے تھے۔ ان کی دیکھا دیکھی تقریباً سب ہی لوگ ایسا کرنے لگے تھے۔ بڑوں کو ایسا کرتا دیکھ کر بچے بھی ساتھ شامل ہوگئے تھے۔ وہ چھوٹا سا ہال امید ان ہی تھا لیکن اس وقت وہ ایک ہی نعرے سے گونج رہا تھا۔

"پاکستان کا مطلب کیا... لا الہ الا اللہ... پاکستان کا مطلب کیا... لا الہ الا اللہ... پاکستان کا مطلب کیا... لا الہ الا اللہ..." وہاں موجود کوئی چہرہ ایسا نہ تھا جس پر مسکراہٹ نہ تھی اور کوئی دل ایسا نہ تھا جس میں نیا ولولہ نہ تھا۔

"اب کیسا محسوس کررہے ہیں آپ؟" ڈاکٹر بچے نے سوال کیا تھا۔ اس کا ہاتھ ابھی بھی سینے پر دھرا تھا۔

"میں بہت اچھا محسوس کررہا ہوں۔ میری ساری مایوسی چھٹ گئی ہے۔" مریض بچہ خوشی سے سرشار لہجے میں بولا تھا۔

"اللہ تیرا شکر... آیئے اب آپ کا دوبارہ ٹیسٹ کرلیتا ہوں۔" اس بچے نے وہیں کھڑے کھڑے کہا تھا۔ پھر اس نے اپنے ہیڈ فون کو اس بچے کے کان سے لگایا تھا۔ اسی دوران نصب کیے ہوئے اسپیکرز سے آواز گونجنے لگی تھی۔ جس کو سن کر دوسرے بچے کے وجود میں دوبارہ لرزش پیدا ہوئی تھی پھر وہ لرزش بڑھنے لگی تھی۔ اسپیکر سے آنے والی آوازیں بلند ہورہی تھیں۔

"ایسی زمین اور آسماں
ان کے سوا جانا کہاں
بڑھتی رہے یہ روشنی
چلتا رہے یہ کارواں
دل دل پاکستان... جاں جاں پاکستان
دل دل پاکستان... جاں جاں پاکستان۔" اس بچے نے جس کے کانوں پر ہیڈ فون نصب تھا نے اپنا سرخ چغہ آہستہ آہستہ کرکے اتار دیا تھا اور اب اس کے بدن پر سبز شرٹ نمایاں تھی۔

"آپ کا ہیموگلوبن تو بالکل نارمل ہوگیا ہے۔"

ڈاکٹر نے خوشی سے سرشار لہجے میں کہا تھا۔ وہ دونوں ساتھ پڑھنے لگے تھے۔

"دل دل پاکستان۔۔۔ جاں جاں پاکستان۔۔۔"

حاضرین نے ان کا بھرپور ساتھ دیا۔ سب تالیاں بجاتے ہوئے تمتماتے چہروں کے ساتھ ان کا ساتھ دے رہے تھے۔ کچھ دیر یہ ہی شوروغل ہوتا رہا۔ ان بچوں کو سب ہی نے سراہا تھا۔

اس کے بعد سب کے لیے چائے کا انتظام تھا۔ بچوں کو ان کی ٹیچرز نے جو کہ مقامی لڑکیاں ہی تھیں ایک طرف کھانے پینے کا سامان دے کر بٹھا دیا تھا جبکہ باقی مہمانوں کے لیے الگ سے انتظام تھا۔ سلمان حیدر اس اسکول کی انتظامیہ میں شامل تھا اور آج آنے والے زیادہ تر نئے مہمان اس کی وساطت سے ہی آئے تھے۔ ان میں پروفیسر آفاق علی تھے جو اپنی اہلیہ اور بیٹے کے ہمراہ آئے تھے۔ ان کا بیٹا وہیل چیئر پر تھا اور سب ہی لوگ اس کے متعلق جانتے تھے۔ ڈاکٹر زارا اور سلمان کی امی بھی پہلی بار یہاں آئی تھیں۔

"آئیں۔۔۔ آپ لوگوں کو اپنی ٹیم سے ملواتا ہوں۔" سلمان نے امی اور زارا سے کہا تھا۔ ان دونوں نے سر ہلایا تھا۔ زارا تو زارا' رافعہ بیگم بھی وہاں موجود لوگوں میں سے چند ایک کے سوا کسی کو نہیں جانتی تھیں۔ اس لیے انہیں سب سے ملنے کا اشتیاق بھی زیادہ تھا۔ باقی لوگ چائے پینے اور ایک دوسرے کے ساتھ باتیں کرنے میں مصروف تھے۔

"یہ سعدیہ ہیں۔۔۔ سعدیہ بتول اعوان۔۔۔ یہ میڈیکل اسٹوڈنٹ ہیں۔۔۔ ان کا تعلق سیالکوٹ سے ہے۔۔۔ یہ اپنے والد کے ساتھ رضاکارانہ طور پر ہماری مدد کو آتی ہیں۔۔۔ بچوں کے ساتھ مل کر ہیموگلوبن والا سارا ڈرامہ انہوں نے ہی تیار کیا تھا۔ ان کے بقول ہر پاکستانی کے خون میں ایک ایجنٹ شامل ہے جسے ہیموگلوبن کہتے ہیں۔ ان کی اس بات پر ان کے کلاس فیلوز کو اعتراض ہو سکتا ہے' لیکن یہ پروا نہیں کرتیں۔" سلمان ایک لڑکی کی جانب اشارہ کر کے اس کا تعارف کروا رہا تھا جبکہ وہ مسکراتے ہوئے اس کی باتوں کو سن رہی تھی۔

"یہ کشف رسول ہیں۔۔۔ ان کا تعلق ساہیوال سے ہے۔۔۔ یہ کبھی باقاعدہ اسکول نہیں گئیں لیکن یہ پڑھے لکھے لوگوں سے کہیں زیادہ پڑھی لکھی ہیں۔ یہ شاعری کرتی ہیں اور یہاں بچوں کو اچھی اچھی نظمیں لکھ کر یاد بھی کرواتی ہیں۔" سلمان نے دوسری لڑکی کا تعارف کروایا تھا' پھر وہ تیسری والی کی طرف بڑھا تھا۔ "یہ زینب ہیں۔" اس نے ایک پیاری سی لڑکی کی طرف اشارہ کیا تھا۔ "ان کی ساری فیملی باہر ہوتی ہے' لیکن یہ اکیلی یہاں رہتی ہیں۔ اسٹوڈنٹ ہیں۔ لیکن یہ بھی ہماری والینٹر ہیں۔۔۔ اور میرا خیال ہے ان کا ہیموگلوبن چیک کیا گیا تو سب سے زیادہ ہائی ریڈنگ آئے گی۔" سلمان اپنے انداز میں متعارف بھی کروا رہا تھا اور سراہ بھی رہا تھا۔ اس کی امی اس لڑکی کے نام پر ذرا اٹک سی گئی تھیں۔

"یہ آمنہ ہے؟" انہوں نے زینب سے خود ہی فرض کر لیا تھا کہ شاید یہ "آمنہ" ہے۔ ان کے سوال پر سلمان گڑبڑا سا گیا تھا۔ جبکہ زارا نے دیکھا۔ عقب سے ایک لڑکی نے سر اٹھا کر ان کی جانب دیکھا۔

"کیا ہوا۔۔۔ مجھے بلایا کسی نے؟" وہ نور محمد کی وہیل چیئر کے پاس کھڑی اس سے باتیں کر رہی تھی۔ اپنا نام سن کر وہ ان کے قریب آ گئی۔

سلمان نے امی کا چہرہ دیکھا' جہاں تجسس تھا' جبکہ زارا اس کا چہرہ دیکھ رہی تھی' وہ خجل سا نظر آیا۔ اس نے کچھ نہیں کہا تھا۔ لیکن اس کے چہرے کے تاثرات بتانے کو کافی تھے کہ اس کی امی کا تجسس ختم ہونے والا تھا۔ زارا کے چہرے پر مسکراہٹ آ گئی تھی۔

"امی! یہ آمنہ ہے۔" سلمان نے ایسے بتایا جیسے بتانے کا دل تو نہیں تھا' لیکن پھر بھی بتا دیا۔

امی فوراً آگے آئی تھیں اور اسے کندھے کے ساتھ لگایا تھا۔ زارا ان کا والہانہ انداز دیکھ کر مسکرائی اور سلمان کی جانب دیکھا۔ وہ بھی خجل سے انداز میں مسکرا رہا تھا۔ زینب اور سعدیہ بھی کچھ کچھ واقف لگتی

تھیں۔ کیونکہ وہ بھی ذو معنی انداز میں مسکرا رہی تھیں۔ امی ہر چیز سے لاپروا بس آمنہ سے باتوں میں مگن ہو گئی تھیں۔

"آؤ، تمہیں بچوں سے ملواتا ہوں ڈاکٹر!" اس نے وہاں سے ہٹ جانا مناسب سمجھا تھا' ورنہ سب مل کر اس کا خوب ریکارڈ لگاتیں۔

"آمنہ سے مل کر اچھا لگا۔" زارا نے اپنے ڈسپازیبل چائے کے کپ کو ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ میں منتقل کرتے ہوئے مسکرا کر کہا تھا۔

سلمان نے سر ہلایا۔ وہ اب مسکرا نہیں رہا تھا' لیکن اس کے ہر انداز سے طمانیت چھلکتی تھی۔ اس کی ایک وجہ آج کے پروگرام کی کامیابی تھی اور دوسری وجہ امی کی آمنہ کے لیے پسندیدگی تھی۔ وہ دونوں باہر گراؤنڈ میں آکر بینچ پر بیٹھ گئے تھے۔ اسکول کے بچے ادھر ادھر کھیلتے پھر رہے تھے۔ سلمان کی نگاہیں ان ہی پر مرکوز تھیں۔

"مجھے بھی....." وہ اتنا ہی کہہ سکا تھا۔

"آپ کی تو پسند ہے نا..... آپ کو تو اچھا ہی لگے گا۔" زارا نے چڑانے کے لیے کہا تھا۔ سلمان نے نفی میں گردن ہلائی۔

"نہیں ڈاکٹر یہ بات نہیں ہے..... آمنہ واقعی ایک اچھی لڑکی ہے۔" وہ مسکراتے ہوئے بولا تھا۔ زارا نے ذو معنی انداز میں اسے دیکھا' جس پر وہ ہاتھ اٹھا کر صفائی دیتے ہوئے بولا۔

"ارے..... ایسے مت دیکھو بی بی..... یہ کوئی بارہ مسالے کی چاٹ والی فلم نہیں ہے کہ تم آنکھیں گھما گھما کر مجھے دیکھو..... یہ محبت کی نہیں عقیدت کی کہانی ہے..... میں اس لڑکی کو سات سال سے جانتا ہوں۔ غریب اور نادار لوگوں کے لیے کسی آرگنائزیشن' فارن فنڈنگ اور حکومتی امداد کے بغیر تن تنہا کام کرتی ہے اور ایسے کرتی ہے کہ رشک آتا ہے..... ان لوگوں نے یہ اسکول تقریباً سات سال پہلے کھولا تھا۔ تب اس کے دادا بھی حیات تھے اور میں ان ہی کی وجہ سے آمنہ سے متعارف ہوا تھا۔ میں ان دنوں ایک آرٹیکل لکھ رہا تھا جس میں پاکستانی گمنام ہیروز کا ذکر تھا۔ کسی نے مجھے اس اسکول اور ان کے چلانے والوں کے بارے میں بتایا..... میں اس سارے سیٹ اپ سے بہت متاثر ہوا تھا..... یہ اسکول ایک زبردست جگہ ہے..... ان لوگوں کا ماننا ہے کہ یہ ایک ایسا اسکول ہے جہاں ٹیچرز بھی پڑھانے نہیں بلکہ پڑھنے آتے ہیں..... سب بچے دن میں کام کرتے ہیں اور شام کو دو گھنٹے یہاں آتے ہیں..... ان ہی سے متاثر ہو کر میں نے رائے ونڈ میں ایسا اسکول شروع کیا ہے..... محنت کرنے والے نادار بچوں کو بھی اپنی عزت نفس قائم رکھتے ہوئے لکھنے پڑھنے کا پورا حق ہے..... یہ بات میں نے اپنی امی کے بعد آمنہ کے منہ سے سنی تھی..... امی کے نزدیک بھی عزت نفس کی بہت اہمیت ہے..... میں شاید آمنہ کو بھی اسی لیے پسند کرتا ہوں کہ یہ بالکل میری امی جیسی ہے۔" وہ وضاحت دے رہا تھا۔ زارا مسکرائی۔

"آپ نے آمنہ کو بتایا کہ آپ انہیں پسند کرتے ہیں۔" وہ سوال کر چکی تو اسے احساس ہوا کہ وہ اس کے سوال کو مذاق میں نہ اڑا دے' لیکن ایسا کچھ نہیں ہوا تھا۔ سلمان سنجیدہ ہی تھا۔

"میرا خیال ہے وہ جانتی ہے..... مجھے منہ سے کہنے کی کبھی ضرورت نہیں پڑی۔" سلمان کا انداز سرسری سا تھا۔

"شادی کب کریں گے آپ؟" زارا نے اپنا خالی کپ زمین پر رکھ دیا تھا۔

"یہ معاملات میرے نہیں ہیں..... امی کو ملوا دیا ہے اس سے..... اب امی جانیں اور امی کے کام..... ویسے میں نے آج تک امی کو کبھی کسی کام میں ہار مانتے نہیں دیکھا..... مجھے لگتا ہے اس سال میں بھی دولہا بن ہی جاؤں گا۔" وہ پہلی بار اپنے متعلق کوئی بات اتنے تفصیلی انداز میں کر رہا تھا۔ زارا کو اچھا لگا۔

"شہروز کیسا ہے؟" سلمان نے اس سے پوچھا تھا۔

"اچھا ہے....." زارا نے سادہ سے انداز میں کہا تھا۔

وہ آج کل کراچی میں تھا۔ اس نے عوف بن سلمان کی این جی او سے لاتعلقی اختیار کرلی تھی۔ ان کے ڈاکومنٹری والے پروجیکٹ کے ملتوی ہو جانے کے بعد

ویسے بھی اس کا ان کے ساتھ منسلک رہنا بے معنی تھا' لیکن زارا جانتی تھی شہروز نے اپنی پوری رضامندی کے ساتھ عوف بن سلمان کو استعفیٰ دیا تھا۔ وہ اخبار اور چینل کے ساتھ ابھی بھی منسلک تھا' لیکن اب اس نے وہ روش ترک کردی تھی جو اس کے وطن یا ہم وطنوں کے خلاف ہوتی۔

"ہاں..... اچھا تو بہت ہے اور بہت ذہین بھی ہے..... میں اس کا پروگرام دیکھتا ہوں..... اچھے منفرد ٹاپکس پر مثبت باتیں کرتا ہے۔" سلمان اسے تسلّی دے رہا تھا۔ زارا نے کچھ نہیں کہا تھا۔ شہروز اتنا اچھا ہو چکا تھا کہ اب اس کے دل میں اس کے لیے نہ کوئی بدگمانی تھی اور نہ ہی کوئی غلط فہمی..... عمر اور امائمہ چند مہینوں میں آنے والے تھے ان کی آمد پر شہروز اور اس کی شادی کی تاریخ مقرر ہونی تھی۔ وہ خوش تھی اور سلمان اس کی خوشی اس کے چہرے پر بکھری دیکھ کر مطمئن تھا۔

☆ ☆ ☆ چھ ماہ بعد

یہ چھ مہینے بعد کی بات تھی۔ وہی گھر جہاں سنّاٹے گونجا کرتے تھے اور جہاں گھر کے مکین ایک دوسرے سے بھی نظریں ملاتے احتیاط برتتے تھے۔ وہاں عجب رونق سی لگی تھی۔ گھر کی اکلوتی بیٹی اپنی گود میں ایک بیٹی لیے اپنے شوہر کے ہمراہ اپنے ماں باپ اور بھائی سے ملنے آئی ہوئی تھی۔

وہ سردیوں کے دن تھے اور سردیاں بھی کہتی تھیں' اس بار شاید کوئی انتقام لینا ہے۔ دن بھر دھند سورج کو اپنی لپیٹ میں لیے رکھتی اور رات کو یخ بستہ ہوائیں سردی کی شدّت کو مزید بڑھا دیتی تھیں۔ اس لیے جب بہت دن کے بعد سورج کہرے اور دھند کو شکست دینے کے بعد آسمان پر پوری آب و تاب سے چمکا تو سب لوگ ہی اس کا نظارہ کرنے کے لیے اپنے گھروں کے صحن اور لان میں آگئے۔ امائمہ بھی اپنی بیٹی کو لیے برآمدے کے تخت پر آ بیٹھی تھی۔

امی نے دعا کے اوپر کے موٹے کپڑے اُتروا کر اس کا مساج کرنا شروع کر دیا تھا۔ عمر شہروز کی طرف تھا۔ شہروز اور زارا کی شادی اس ہفتے قرار پائی تھی' سو وہ وہاں اپنا زیادہ وقت گزارتا تھا۔ امائمہ مالٹوں کی باسکٹ اٹھا کر لے آئی تھی۔ ابو اور نور محمد بھی لان میں ہی بیٹھے تھے۔ نور محمد بہت کم گو تھا' لیکن وہ سب کو دیکھ کر مسکراتا ضرور رہتا تھا۔ چھ مہینے میں اس کی صحت میں کافی اچھی تبدیلیاں رونما ہوئی تھیں۔ امائمہ نے مالٹے چھیل کر ان پر نمک چھڑکا تھا اور پھر وہیل چیئر پر بیٹھے نور محمد کی گود میں رکھ دیا تھا کہ وہ ایک ایک کر کے کھاتا رہے۔ ابو ایک چوکی پر بیٹھے اس کے پاؤں کا مساج کر رہے تھے۔ وہ ڈاکٹرز کے ہر مشورے پر بے چوں چراں عمل کرتے تھے۔ نور محمد کے کھانے کا خیال رکھنا' اسے ہلکی پھلکی ورزشیں کروانا' اس کا مساج کرنا ہر چیز کی ذمہ داری انہوں نے اپنے سر لے رکھی تھی۔ امائمہ اپنے ماں باپ کو اس طرح مصروف دیکھ کر کافی مطمئن تھی۔

"اب تو بھائی کافی سنبھل گیا ہے امی۔" اس نے ایک قاش اپنے منہ میں بھی رکھی تھی۔ امی نے دعا کے ننّھے سے ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں لے رکھا تھا اور بہت نرمی سے اس کی انگلیاں رگڑ رہی تھیں۔ امائمہ کی بات سن کر انہوں نے رخ موڑ کر وہیل چیئر پر بیٹھے نور محمد کی جانب دیکھا' پھر مسکراہٹ ان کے چہرے پر بکھر گئی تھی۔

"اللہ کا جتنا شکر ادا کروں کم ہے امائمہ..... اب بہت سنبھل گیا ہے۔ ورنہ جب یہ آیا تھا تو نہ خود چل پاتا تھا' نہ ٹھیک سے بول سکتا تھا۔ دماغی حالت ایسی تھی کہ کسی کو پہچانتا بھی نہیں تھا۔ کھانا دے دیتے تھے تو کھا لیتا تھا' پانی دے دیتے تھے تو پی لیتا تھا۔ بڑا کڑا وقت تھا امائمہ..... جتنا اس کے بغیر گزرا' وہ سارا وقت ایک طرف اور وہ اس کی واپسی کے بعد کے پہلے چند دن ایک طرف....." امی دعا کی ہتھیلی رگڑتے ہوئے بتا رہی تھیں۔

"آپ تو سوچتی ہوں گی کہ ایسی حالت میں بیٹے کو دیکھنے سے بہتر تھا کہ یہ ملتا ہی نہیں۔" امائمہ نے اپنی دھن میں مگن کہا تھا۔

"نہیں امائمہ!" امی نے قطعیت سے کہا۔ "میں نے اس کو جب دروازے پر اتنے سالوں بعد کھڑا دیکھا ناتو دل چاہا اسے دل میں چھپالوں۔ ایسے کہ دنیا اس کی طرف دیکھ بھی نہ سکے۔ میں اس کا چہرہ چھوچھو کر دیکھتی تھی اور میرا جی نہیں بھرتا تھا۔۔۔ اتنا عرصہ ہو گیا تھا امائمہ۔۔۔ اللہ سے کچھ نہیں مانگا تھا سوائے اس بیٹے کے دوبارہ مل جانے کے۔۔۔ اس کو دیکھ کر میرے منہ سے صرف کلمۂ شکر نکلتا تھا۔۔۔ صرف کلمۂ شکر۔۔۔ کہ یا اللہ تونے واپس دے دیا۔۔۔ تیری مہربانی۔۔۔ اب باقی کام ہمارا ہے۔" ان کی آنکھیں جھلملائی تھیں، لیکن ان کا سارا دھیان دعا کی جانب تھا۔

"آپ بہت ہمّت والی ہیں امی۔" امائمہ نے انہیں سراہا۔

"ہر ماں ہمّت والی ہوتی ہے امائمہ۔۔۔ جب معاملہ اپنی اولاد کا آتا ہے ناتو ہر ماں میں ہمّت آجاتی ہے۔ تم دعا کے معاملے میں ہمّت والی ہو۔ یہ اللہ کی عطا ہے۔۔۔ اس نے عورت کمزور، لیکن ماں بہت مضبوط بنائی ہے۔"

امی نے تیل کی بوتل کھول کر اس میں سے تھوڑا تیل اپنی ہتھیلی پر انڈیلا تھا۔ پھر دوبارہ اس کا ڈھکن بند کر کے دوبارہ سے سلسلۂ کلام وہیں سے جوڑا جہاں سے منقطع ہوا تھا۔

"میرے اس بیٹے نے مجھے ہی نہیں، اپنے باپ کو بھی ایک نئی ہمت عطا کی ہے امائمہ۔۔۔ پروفیسر صاحب اس کی خاطر ایک ٹانگ پر بھی کھڑے رہنے کو تیار تھے۔ ہم نے یعنی میں نے اور تمہارے ابو نے ایک لمحہ بھی مایوسی کو قریب نہیں پھٹکنے دیا۔ ابتدا میں ہر روز اسپتال جانا پڑتا تھا۔ اس کی تھراپی ہو رہی تھی۔ سائیکاٹرسٹ کے ساتھ سیشنز تھے۔ ہر دوسرے دن کوئی نہ کوئی لیب ٹیسٹ ہوتا تھا۔ تم جانتی ہی ہو۔۔۔ تمہارے ابو کو ڈرائیونگ سے کتنی چڑ رہی ہے، لیکن بیٹے کی خاطر ہر روز اتنی لمبی ڈرائیو کر کے اسپتال لے جاتے تھے، پر ہم دونوں بہت خوش ہیں۔ مشکل ٹل چکی ہے امائمہ۔۔۔ کڑا وقت گزر گیا ہے۔ تمہیں بتاؤں یہ ابتدا میں صرف ایک جملہ بولتا تھا۔ "امی میں فیل ہو گیا تھا نا۔" ہر وقت بس یہ ہی ایک جملہ۔۔۔ میں سنتی تھی تو آنکھوں سے پانی کی جھڑی بہنے لگتی تھی۔ دل جیسے کوئی آرے سے چیرتا تھا۔ میں اسے اپنی باہنوں میں لے لیتی اور بس اس کا منہ سر چومتی رہتی۔ اسے اپنے نروز پر اتنا کنٹرول بھی نہیں تھا کہ منہ سے بہتے لعاب کو سنبھال سکتا۔۔۔ سوچو۔۔۔ باقی کام کیسے کرتا ہوگا۔" امی لمحہ بھر کے لیے رکی تھیں۔ آنکھیں بھیگنے کو تیار تھیں، لیکن انہوں نے آنسوؤں کو بہنے نہیں دیا تھا۔

"آپ کو تو بہت مایوسی ہوتی ہوگی امی۔" امائمہ نے پھر ایک بے تکا سوال پوچھا تھا۔

"نہیں امائمہ۔۔۔ بالکل بھی نہیں۔۔۔ مایوس ہو جاتی تو ناکام ہو جاتی۔۔۔ اور مجھے دوسری بار ناکام نہیں ہونا تھا۔ میں بس اسے دیکھتی تھی اور اللہ سے معافی مانگتی تھی کہ اللہ کریم تیری نعمت کی قدر نہ کر سکی۔۔۔ مجھے معاف کر دے اور اب جو یہ موقع دیا ہے نا دوبارہ سے۔۔۔ اپنے بیٹے کو دیکھنے کا۔۔۔ اسے پالینے کا۔۔۔ اسے دوبارہ سے ایک کار آمد انسان بنانے کا تو میں اسے ضائع نہ کروں۔۔۔ میں بہت قسمت والی ہوں امائمہ۔۔۔ مجھے میرا بیٹا دوبارہ دیا گیا ہے۔ ورنہ اللہ کب اپنی نعمتوں کی قدر نہ کرنے والوں پر اتنا رحم کرتا ہے۔ یہ سب اللہ کا کرم ہے امائمہ! تو میں مایوس ہو کر اسے کیسے ضائع کر دوں۔"

امی نے دعا کو اپنے پاؤں پر الٹا لٹا لیا تھا اور اب اسی نرمی سے اس کی پشت رگڑ رہی تھیں۔ امائمہ نے گہری سانس بھری۔ وہ امی کے سامنے رونا نہیں چاہتی تھی۔ لیکن اسے رونا آجاتا تھا۔ اس کے ماں، باپ کی عمر اب اس طرح مشقّت کرنے والی نہیں تھی۔ ان کے آرام کے دن تھے اور انہیں اپنے عاقل بالغ بیٹے کو چھوٹے بچّے کی طرح پالنا پڑ رہا تھا۔ اس نے ایک نظر ابو کی طرف دیکھا۔ اب جب اپنی اولاد سے اپنے پاؤں دبوانے کے دن تھے، وہ اپنے بیٹے کے پاؤں سہلا رہے تھے۔ وہ اس قدر مگن تھے کہ لگتا تھا انہیں اردگرد سے بھی کوئی سروکار نہیں ہے۔

نور محمد باتیں کرتا تھا' لیکن اس کی باتیں بہت غور کرنے پر سمجھ میں آتی تھیں۔ امائمہ جب سے آئی تھی' یہ ہی دیکھ رہی تھی کہ ابو اس کے پاس بیٹھے بس باتیں کرتے تھے۔ چھوٹی چھوٹی لایعنی باتیں.... ڈاکٹرز نے کہا تھا کہ اسے بولنے کی تحریک دیتے رہیں گے تو بہت جلد روانی سے بولنے لگے گا۔ ابو نہ صرف اس سے باتیں کرتے تھے' اس کی باتیں سنتے تھے۔ اسے تلاوت کرواتے تھے۔ اسے کرکٹ میچ دکھا کر اس سے ڈسکس بھی کرتے تھے۔ ڈاکٹرز نے کہا تھا اسے چھوٹے چھوٹے گیمز بھی کھلائیں' تاکہ اس کے ہاتھ پاؤں میں خون کی گردش تیز ہو۔

اور امائمہ دیکھتی تھی کہ ابو نور محمد کو مجبور کرتے تھے کہ وہ گیند کو زور سے پھینکے اور جب وہ پھینکتا تھا تو ابو خود اپنی جگہ سے اٹھ کر جاتے تھے اور اسے دوبارہ لا کر اس کے ہاتھ میں دے دیتے تھے' تاکہ وہ یہ عمل دہرائے۔ اسے وہیل چیر سے اٹھا کر اسٹینڈ کے سہارے چلنے کی پریکٹس کروانا' اسے باتھ روم جانے میں مدد کرنا.... یہ سب ایک بوڑھے آدمی کے لیے بہت مشقت والے کام تھے' لیکن ابو ہنسی خوشی سب کرتے تھے۔ گھر میں دو کل وقتی ملازم بھی تھے' لیکن نور کے سب کام امی اور ابو ہی کرتے تھے۔ ایسا لگتا تھا ان کی زندگی کا صرف ایک محور تھا اور وہ نور محمد تھا اور وہ اس کے کام کرتے ہوئے اتنے مطمئن نظر آتے تھے کہ امائمہ اللہ کا شکر ادا کرتے نہ تھکتی تھی۔ اللہ نے دوبارہ اولاد دی تھی اور اسے پھر سے پرورش کرنے کی ہمت بھی دوبارہ عطا کردی تھی۔ وہ بھائی اور ابو کی جانب دیکھ رہی تھی' جبکہ امی اس کی جانب گاہے بگاہے نظر ڈال لیتی تھیں۔

"میں جانتی ہوں' تمہیں عجیب لگ رہا ہوگا.... شاید تمہیں میری بات کا یقین بھی نہ آئے' لیکن ہم نور محمد کو پاکر پہلے سے زیادہ خوش اور مطمئن ہیں۔" امی نے دعا کی قلقاریوں کو خوشی سے سنتے ہوئے امائمہ کی جانب دیکھ کر کہا تھا۔

"یہ اب بہت سنبھل گیا ہے۔ پڑھنے لکھنے لگا ہے۔ خود کھانا کھا لیتا ہے۔ باتھ روم چلا جاتا ہے۔ کپڑے تبدیل کرلیتا ہے۔ میں بہت پُرامید ہوں کہ ایک دن یہ بالکل صحت مند انسانوں کی طرح زندگی گزارے گا۔" امی نے گویا اسے تسلی دی تھی کہ وہ پریشان نہ ہو۔

"ان شاء اللہ...." امائمہ یہ کہتے ہوئے خود کو دل گرفتی سے نکال نہ سکی تھی۔

"امی! میں سوچ رہی ہوں میں یہیں رہ جاؤں۔ میں بات کروں گی عمر سے کہ وہ مجھے کم از کم چھ مہینے کے لیے تو ضرور رہنے دے' تاکہ آپ کو کوئی ہیلپنگ ہینڈ مل سکے۔ آپ اکیلے کیا کیا سنبھالیں گے۔"

امائمہ نے بیٹھے بیٹھے منصوبہ بنا لیا تھا۔ اسے یقین تھا کہ عمر اسے اجازت دے دے گا۔ امی کو اس کی بات سن کر ہنسی آئی۔

"تم کیا سمجھتی ہو.... یہاں تک کیا ہم اکیلے لے آئے ہیں اپنے بیٹے کو.... بہت ہیلپنگ ہینڈ میسر ہیں ہمیں.... تمہیں اندازہ ہی نہیں کہ کتنا پیار ملا ہے میرے بیٹے کو۔ اتنے لوگ ہماری مدد کو آگئے تھے کہ ان سب کا نام لینے لگوں تو ایک سانس میں لے بھی نہ پاؤں۔ ایک نیک ماں کا بچہ ہے سلمان حیدر.... اس کے ساتھ کہیں اسکول میں پڑھا کرتا تھا۔ وہ صحافی ہے۔ اس نے اس کی خاطر بڑی محنت کی تھی اور اس کے آجانے کے بعد بھی نہ صرف اس کا بلکہ ہمارا بھی بہت خیال رکھتا ہے۔ ہر روز اسے لینے کے لیے آتا ہے۔ ڈیڑھ گھنٹے کی ڈرائیو کرکے اسے پک اینڈ ڈراپ دیتا ہے۔ اس نے غریب نادار بچوں کے لیے ایک اسکول بنا رکھا ہے۔ وہاں نور کو بھی لے جاتا ہے۔ اس کی امی بھی وہیں پڑھاتی ہیں۔ وہاں نور ہر روز لیکچر دیتا ہے.... ہر روز.... اور سب بیٹھ کر غور سے سنتے ہیں۔ اسے پوری آزادی دیتے ہیں کہ یہ جو چاہے بولے اور باقی بچے صرف بیٹھ کر سنتے ہیں۔ تمہارے ابو لیکچر تیار کرکے دیتے ہیں اور یہ وہاں جاکر پڑھتا ہے ان بچوں کو.... واپسی پر مجھے ساری روداد خوشی خوشی سناتا ہے۔ آج کل سردیاں ہیں تو ڈاکٹر نے منع کر رکھا ہے' کھلے آسمان تلے زیادہ دیر بیٹھنے سے۔ اس لیے نور آج کل

گھر رہتا ہے۔ ورنہ روز جایا کرتا تھا۔ زارا بھی ہفتے میں دو بار آیا کرتی تھی۔ صرف اس سے ملنے۔ اسے۔۔۔ ہمت دینے شہروز بھی لاہور آیا ہو تو ملنے آتا ہے۔ اسے کہتا ہے میری شادی میں تم نے گانا ضرور گانا ہے اور سب سے بڑھ کر وہ جو ادیب نور محمد ہیں۔۔۔ ہر دوسرے تیسرے دن اس سے ویڈیو کال پر بات کرتے ہیں۔ اس کا حال پوچھتے ہیں۔ اسے آگے بڑھنے کا حوصلہ دیتے ہیں اور کہتے ہیں جلدی سے ٹھیک ہو جاؤ اور مجھ سے ملنے کے لیے آؤ۔۔۔ بتاؤ امائمہ۔۔۔ ہمیں مزید ہیلپنگ ہینڈ کیا کرنے۔۔۔" امی کہہ رہی تھیں اور اب کی بار ان کی آنکھیں جھلملائی تھیں۔

"امائمہ! تم میری یا اپنے ابو کی فکر مت کرو۔ تم بس اب اپنی بیٹی کی تربیت پر دھیان دو۔۔۔ یہ تمہارا فرض ہے۔ اس کی پوچھ پڑتال ہے۔ من کا کھایا، تن کا پہنا سب یہیں رہ جائے گا۔ برانڈڈ کپڑے، آئی فونز، پزا برگر۔۔۔ ناچ گانے، سب غیر ضروری باتیں ہیں۔ اصل چیز ہے انہیں انسانیت کا وہ سبق پڑھایا جائے جس کا اللہ اور پیارے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا ہے۔ اس لیے امائمہ اولاد کو ایسی تربیت دو کہ وہ اللہ کے یہاں بھی سرخرو ہو سکے۔"

امائمہ اب کی بار اپنے آنسو روک نہیں پائی تھی، لیکن اس کا دل بوجھل نہیں تھا۔ یہ خوشی کے آنسو تھے۔ اس نے امی کے ہاتھ سے دعا کو لے لیا تھا۔

"ان شاء اللہ امی۔۔۔ عمر تو کہتا ہے ہم اپنی بیٹی کو بیٹے کی طرح پالیں گے۔ بہت پیار کرتا ہے دعا سے۔" وہ کہہ رہی تھی، امی مسکرائیں۔

"جب اللہ نے بیٹی دی ہے تو اسے بیٹی کی طرح ہی پالنا میری بچی۔۔۔ کیا کبھی کسی نے یہ کہا ہے کہ وہ اپنے بیٹے کو بیٹی کی طرح پالے گا۔ یہ احساس کمتری ہے۔ اللہ نے بیٹی دی ہے تو فخر سے اسے بیٹی والی سوچ کے ساتھ پالو۔ اسے اس کے ہونے کا فخر دو۔۔۔ غرور دو۔۔۔ تاکہ وہ کل کو نہ صرف اپنے گھر کے لیے بلکہ معاشرے کے لیے ایک بھی ایک صحت مند کردار ادا کر سکے۔" امی نے نصیحت کی تھی۔

"یاد رکھو امائمہ! عورت کا کردار کسی بھی گھر یا معاشرے کے لیے بہت اہم ہوتا ہے۔ ایک چھوٹی بچی نے کل کو بڑے ہو کر ماں بننا ہوتا ہے۔۔۔ اور کتابوں میں لکھا ہے کہ ریاست کے سات ستون ہوتے ہیں۔" ریاست کا سارا وزن ان ہی سات ستونوں پر ہوتا ہے، لیکن میں جانتی ہوں۔۔۔ ریاست کا ایک آٹھواں ستون بھی ہوتا ہے اور وہ اس ریاست کی "ماں" ہوتی ہے۔ سارے ستون بھی کمزور ہو جائیں نا تو وہ ریاست قائم رہ سکتی ہے، لیکن "ماں" نام کا یہ آٹھواں ستون اگر ناکام ہو جائے تو پھر ریاستیں ٹوٹ پھوٹ جایا کرتی ہیں۔ میں نے تو اپنی زندگی سے یہی سیکھا ہے کہ ماں کو کبھی کمزور نہیں پڑنا چاہیے نہ ہار ماننی چاہیے۔ اسی میں اس کی اولاد کی بھلائی ہے۔" امی بہت محبت سے اسے سمجھا رہی تھیں، امائمہ نے مسکراتے ہوئے آنکھیں گھما کر انہیں دیکھا "آپ تو بہت ذہین ہو گئی ہیں امی۔" امی مسکرائیں۔

"عہد الست سے سیکھا ہے۔ تمہیں بھی "عہد الست" دوں گی۔۔۔ اسے ضرور پڑھنا۔۔۔ تمہیں نہ صرف اچھا لگے گا بلکہ تمہیں کچھ نئی چیزیں بھی سیکھنے کو ملیں گی۔" امی کہہ رہی تھیں۔ امائمہ نے دعا کو دیکھتے ہوئے سر ہلایا تھا۔

روشنی کو حکم تھا کہ وہ اس کے پورے وجود کو اپنی بانہوں میں بھر کر اس کا اوڑھنا بچھونا ہو جائے۔ روشنی کی بساط نہ اوقات کہ وہ اس کے حکم سے انکار کرتی، سو اس نے فقط پلکیں جھپکی تھیں اور ایک معصوم وجود کو تاریکی سے روشنی میں دھکیل دیا گیا تھا۔

اسے زندگی عطا کر دی گئی تھی۔ وہ آ چکا تھا ایک ایسی دنیا میں جو تخلیق ہی اس کے لیے کی گئی تھی، تاکہ وہ اس طرح جی سکے جس طرح جینے کا حکم ہے۔ اسی لیے وہ مطمئن اور پر سکون تھا۔ اسے زندگی کی نعمت دان کر دی گئی تھی۔ اس کے معصوم چہرے کا ایک ایک نقش، اس کے جسم کا ایک ایک عضو اور اس کے خون کی ایک ایک بوند اس نعمت پر شکر گزاری کے جذبے سے سرشار تھی۔ وہ چند لمحے قبل دنیا میں آیا تھا۔ لیکن اس

کی حسیات مکمل تھیں۔ وہ سوچ سکتا تھا اور وہ سوچ رہا تھا۔

"کیا واقعی "دنیا" ایک حقیقت ہے؟"

نور محمد نے ایک ایک لفظ کو غور سے پڑھتے ہوئے اس کے معنی و مطالب پر غور کرنے کی کوشش کی تھی۔ امی کہتی تھیں یہ کتاب اس کی زندگی کے حالات پر لکھی گئی تھی، لیکن اسے یاد نہیں تھا کہ اس کی زندگی میں کیا کیا کچھ ہو چکا تھا۔ وہ ماضی کو کھنگالنے کی کوشش ہی نہیں کرتا تھا۔ امی کہتی تھیں جو ہو چکا ہے وہ ہو چکا ہے۔ اسے بھول جاؤ اور واقعی بھول جاتا تھا۔ اس کے پاس کرنے کو اور بہت کام تھے۔ وہ کب تک ماضی کو یاد کرتا رہتا۔ وہ اسکول ہیں بچوں کو پڑھاتا تھا۔ پہلے پہل اسے صرف انگلش پڑھانے کے لیے کہا گیا تھا' لیکن اب وہ میتھس' انگلش اور اردو بھی پڑھا رہا تھا۔ اس کا سارا وقت اپنی کلاس کے بچوں کے بارے میں سوچتے ہوئے گزرتا تھا۔ اسے انہیں پڑھانے میں مزہ آتا تھا۔ وہ بھی اس کے ساتھ بہت خوش رہتے تھے اور یہ امر نور محمد کے لیے سب سے مطمئن کردینے والا تھا کہ کچھ لوگ تھے جو اس کی معیت میں اس قدر خوش ہوتے تھے۔ وہ کبھی اگر نہیں جاپاتا تھا تو سلمان حیدر فون کرکے اس کی کسی نہ کسی بچے سے بات ضرور کرواتا تھا جو اس بات پر اصرار کرتا کہ ہم اداس ہیں اور آپ کو یاد کررہے ہیں۔ اس کی زندگی کی سب سے بڑی خوشی وہ بچے تھے جنہیں پڑھاتے ہوئے اسے اپنا آپ معتبر لگتا تھا۔ وہ وہیل چیر کے بغیر چل سکتا تھا' اگرچہ چال غیر متوازن تھی' لیکن وہ خوش تھا کہ وہ اپنی ٹانگوں پر چلتا تھا۔ ایک بازو ابھی بھی رعشہ کا شکار تھا۔ لیکن ڈاکٹرز پرامید تھے کہ وہ بھی جلد ٹھیک ہو جائے گا۔ وہ اپنی زندگی سے بے حد مطمئن تھا۔ کیا نہیں ہے یا کیا ہونا چاہیے تھا کے بجائے وہ جو ہے جیسا ہے' شکر ہے کہ اصولوں پر چلنے میں خوش رہتا تھا۔ اس کے گھر والے بھی اس بارے میں زیادہ نہیں سوچتے تھے۔ ابو کہتے تھے۔

"زندگی فقط سسکی سے شروع ہو کر ہچکی پر ختم ہو جانے والا ایک مختصر ترین عمل ہے۔ جو شروع تو مٹی کے اوپر ہوتا ہے' لیکن ختم ہمیشہ مٹی کے نیچے ہوتا ہے' لیکن خاک سے بنے انسان کو تب تک یہ بات سمجھ میں نہیں آتی جب تک کہ وہ خاک کی خوراک نہیں بن جاتا۔ اس لیے زندگی کی کمیوں کے بارے میں اتنا مت سوچو۔ اللہ کا شکر ادا کرو کہ اس نے اتنا اچھا بنایا ہے۔" نور محمد نے کانپتے ہاتھ' مگر مسرور دل کے ساتھ اپنا کمبل درست کیا تھا۔ عہد الست ابھی بھی اس کے ہاتھ میں تھی۔ اس نے آخری صفحہ نکال لیا تھا' جس کا پہلا جملہ ہی دلچسپ تھا۔

"کیا واقعی دنیا ایک حقیقت ہے۔" یہ عہد الست کا اختتام تھا۔

جب آپ زندگی کا زیادہ عرصہ اس دنیا میں گزار لینے کے بعد یہ سوال پوچھتے ہیں تو دنیا بھی قہقہہ لگا کر آپ کا تمسخر اڑاتی ہے اور سوال پوچھتی ہے کہ.....

"اے اشرف المخلوقات! تجھے تیرے رب نے دنیا کے سینے پر اتارا' تجھے اپنا نائب بتایا' تجھے زمین کی سلطنت دان کی گئی۔ تجھے فہم و فراست عطا کی گئی۔ تجھے مسجود ملائک بنایا گیا۔ تو یہ سوال پوچھتا اچھا نہیں لگتا۔ تجھے حق نہیں کہ تو میرے بارے میں سوال کرے۔ میرے بارے میں تجھے سب بتایا گیا۔ میں کیا ہوں' میری حقیقت کیا ہے۔ مجھے کیسے برتنا ہے' کیسے استعمال کرنا ہے' میں صفر ہوں' جب تک دین کی اکائی کے ساتھ نہیں ملوں گی۔ تمہارے کام نہیں آوں گی۔ مجھے دس بنا کر استعمال کرنا' تمہیں تو سب بتایا گیا تھا' مجھے تمہارے بارے میں کچھ نہیں بتایا گیا تھا کہ تم کیا ہو' مجھے صرف تمہاری تعریف سنا سنا کر مرعوب کیا گیا تھا۔ تم وہ ہو جسے جنوں' فرشتوں نے سجدے کیے تھے۔ تم وہ ہو جسے اللہ نے اپنے ہاتھوں سے بنایا تھا۔ تم خلیفہ الارض ہو...... تم مسجود ملائیک ہو...... تم اشرف المخلوقات ہو...... اس لیے یہ میرا حق ہے کہ سوال کروں کہ....."

اے گوشت کے لوتھڑے
خاک و آب کے امتزاج تو مجھے بتا
کیا واقعی انسان ایک حقیقت ہے؟"

روح کو جسم کی پوشاک میں رکھا گیا تھا
میں بہت خوش تھا مجھے خاک میں رکھا گیا تھا

میں نے اُس وقت بھی خالق سے شکایت کی تھی
عشق جب خانۂ ادراک میں رکھا گیا تھا

ایک مٹی سے بنائے گئے میں اور چراغ
اور پھر دونوں کو اک طاق میں رکھا گیا تھا

میں نے اُس رات بہت دیر تلک گریہ کیا
ہجر جب دیدۂ نم ناک میں رکھا گیا تھا

میرا مصلوب ہوا عشق گواہی دے گا
میں سیہ بخت سدا خاک میں رکھا گیا تھا

میثم علی آغا

دُکھ

کبھی سوچا ہے...؟
تم نے رگِ جاں...
میرے آنگن کی یہ چڑیاں
بہت روتی کیوں ہیں؟
انہیں درختوں کے اُجڑنے کا ڈر لاحق
ہے...!

حرا قریشی

شگفتہ جاہ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا،

حضرت ابن عمر رضی سے روایت ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"جب آدمی اپنے (مسلمان) بھائی کو "اے کافر" کہے تو وہ دو باتوں میں سے کسی ایک کی طرف لوٹتا ہے۔ اگر وہ (واقعی) ایسا ہوا جیسا کہ اس نے کہا (تو درست) ورنہ وہ کفر اس کی طرف لوٹ آئے گا۔"

(بخاری و مسلم)

اس میں بلاوجہ کسی مسلمان کو کافر کہنے کی سخت ممانعت ہے کیونکہ اس میں وجوہ کفر نہ پلٹ گئے تو کہنے والا کافر کہلائے گا۔

بدقسمت،

مال داروں میں بخیل سے زیادہ بدقسمت میں نے کوئی نہیں دیکھا۔ کیونکہ دنیا میں اسے مال جمع کرنے کا طعنہ ملتا ہے اور آخرت میں اس سے مال دبانے پر حساب ہوگا۔ نہ دنیا میں غم سے سلامت رہا اور نہ آخرت میں گناہ سے چھٹکارا پایا۔ اس کی دنیا کی زندگی فقیروں جیسی اور آخرت کا حساب مال داروں جیسا ہوگا۔

(حسن بصریؒ)

حق بات،

حضرت سفیان ثوریؒ ایک شخص کا جنازہ پڑھ کر آئے تو آپ نے جس شخص کی زبان سے بھی سنا تو یہی کہ یہ مرنے والا بڑا ہی اچھا تھا۔ کوئی بھی تو اس کے خلاف نہیں کہہ رہا تھا۔ حضرت سفیانؒ نے فرمایا۔

"اگر مجھے معلوم ہوتا کہ یہ شخص ایسا ہر دل عزیز ہے تو اس کا جنازہ کبھی نہ پڑھتا۔ اس لیے کہ یہ شخص حق گو نہ تھا۔ اگر یہ حق بات کہنے کا عادی ہوتا تو کئی لوگ اس کے مخالف بھی ہوتے۔ مگر چونکہ سب ہی اس سے خوش ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ یہ ہر ایک کی ہاں میں ہاں ملانے والا تھا۔"

ثناء عبدالقیوم۔ بنکہ چیمہ

حقیقت،

سیکرٹری نے اپنے باس کے کمرے میں داخل ہو کر کہا۔

"جناب! ایک خاتون آپ سے ملاقات کرنے آئی ہیں۔"

"کیا وہ خوبصورت ہے؟" باس نے اشتیاق کے ساتھ پوچھا۔

"جی ہاں۔" سیکرٹری نے جواب دیا۔ "انتہائی خوبصورت اور دلکش۔"

"اچھا اسے اندر بھیج دو۔" باس نے کہا اور جلدی جلدی اپنے بال سنوارنے لگا۔

جب وہ عورت ملاقات کر کے چلی گئی تو باس نے اپنے سیکرٹری کو طلب کیا۔

"تم احمق ہو۔" باس نے غصے سے کہا۔ "اس بدصورت عورت میں تمہیں حسن کیسے نظر آیا؟"

"میں معذرت خواہ ہوں جناب!" سیکرٹری نے لجاجت سے کہا۔ "اس نے اپنا نام نہیں بتایا تھا۔ میں سمجھا کہ شاید وہ آپ کی بیوی ہے۔"

"وہ میری بیوی ہی تھی۔" باس نے دھیرے سے کہا۔ "اب دفع ہو جاؤ۔"

ثمرہ، اقرأ۔ کراچی

حسن اخلاق،

حضرت شیخ جنید بغدادیؒ کا فرمان ہے کہ حسن اخلاق چار چیزوں کا نام ہے۔ سخاوت، الفت،

نصیحت اور شفقت۔

آپ نے فرمایا" مجھے فصیح و بلیغ جھوٹے سے بدکار سچے کی محبت زیادہ پسند ہے۔"

نجبہ اکرم۔ گاؤں گوئیکی

بہت تلاش ہو چکی،

جو زندگی فروش تھے وہی ہیں شہر کی زبان
جو خود زمیں کا بوجھ ہیں بنے ہیں میرِ کارواں

غلام سر اٹھائیں گے، کہاں تھا تخت کو گماں
زمین کھا گئی انہیں، جو بن رہے تھے آسماں

جو زندگی کا حسن تھے، وہ لوگ رہ گئے کہاں
بہت تلاش ہو چکی، بس اب تو تھک گئے میاں

امجد اسلام امجد

آزادی،

آزادی اکیلے آدمی کا سفر ہے۔ رسی تڑا کر سرپٹ بھاگنے کا عمل ہے۔ محبت اپنی مرضی سے کھلے پنجرے میں طوطے کی طرح بیٹھنے کی صلاحیت ہے۔ محبت اس غلامی کا طوق ہے جو انسان خود اپنے اختیار سے گلے میں ڈالتا ہے۔ یہ عہد پیری مریدی کا نہیں کہ مرشد منوالئے اور سالک ماننے کے مقام پر ہو۔ یہ زمانہ شادی کا بھی نہیں کہ شادی میں قدم قدم پر اپنی مرضی قربان کرنا پڑتی ہے۔ حضرت اسمٰعیل جس طرح اپنے آپ کو قربان کرنے پر راضی بہ رضا رہے۔ یہ محبت کی عظیم مثال ہے۔ محبت میں ذاتی آزادی طلب کرنا شرک ہے کیونکہ بیک وقت دو افراد سے محبت نہیں کی جا سکتی۔ محبوب سے بھی اور اپنے آپ سے بھی، محبت غلامی کا عمل ہے اور آزاد لوگ غلام نہیں رہ سکتے۔

(بانو قدسیہ کے ناول حاصل گھاٹ سے اقتباس)

عروسہ شہزاد۔ جہلم

نمک پارے،

وہ شخص واقعی خوش نصیب ہے جو صرف اپنے

آپ سے محبت کرتا ہے کیونکہ اس کا کوئی رقیب نہیں ہوتا۔

، بیوی وہ ہوتی ہے جو شوہر کی ان تمام مصیبتوں میں اس کا ساتھ دیتی ہے جو کبھی پیدا نہ ہوتیں اگر وہ اس سے شادی نہ کرتا۔

، خوب صورت عورتیں دو قسم کی ہوتی ہیں۔ ایک وہ جو واقعی خوب صورت ہوں، دوسری وہ جنہیں از راہِ اخلاق یا مذاق خوب صورت کہا جاتا ہے۔

عائشہ۔ گوجرہ

چالاکی،

دروازے پر دستک ہوئی۔ بیوی نے دروازہ کھولا۔ دروازے پر بغیر شرٹ کے اس کا شوہر تھا۔ اس کے منہ سے خون بھی بہہ رہا تھا۔ بیوی نے گھبرا کر پوچھا۔

"یہ آپ کو کیا ہوا ہے۔ آپ تو بینک سے پیسے نکلوانے گئے تھے۔"

"اسی کا تو کمال ہے۔" شوہر نے جل کر کہا۔ "غنڈوں نے مجھے گھیر لیا تھا اور پیسے بھی لے گئے۔"

"لیکن آپ کی شرٹ کہاں ہے؟" بیوی نے پوچھا۔

"وہ شرٹ بھی ایک کو پسند آگئی اور میں نے اتار کر دے دی۔ پھر میں نے ہاتھ جوڑ کر ان سے کہا کہ مجھے جانے دو تو انہوں نے میری گھڑی دیکھی۔ کہنے لگے بڑی چمک رہی ہے۔ جلدی سے اتار دو۔ گھڑی اتارتے وقت انہوں نے میری انگوٹھی دیکھی۔ کہنے لگے اسے بھی اتار دو۔

میں نے کہا بھئی اسے تو چھوڑ دو یہ مجھے میری شادی میں ملی تھی۔ اس پر انہوں نے مجھے بہت مارا اور انگوٹھی اتار لی۔"

"اس کا مطلب ہے انہوں نے آپ سے سب کچھ چھین لیا؟" بیوی نے کہا۔

اس کے شوہر نے اترا کر کہا۔ "نہیں میں نے بھی ایک چیز انہیں لینے نہیں دی۔ اتنی چھپا کے رکھی تھی کہ وہ دیکھ ہی نہیں سکے۔"

بیوی نے خوش ہو کر کہا۔ "اچھا وہ کیا؟"

اس پر شوہر نے جلدی سے جیب سے پستول نکالا اور کہنے لگا "یہ۔"

صائمہ سلیم۔ کراچی

حضرت علیؓ نے فرمایا،

عقل جیسی کوئی دولت نہیں۔ اور جہالت جیسی کوئی غربت نہیں۔ ادب و آداب جیسی کوئی میراث نہیں اور مشورے جیسا کوئی مددگار نہیں۔

تحریم۔ اسلام آباد

اقتباسات،

- بعض اوقات جب ہم اپنی آرزو کو حاصل کرتے ہیں تو محسوس ہوتا ہے کہ یہ تو وہ چیز ہی نہیں جو ہم نے چاہی تھی۔ تمنا اور حاصل میں بڑا فرق ہوتا ہے۔ خوابوں اور تعبیروں میں بڑے فاصلے ہوتے ہیں۔
- محبت کوشش یا محنت سے حاصل نہیں ہوتی۔ یہ تو عطا ہے۔ یہ بڑے نصیب کی بات ہے۔
- زمین کے سفر میں اگر کوئی چیز آسمانی ہے تو وہ محبت ہے۔
- اندیشہ شاید ہماری خواہش کے برعکس کسی نتیجے کا امکان ہے۔

صدف عمران۔ کراچی

ہونٹ،

خاموش ہونٹ بہت ساری پریشانیوں اور مشکلات کو نظر انداز کرتے ہیں لیکن مسکراتے ہوئے ہونٹ ہر مشکل ہر پریشانی کو حل کرتے ہیں۔

مدیحہ نورین مہک۔ برنالی

تکلیف،

کسی دشمن کے سو الفاظ بھی تکلیف نہیں دیتے مگر ایک اچھے اور مخلص دوست کی خاموشی بہت تکلیف دیتی ہے۔ اس ایک اچھے اور مخلص دوست کا ایک لفظ، ایک اچھی بات دشمن کے ایک سو الفاظ پر غالب آ جاتی ہے۔

فوزیہ ثمر بٹ۔ گجرات

خالدہ جیلانی

عظمیٰ شفیق ـــــــ جڑانوالہ

مجھ کو معلوم ہے جونہی میں قدم رکھوں گا
زندگی تیرا کوئی اور کنارہ ہو گا

گڑیا شاہ ـــــــ کہروڑ پکا

جس شام برستے ہیں تیری یاد کے بادل
اس شب کو کوئی ہجر کا مارا نہیں ہوتا
یونہی میرے پہلو میں چلا آتا ہے اکثر
وہ درد جسے ہم نے پکارا نہیں ہوتا

تسیت سنیعہ ـــــــ کہروڑ پکا

نہ جانے کون ہے جس کی تلاش میں ناصر
ہر اک سانس میرا اب سفر میں رہتا ہے

گیلانی سسٹرز ـــــــ کہروڑ پکا

بھلا دے مجھ کو کہ بے وفائی بجا ہے لیکن
گنوا نہ مجھ کو کہ میں تیری زندگی رہا ہوں
وہ اجنبی بن کے ملے بھی تو کیا ہے محسن
یہ ناز کم ہے کہ میں بھی اس کا کبھی رہا ہوں

ثمرہ، اقراء ـــــــ کراچی

رات کے پچھلے پہر میں، میں ہوں اور اداسی
تنہائی کی لہر میں، میں ہوں اور اداسی
وہ ملا آخری بار تو دل ٹوٹ کے رو دیا
جب کہا اس نے گھر میں، میں ہوں اور اداسی

صدف عمران ـــــــ کراچی

میرے کمرے میں پڑے ہیں قسمت کے نجوم
ہر طرف بکھرے رسالے اور کتابوں کا ہجوم

مہ جبیں یوسف ـــــــ کراچی

کبھی کہا نہ کسی سے تیرے فسانے کو
نہ جانے کیسے خبر ہو گئی زمانے کو

نخبہ اکرم ـــــــ گاؤں گوئیکی

ہوا کے دوش پہ اڑنے کا ہنر جانتا ہے
وہ بات کر کے مکرنے کا ہنر جانتا ہے

سیدہ نوبا سجاد ـــــــ کہروڑ پکا

ہمیں نظروں سے اس نے دور رکھا
نہ پوچھو کس قدر مجبور رکھا
میرے آنگن میں دکھ بکھرے ہوئے تھے
مگر دل کو بہت مسرور رکھا

ثنا عابد ـــــــ گجرات

میرے ساتھ ساتھ ہے وہ بڑی تن دہی سے
نہ دل آشنا ہے میرا، نہ مزاج داں ہے شاید

پاکیزہ ہاشمی ـــــــ بہاول پور

گھر کی تنہائی مار دیتی مجھے
میں کسی کام سے نکل آیا

فضیلہ کھوکھر ـــــــ میاں چنوں

اپنا چہرہ تو دکھا جاتا ہے
روز وہ خواب میں آ جاتا ہے
میرے گل دان میں آ کر سرِ شام
کون یہ پھول سجا جاتا ہے

سیمی حیدر ـــــــ راولاکوٹ

پھر اس کے بعد نہ شاید ملے تمہیں لوگو
محبتوں کی کہانی، فسانہ خوشبو کا

آسیہ جاوید ـــــــ علی پور چٹھہ

تری خموش نگاہی سے پھر بھی کم تر ہیں
وہ گیت جو میرے خوابوں نے گنگنائے ہیں

سیدہ نسبت زہرا کی ڈائری سے

انسان کی زندگی میں بے شمار ایسے حالات و واقعات گزرتے ہیں جن کی یادیں ذہن پر بادل کی پرچھائیوں کی طرح چھاجاتی ہیں۔ کچھ باتوں پر یقین کرنا بہت مشکل ہوتا ہے کیونکہ کسی بات کا کسی کے بدل جانے کا ہم تصور بھی نہیں کر رہے ہوتے اور یہ سب انسان نہیں سمجھتا کہ جو دیکھا وہ سچ ہے یا پھر وہ جو سوچ رہا ہوتا ہے وہ صحیح ہے۔ پروین شاکر کی یہ غزل ان حقیقتوں کی عکاس ہے۔ یہ خوبصورت اور حقیقت سے قریب تر غزل ہے۔ آپ بھی پڑھیے اور محسوس کیجیے۔

اک ہنر تھا، کمال تھا، کیا تھا
مجھ میں تیرا جمال تھا، کیا تھا

تیرے جانے پہ اب کے کچھ نہ کہا
دل میں ڈر تھا، ملال تھا، کیا تھا

برق نے مجھ کو کر دیا روشن
تیرا عکسِ جمال تھا، کیا تھا

ہم تک آیا تو مہر لطف و کرم
تیرا وقتِ زوال تھا، کیا تھا

جس نے تہہ سے مجھے اچھال دیا
ڈوبنے کا خیال تھا، کیا تھا

جس پہ دل سارے عہد بھول گیا
بھولنے کا سوال تھا، کیا تھا

تتلیاں تھے ہم اور قضا کے پاس
سرخ پھولوں کا جال تھا، کیا تھا

شبنم شمشاد کی ڈائری سے

محبت انسان کو کیا سے کیا کر دیتی ہے۔ کیسے کیسے انمول انسان محبت کے ہاتھوں بے مول ہو جاتے ہیں۔ یہ نظم اس کی عکاسی کرتی ہے۔

اے محبت!
تیری قسمت کہ تجھے مفت میں ملے ہم سے دانا
جو کمالات کیا کرتے تھے
خشک مٹی کو امارات کیا کرتے تھے

اے محبت!
یہ تیرا بخت کہ بن مول ملے ہم سے انمول
جو ہیروں میں تلا کرتے تھے
ہم سے منہ زور جو بھونچال اٹھا رکھتے تھے

اے محبت!
ہم تیرے مجرم ٹھہرے
ہم کہ جو لوگوں سے سوالات کیا کرتے تھے
ہم جو سو باتوں کی ایک بات کیا کرتے تھے
تیری تحویل میں آنے سے ذرا پہلے تک
ہم بھی اس شہر میں عزت سے رہا کرتے تھے
ہم بگڑتے تو کئی کام بنا کرتے تھے

اور!
اب تیری سخاوت کے گھنے سائے تلے
خلقت شہر کو ہم زندہ تماشا ٹھہرے
جتنے الزام تھے
مقسوم ہمارا ٹھہرے

اے محبت!
ذرا انداز بدل لے اپنا
تجھ کو آئندہ بھی عشاق کا خوں پینا ہے
ہم تو مر جائیں گے، تجھ کو مگر جینا ہے

اے محبت!
تیری قسمت کہ تجھے ملے ہم سے انمول
ہم سے دانا!

خبریں وبریں

واصفہ سہیل

کردار

پچھلے دنوں گلوکارہ حمیرا ارشد اور ان کے شوہر احمد بٹ میں صلح ہو گئی ہے۔ لڑائی کے دوران دونوں نے پریس کانفرنس کر کے ایک دوسرے پر انتہائی سنگین قسم کے الزامات لگائے تھے۔ لیکن ان کے اکلوتے بیٹے علی متقین نے ان دونوں کے درمیان صلح کروادی ہے۔ اس بارے میں حمیرا ارشد کہتی ہیں کہ "شکر ہے ہمارا گھر برباد ہونے سے بچ گیا' ہمارے درمیان جو غلط فہمیاں تھیں۔ وہ سب ختم ہو چکی ہیں۔ ہم اپنے بچے کے اچھے مستقبل کے لیے آئندہ کبھی جھگڑا نہیں کریں گے۔ احمد نے مجھ سے اپنی غلطیوں پر معافی مانگی ہے اور ہم دونوں کے گھر والوں نے ہمارے درمیان گلے شکوؤں کو دور کرنے میں بہت مدد دی۔ میں نے احمد سے دل سے صلح کی ہے اور امید کرتی ہوں کہ احمد آئندہ کسی کی باتوں میں نہیں آئیں گے۔" احمد بٹ نے اس بارے میں کہا ہے کہ میں نے حمیرا سے اور سخی سرور سے بھی معافی مانگی ہے اور میں نے ان پر جو الزامات لگائے ہیں وہ سب میں واپس لیتا ہوں۔ میں تمام دوست' رشتہ داروں اور خاص طور سے میڈیا کا شکر گزار ہوں کہ جنھوں نے اس بات کو اچھالنے کے بجائے ایسا کردار ادا کیا کہ ہم بجائے دور ہونے کے مزید قریب ہو گئے۔"

تنقید

ثمینہ احمد کہتی ہیں کہ مجھے فلم انڈسٹری کے مستقبل کے بارے میں کچھ علم نہیں ہے۔ مستقبل کے بارے میں کوئی بھی کچھ نہیں کہہ سکتا۔ لیکن اگر ہم بھارت کو کاپی نہ کریں' ہمارا اپنا کام ہو' اپنی کہانیاں ہوں تو ہم جگہ بنا سکتے ہیں۔ حکومت کو چاہیے کہ کیمروں پر سے ڈیوٹی ختم کردے۔ جب ہم فلم بناتے ہیں تو ہمیں نہیں پتا ہوتا کہ پہلی ہی فلم ہٹ ہو جائے گی۔ (ثمینہ آج کے

نوجوان تو اس کے لیے آئٹم نمبر کا تڑکا لگاتے ہیں۔ (کبھی کسی کا آئیڈیا ہٹ ہو جاتا ہے اور کسی کا ہٹ آئیڈیا بھی ہٹ نہیں ہوتا۔

بھارت میں کام کرنے پر ہمیں فن کاروں پر تنقید نہیں کرنی چاہیے' اگر کسی کا بھارت میں کام کرنے کا جی کرتا ہے تو اس کو کرنا چاہیے۔ (ثمینہ! جی کی بات نہ کریں' ورنہ آپ کی فن کار برادری یہاں نظر نہیں آئے گی کیوں کہ.....) بھارت والوں کو کوئی فائدہ ہوتا ہے تو وہ ہمارے فن کاروں کو بلاتے ہیں۔ (فائدہ تو بہت گہرا ہے' مگر ہمیں اپنے نقصان کا اندازہ کب ہوگا؟)

ریکارڈ

ہماری ادھوری کہانی میں پاکستانی رائٹر اور شاعر خلیل الرحمان کے لکھے گیت "تیری آنکھوں کے دریا میں اترنا ضروری تھا" کو بھی شامل کیا گیا ہے۔ اس گانے کو راحت فتح علی خان نے گایا ہے۔ خلیل الرحمان قمر کا کہنا ہے کہ یہ پاکستانی ڈراما سیریل "ان سنی" کا تھیم سانگ ہے۔ یہ سیریل جلد آن ایئر ہونے والا ہے۔ اس گانے نے ایشیا میں پاپولر گانے کے ریکارڈ توڑ دیے ہیں (ہیں۔ کیا کہا کیا لوگوں نے....؟)

ادھر ادھر سے

آدمی تنقید گوارا اور پھر فراموش بھی کر دیتا ہے مگر وہ اپنی تحقیر کبھی نہیں بھولتا۔ عمران خان نے افتخار چوہدری پر 73 دفعہ اور نجم سیٹھی پر 65 مرتبہ دھاندلی کے الزامات لگائے اور نام لے لے کر ان پر ملامت کی۔

(محمد طاہر۔ ماجرا)

جمائما کی عمران سے مایوسی اس ناشتے کا نتیجہ تھا جو موصوفہ نے مشرف کے ساتھ کیا تھا۔ جس میں پرویز مشرف نے جمائما کو عمران کی اپنی اور "مہیا کردہ" حمایت کا پورا ماجرا بھی بیان کر دیا تھا۔ جمائما نے تب عمران خان کے حوالے سے اپنی زندگی پر نظر ثانی شروع کر دی تھی۔

(محمد طاہر..... ماجرا)

☆ ہندو قیادت کا ایک نفسیاتی اور تاریخی مسئلہ برصغیر میں مسلمانوں کی آبادی ہے۔ مسلمان 712ء میں' برصغیر میں آئے تھے تو ان کی آبادی ہزاروں میں تھی' جبکہ آج برصغیر میں ان کی آبادی 50 کروڑ سے زیادہ ہے۔ ظاہر ہے کہ مسلمانوں کی یہ آبادی مقامی ہندو آبادی کے بڑے پیمانے پر اسلام قبول کرنے کا نتیجہ ہے۔ اہم بات یہ ہے کہ مذہب کی تبدیلی کے عمل میں جبر اور لالچ کا کوئی پہلو موجود نہیں۔

(شاہنواز فاروقی۔ گفتگو)

ماڈل ایان علی نے دھمکی دی ہے کہ اگر اس کی مدد نہ کی گئی تو وہ یوسف رضا گیلانی' آصف علی زرداری اور رحمٰن ملک کے تمام راز فاش کر دے گی۔ یہ دھمکی کام کر گئی ہے اور اب پیپلز پارٹی کی قیادت کے حکم پر سابق گورنر پنجاب لطیف کھوسہ ایان علی کی قانونی پیروی کے لیے سامنے آگئے ہیں۔

میاں منیر احمد۔ فرائی ڈے اسپیشل)
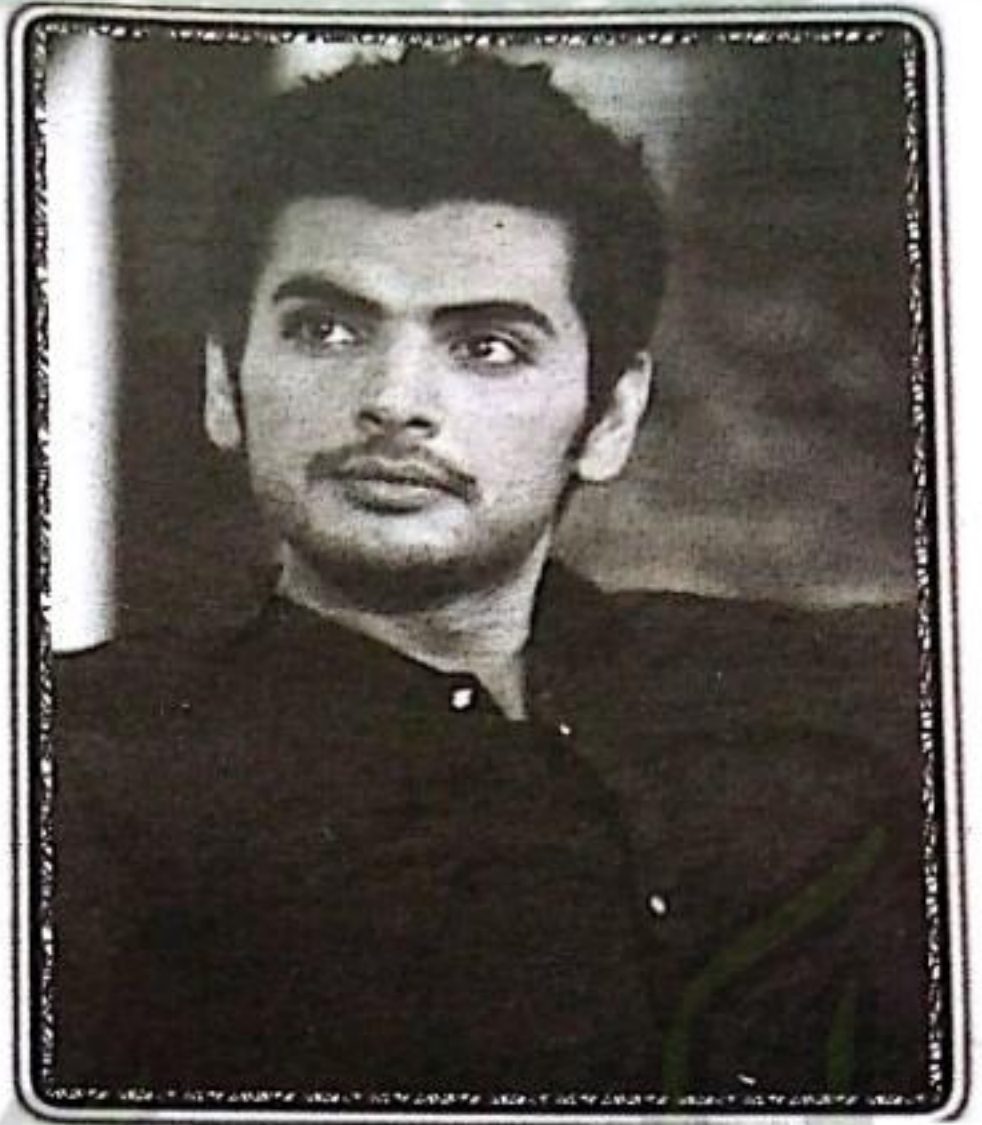
البتہ اسپورٹس سے بہت دلچسپی ہے۔"

8 "قد/ستارہ؟"

"5 فٹ 11 انچ/ستارہ آپ ڈیٹ آف برتھ سے نکال لیں۔"

9 "فیلڈ میں آنے کی وجہ؟"

"مجھے ہیرو بننا تھا۔"

10 "برائی شوبز میں ہے یا اپنے اندر ہے؟"

"برائی ہمارے معاشرے میں ہے۔"

11 "آپ کی گڈ مارننگ کب ہوتی ہے؟"

"صبح تقریباً" 10 بجے۔"

12 "اور گڈ نا ... ؟"

"تقریباً" رات کے دو بجے۔"

13 "آپ کی عادت ہے کہ؟"

"کہ صبح اٹھ کر کلی کرکے جوس کا ایک گلاس پیتا ہوں۔

باتیں یاسر شورو کی

شاہین رشید

1 "اصلی نام؟"

"یاسر نور شورو۔"

2 "پیار کا نام؟"

"یاسر ہی کہتے ہیں۔"

3 "تاریخ پیدائش/شہر؟"

"4 نومبر 1985ء/سعودی عرب۔"

4 "فیملی ممبرز؟"

"والدین ایک بڑا بھائی ایک چھوٹا بھائی میں بیچ کا۔"

5 "شادی؟"

"جی شادی ہو چکی ہے تقریباً" دو سال پہلے۔"

6 "تعلیم؟"

"گریجویٹ ہوں۔"

7 "تعلیم سے دلچسپی؟"

"بہت زیادہ نہیں ہے اس لیے صرف گریجویشن ہی کیا۔

اور ضرور پیتا ہوں۔

14 "آپ کو شکوہ ہے گھر والوں سے کہ؟"

"کہ مجھے کوئی پوچھتا نہیں ہے کہ آج کل کیا کر رہے ہو' کون کون سے ڈرامے آ رہے ہیں۔ میرا دل چاہتا ہے کہ گھر والے مجھ سے پوچھیں۔"

15 "اپنے ملک کا کون سا قانون برا لگتا ہے؟"

"قانون تو اچھے برے ہیں ہی..... مگر مجھے اپنے ملک کے سیاست داں بہت برے لگتے ہیں۔"

16 "کیا آپ ایک مکمل شخصیت ہیں جسمانی لحاظ سے؟"

"الحمد للہ..... مکمل شخصیت ہوں۔"

17 "پسندیدہ تہوار؟"

"مجھے مذہبی تہوار بہت اچھے لگتے ہیں نہ صرف اپنے بلکہ دوسروں کے بھی۔"

18 "شدید بھوک میں کھانے کو دل چاہتا ہے؟"
"بریانی۔"

19 "دوسروں کے دکھ کا احساس کب ہوتا ہے؟"
"آپ یہ پوچھیں کہ دوسروں کی بھوک کا احساس کب ہوتا ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ جب مجھے بھوک لگی ہو تو پھر غریبوں کا احساس ہوتا ہے۔"

20 "ملک میں کون سی تبدیلی ضروری ہے؟"
"ملک میں قوانین نافذ کر دیے جائیں تو سب ٹھیک ہو جائے۔"

21 "آپ کی خوشی اسی میں ہے کہ؟"
"کہ لوگ خوش ہوں' ورنہ میں نے دیکھا ہے کہ کوئی خوش ہو تو لوگ کہتے ہیں کہ کیوں خوش ہے اور کوئی روئے تو.... ہو گی کوئی بات۔"

22 "کن کن ممالک میں جانے کا اتفاق ہوا؟"
"دبئی' سری لنکا' تھائی لینڈ' سعودی عرب وغیرہ۔"

23 "ضدی ہیں؟"
"ہاں ہوں.... مگر کوشش کرتا ہوں کہ ضد نہ کروں۔"

24 "شدید غصہ آتا ہے؟"
"جب کوئی بغیر کسی لاجک کے بے وقوفی کی باتیں کرتا ہے۔"

25 "بہترین انتقام آپ کی نظر میں؟"
"اگنورنیس۔"

26 "خواتین میں کیا بات اچھی لگتی ہے اور بری؟"
"ایمان داری / توقعات۔"

27 "جب کوئی لڑکی مسلسل گھورے تو؟"
"مجھے لگتا ہے میں آج زیادہ اچھا لگ رہا ہوں۔"

28 "گھر میں کس کے غصے سے ڈر لگتا ہے؟"
"والدہ کے۔"

29 "کیا وقت سے پہلے ملا؟"
"بہت کچھ' بہت سی کامیابیاں عزت' شہرت۔"

30 "اکاؤنٹ جوائنٹ ہونا چاہیے؟"
"نہیں.... اپنا اپنا۔"

31 "محبت کا اظہار کھل کر کرتے ہیں؟"
"نہیں.... مجھے اظہار کرنا نہیں آتا۔"

32 "ونڈو شاپنگ میں آپ کی دلچسپی؟"
"نہیں ونڈو شاپنگ پسند نہیں' کچھ خریدنا ہوتا ہے تب ہی جاتا ہوں شاپنگ پہ۔"

33 "آپ کے دنیا میں آنے کا مقصد؟"
"ہر انسان کا اس دنیا میں آنے کا کوئی نہ کوئی مقصد ضرور ہوتا ہے اور میرا مقصد شوبز میں آنا اور اپنی پرفارمنس سے متاثر کرنا ہے۔"

34 "پیسہ بے دریغ خرچ کرتے ہیں؟"
"نہیں' بہت سوچ سمجھ کر کرتا ہوں مگر کنجوسی نہیں دکھاتا بلکہ اچھی لائف گزارنے کے لیے مزید محنت کرتا ہوں۔"

35 "کوئی برا وقت آپ نے گزارا؟"
"برا اور اچھا وقت انسان اپنی سوچ سے گزارتا ہے۔ اگر جیب میں پیسہ نہیں ہے تو سمجھیے کہ آپ کا برا وقت ہے اور۔"

36 "بہترین تحفہ خدا کی طرف سے؟"
"ایک خوب صورت اور چھوٹی سی فیملی۔"

37 "کس بات سے موڈ اچھا ہو جاتا ہے؟"
"جب ہم عام پبلک میں پہچانے جاتے ہیں۔"

38 "آنکھ کھلتے ہی بستر چھوڑ دیتے ہیں؟"
"بالکل.... کبھی کبھار ہی مشکل ہوتی ہے۔"

39 "مخلص کون ہوتے ہیں۔ اپنے یا پرائے؟"
"صرف اور صرف اپنے۔"

40 "چھٹی کا دن کس طرح گزارنے کا دل چاہتا ہے؟"
"دل تو چاہتا ہے کہ اکیلے ہی گزاروں' مگر بیوی ہے تو بھلا اکیلا کیسے گزار سکتا ہوں۔"

41 "گھر میں پسندیدہ لباس؟"
"شارٹس اور ٹی شرٹ۔"

43 "عورت حسین ہونی چاہیے کہ ذہین؟"
"حسین ہونی چاہیے ذہین تو وہ پہلے سے ہی ہوتی ہے۔"

44 "گھر کے کس کونے میں سکون ملتا ہے؟"
"باتھ روم میں (قہقہہ)"

45 ”کس کے ایس ایم ایس کے جواب فوراً“ دیتے ہیں؟“

”جن میں کوئی ضروری بات پوچھی گئی ہو۔“

46 ”میوزک کب سنتے ہیں؟“

”جب بور ہو رہا ہوتا ہوں۔“

47 ”کسی کو فون نمبر دے کر پچھتائے؟“

”ہاں کیوں نہیں، پتا نہیں لوگوں کو میرا نمبر کہاں سے مل جاتا ہے۔“

48 ”مہمانوں کی اچانک آمد....؟“

”بہت بری لگتی ہے۔“

49 ”سیاست سے آپ کی دلچسپی؟“

”بالکل بھی نہیں ہے۔“

50 ”کیا چیزیں جمع کرنے کا شوق ہے؟“

”مختلف برانڈ کی چیزیں جمع کرنے کا شوق ہے۔“

51 ”نصیحت جو بری لگتی ہے؟“

”بہت ساری ہیں۔ انسان جب بڑا ہو جائے تو بہتر ہے کہ اسے اپنی مرضی سے جینے دیا جائے۔“

52 ”انسان کی زندگی کا بہترین دور؟“

”بچپن.... آزادی، بے فکری.... مزے۔“

53 ”کوشش کے باوجود عمل نہیں کر پاتا؟“

”قہقہہ.... وقت کی پابندی .... پھر سوری بھی کر لیتا ہوں۔“

54 ”خرچ کرنے کو دل چاہتا ہے ان لوگوں پر؟“

”جو مجھ سے کسی قسم کی توقعات نہیں رکھتے۔“

55 ”اپنے لیے اپنی کمائی سے کیا کچھ خریدا؟“

”کیا کچھ نہیں خریدا.... بہت ساری چیزیں خریدی ہیں۔“

56 ”کھانے کے لیے پسندیدہ جگہ چٹائی، ڈائننگ ٹیبل یا اپنا بیڈ؟“

”اپنا بیڈ۔“

57 ”دیسی انداز میں کھانا پسند ہے یا بدیسی انداز میں؟“

”دیسی انداز میں جہاں ضرورت ہو چھری کانٹے کا بھی استعمال کر لیتا ہوں۔“

58 ”ریسٹورنٹ میں کھانا کھانا پسند ہے یا ڈھابے میں؟“

”جہاں کوالٹی آف فوڈ ہو۔“

59 ”اگر آپ کے علاوہ ساری دنیا سو جائے تو دنیا سے کیا لینا چاہیں گے؟“

”کچھ نہیں.... میں بھی سو جاؤں گا۔“

60 ”ہم اپنے لیے بنتے سنورتے ہیں یا دنیا کے لیے؟“

”ففٹی ففٹی.... دکھانے کے لیے بھی اور اپنے لیے بھی۔“

61 ”انٹرنیٹ اور فیس بک سے آپ کی دلچسپی؟“

”دنیا کے ساتھ چلنا ہے تو دلچسپی تو لینی ہے۔“

62 ”دیسی کھانے پسند ہیں یا کانٹی نینٹل؟“

”دیسی کھانے پسند ہیں۔“

63 ”نرم دل کون ہوتا ہے؟“

”مرد۔“

64 ”کپڑے سلواتے ہیں یا بوتیک کا فائدہ اٹھاتے ہیں؟“

”ریڈی میڈ.... کون درزیوں کے چکر لگائے۔“

65 ”اگر آپ خدانخواستہ اغوا ہو جائیں تو فکرمند کون ہو گا؟“

”میرے خیال سے پوری فیملی۔“

66 ”کن کیڑوں سے ڈر لگتا ہے؟“

”چھپکلی اور سانپ سے۔“

67 ”کیا محبت اندھی ہوتی ہے؟“

”بالکل بھی نہیں۔“

68 ”کون سے رویے دکھ دیتے ہیں؟“

”وہ جن سے آپ توقعات وابستہ کر لیتے ہیں۔“

69 ”شادی میں پسندیدہ رسم؟“

”رخصتی۔“

70 ”شادی میں تحفہ دینا چاہیے یا کیش؟“

”کیش دینا چاہیے۔“

71 ”ناشتہ اور کھانا کس کے ہاتھ کا پکا پسند ہے؟“

''امی اور بیگم دونوں کے ہاتھ کا' جو بھی بنادے۔''

72 ''اپنا فون نمبر کتنی بار تبدیل کیا؟''

''تین بار۔''

73 ''آپ کو فوبیا ہے؟''

''زیادہ کام کا.... کہ اگر اچانک کام ملنا بند ہو گیا تو؟''

74 ''کن چیزوں کو لیے بغیر گھر سے نہیں نکلتے؟''

''فون اور والٹ۔''

75 ''عام لوگوں سے آپ مختلف ہیں؟''

''نہیں بالکل بھی نہیں۔ میرے کام نے مجھے پہچان دی ہے۔''

76 ''خونی رشتے سچے ہوتے ہیں یا پرائے؟''

''خونی رشتے۔''

77 ''اپنی غلطی کا اعتراف کر لیتے ہیں؟''

''بالکل اور کر لینا چاہیے۔''

78 ''آپ کی اچھی اور بری عادت؟''

''کبھی کبھی بات نہ ماننا بری عادت ہے اور سوری کر لینا اچھی عادت ہے۔''

79 ''دل کی مانتے ہیں یا دماغ کی؟''

''دل اور دماغ کی سن کر آخر میں دل کی مانتا ہوں۔''

80 ''کب منہ سے گالیاں نکلتی ہیں؟''

''جب کوئی تنگ کرے تو۔''

81 ''غصے میں پہلا لفظ؟''

''معاف کر دو بھئی۔''

82 ''وہ بے وقوف ہوتے ہیں؟''

''جو غصے میں کھانا پینا چھوڑ دیتے ہیں۔''

83 ''شہرت کب مسئلہ بنتی ہے؟''

''شہرت اس وقت مسئلہ بنتی ہے جب حقیقی چہرے آپ کے سامنے آتے ہیں کہ جب تک آپ عام ہوتے ہیں تو لوگوں کے کیا رویے ہوتے ہیں اور خاص ہوتے ہیں تو کیا رویے ہوتے ہیں۔''

84 ''نیند فوراً'' آجاتی ہے یا انتظار کرتے ہیں؟''

''فوراً'' آجاتی ہے۔ شاید تھکاوٹ ہوتی ہے اس لیے۔''

85 ''اپنے سرہانے کیا کیا چیزیں رکھتے ہیں؟''

''چارجر اور پانی۔''

86 ''خدا کی حسین تخلیق؟''

''انسان۔''

87 ''زندگی کب بری لگتی ہے؟''

''جب سب کچھ ہاتھ سے چلا جائے تب۔''

88 ''کھانے کی ٹیبل پر کیا نہ ہو تو کھانے کا مزہ نہیں آتا؟''

''سلاد اور رائتہ۔''

89 ''ویلنٹائن ڈے منانا کیسا لگتا ہے۔''

''فضول.... پیار کے لیے ایک دن نہیں ہوتا ہر دن ہوتا ہے۔''

90 ''محنت سے پیسہ ملتا ہے یا قسمت سے؟''

''محنت سے.... قسمت اچھی ہو تو کیا کہنے۔''

91 ''کوئی گہری نیند سے اٹھا دے تو؟''

''مجھے ایسے کوئی نہیں اٹھاتا.... سوائے کسی ضروری کام کے۔''

92 ''جھوٹ کب بولتے ہیں؟''

''ہر وقت۔''

93 ''اپنی شخصیت میں کیا چیز بدلنا چاہتے ہیں؟''

''کچھ کہہ نہیں سکتا۔ ویسے میرے خیال میں کچھ نہیں۔''

94 ''بہت سارا پیسہ ہاتھ آجائے تو؟''

''پہلے آتو جائے پھر سوچوں گا کہ کیا کرنا ہے۔''

95 ''دن کے کس حصے میں فریش ہوتے ہیں؟''

''صبح کے وقت۔''

96 ''گھر آکر پہلی خواہش؟''

''سونے دو۔''

97 ''موبائل سروس آف ہو تو؟''

''خوش ہوتا ہوں۔''

98 ''دنیا کا سب سے برا جملہ؟''

''آئی ایم سوری۔''

''اگر آپ کی شہرت کو زوال آجائے تو؟''

''زوال آپ کی سوچ کی وجہ سے آتا ہے۔''

☆

آپ کا باورچی خانہ

مسز حمیرا ثقلین

1 ۔ کھانا پکاتے ہوئے ظاہر ہے سب سے پہلے تو پسند ناپسند کا خیال رکھنا پڑتا ہے۔ گھر میں کس کو کیا کھانا ہے اور کیا نہیں اسی لیے میری یہ کوشش ہوتی ہے کہ وہی کچھ پکایا جائے جو میاں صاحب اور بچے شوق سے کھائیں اور اپنی تو خیر ہے گوشت یا سبزی یا دال جو بھی ہو سب چلتا ہے۔ غذائیت کا دھیان بھی رکھا جاتا ہے اور صحت کا بھی لیکن پسند ناپسند سب سے پہلے ہے۔

2 ۔ ویسے تو مہمان وقت بے وقت آتے ہی رہتے ہیں اور عام روٹین میں جو کچھ پکا ہو' وہ چل جاتا ہے۔ لیکن بسا اوقات اگر مہمان خاص ہوں تو پھر ان کے لیے خاص اہتمام کرنا پڑتا ہے' چاہے وقت کی کمی ہی کیوں نہ ہو۔ اگر کبھی اس طرح کی چویشن ہو جائے تو پھر بھی میں تین چار ڈشز ایک گھنٹے میں تیار کر لیتی ہوں۔ جس میں چاول پلاؤ کی شکل میں خصوصاً" گوشت ڈال کر' قیمہ کوئی سبزی ڈال کر' سادہ گوشت تھوڑی سی گریوی والا اور ایک ڈش مرغی کے گوشت کی ۔مثلاً" فرائی چکن' یہ نام میری بیٹی نے اس ڈش کا رکھا ہے۔ جبکہ ترکیب خالص میری اپنی ہے۔ اس کو بناتے وقت آپ دوسرا کوئی کام مثلاً" پلاؤ ۔ کے لیے گوشت تیار کرنا' رائتہ' سلاد بنانا یا پھر میز پر برتن وغیرہ لگا سکتی ہیں' جبکہ اسی دوران آپ مہمانوں کے پاس بھی آکر بیٹھ سکتی ہیں۔ ترکیب یہ ہے۔

ضروری اجزا :

چکن (سائز نارمل بوٹی)	ایک کلو
دہی	ایک پاؤ
سفید سرکہ	ایک کھانے کا چمچ
نمک' سرخ مرچ	حسب ذائقہ
کالی مرچ (پسی ہوئی)	حسب ذائقہ
ہلدی	آدھا چائے کا چمچہ
گھی تلنے کے لیے	حسب ضرورت

ترکیب :

تمام مسالے سفید سرکہ سمیت دہی میں اچھی طرح ملا کر دہی کو پھینٹ لیں۔ چکن دھو کر اس کا پانی نچوڑ لیں اور اس میں مسالے والا دہی ڈال کر اچھی طرح ملا کر اس کو آدھے گھنٹے کے لیے رکھ دیں۔ اب ایک درمیانے سائز کی کڑاہی میں آدھا چکن ڈال کر اوپر سے ڈھک دیں۔ آنچ دھیمی کر دیں۔ پانچ منٹ کے بعد تیز آنچ کر دیں اور کھانے کے تقریباً" پانچ چمچ گھی ڈال کر چکن کا پانی سکھا کر اسی گھی میں اس کو فرائی کریں۔ فرائی کرنے کے بعد اسی گھی میں دوسرا بچا ہوا چکن بقیہ دہی سمیت ڈال کر اسی طریقہ سے پکائیں۔

مسالے والے چکن کو دہی کی چٹنی اور روٹی کے ساتھ بھی کھا سکتے ہیں۔ ٹماٹو کیچپ کے ساتھ' مہمانوں کو چائے کے ساتھ بھی پیش کر سکتے ہیں۔

3 ۔ کچن کی صفائی صبح ناشتے کے بعد اور پھر رات کے کھانے کے بعد روزانہ خود کرتی ہوں۔ رات کو برتن سکھا کر سمیٹ کر کچن کو صاف کر کے سوتی ہوں تاکہ صبح اٹھ کر کچن میں آنے پر پریشانی نہ ہو۔ سلیب' اوون' نمک مرچ والے ڈبے اور کوکنگ رینج میری صبح اور رات کی صفائی میں شامل ہیں۔ بقیہ الماریوں کی صفائی ہر چار مہینے کے بعد کرتی ہوں کیوں کہ وہ اندر سے بھی لکڑی کی بنی ہوئی ہیں اس لیے ان میں برتن صاف رہتے ہیں۔

4 ۔ صبح کا ناشتہ میاں صاحب اور اپنے لیے بناتی ہوں کیوں کہ بچے اسکول چلے جاتے ہیں۔ ابھی چھوٹی کلاسوں میں ہیں اس لیے صبح دودھ پی کر اور لنچ ساتھ لے کر جاتے ہیں۔ اگر کبھی مہمان آجائیں تو ناشتے میں

اہتمام ہوتا ہے' نہیں تو رات کا بچا ہوا سالن ہی ناشتے میں استعمال ہوتا ہے۔

تلے ہوئے آلو جو مجھے اور باقی گھر کے افراد اور ساتھ ہی مہمانوں کو بھی بہت پسند آتے ہیں اس کی ترکیب حاضر خدمت ہے۔

تلے ہوئے آلو

ضروری اجزا :

آلو	1/2 کلو
نمک' سرخ مرچ	حسب ضرورت
سبز دھنیا	چند پتے
سبز مرچ کٹی ہوئی	چار عدد
موٹے سائز میں	
گھی' تیل تلنے کے لیے	حسب ضرورت

ترکیب :

آلوؤں کو چھیل کر دھولیں۔ ان کے باریک قتلے کاٹ کر کڑاہی میں زیادہ تیل یا گھی ڈال کر تھوڑا تھوڑا کر کے ان کو تل لیں' کسی برتن میں نکال کر اس پر نمک' سرخ مرچ چھڑک لیں۔ اب کڑاہی والا گھی تیل کسی اور برتن میں نکال کر محفوظ کرلیں اور کڑاہی میں آلو اور سبز مرچ کٹی ہوئے ڈال کر پانی کا چھینٹا لگا کر ان کو اوپر نیچے کر کے ڈھکن ڈھک دیں اور آنچ دھیمی کر کے پانچ منٹ دم دے دیں۔ دم کھول کر ان کو ہلالیں اور سبز دھنیا آلوؤں کے اوپر ڈال دیں۔

تلے ہوئے مزیدار آلو تیار ہیں۔

5 ۔ ہمارے یہاں اگرچہ ہوٹل تو بہت سے ہیں لیکن مجھے وہاں جا کر کھانا کھانے کا اتفاق کبھی بھی نہیں ہوا' نہ تو کبھی کے ساتھ' نہ ہی سالگرہ یا کسی اور موقع پر۔ ہاں اگر کبھی ملتان اپنی ننھیال بچوں کے ساتھ جاؤں تو وہاں بھی کسی ہوٹل میں جانے کی بجائے کے ایف سی جانا پسند کرتی ہوں اور میرے بچے بھی۔

6 ۔ روز مرہ کی روٹین میں تو وہی کچھ بنتا ہے' جو کہ گھر کے افراد پسند کریں ہاں اگر کبھی بارش ہو تو پھر موسم کی مناسبت سے کبھی پکوڑے تو کبھی چپس اور پھر کبھی مال پوڑے جو کہ ملتان کی ایک خاص ڈش ہے اور حلوائی کی دکان سے پوریوں کے ساتھ ملتے ہیں' وہ ضرور بناتی ہوں۔ ویسے سب ہی کہتے ہیں کہ میرے بنائے ہوئے مال پوڑوں اور حلوائی کے مال پوڑوں میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔ یہ مال پوڑے جب میں بناتی ہوں تو اپنے ملنے والوں کے گھر ضرور بھیجتی ہوں۔

7 ۔ اچھا پکانے کے لیے محنت تو ہوتی ہی ہے لیکن شوق ضرور ہونا چاہیے' تب ہی کھانا اچھا بنتا ہے۔

8 ۔ کیلوں کو گیلے کپڑے سے ڈھانپ کر اگر فریج میں رکھیں تو وہ باہر سے دیکھنے میں تازہ ہی لگتے ہیں دوسرا جلدی خراب بھی نہیں ہوتے۔

فریج میں کٹا ہوا لیموں رکھنے سے ایک کھانے کی خوشبو دوسرے کھانے یا چیز میں نہیں پھیلتی۔

✡

موسم کے پکوان

خالدہ جیلانی

چاول کے ٹکڑے

ضروری اجزا:

چاول	1کلو
گڑ	1کلو
پستہ/مونگ پھلی	حسب ضرورت
بادام	حسب ضرورت

ترکیب:

چاول کو بھگو کر رکھ لیں۔ اتنی دیر بھگوئیں کہ چاول نرم ہو جائیں۔ پھر چاول کو خشک کر لیں اور پھر کپڑے پر ڈال دیں۔ تاکہ پانی خشک ہو جائے۔ پھر چاولوں کو گرائنڈ کر لیں۔ گڑ کا شیرہ بنا لیں۔ پھر ان چاولوں کو شیرہ میں ڈال دیں۔ پھر دونوں چیزوں کو اچھی طرح ملائیں کہ دونوں یکجان ہو جائیں خشک میوہ جات پیس کر ڈال دیں۔

مزے دار ٹکڑے تیار ہیں۔

حمیرا شکیل۔۔۔۔ چنیوٹ

خشک چٹنی

ضروری اجزا:

سبز دھنیا	ایک گٹھی
پودینہ	ایک گٹھی
سبز مرچ	5عدد
ثابت لال مرچ	5عدد
کالی مرچ	حسب ضرورت
نمک	حسب ضرورت

ترکیب

ان سب چیزوں کو دھوپ میں خشک کر لیں اور گرائنڈ کر لیں۔ ایک پیالے میں دہی لیں اور ایک چٹکی چٹنی ڈال کر مکس کر لیں۔ مزے دار چٹنی تیار ہے۔

کھاؤسے.....(میمنی ڈش)

یہ ڈش تین مراحل میں تیار ہوگی۔ پہلے مرحلے میں کڑھی تیار کی جائے گی۔

پہلا مرحلہ۔

کڑھی:

ضروری اجزا:

بیسن	آدھا پاؤ
ہری مرچ	آٹھ عدد
ہلدی	ایک بڑا چمچہ
کھوپرا	(پسا ہوا)
پیاز	ایک عدد
ٹماٹر	ایک عدد
ملائی	چار کھانے کے چمچے
سوکھی ٹاٹری	ایک چائے کا چمچہ

ترکیب:

مندرجہ بالا تمام اجزا کو بیسن' ایک پاؤ دہی کے مرکب میں ملا کر بلینڈ کر لیں پھر اس کو پتیلی میں ڈال کر 5 گلاس پانی ڈال کر پکنے کے لیے رکھ دیں ایک جوش آجائے تو آنچ ہلکی کر کے ڈھک دیں۔

کڑھی کا بگھار:۔

بگھار کے لیے کڑھی پتے' ثابت لال مرچ' زیرہ اچھی طرح تیل میں کڑکڑائیں اور کڑی پر ڈال دیں۔

دوسرا مرحلہ: دوسرے مرحلے میں کھاؤسے کے لیے قورمہ تیار کیا جائے گا۔

ضروری اجزا :

گوشت	(چھوٹی چھوٹی بوٹیاں بنالیں) آدھا کلو
پیاز	باریک چوپ کرلیں (4-5 عدد)
دہی	1 پیالی
نمک	حسب ضرورت
ادرک لہسن	2 بڑے کھانے کے چمچے
ہلدی	1 چائے کا چمچہ
تیل	حسب ضرورت
ثابت گرم مسالا	ایک کھانے کا چمچہ

ترکیب :

پیاز کو تیل میں سنہری کر کے نکال لیں پھر اس پیاز کو دہی کے ساتھ پیس کر رکھ لیں۔ اسی تیل میں گوشت

اور باقی مسالا ڈال کر فرائی کریں پھر پانی ڈال کر گلنے کے لیے رکھ دیں۔ گوشت گل جائے تو پیاز اور دہی کا مکسچر ڈال کر اچھی طرح بھونیں آئل اوپر آجائے تو پانی ڈال کر کچھ دیر پکائیں پھر چولہا بند کردیں۔

تیسرا مرحلہ : ۔

ضروری اجزا :

اسپگٹھی کو ابال لیں اور ابلتے وقت ایک چمچہ تیل بھی ڈال دیں۔ ابل جائے تو چھلنی میں چھان کر ٹھنڈے پانی میں ڈال کر رکھ دیں۔

کھاؤسے کے لوازمات : ۔

کٹی ہوئی مرچ اور لہسن کے باریک جوے الگ الگ فرائی کر کے نکال لیں۔

ابلی ہوئی تھوڑی سی نوڈلز کو بھی فرائی کر کے کڑک کرلیں۔

ہری پیاز کو باریک کاٹ لیں۔

پاپڑی بھی ساتھ رکھیں اور کرش کرلیں۔

کھاؤسے کی پلیٹ بنانے کا طریقہ :

سب سے پہلے ابلے ہوئے نوڈلز کو ٹھنڈے پانی سے چھان کر ایک پلیٹ میں نکال لیں پھر کڑھی اور گوشت کے قورمے کی ایک ایک تہہ لگائیں پھر کڑک کی ہوئی نوڈلز، پاپڑی، لہسن اور لال مرچ فرائی کی ہوئی اوپر ڈالیں ہری پیاز اور اگر کوئی ساس گھر میں رکھی ہے تو وہ بھی اوپر ڈال دیں۔ لیجیے مزے دار سی کھاؤسے کی پلیٹ تیار ہے۔

صائمہ خان

دیسی رینبو پزا

ضروری اجزا :

قیمہ (بھنا ہوا)	1 کپ
چاول کا آٹا	1/4 کپ
مکھن	1 چائے کا چمچہ
نمک	حسب ذائقہ
پیاز (چوپ کرلیں)	1 عدد
ہری پیاز	1/2 کپ
ہری مرچیں (چوپ کرلیں)	4 عدد
ٹماٹر	1/2 کپ (باریک کٹے ہوئے)

ترکیب :

ایک پیالے میں چاول کا آٹا اور نمک ڈال کر پتلا سا پیسٹ بنالیں۔ نان اسٹک توے کو پہلے اچھی طرح گرم کرنے کے بعد آنچ بالکل ہلکی کردیں۔ اب توے پر پہلے مکھن ڈال کر چاول کا آٹا ڈال کر گول روٹی کی طرح پھیلا دیں۔ روٹی زیادہ بڑی نہیں بنانی اور تھوڑی سی موٹی رکھنی ہے۔ اب سب سے پہلے اس کے اوپر قیمہ پھیلائیں۔ قیمہ کے اوپر پیاز، ہری پیاز، ٹماٹر اور آخری میں تھوڑا سا نمک چھڑک دیں۔ اب انڈے کو اس طرح توڑ کر ڈالیں کہ درمیان میں زردی رہ جائے اور سفیدی باہر کی طرف آجائے۔ اب اس کو ہلکی آنچ پر 5-4 منٹ تک ڈھک کر پکائیں۔ دیسی اسٹائل رینبو پزا تیار ہے۔

س.... کراچی

س:۔ اس دنیا میں موجود کوئی چیز چاہے وہ میرے بچے ہوں یا کچھ اور، مجھے کچھ بھی اچھا نہیں لگتا، بس میں جینا نہیں چاہتی۔ اللہ پر میرا یقین بہت مضبوط ہے، میں جانتی ہوں کہ جو کچھ بھی ہمارے ساتھ ہوتا ہے اس میں ہمارے لیے کچھ نہ کچھ بہتری ضرور ہوتی ہے۔

میری عمر 24 سال ہے۔ میرے شوہر نے مجھ سے بے وفائی کی اور مجھے بتا بھی دیا مگر وہ یہ نہیں سمجھتا کہ اس نے مجھ سے کوئی زیادتی کی ہے اور یہ ہے بھی حقیقت کہ قطع نظر اس کی بے وفائی کے وہ دنیا کا سب سے اچھا شوہر ہے۔ وہ میرا بہت خیال کرتا ہے مگر آپ خیال رکھنے اور محبت کرنے کے بیچ فرق تو سمجھتے ہوں گے؟ اس کے بقول وہ اس لڑکی سے ملنا چھوڑ چکا ہے، مگر آپ مجھے بتائیں کہ مجھے یقین کیسے آئے۔ اس شک نے میرا دماغ اور میری زندگی خراب کردی ہے۔ پورے خاندان میں میرے شوہر کا امیج بہت زیادہ شریف اور اچھے باکردار آدمی کا تھا اور ہے۔ جب پہلی دفعہ مجھے اس کے بارے میں معلوم ہوا تو میں نے اپنے شوہر پر یقین کرلیا کہ آئندہ وہ کبھی اس لڑکی سے دوبارہ نہیں ملے گا مگر دو تین دفعہ میرا اعتبار توڑ چکا ہے اور اب میں شک کی زد میں اسے بھی لفظوں سے ہرٹ کرتی رہتی ہوں اور خود تو رہتی ہی زخمی ہوں۔ میرے بچوں کے ساتھ میرا رویہ بہت تلخ ہوتا ہے، مجھے لگتا ہے کہ یہ درد برداشت کرتے کرتے میں پاگل ہو جاؤں گی۔ آپ مجھے بتائیں میں کیا کروں کیوں کہ مجھ سے صبر نہیں ہوتا۔ اکثر اوقات میں روتی رہتی ہوں۔ ہر وقت خود بھی اذیت میں رہتی ہوں اور اپنے شوہر کو بھی مبتلا رکھتی ہوں۔ مجھے ایک ایسا بندہ چاہیے جو ہر وقت میرے آنسو صاف کرے اور مجھ سے کہے کہ تیرے سارے آنسو میرے اور میرے سارے سکھ تیرے۔ مجھے معلوم ہے لوگوں کے ساتھ اس سے بھی برا ہوتا ہے، مگر پھر بھی میرا جینے کو دل نہیں کرتا۔ مجھے محبت چاہیے، محبت کا والہانہ اظہار چاہیے اور اگر ایسا نہ ہو تو میں زندہ نہیں رہنا چاہتی۔ ہمارے گھر کا ماحول بہت سخت ہے، باہر جانے پر پابندی ہے۔ ٹیلیفون سننے پر پابندی ہے لہٰذا میں اپنے دل کو ادھر ادھر لگا بھی نہیں سکتی، میرے گھر والے مجھے صبر کرنے کو کہتے ہیں، اس کا مطلب ہے کہ وہ مجھے میرے تین بچوں کے ساتھ نہیں رکھ سکتے۔ مجھے کیا کرنا چاہیے، مرجانا چاہیے، گھر سے بھاگ جانا چاہیے یا پھر چوری چھپے ٹیلیفون پر لڑکوں سے باتیں شروع کردینی چاہئیں۔ میرے پاس ان دونوں لڑکیوں کے فون نمبرز ہیں، میں نے ان سے بات کی کہ میرا گھر خراب نہ کریں اور میرے شوہر کا پیچھا چھوڑ دیں، مگر ایک نے کہا میں اس سے ملنا نہیں چھوڑ سکتی وہ میرا پیار ہے۔ اور دوسری نے کہا میں تو اس سے ملتی ہی نہیں ہوں۔ آپ مجھے ایسا کچھ بتائیں کہ میرا شوہر ٹھیک ہو جائے اور مجھے صبر آجائے میرے بچے بہت بدتمیز ہوتے جارہے ہیں۔ میں بہت بزدل ہوں اس کے باوجود میں مرنے کی کوشش کرچکی ہوں، مگر ناکام ہوئی۔ میرا شوہر کہتا ہے کہ اس چیز سے تمہیں کیا تکلیف ہوتی ہے۔ اس چیز سے میری ایگو متاثر ہوتی ہے اور پھر اس کی لڑکی سے صرف دوستی تو نہیں ہے نا؟ میں یہ چیز برداشت نہیں کرسکتی۔

ج۔ اچھی بہن! سارے آپشن آپ نے خود لکھ کر ساتھ یہ بھی لکھ دیا ہے کہ یہ ممکن نہیں، حتیٰ کہ آپ نے خودکشی کی کوشش کی، اس میں بھی ناکام ہوئیں۔ سارا مسئلہ آپ کی طبیعت، آپ کے مزاج اور آپ کی فطرت کا ہے۔

آپ کا مزاج شدت پسندی کی طرف مائل ہے۔ آپ ٹی وی ڈرامے زیادہ دیکھتی ہیں اور افسانوں کی دنیا میں رہتی ہیں۔

آپ نے خود لکھا ہے کہ وہ آپ کا خیال رکھتا ہے بقول آپ کے وہ دنیا کا سب سے اچھا شوہر ہے۔ کسی لڑکی سے بات کرنے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ لازمی وہ آپ سے بے وفائی کررہا ہے پھر یہ بھی دیکھیں کہ جو شخص بے روزگار ہے وہ کسی لڑکی کو کیا دے گا اور لڑکی اس سے تعلق کیوں رکھے گی؟ ہوسکتا ہے کہ اس لڑکی نے چڑ کر آپ سے جھوٹ بولا ہو۔

تین بچوں کی ماں ہو کر یہ سوچ کہ گھر سے بھاگ جانا چاہیے، چوری چھپے لڑکوں سے باتیں شروع کردینا چاہئیں۔ میرے خیال میں یہ سوچنا بھی گمراہی ہے۔

پھر یہ کہ آپ کو ایسا بندہ چاہیے جو ہر وقت آپ کے آنسو صاف کرے اور کہے تیرے سارے آنسو میرے اور میرے

سارے سکھ تیرے..... اچھی بہن! حقیقی زندگی میں یہ ڈائیلاگ نہیں بولے جاتے۔ رویوں سے اظہار کیا جاتا ہے۔ آپ کا شوہر آپ کا خیال رکھتا ہے، یہی محبت ہے۔ یہ کوئی ٹی وی ڈراما یا فلم نہیں ہے، جہاں ہیرو کو یہ ڈائیلاگ بولنے کے پیسے ملتے ہیں۔ آپ کو جو کچھ حاصل ہے اس پر اللہ کا شکر کریں۔ یہ محض آپ کا شک بھی ہو سکتا ہے کہ اس لڑکی سے آپ کے شوہر کا تعلق دوستی سے آگے کا ہے۔ آپ خود سوچیں اگر ایسی بات ہوتی تو خاندان میں آپ کے شوہر کا امیج خراب ہوتا۔ جبکہ بقول آپ کے سب اسے بہت شریف سمجھتے ہیں۔

جب آپ کا اللہ پر یقین مضبوط ہے اور آپ یہ بھی جانتی ہیں جو کچھ ہمارے ساتھ ہوتا ہے اس میں بہتری ہوتی ہے تو پھر سب کچھ اللہ پر چھوڑ کر مطمئن ہو جائیں۔ اللہ بہتر کرے گا۔

م۔ کوثر بسم اللہ پور

س:۔ پچھلی دفعہ آپ نے میرے خوابوں کے بارے میں جو تجزیہ کیا یا اندازہ لگایا تھا، وہ سو فیصد درست تھا حالانکہ میں نے آپ کو اپنے حالات نہیں بتائے تھے، صرف خواب بتائے تھے۔ اللہ تعالیٰ آپ کی ذہنی صلاحیتوں کو مزید نکھار بخشے۔ آمین۔

اب جو مجھے پرابلمز درپیش ہیں وہ یہ کہ میرا دماغ بہت سست رہتا ہے جیسے غنودگی میں یا بے خوابی کی دھند چھائی ہوئی ہو۔ خواب کی سی کیفیت لگتی ہے۔ یہ کیفیت تب طاری ہوتی ہے، جب میں بیماری کے بعد تندرستی کی طرف قدم بڑھا رہی ہوتی ہوں، بیماری چاہے معمولی نوعیت ہی کی کیوں نہ ہو جیسے کان کا درد۔ بی پی، شوگر جیسی کوئی پرابلم نہیں ہے۔ نیند بھی ٹھیک ٹھاک آتی ہے۔ بیماری دور ہو جاتی ہے لیکن دماغ کی سستی، غنودگی نہیں جاتی کافی عرصے تک۔ لمبا سفر یا نیند کی بے آرامی بھی ذہن کو سست کرنے میں معاون ثابت ہوتی ہے۔ گھر کے کام کرتی ہوں مگر لگتا ہے کہ جیسے زبردستی مجھ پر لاد دیے گئے ہوں۔ ماضی کے دریچے کھول کر جھانکتی ہوں تو جہاں تک میرا شعور کام کرتا ہے، جب جب میں بیمار ہوئی میری ذہنی کیفیت ایسی ہی تھی۔ میری امی اور چچی جان ذکر کرتی ہیں، میں بہت چھوٹی تھی تو مجھے ٹائیفائڈ ہوا تھا۔ میرے سر کو چڑھ گیا تھا، کہیں ایسا تو نہیں کہ بچپن کے ٹائیفائڈ کا اثر میرے دماغ پر ہو گیا ہو۔

میں ہمیشہ یہ دعا کرتی تھی کہ اللہ تعالیٰ مجھے میری ماں سے ملا دے (امی باہر تھیں بھائیوں کے پاس) پھر اللہ کا کرنا ایسا ہوا کہ جس بات کی امید نہیں تھی، وہ معجزہ ہو گیا۔ امی جان کو باہر کا موسم راس نہیں آیا وہ میرے پاس آگئیں۔ میرا دماغ سست ہی تھا، مگر اپنی ماں کے آنے کی مجھے بے حد خوشی تھی۔ میرا ذہن سنبھل رہا تھا۔ ماں کی محبت جیسے عشق میں تبدیل ہو رہی تھی پھر اچانک میری پیاری ماں دار فانی سے دار البقا کی طرف چلی گئیں۔ مجھے سخت ذہنی دھچکا لگا۔ مجھے لگا کہ میری دنیا ویران ہو گئی۔ پھر میں نے خدا سے لو لگالی۔ مگر عشق حقیقی کی سیڑھی کے پہلے زینے کی خاک ہی بنی ہوئی ہوں۔

شاعری کرتی ہوں جی چاہتا ہے چھپواؤں مگر کہاں؟ پہاڑ جیسا سوالیہ نشان۔ بعض دفعہ میں سوچتی ہوں کہ کوئی کام میں شاید ڈھنگ سے نہیں کر سکتی۔ ٹیچری کا شوق تھا دو سال کی بھی، مگر پھر سیاست کی نذر ہو گئی۔ اپنی کہانیاں ادھوری پوری کر سکوں اپنی نظمیں چھپوا سکوں۔ جواب نفی میں ہوتا ہے تو دل چاہتا ہے کہ چپکے سے مرجاؤں، مگر پاؤں میں بچوں کی زنجیر، قبر کا عذاب مرنے سے روک لیتا ہے۔ عید الفطر کے تین چار دن ایسے ہی جاگتے سوتے گزرے۔

ج۔ اچھی بہن! آپ کا بنیادی مسئلہ صحت ہے۔ ذہنی صحت نہیں جسمانی صحت..... ذہنی لحاظ سے آپ بالکل ٹھیک ہیں آپ کے خط سے اندازہ ہوتا ہے۔ ذہین بھی ہیں۔ اور لکھنے کی صلاحیت بھی ہے۔

بیماری کے بعد آپ کی یہ کیفیت دواؤں کے ری ایکشن کا نتیجہ بھی ہو سکتی ہے۔ کچھ لوگوں کو ایلوپیتھک دوائیں موافق نہیں آتیں، ہو سکتا ہے یہ اینٹی بائیوٹک کے سائڈ ایفکٹ کی وجہ سے ہو۔ کچھ دواؤں سے قبض بھی ہو جاتا ہے قبض کی وجہ سے بھی ذہن سست رہتا ہے اور غنودگی کی کیفیت طاری رہتی ہے۔

جسم میں خون کی کمی اور کمزوری سے بھی یہ کیفیت ہو جاتی ہے بہتر یہ ہے کہ آپ کسی اچھے ڈاکٹر سے مشورہ کریں۔ ہومیو پیتھک یا حکیمی علاج سے بھی آپ کو فائدہ ہو سکتا ہے۔ کان کی تکلیف اگر اب بھی ہے تو کسی ای این ٹی اسپیشلسٹ کو دکھائیں۔

آپ اپنی شاعری اور کہانیاں بھجوادیں۔ اگر قابل اشاعت ہوئیں تو شعاع، خواتین میں شائع ہو جائیں گی۔

ع۔ت قصور

س ۔ آپی میرا مسئلہ یہ ہے کہ میرے ماتھے اور ہونٹ کے اوپر والے حصے پر ٹانکے لگے تھے' جن کے نشان بہت واضح ہیں میں ان نشانوں کو ختم کرنا چاہتی ہوں پلیز کوئی گھریلو ٹوٹکا بتادیں۔

آپی کوئی ایسا ٹوٹکا بتادیں جس سے چہرے کے ساتھ جسم بھی سفید ہوجائے۔ آپی میری عمر 17 سال ہے قد 5 فٹ ہے میرا وزن 33 کلو ہے۔ میں بہت زیادہ پتلی ہوں جس کی وجہ سے شرمندگی ہوتی ہے پلیز کوئی ایسا ٹوٹکا بتادیں' جس سے دبلا پن ختم ہوجائے۔

آپی میرے چہرے پر رونق نہیں ہے میں چاہتی ہوں میرے چہرے پر رونق بھی آجائے اور گال بھی گلابی ہوجائیں۔ میری آنکھوں میں بھی چمک نہیں ہے۔ آپ نے ایک دفعہ بتایا تھا کہ آنکھوں میں خالص شہد لگانے سے آنکھیں چمک دار ہوجاتی ہیں۔ میں نے خالص شہد آنکھوں میں لگایا تو میری آنکھوں میں جلن اور خارش شروع ہوگئی۔

ج ۔وزن بڑھانا تو کوئی مسئلہ ہی نہیں ہے وزن کم کرنا مسئلہ ہے۔

قد اور عمر کے لحاظ سے وزن بہت زیادہ کم نہیں' آپ بہت زیادہ وزن بڑھانے کی کوشش نہ کریں۔ عمر کے ساتھ ساتھ خود بخود وزن بڑھ جاتا ہے۔

وزن بڑھانے کے لیے آپ ایک گلاس دودھ میں ایک کیلا باریک ٹکڑے کاٹ کرڈالیں اس میں پانچ سے سات کھجوریں کاٹ کرڈال دیں اور ہفتہ میں دو تین بار کھائیں۔ وزن بڑھ جائے گا۔ آم بھی وزن بڑھاتا ہے۔ آم اور دودھ کا شیک بنا کرپی سکتی ہیں۔

سیبوں کا موسم شروع ہوچکا ہے ایک سیب کاٹ کر کھلے آسمان کے نیچے چھلنی سے ڈھانپ کر رکھ دیں۔ صبح ایک کپ دودھ کے ساتھ استعمال کریں۔ وزن بڑھ جائے گا۔

اگر آپ نے ان مشوروں پر عمل کیا تو آپ کے چہرے پر رونق اور آنکھوں میں چمک بھی آجائے گی۔

ٹانکوں کے نشان جانا ممکن نہیں۔ یہ صرف پلاسٹک سرجری سے دور ہوسکتے ہیں۔

ماہ نور شفق..... بھکر

س ۔ "ریٹھے' آملے اور سیکا کائی کو پیس کر اس سے بال دھوتی ہوں۔ تقریباً" ایک ڈیڑھ مہینہ سے یہ عمل ہفتے میں ایک بار دوہراتی ہوں مگر مجھے خاطر خواہ فوائد حاصل نہیں ہورہے اور یوں لگتا ہے کہ مذکورہ اشیا سے بال دھونے کے بعد ان میں وہ نکھار مفقود ہوجاتا ہے جیسا شیمپو کے بعد بال پھولے پھولے لگتے ہیں۔

ان اشیا سے بال دھونے کے بعد چپ چپاہٹ واضح ہوتی ہے ایسا لگتا ہے جیسے بال دھوئے ہی نہ ہوں اور ان میں تیل لگا ہو۔ میں نے ان تمام چیزوں کو اکٹھا پیس کر رکھا ہوا ہے۔ نہانے سے آدھا گھنٹے پہلے ان تمام اشیا کو پانی سے مکس کرکے رکھ دیتی ہوں اور بالوں میں لگاتے وقت زیادہ تر جڑوں پر لگانے کی کوشش کرتی ہوں تقریباً" 2 یا 3 منٹ کے لیے' پھر بال پانی سے دھولیتی ہوں بعد ازاں کوئی شیمپو یا کنڈیشنر کا استعمال نہیں کرتی۔

ج ۔ آملہ اور سیکا کائی سے بالوں کی افزائش ہوتی ہے اور ریٹھا بالوں کی صفائی کے لیے ہوتا ہے۔ آپ جو پیسٹ بناتی ہیں اس میں ریٹھے کی مقدار بڑھادیں' بالوں سے چپ چپاہٹ دور ہوجائے گی۔ آپ کا بال دھونے کا طریقہ صحیح ہے' لیکن یہ پیسٹ بالوں میں صرف جڑوں میں نہیں بلکہ پورے سر پر لگائیں۔ اور کم از کم پندرہ منٹ تک لگا رہنے دیں۔ پھر سر دھوئیں۔ بال صاف ہوجائیں گے۔ لیکن جو بات شیمپو کرنے سے ہوتی ہے۔ وہ ممکن نہیں۔ آپ چاہیں تو بال دھونے کے بعد شیمپو بھی استعمال کرسکتی ہیں۔ شیمپو کے انتخاب میں احتیاط ضروری ہے صرف وہ شیمپو استعمال کریں' جو آپ کے بالوں کے لیے مناسب ہو۔